چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

منیجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت -/60 روپے

سالانہ قیمت -/1080 روپے

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیوار دو بازار کراچی: 32744391

☆ مشرکوں کو زیبا نہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں جب کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہوں۔ ان لوگوں کے سب اعمال بے کار ہیں اور یہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اللہ کی مسجدوں کو تو وہ لوگ آباد کرتے ہیں، جو اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان لاتے اور نماز پڑھتے اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے یہی لوگ امید ہے کہ ہدایت یافتہ لوگوں میں داخل ہوں کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد محترم یعنی خانہ کعبہ کو آباد کرنا اس شخص کے اعمال جیسا خیال کیا ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے یہ لوگ اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ (سورۃ توبہ 9 آیت 17 سے 19)

☆ یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے، یہاں تک کہ اگر مقدور ہو تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر کر کافر ہو جائے گا اور کافر ہی مرے گا، تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں برباد ہو جائیں گے اور یہی لوگ دوزخ میں جانے والے ہیں جس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 217)

☆ مومنو! اہل کتاب کے بہت سے عالم اور مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھاتے اور ان کو راہ اللہ سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے رستے میں خرچ نہیں کرتے ان کو اس دن کے عذاب الیم کی خبر سنا دو۔ (سورۃ توبہ 9 آیت 34)

☆ مومنو! کسی غیر مذہب کے آدمی کو اپنا راز دار نہ بنانا یہ لوگ تمہاری خرابی اور فتنہ انگیزی کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ جس طرح ہو تمہیں تکلیف پہنچے ان کی زبانوں سے تو دشمنی ظاہر ہو ہی چکی ہے اور جو کینے ان کے سینوں میں مخفی ہیں وہ کہیں زیادہ ہیں اگر تم عقل رکھتے ہو تو ہم نے تم کو اپنی آیتیں کھول کھول کر سنا دی ہیں دیکھو تم ایسے صاف دل لوگ ہو کہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہو حالانکہ وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے اور تم سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو اور وہ تمہاری کتاب کو نہیں مانتے اور جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر غصے کے سبب انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ بدبختو غصے میں مر جاؤ اللہ تمہارے دلوں کی باتوں سے خوب واقف ہے۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 118 سے 119)

☆ مومنو! اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو، تو اس میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کی طرف رجوع کرو یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 59)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

صبا محمد اسلم گوجرانوالہ سے، السلام علیکم! دو ماہ سے ڈر ڈائجسٹ کے خطوط کی محفل میں شامل نہ ہوسکی جس کی وجہ یہ تھی کہ میرے ابو سخت علیل تھے اور سارے گھر کا نظام درہم برہم ہوکر رہ گیا تھا، ہم تمام گھر والوں کا دن کا چین اور رات کا سکون ختم ہوکر رہ گیا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی ہم اپنے بھاگ دوڑ اور پریشانیوں سے چھٹکارا نہ پاسکے اور پھر وہ کچھ ہوگیا جو ہم تصور نہ کرسکتے تھے، ہمارے ابو ہم سے جدا ہوکر خالق حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ یہ تو حقیقت ہے کہ ہر کسی نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور ایک نہ ایک دن ہر کسی نے اس دنیا سے چلے جانا ہے۔ لیکن کچھ رشتے اور ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جو بھلائے نہیں بھولتیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ابو کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے، اب ہم ان کے لئے اشک بھری آنکھوں سے دعا ہی کرسکتے ہیں، خیر ڈر ڈائجسٹ کے قارئین سے میری التجا ہے کہ میرے ابو کے لئے دعا مغفرت ضرور کریں۔ شکریہ۔

☆☆ صبا صاحبہ: ہماری اور تمام قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ابو کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور تمام لواحقین کو صبر جمیل، یہ حقیقت ہے کہ ہر کسی نے ایک نہ ایک دن اس دنیا سے چلے جانا ہے اور باقی رہے گا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا وجود، اللہ تعالیٰ ہم تمام پاکستانیوں اور تمام مسلمانوں پر اپنا فضل و کرم رکھے اور ہمیں نیک عمل کی توفیق عطا کرے۔ (آمین)

وجیہہ سحر جوہر آباد سے، ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! سب سے پہلے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ آپ نے مجھے ''ڈر ڈائجسٹ'' کے رائٹرز میں شامل کرلیا۔ ان قارئین کی بھی مشکور ہوں جنہوں نے میری کہانی ''خناس'' کو پڑھا اور میری کاوش کو سراہا۔ میں ایک عرصے سے ایک میگزین کے لئے لکھ رہی ہوں، لیکن ڈر ڈائجسٹ میں کہانی شائع ہونے کے بعد مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں اپنے جیسے لوگوں میں آ گئی ہوں، پراسرار موضوعات پر کہانیاں لکھنا میری تخلیقی صلاحیت ہی نہیں میرا شوق بھی ہے۔ مارچ کا ڈر ڈائجسٹ بہترین کہانیوں کا مجموعہ تھا خاص طور پر ملک این اے کاوش کی کہانی ''تہی دست'' اور بلقیس خان کی کہانی ''موت کا قلعہ'' بہترین تحریریں تھیں۔ دونوں کہانیوں میں سبق آموز ہونے کی بات مشترک تھی۔ ایم اے راحت کی سلسلہ وار کہانی ''زندہ صدیاں'' اور ایم الیاس کی عشق ناگن منفرد انداز اور اچھوتے حقائق کی بہترین مثال ہیں۔ شاعری کا سلسلہ پسند آیا۔ میں بھی اپنی دو غزلوں کے ساتھ اس سلسلے میں شامل ہورہی ہوں، اگر پسند آئیں تو ضرور شائع کیجئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کے لئے نت نئے موضوعات پر کہانیاں لکھوں گی۔ بس ڈر ڈائجسٹ کے رائٹرز کو اتنا پیغام دوں گی کہ پراسرار موضوعات پر کہانیاں اس طرح لکھیں کہ اس میں کوئی شک کی گنجائش نہ ہو۔

☆☆ وجیہہ صاحبہ: بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ڈر ڈائجسٹ کو اہمیت دی اور ڈر ڈائجسٹ کے لئے اپنے مثبت خیالات کا اظہار کیا، کون سا رائٹر اچھی کہانیاں لکھتا ہے، یہ قارئین کی پسند پر منحصر ہے کہ قارئین کس کی کہانیاں زیادہ پسند کرتے ہیں، امید ہے کہ آئندہ بھی آپ کا تعاون ڈر ڈائجسٹ کے ساتھ جاری رہے گا۔ Thanks۔

بلقیس خان پشاور سے، السلام علیکم، امید واثق ہے کہ ادارہ خیر و عافیت سے ہوگا اور زندگی کے کاموں کو با احسن انداز میں ادا کر رہا ہوگا، ڈر ڈائجسٹ ماہ اپریل 2015ء کا شمارہ 22 تاریخ کو ملا، ٹائٹل پر موجودہ حسینہ بہت ہی معصوم بھولی بھالی لگ رہی تھی۔ خیر اپنی کہانی جیت دیکھ کر دلی طمانیت ملی۔ ڈر ڈائجسٹ میں اس ماہ کے خطوط، بہت اچھے اور پیارے تھے، کہانیوں میں خواہش ناتمام پڑھ کر خوف کے رونگٹے کھڑے ہوگئے، ویلڈن عثمان غنی، آپ ریگولر کیوں نہیں ہوجاتے، منفرد کہانیاں لکھنے میں آپ ماہر ہیں، ایس امتیاز احمد عجیب مخلوق زبردست، طاہرہ آصف جادوئی چکر بہترین کہانی، جنات سے دوستی شگفتہ ارم درانی انوکھی و اچھوتی کہانی۔ قسط وار تحریروں میں ردلو کا اچھی ہے، زندہ صدیاں تھوڑی سی الجھی ہے۔ عشق ناگن پرانے دور کی ہندو داستان لگ رہی ہے۔ رقص اجل، شہزادہ چاندزیب صاحب آپ کی تحریر ڈر کے معیار کے مطابق نہیں تھی، ایم الیاس کی بیک ٹائیگر کی طرز کی لکھی ہوئی کہانی تھی جس میں خوف سے زیادہ ایکشن قلم بند کیا گیا ہے۔ میری کہانی آخری خواہش آپ کے پاس ہے۔ جلد شائع کرکے شکریہ کا موقع فراہم کردیں۔

☆☆ بلقیس صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، جن رائٹروں کی زیادہ کہانیاں موجود ہوتی ہیں وہ ریگولر ہوتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ ہر ماہ ایک کہانی بھیج کر انتظار کرنا پڑے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس موضوع پر پہلے سے کہانی موجود ہوتی ہے، کمپوز شدہ لہٰذا

کہانی التوا کا شکار ہوجاتی ہے، جب دو تین کہانیاں ہوتی ہیں تو کوئی نہ کوئی کہانی ضرور شامل اشاعت ہوتی ہے۔ امید ہے غور فرمائیں گی۔

ناصر محمود فرہاد فیصل آباد سے۔ السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ ایک طویل وقفے کے بعد دوبارہ ملاقات ہورہی ہے۔ نہ تو کوئی ضروری کام تھا نہ کوئی مصروفیت، پھر بھی نہ جانے کیوں رابطہ ہی نہ ہو پایا۔ ہر ماہ رابطہ کرنے کا ارادہ باندھتا مگر پھر نہ جانے کیسے وقت ہی گزر جاتا اور بات اگلے مہینے کے حوالے ہوجاتی۔ یوں دھیرے دھیرے کتنا ہی وقت گزر گیا۔ یا شاید دھیرے سے تو نہیں وقت تو بہت تیزی سے گزر گیا ہے۔ مگر میں شکر گزار ہوں آپ کا...... اور سب قارئین کا جنہوں نے مجھے یاد رکھا۔ جو میری کہانیوں کو پسند کرتے ہیں اور انہی کی بدولت مجھے لکھنے کی تحریک ملتی ہے۔ جس کا نتیجہ کہانی کی شکل میں آپ کی میز پر ہوتا ہے۔ زیر نظر کہانی بھی اس تحریک کا نتیجہ ہے۔ میں کسی ایک کا خصوصیت سے نام تو نہیں لوں گا کیونکہ سب قارئین ہی بہت اچھے اور پیار کرنے والے ہیں اور مجھے خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہے کہ انہوں نے مجھ ناچیز کو یاد رکھا کیونکہ اس محفل میں مجھ سے زیادہ اچھے لکھنے والے، اچھا تخیل رکھنے والے موجود ہیں اور ان کے ہوتے کسی کی کمی محسوس نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ جہاں اتنے اچھے قلم کار موجود ہوں وہاں جگہ حاصل کرنا ہی اعزاز کی بات ہے۔ آپ کے ''حسن نظر'' کی ''نذر'' یہ ''زیر نظر'' کہانی ہے۔ امید ہے پسند آئے گی۔ تبصرے کا منتظر رہوں گا۔ آپ سب کا شکریہ۔ اللہ سب کو خوش رکھے اور سکون عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆ ناصر صاحب: بہت بہت شکریہ کہ اپنی مصروفیات سے تھوڑا وقت نکال کر ڈر ڈائجسٹ کو یاد رکھا اور کہانی ارسال کی، اچھے لوگ اکثر یاد آتے ہیں اور ان کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے، کہانی اور خط دلی لگاؤ کے لئے ہوتے ہیں اور اس طرح زبان پر خیر و عافیت کے الفاظ مچلنے لگتے ہیں، خیر امید ہے آئندہ ماہ بھی شکریہ کا موقع ضرور دیں گے، کہانی لیٹ موصول ہوئی، لہٰذا آئندہ ماہ شامل اشاعت ہوگی۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ یار سے۔ ایڈیٹر صاحب سلام مسنون، آپ کی اور آپ کے اسٹاف کی خیریت کا طالب ہوں، میری طرف سے ان سب کا شکریہ ادا کردیں جنہوں نے مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھا اور میری اہلیہ کے لئے دعائے مغفرت کی، اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی امان میں رکھے۔ شوکت علی بلوچ صاحب آپ کے روحانی الفاظ پر عمل کریں۔ اللہ اپنی رحمت کی بارش کرے گا۔ آئندہ تبصرہ کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ ڈر کے نئے پرانے ساتھیوں کے لئے دعائیں۔

☆☆ شرف الدین صاحب: آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنی انتھک مصروفیات کے باوجود دلی جذبات کے لئے وقت نکالا، آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی، اللہ حافظ۔

ضرغام محمود کراچی سے۔ تسلیمات! ماہ اپریل 2015 کا ڈر ڈائجسٹ خوب صورت سرورق کے ساتھ ملا، سرورق پر نظر پڑتے ہی دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں، سرورق پر دوشیزہ اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ اپنے حنائی ہاتھوں کو گھور رہی تھی۔ چہرے پر معصومیت کا وہ عالم تھا کہ......

اتنی خاموش سی معصوم نظر
مصروف دعا ہو جیسے کوئی

دل پر جبر کر کے امنگوں کو لوری دے کر سرورق سے نظر ہٹائی اور شمارے کے اندر جھانکا قرآن کی باتیں پڑھتے ہوئے خطوط تک آئے، اس دفعہ خطوط میں کہانیوں پر تبصرہ کم تھا، پچھلے شمارے پر میں نے سیر حاصل تبصرہ لکھ کر سیل کیا تھا، شاید آپ تک نہیں پہنچا اس لئے اس دفعہ ڈاک سے تبصرہ روانہ کر رہا ہوں۔ خطوط میں تمام بہنوں بھائیوں کے خطوط پڑھے ان تمام قارئین کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھ ناچیز کی تحریروں کو پسند کیا۔ خطوط سے آگے بڑھے تو کہانیوں کی باری آئی، سب سے پہلے سلسلے وار کہانیاں پڑھیں۔ رولوکا، زندہ صدیاں، عشق ناگن اور خناس چاروں کہانیاں نہایت عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہیں، مگر چار چار قسط وار کہانیاں...... باقی تحریروں میں شہزادہ چاند زیب عباسی کی تحریر ''رقص اجل'' سیونٹی کے دور کی بہترین تھریلر مووی تھی جس میں دو ہیرو اور ایک ہیروئن کے درمیان محبت و نفرت کی کشمکش کو عمدگی سے پیش کیا گیا حالانکہ تحریر بہت اچھی تھی مگر اس تحریر میں خوف یا ڈر کا عنصر نہیں تھا...... ہاں تھریلر بہت تھا...... طاہرہ آصف صاحبہ کی جادوئی چکر بھی بہترین تحریر تھی۔ خلیل جبار کی پراسرار حویلی نے بھی متاثر کیا۔ غیبی محافظ اور خونی حویلی بھی اچھی تحریریں تھیں جبکہ اس شمارے کی سب سے بہترین تحریر بلقیس خان صاحبہ کی جیت تھی مختصر سی تحریر کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا تھا بہت خوب بلقیس خان صاحبہ...... اللہ کرے زور قلم اور زیادہ...... خیر ڈر ڈائجسٹ کی مزید ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆☆ضرغام صاحب: بہت بہت شکریہ کہ آپ نے خلوص دل ارسال کیا، امید ہے آپ ہر ماہ خوب صورت لفظوں کو تحریر کی صورت میں بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

اسحاق انجم کنگن پور سے، السلام علیکم! شمارہ مارچ ڈر ڈائجسٹ ملا، ''تہی دست'' بہترین تحریر تھی! آج کل نوجوان نئی نسل جوانی کے نشے میں سب کچھ بھول رہی ہے اور ان کا انجام ملک علی زمان جیسا ہی ہوتا ہے جو نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا، نئی نسل کو اس کہانی سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ ''نیا رشتہ'' بھی خوب رہا، ''اندھا قتل'' ''موت کے پنجے'' ''خواب پریشان'' ''موت کے شکنجے میں'' ''غلط فہمی'' اور ''تماشہ اجل'' یہ ہی کہانیاں پڑھ سکا، چھوٹی چھوٹی کہانیاں بہت اپنے اندر دلوں کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی تھیں۔ سلسلے وار تحریریں رولو کا، عشق ناگن رائٹرز کا نام زندہ رکھیں گی! قوس قزح بھی پسند آئے، سرورق تو اپنی مثال آپ ہوتا ہے! ابھی یہاں پنجاب میں بارشوں کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا ہے، اور ڈر کے لئے خط پوسٹ کرنا پھر لیٹ ہوتا جا رہا ہے! خدا جانے اس بار بھی شامل اشاعت ہوتا ہے یا رہ جاتا ہے! تمام رائٹرز کو خلوص دل سے سلام!

☆☆اسحاق صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اور تمام اہل خانہ پر اپنی رحمت کی بارش برسائے، اور آپ کو کلی صحت عطا کرے، خط لکھنے، کہانیوں کی تعریف اور آئندہ بھی نوازش نامہ بھیجنے کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں۔

احسان سحر میانوالی سے، السلام علیکم! اللہ پاک تمام اہل مسلم کو جہاں بھی رکھے امن وسکون سے رکھے۔ اچھی باتیں دل سے نکل کر دل میں ہی سما جاتی ہیں، خوشگوار یادیں بھی انسان کے دل و دماغ کو شاد رکھتی ہیں، ہم بھی آج کل موسم بہار کی خوبصورتی کو سمیٹنے اپنے گاؤں آئے ہوئے ہیں، جب بھی بہار آتی ہے میں شہر کے شور وغل سے فرار ہو کر اپنے گاؤں کی بانہوں میں سما جاتا ہوں۔ امی، ابو اور بھائیوں کے ساتھ وقت اتنا سہانا گزرتا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ پھر جب جانے کا وقت آتا ہے تو ہر چیز اداس ہو جاتی ہے۔ خیر یہ تو زندگی کا حصہ ہے آنا جانا...... اور جا کر آنا...... جدائی...... ملن...... خوشی...... غمی...... یہ زندگی کے تحفے ہیں۔ خیر اپنی محفل میں حاضری دے کر بھی مجھے بہت اچھا لگتا ہے...... زندگی رہی تو اگلے ماہ حاضر ہوں گے...... ڈر کی کہانیوں پر تفصیلی تبصرے کے ساتھ۔ شاہد انکل...... جو اب انکل کم اور دوست زیادہ ہیں سے کافی دلی لگاؤ ہے مجھے، فون پر ان سے گلے شکوے حالات کا رونا رونا کافی اچھا لگتا ہے اللہ پاک انہیں صحت والا سکون عطا فرمائے اور ساتھ تمام قارئین کو بھی آمین۔

☆☆احسان صاحب: خط لکھنے اور حال دل سنانے اور خیر خیریت کیلئے Thanks، امید ہے آئندہ ماہ بھی حال دل سنا کر شکریہ کا موقع دیجئے۔

قدیر رانا راولپنڈی سے، قابل احترام ایڈیٹر صاحب، آداب عرض آپ کی خیریت کا طالب ہوں، اپریل کے شمارے میں غزل کی اشاعت پر تہہ دل سے مشکور ہوں۔ امید ہے کہ جاری تعاون کا یہ سلسلہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ میرے بڑے بھائی اور استاد محترم جناب رانا حنیف عاطر صاحب پچھلے تین ماہ سے سخت بیمار ہیں انہیں فالج کا اٹیک ہوا ہے، قارئین ڈر سے مودبانہ التماس ہے کہ ان کے حق میں دعا کریں تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں جلد از جلد صحت عطا فرمائے، آمین۔ میں ان تمام قارئین کا شکر گزار ہوں کہ وہ میرے کلام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

☆☆قدیر صاحب: ہماری اور قارئین کی تہہ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ رانا حنیف عاطر صاحب کی تمام پریشانیاں اور بیماریاں ختم کر کے کلی صحت عطا کرے اور اپنے فضل وکرم سے نوازے۔ (آمین)

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! وعدے کے مطابق Short Story بھیج رہے ہیں۔ بھوت ہاؤس، مراسلہ، غزل ارسال خدمت ہے۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ ہماری طرف سے آپ کو اور اسٹاف کو دعا سلام اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆امتیاز صاحب: دعا ہے کہ خوش وخرم رہیں، ہر ماہ کہانی بھیجتے رہیں اور ہاں خاص طور سے تجزیہ لکھنا نہ بھولئے گا۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیر وعافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، کام کی مصروفیات کی وجہ سے جلدی شہر بک اسٹال پر نہ جا سکا۔ آج ہی شہر گیا تو ڈر ڈائجسٹ اپریل کے پرچے سے ملاقات ہوگئی، جسے پا کے میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا، سرورق بہت خوب صورت تھا پرچے کے اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہوگئی، یہ ایک معیاری پرچہ ہے، جو ہمیں مقررہ تاریخ پر مل جاتا ہے، غزل اور خط شائع کرنے کا شکریہ، پرچے کے تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ بہتر ہیں۔ اس بار خط لیٹ ہوگیا ہے آئندہ ایسا نہیں ہوگا، موسم کافی حد تک بدل گیا ہے۔ ہر طرف رنگ برنگے پھول چمک رہے ہیں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ قرآن کی باتیں بہت اچھا سلسلہ ہے، کہانیوں میں جیت، تباہی بربادی، عشق ناگن، خونی حویلی وغیرہ اپنی اپنی جگہ پر اچھی تھیں، اگر آپ پرچے

میں کچھ تبدیلیاں کریں تو پرچے کو چار چاند لگ جائیں گے۔ چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں کسی قریبی شمارے میں جگہ دے دیں۔

☆☆ اسلم صاحب: خط لکھنے اور پرچے کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے تمام اہل خانہ کو خوشیوں سے نوازے، اگلے ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

وارث آصف خان واں بھچراں سے، السلام علیکم! اپریل کا شمارہ اپنی تمام تر رونقوں اور حشر سامانیوں کے ساتھ ملا۔ سرورق بے حد پسند آیا، ڈر ڈائجسٹ میں سرورق کے ٹائٹل پر بے حد توجہ دی جاتی ہے، کہانیاں بھی مزیدار تھیں، رولوکا کا تو جواب نہیں ہر قسط میں ایک نیا ولولہ نیا جوش دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے اندر ایسا سحر ہے کہ جو قاری کو جکڑ سا لیتا ہے۔ احسان سحر کافی عرصے بعد واپس آئے موسٹ ویلکم، اب بنا کسی تعطل کے کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ ساحل دعا بخاری اس ماہ غیر حاضر تھیں، ان کے بغیر ڈر ڈائجسٹ پھیکا پھیکا سا لگا۔ ان کی تمام چٹ پٹی اور نصیحت آمیز باتوں سے اس دفعہ ہم محروم رہ گئے لیکن امید ہے کہ یہ محرومیت صرف اسی ماہ تک ہے، خالد شاہان صاحب بے حد اچھا اور زبردست لکھتے ہیں۔ ان کے قلم میں خدا نے وہ سحر سا ڈالا ہے کہ ان کی ہر تحریر پڑھے بنا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ جلد سے جلد دوبارہ نئی کہانی کے ساتھ جلوہ گر ہوں۔ آج کل بارشوں کا سیزن ہے۔ اس باران رحمت نے کہیں تو فصلوں میں ہریالی سی بھری، تھل جیسے علاقوں میں پانی کی گھٹتی ہوئی مقدار کو کم کیا تو کہیں سیلاب کی صورت میں موت بن کر ابھری۔ کئی لوگ چھتیں گرنے سے جاں بحق ہو گئے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا ان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین) قارئین یہ دنیا بے وفا ہے۔ یہاں کسی کو بھی محبت کا صلہ نہیں ملتا۔ اگر کسی کو جان سے بڑھ کر چاہا جائے اس کے لئے ہر حد سے بھی بے شک گزرا جائے لیکن اس کا اجر نہیں ملتا۔ محبت کے بدلے محبت نہیں ملتی نفرت ملتی ہے، دکھ ملتا ہے...... اذیت ملتی ہے...... اس دنیا میں شاید سچی محبت کا کوئی صلہ نہیں ہوتا، ہر کوئی مفاد پرست ہے مفاد ہو تو آپ ان کے لئے جان سے بڑھ کر عزیز ہوں گے، وہ آپ پر جان نچھاور کریں گے۔ لیکن جب مفاد نکل جائے گا وہ آپ کو آٹے سے بال کی طرح نکال کر پھینک دیں گے اور پھر ساری زندگی آپ روتے رہیں گے۔ کاش کہ دل پر اختیار ہو جائے تو یہ رونا بھی مقدر نہ بنے۔ کاش کہ لوگ اس بے وفا لوگوں سے دل لگانے کے بجائے خدا کی ذات سے دل لگائیں۔ انسان بے وفا ہے لیکن خدا بے وفا نہیں ہے وہ تو اپنے بندوں سے حد سے بڑھ کر پیار کرتا ہے لیکن ہم بجائے اس کے کہ اصل محبت کی طرف لپکیں ہم دکھ درد کی طرف منہ کرتے ہیں۔ بہرحال ڈر ڈائجسٹ سے تعلق تھا...... ہے اور رہے گا۔ اب انشاء اللہ ہر ماہ حاضری دیا کروں گا اور بہت جلد اک کہانی بھی ارسال کروں گا۔ اگلے ماہ تک اجازت دیں۔ خدا حافظ۔''

☆☆ وارث صاحب: ایک مرتبہ پھر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، امید ہے کہ اب حسب وعدہ اپنا وعدہ پورا کریں گے، یعنی ڈر ڈائجسٹ میں ہر ماہ اپنی کاوشیں بھیجتے رہیں گے، تھینکس۔

حسنین حیدر شاہین لالیاں سے، السلام علیکم! ادارے کی ترقی کے لئے نیک خواہشات اور ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ دوسری مرتبہ میں پھر حاضر ہوں۔ اپنا خط ڈر ڈائجسٹ میں دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ امید کرتا ہوں کہ ڈر ڈائجسٹ ایک دن ان ہی اچھائیوں کی وجہ سے آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے گا۔ اور ایسا ہو بھی رہا ہے۔ اپریل میں میری سالگرہ پر آپ نے مجھے بہت اچھا تحفہ دیا۔ اس کے لئے تھینکس۔ قرآن کی باتیں بہت ہی اچھی تھیں۔ اور اب آتے ہیں کہانیوں کی لوکیشن کی طرف۔ تو سب سے پہلے بلقیس خان کی جیت نے تو دل ہی جیت لیا۔ آپی نے بہت ہی اچھا لکھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے قلم کو اور طاقت بخشے۔ آمین۔ جادوئی چکر، شیطانی مخلوق، رولوکا، پراسرار حویلی نے تو جیسے ڈر ڈائجسٹ میں جان ڈال دی ہو، بہت ہی اچھی اور منفرد تحریریں تھیں۔ رقص اجل نے تو واقعی رقص کرا دیا۔ خونی حویلی کو کاشف عبید نے بہت خوب لکھا۔ میں حسب وعدہ اپنی تحریر ادھورا انتقام بھیج رہا ہوں، مجھے 100 فیصد یقین ہے کہ یہ تحریر ضرور اپنی جگہ بنالے گی۔ میں شب و روز ڈر ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ حسنین صاحب: اللہ کرے کہ ادھورا انتقام اپنی جگہ بنالے، ابھی پڑھی نہیں اچھی ہوئی تو ضرور جلوہ گر ہو گی، آپ کوشش پر کوشش کرتے رہیں تو یقیناً کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

ایم نادر شاہ شجاع آباد سے، السلام علیکم ورحمۃ اللہ! امید کرتا ہوں کہ ڈر ڈائجسٹ کے تمام قارئین، اسٹاف اور رائٹرز خیر و عافیت سے ہوں گے...... اس امید کے ساتھ خط لکھ رہا ہوں کہ شائع کر کے حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ ڈر ڈائجسٹ میں تمام کہانیاں اچھی ہوتی ہیں، میں نے بھی کئی کہانیاں بھیجی تھیں...... ان کا کیا بنا...... مجھے ضرور جواب دیجئے گا...... آج کل میں بہت مصروف ہوں...... اس لئے

نہیں لکھ سکا...... آئی ایم سوری جی...... میری طرف سے تمام ڈر سے انسیت رکھنے والوں کو پیار ابھرا سلام۔

☆☆ نادر صاحب: کوئی اچھی سی کہانی ارسال کریں، جو کہانیاں موجود ہیں، وہ بہت زیادہ اصلاح طلب ہیں اور آج کل وقت کی بہت کمی ہے، اگر وقت ملا تو اصلاح کر کے شائع کردی جائیں گی۔

طاہر عباس شجاع آباد سے، میری طرف سے تمام قارئین اور رائٹرز کو پیار و محبت بھرا سلام قبول ہو...... آج ڈر ڈائجسٹ کو دیکھا تو وہ دن یاد آ گئے کہ جب مجھے لکھنے کا شوق تھا...... لیکن آپ نے میری کوئی اسٹوری شائع نہیں کی تو میں نے لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا، ڈر پڑھ کر ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے، خاص طور پر ردلوکا، اور عشق ناگن یہ کہانیاں تو میری بیسٹ کہانیاں ہیں، مارچ کے شمارے میں سب سے پہلے اپنے پرانے دوست کاشف عبید کی کہانی پڑھی، میری طرف سے کاشف کو بہت بہت مبارک ہو، 2013ء سے ہم نے ڈر ڈائجسٹ کو پڑھنا شروع کیا ہے اور دو تین اسٹوریاں لکھی ہیں اور بھیجی بھی ہیں لیکن مجھے بہت افسوس ہوا کہ آپ نے میری کہانی شائع نہیں کی۔

☆☆ طاہر صاحب: جو کہانیاں زیادہ اصلاح طلب ہوتی ہیں وہ التوا کا شکار ہو جاتی ہیں، دل برداشتہ ہونا ٹھیک نہیں، لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بن جاتا ہے اور گاتے گاتے گویا بن جاتا ہے، امید ہے آپ ان باتوں پر غور فرمائیں گے اور نئی کہانی کسی سے اصلاح کرا کے ارسال کریں گے۔

محسن عزیز حلیم کوٹھا کلاں سے، امید ہے کہ ڈر سے وابستہ تمام افراد خوش و خرم ہوں گے، اللہ تعالیٰ سب کو خوش رکھے آمین، سب سے پہلے کہانی شائع کرنے کے لئے شکریہ، امید ہے کہ جس طرح آپ نے یہ کہانی شامل اشاعت کی اسی طرح، مظلوم روحیں...... بھی شامل اشاعت ہوگی اور ڈر اپنے چاہنے والوں کو بھی مایوس نہیں کرتا۔ اپریل کے شمارہ کا تو...... ابدی زندگی ضرغام محمود نے بہت اچھا لکھا، جادوئی چکر طاہرہ آصف نے حقیقت میں ڈرایا، رقص اجل، خونی حویلی، عجیب مخلوق، جیت، شیطانی محلول، پراسرار حویلی، غیبی محافظ، خواہش ناتمام، جنات سے دوستی یہ سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، ویسے ساجدہ اینڈ عطیہ زاہرہ دونوں ہی غائب ہیں، توس قزح میں دعا عالم بخاری، مس فوزیہ کنول، فوزیہ محمود، مسکان فاطمہ، فریدہ خانم، مریم شاہ بخاری، شگفتہ ارم درانی، ساحل دعا بخاری، مجھے ان سب کی شاعری بہت اچھی لگی اور باقی سب نے بہت اچھا لکھا۔ اسحاق انجم کے لئے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں دل کی تکلیف سے نجات دے اور صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆ محسن صاحب: آپ کی کہانی کافی اصلاح کے بعد شائع ہوئی اور اب آپ کوئی اور کہانی ارسال کریں، کہانی ایک لائن چھوڑ کر لکھئے گا۔ امید ہے خوش دلی سے کوئی اور کہانی ضرور بھیجیں گے۔

مدثر بخاری شہر سلطان سے، محترم ایڈیٹر صاحب، آداب و تسلیمات! خیریت مسنون! ایک مرتبہ پھر محبتوں، چاہتوں اور خوشبو بھری محفل میں حاضر ہیں اور کیوں نہ ہوں شامل، جہاں خلوص بھرے بلا کے گہرے رشتے ہوں وہاں دل مچلتا ہے اور قلم خود بخود لفظوں کا گلدستہ بناتا چلا جاتا ہے...... ! اپریل کا جریدہ 20 مارچ کی ٹھنڈی دوپہر کے آنچل میں خوب صورت حسینہ کے ٹائٹل سے ملا...... کیا غضب کا چہرہ تھا۔ جھکی ہوئی پلکیں، ہاتھوں پہ جچتی مہندی اور گلے میں سونے کی زنجیر، معصوم چہرہ، ماتھے پر جھولتی زلف...... میرا دل تو ایک لمحے کو دھڑکنا بھول گیا...... ! خطوط سارے اچھے تھے۔ لیڈیز فرسٹ کے تحت پہلے سات خطوط پیاری بہنوں کے شامل تھے، کوئی شک نہیں کہ خواتین ڈر پر چھائی ہوئی ہیں اور یہ خوش آئند بات ہے...... کہانیوں میں طاہرہ آصف کی جادوئی چکر نے توجہ مبذول کروائی، طاہرہ کو پہلے ہی میں نے ایک اچھا اضافہ قرار دیا تھا۔ محنت کر رہی ہیں اور محنت واحد راستہ ہے جو انسان کو عام سے خاص بنا دیتا ہے...... بلقیس خان نے جیت کا تڑکہ لگایا، کبھی کبھی انسان ہار کر بھی جیت جاتا ہے اور یہ جیت، حقیقت میں حقیقی جیت نہیں ہوتی...... اچھا لکھا، شیطانی محلول، میں نے لکھی، امید ہے پسند آئے گی...... قارئین...... پلیز تنقید برائے اصلاح ضرور کیا کریں، غلطیوں کی نشاندہی لازمی ہے...... شگفتہ ارم درانی، جنات سے دوستی کے ساتھ حاضر ہوئی۔ آپ بہت حساس ہو، آپ کی دلہن اور عینی بھی پسند آئی تھی اور بہنا کو شادی مبارک...... اللہ پاک خوش رکھے...... آمین...... ضرغام محمود کی ابدی زندگی، زبردست رہی...... ضرغام بھائی...... آپ میں چھپا ہوا رائٹر منظر عام پر آ رہا ہے اور آنے والے وقتوں میں آپ کی صلاحیتوں میں اضافہ ہو۔ آمین اور آپ اپنے قلم سے خوب صورت تحریریں تخلیق کرتے رہیں۔ ڈر کے خوب صورت اور قابل رائٹر، ایس امتیاز احمد، عجیب مخلوق کے ساتھ سرفہرست رہے، واقعی ان کا نام ہی کافی ہے۔ مستقبل کے زبردست لکھاری، محنتی اور اچھوتے انداز سے اچھوتی تخلیق کرنے والے اس لکھاری کے لئے دل سے دعا گو ہوں۔ خواہش ناتمام عثمان غنی کی خوب صورت تحریر، خواہشات کے تلے دبنے والے انسان، انسانیت کے زمرے سے باہر نکل جاتے ہیں اور

حیوانیت کا منبع لے کر اپنی قدرو منزلت کھو بیٹھتا ہے۔ غالب نے بھی کہا تھا۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے، بہت نکلے میرے ارمان مگر پھر بھی کم نکلے، خواہشات کے ملبے تلے دبنے والے لوگ خود اپنی ذات کھو بیٹھتے ہیں اور گمنامی کے اندھیروں میں کھو جاتے ہیں، عثمان غنی نے اچھا Describ کیا۔ good، کاشف عبید کاوش کی ''حویلی حویلی'' اپنی نوعیت کی بہترین تحریر...... کاشف سے میں نے کہا تھا کہ رنجیدہ نہ ہو، آپ کی کہانی ضرور شائع ہوگی، اور دیکھ لیں، آپ کی کہانی چھپ گئی...... مبارک ہو جناب...... !مزید محنت اور کوشش کریں......! میں ڈرڈائجسٹ کی مزید ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ مدثر صاحب: بہت بہت شکریہ کہ آپ نے کہانیوں کا انبار لگا دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر ماہ کہانی جلوہ گر ہو رہی ہے اور امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی خلوص دل سے تجزیہ ضرور ارسال کریں گے۔ Thanks۔

رانا حبیب الرحمن (قیدی) سینٹرل جیل لاہور سے۔ السلام علیکم! امید ہے سب خیریت سے ہوں گے۔ سب سے پہلے ڈرڈائجسٹ کے ادارہ اور مصنفین ورائٹرز اور اس کے قارئین کو سلام محبت، ماہ اپریل کا سرورق ہمیشہ کی طرح خوب صورتی سے مزین تھا۔ قرآن کی باتیں دل کو منور کر گئیں۔ اس وقت میں دکھ بھری زندگی یعنی زندان میں قید تنہائی کاٹ رہا ہوں، سینٹرل جیل لاہور میں سزائے موت کا قیدی ہوں جو کہ ایک نا کردہ جرم میں ہوئی ہے۔ ویسے مجھے جیل میں 9 سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ میں نے 2012ء میں کچھ کہانیاں اور تحریریں ارسال کی تھیں لیکن اس کے بعد میرا رابطہ مکمل طور پر ڈر سے کٹ گیا تھا۔ اور اب پھر سے حوصلہ ہمت کو یکجا کر کے خط ارسال کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میری حوصلہ افزائی کر کے شکریہ کا موقع دیا جائے گا۔ ایک قیدی کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ قیدی ہی جان سکتا ہے، جیسے کہ پنجرے میں پرندے اور جانوروں کو بند کر دیا جاتا ہے، خیر اٹھتے بیٹھتے اپنی غلطیوں پر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتا رہتا ہوں اور اسی طرح زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں، امید ہے میری کاوشیں شامل اشاعت کر کے ضرور خوشی کا موقع فراہم کریں گے۔

☆☆ حبیب صاحب: بہادر شاہ ظفر کا ایک شعر ہے۔ ''ظفر آدمی اسے نہ جانیو! جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا اور عیش میں یاد خدا نہ رہا۔'' خیر انسان کے لئے جب دنیا میں سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو ایک دروازہ جو کہ اللہ تعالیٰ کا ہے وہ ہمیشہ کھلا ہوا رہتا ہے اور خدا توبہ کو قبول کرنے والا ہے، پتہ نہیں کب خدا کی رحمت جوش میں آجائے، ہم آپ کی خوشیوں کے لئے دعا گو ہیں۔

محمد ابو ہریرہ بلوچ بہاولنگر سے، امید کرتا ہوں کہ ڈر کا تمام عملہ، اسٹاف، قارئین اور رائٹرز حضرات بخیریت ہوں گے، اپریل 2015ء کا شمارہ 27 مارچ کو موصول ہوا، ٹائٹل کافی پرکشش اور دلفریب تھا، پچھلے ماہ خط نہ بھیج سکا، وجہ یہ ہے کہ میرے بی اے کے امتحان سر پر ہیں اور سر کھجانے کو فرصت نہیں۔ مارچ میں میری اسٹوری خواب پریشان شائع کرنے کا شکریہ، ان دوستوں کا شکریہ جنہوں نے میری کہانی کی تعریف کی خصوصاً شاہد رفیق صاحب، میری ایک اور کہانی غیبی مدد آپ کے پاس محفوظ ہے، اسے بھی شامل اشاعت کریں، امید ہے کہ مایوس نہیں کریں گے، آپ نے مجھے ایک لائن چھوڑ کر لکھنے کو کہا تو کیا میں ایک لائن چھوڑ کر صفحے کے دونوں طرف لکھ سکتا ہوں۔ اپریل میں شامل کہانیوں میں خواہش ناتمام بڑھی ویلڈن، اس کے بعد غیبی محافظ پڑھی لاجواب کہانی تھی، ایس امتیاز احمد کی عجیب مخلوق، بلقیس خان صاحبہ کی جیت بھی عمدہ اسٹوریاں تھیں۔

☆☆ ابو ہریرہ صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اچھے نمبروں سے کامیاب و کامران کرے، کوئی دوسری کہانی ارسال کریں لیکن ایک لائن چھوڑ کر کہانی لکھیے گا، چاہے دونوں طرف لکھ دیں۔

عثمان غنی پشاور سے، السلام علیکم! ماہ اپریل کا ڈرڈائجسٹ 22 کو مل گیا۔ ٹائٹل اچھا تاثر دے رہا تھا اور آغاز قرآن کی باتوں سے کیا۔ فہرست میں اپنی کہانی خواہش ناتمام دیکھ کر دلی طمانیت ملی، سب دوستوں کے خطوط پڑھے، بہت اچھے خط تھے، کہانیوں میں مدثر بخاری آپ ریگولر لکھ رہے ہیں، بہت اچھے، ایس امتیاز احمد کی عجیب مخلوق، بہت انوکھی و اچھوتی کہانی تھی۔ جادوئی چکر طاہرہ آصف کا لکھنے کا انداز سب سے منفرد اور جدا ہے۔ آپ اسی طرح لکھتی رہیے گا۔ جیت بلقیس خان کی بالکل ڈر کے موضوع کے مطابق تھی، اگرچہ چھوٹی تھی مگر معیاری تھی، تبھی ڈر کے صفحات پر جگمگائی، شگفتہ ارم درانی کی جنات سے دوستی عمدہ ترین کہانی تھی۔ ویلڈن شگفتہ جی، قسط وار تحریروں میں رولو کا بیسٹ جا رہی ہے۔ رقص اجل شہزادہ چاند زیب آپ کی کہانی ذرا بھی ہارر نہیں تھی، یہ کہانی ہارر سے زیادہ ایکشن کہانی تھی، پلیز آپ بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ مگر اتنی بڑی کہانی میں 10 فیصد بھی ڈر نہیں ہوتا کیا وجہ ہے جی آپ کا مائنڈ ایکشن سے ہٹتا ہی نہیں، پلیز مائنڈ نہ کیجئے گا، قوس قزح کے سب رنگ بہترین تھے، نئی کہانی جذبہ بے اختیار بھیج رہا ہوں، امید ہے یہ کہانی جلد ڈر کے صفحات پر جگمگائے گی۔

☆☆ عثمان صاحب: ڈرڈائجسٹ اور کہانیوں کی تعریف کے لئے تھینکس، تمام رائٹروں کو تنقید کے معاملے پر توجہ دینی چاہیے تاکہ آئندہ کہانی کی اصلاح ہوجائے، آپ کی کہانی آئندہ ماہ ڈر کے صفحات پر جگمگائے گی، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

نعیم اللہ ہڈالی سے، تمام ڈر کی ٹیم کو اور ڈر پڑھنے اور لکھنے والوں کی خدمت میں سلام شوق، میں آج ہی جماعت دہم کے امتحانات سے فارغ ہوا ہوں اور اپنی پہلی فرصت میں آپ کو خط بمعہ کہانی ارسال کررہا ہوں، ہمیں ڈر سے اتنی محبت اور لگن ہے کہ اس کے لئے وقت ضرور نکال لیتے ہیں۔ اب ہمیں بھی موقع دیں اور میری کہانی بھی جلد شائع کردیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ خط ضرور لکھا کریں لیکن ہم خط تو ہر ماہ ارسال کرتے ہیں اور اپنے ڈر سے محبت ولگن کا ثبوت دیتے ہیں لیکن آپ ان خطوط کو ردی کی ٹوکری کی نذر کردیتے ہیں۔ یعنی ایک ماہ شائع کردیتے ہیں اور اگلے ماہ غائب، چلیں کوئی بات نہیں اب آپ سے التماس ہے کہ مہربانی فرما کر میری کہانی ضرور شائع کردیں اور مجھے شکریہ کا موقع دیں چونکہ آج 18 مارچ 2015ء ہے اور ابھی تک ڈرڈائجسٹ نہیں ملا اس لئے تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں، آخر میں تمام ڈر کے اسٹاف، رائٹرز اور ڈر پڑھنے والوں کو دعا سلام، اور ہمیں بھی دعاؤں میں یاد رکھئے گا شکریہ۔

☆☆ نعیم اللہ صاحب: اب آپ کہانی بھیجیں تو ایک لائن چھوڑ کر کہانی لکھیے گا، کیونکہ جو رائٹر نئے ہوتے ہوئے ہیں ان کی کہانی اصلاح طلب زیادہ ہوتی ہے اور ہر تحریر کے لئے کاغذ مزید بڑا لیا کریں۔ اگر خط لیٹ موصول ہوتا ہے تو اشاعت سے رہ جاتا ہے۔

تارز نوید کراچی سے، السلام علیکم! اپریل کا ڈرڈائجسٹ تھوڑا لیٹ ملا مگر پڑھ کر خوشی ہوئی، تمام کہانیاں ایک خوب صورت گلاب کے گلدستے کی مانند اپنی خوشبو بکھیرتے نظر آئیں جن کی خوشبو سے سارا گھر مہک اٹھا، بھائی نے کہا پہلے میں پڑھوں گا اور ہم نے کہا ہم قرعہ فال ڈالا گیا تو قرعہ اس ناچیز کے نام ہی نکلا سب سے پہلے قسط وار کہانیوں میں رولو کاری، پھر عشق ناگن، پہلی بار کسی ڈائجسٹ میں خطوط کی محفل میں حصہ لے رہا ہوں، ساتھ ہی دعا کررہا ہوں شاید کہ ہماری بھی حوصلہ افزائی ہوجائے اور ساتھ ہی اپنی پہلی کہانی، اس امید کے ساتھ بھیج رہا ہوں، شاید کے ڈائجسٹ کے قیمتی صفحات میں اپنی جگہ بنالے۔

☆☆ تارز صاحب: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، خوش ہوجایئے حوصلہ افزائی ہوگئی، کہانی ابھی پڑھی نہیں، اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

شوکت علی بلوچ (قیدی) سینٹرل جیل کراچی سے، پیارے ڈرڈائجسٹ کے تمام اسٹاف، رائٹرز اور قارئین کو السلام علیکم! بعد سلام مالک کائنات سے دعا ہے کہ میرے پیارے ڈرڈائجسٹ کی پوری ٹیم وفیملی کو سدا خوش وسلامت رکھے اور ترقی وکامرانی عطا کرے۔ آمین۔ سب سے پہلے میں شکر گزار ہوں کہ مجھ ناچیز کو عزت بخشی اور میری حوصلہ افزائی کی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ مجھے کتنی زیادہ خوشی محسوس ہوئی کہ میری لائف میں کسی بھی رسالے یا ڈائجسٹ کے لئے لکھا گیا میرا پہلا محبت وپیار بھرا خط شائع کیا گیا، بہت شکریہ۔ اپریل کے ڈائجسٹ کا ٹائٹل بہت ہی پیارا لگا۔ سب سے پہلے قرآن کی باتوں سے دل کو منور کیا پھر خطوط کا مطالعہ کیا، جس میں اپنا خط پاکر دل باغ وبہار ہوا، پھر کہانیوں اور قوس قزح کے پیارے اشعار وغزلوں میں کھو کر گم ہوا۔ جیسا کہ میرے پیارے ڈرڈائجسٹ کے تمام رائٹرز صاحبان بہت ہی اچھا لکھتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ خدا انہیں اور زور قلم عطا کرے تاکہ یہ کاروان یونہی چلتا رہے۔ آمین۔

☆☆ شوکت صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی دلی لگاؤ سے تعریف کیلئے بہت شکریہ، امید ہے آئندہ بھی خط ارسال کرکے شکریہ کا موقع دیجئے۔

کاشف عبید کاوش بندہ موری ٹلگرام سے، السلام علیکم! امید ہے ڈرڈائجسٹ کے تمام اسٹاف اور تمام قارئین بخیر وعافیت ہوں، اپریل کا نیا شمارہ اعزازی کے طور پر 25 مارچ کو ملا، شمارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور جب میں نے فہرست کا صفحہ کھولا تو میری خوشی کو چار نہیں بلکہ چالیس چاند لگ گئے، کیونکہ ایک طویل انتظار کے بعد میری کہانی ''خونی حویلی'' شائع ہوئی تھی۔ میں ادارہ ڈرڈائجسٹ اور ایڈیٹر صاحب کا جس قدر شکریہ ادا کروں کم ہے، اور پھر رسالہ لے کر بیٹھ گیا اور پڑھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے خطوط پڑھے جو کہ بہت لاجواب تھے۔ شاعری میں بھی سب نے بہت خوب لکھا۔ تین دن میں تمام کہانیاں پڑھ ڈالیں، اب کسی ایک کہانی کی تعریف کیا کروں، یہاں تو تمام کی تمام اپنی مثال آپ ہیں، خالد شاہان کی کہانی نہ پاکر دل افسردہ ہوا، دیگر کئی رائٹر بھی نظر نہیں آئے۔ خیر میں اپنی نئی کہانی بھیج رہا ہوں، امید ہے کہ مئی کے شمارے میں شائع کرکے شکریہ کا موقع ضرور دیں گے اور ویسے بھی 17 مئی کو میری سالگرہ ہے۔

☆☆ کاشف صاحب: ارسال کردہ کہانی لیٹ موصول ہوئی، اس لئے اشاعت سے رہ گئی۔ خیر سالگرہ آپ کو بہت مبارک ہو، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ آپ پر اپنا فضل وکرم رکھے اور تمام جائز خوشیوں سے نوازے۔ اور آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنا بھولئے گا نہیں۔

☆☆

زہریلی حسینہ

ضرغام محمود-کراچی

اپنے ساتھ زیادتی کرنے والے کے ہاتھوں سے چھٹکارا پانے کے لئے خوبرو لڑکی مچلتی رہی اور پھر مجبور ہو کر لڑکی نے پنے دانت نوارد کے ہاتھ پر گاڑ دیئے اور پھر چشم زدن میں وہ شخص مچلتے ہوئے زندہ درگور ہوگیا۔

یقین نہ آنے والی عجیب وغریب لرزہ براندام دل ودماغ پر سکتہ طاری کرتی حقیقی روداد

میری گاڑی افریقہ کے ملک کانگو کے دارلحکومت برازویلی کے ہائی وے پر دوڑی جارہی تھی میں برازویلی سے ڈانگا شہر جارہا تھا جو کانگو کا ایک دور افتادہ شہر ہے میری گاڑی میں میرے ساتھ سوہانا بیٹھی تھی۔ میں نے گاڑی چلاتے ہوئے کن انکھیوں سے سوہانہ کی جانب دیکھا وہ گم صم بیٹھی تھی کھڑکی سے آنے والے ہوا کے دلفریب جھونکے سوہانا کے بالوں سے اٹھکیلیاں کررہے تھے اس کی زلفیں اس کے گالوں کو چوم رہی تھیں اس کا چہرہ کھلتے گلاب کی طرح تروتازہ تھا اس کی بڑی بڑی غزالی آنکھوں میں ایک خوف سا صاف نظر آرہا تھا، وہ بار بار اپنے بالوں کو سنوارتی مگر شریر لٹیں پھر اس کے رخساروں پر آکر کھیلنے لگتیں وہ خوفزدہ نظروں سے پیچھے مڑمڑ کر دیکھ رہی تھی۔

"تم خوفزدہ مت ہو، ہمارے پیچھے کوئی نہیں آرہا۔" میں نے سوہانہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"مم۔۔۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے کہ میں۔۔ میں۔ آزاد ہوگئی ہوں۔" سوہانہ نے بے یقینی سے جواب دیا۔

"یقین کرلو میری جان۔۔۔ تم آزاد ہو اور بالکل محفوظ ہو اور میرے ساتھ ہو۔" میں نے سوہانہ کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا تو سوہانہ نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔ میری نظریں سڑک پر تھی اور میرا ذہن مسلسل سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

ایک ماہ پہلے تک میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں کوئی غیر قانونی کام بھی کرونگا لیکن آج۔۔ آج میں ایک لڑکی کو اس کے گھر سے بھگا کرلے جارہا ہوں وہ بھی اپنے ملک سے سینکڑوں میل دور اس تاریک براعظم افریقہ کے ایک ملک کانگو میں، میں ایک مقامی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوکر اسے اس کے گھر سے بھگا کرلے جارہا ہوں۔

مجھے یاد ہے دو ماہ قبل میرے دوست اشفاق نے جو پامسٹری میں کافی مہارت رکھتا تھا میرا ہاتھ دیکھتے ہو کہا۔ "تمہاری زندگی میں ایک گھمبیر بحران آنے والا ہے۔"

"میری زندگی آل ریڈی اتنی بحران زدہ ہے کہ اب اس زندگی میں مزید کسی بحران کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔" میں نے بات مذاق میں ٹالی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں کہ تمہاری زندگی میں کچھ ایسی مشکلات آنے والی ہیں جہاں تمہاری جان کو بھی خطرہ ہوسکتا ہے۔۔۔ اگر اس دوران تم پاکستان سے باہر گئے تو تمہاری واپسی ناممکن ہے۔" اشفاق نے مجھ سے کہا۔

"میرے بھائی۔۔ پاکستان سے باہر تو دور کی بات ہے میرے پاس لاہور جانے کا بھی کرایہ نہیں ہے۔" میں

نے ہنستے ہو جواب دیا۔ اس دن بات آئی گئی ہوگئی۔

دو دن بعد ہی مجھے ایک غیر ملکی چینل سے نوکری کی آفر ہوئی تو میں نے کسی پس و پیش کے بغیر آفر قبول کرلی۔ میں ایک ڈاکومینٹری فلم ڈائریکٹر ہوں اور پاکستان میں میں نے کافی ڈاکومینٹریز بنائی ہیں خاص طور پر تھر کی قحط سالی پر بنائی گئی میری ڈاکومینٹری فلم ''موت کا جال'' نے کافی پزیرائی حاصل کی اسی لئے ایک غیر ملکی چینل نے مجھے نوکری کی آفر دی جو میں نے قبول کرلی۔ چینل پر نوکری جوائن کرنے کے بعد مجھے پہلا اسائمنٹ افریقہ کے باسیوں کی زندگی پر ایک ڈاکومینٹری بنانے کا دیا گیا۔

افریقہ کے ملک کانگو کے دارالحکومت برازویلی میں اترتے وقت میرے ذہن میں اشفاق کی باتیں گونج رہی تھیں مگر میں نے سر جھٹک کر ان پریشان کن خیالات سے چھٹکارا حاصل کیا۔ میں ایک پڑھا لکھا آزاد خیال شخص ہوں اور ہاتھ کی لکیروں وغیرہ جیسی باتوں پر میں یقین نہیں رکھتا۔ برازویلی آنے سے پہلے میں نے یہاں کی مقامی زبان ٹونگو میں جانکاری حاصل کی کیونکہ مجھے یہاں کی مقامی زندگی کو فلمبند کرنا تھا لہذا ضروری تھا کہ مجھے یہاں کی مقامی زبان آئے تاکہ میں لوگوں کی بات سمجھ سکوں لہذا میں نے یہاں آنے سے پہلے ٹونگو زبان سیکھی اور یہاں رہتے ہوئے میں نے ٹونگو زبان میں کافی مہارت حاصل کرلی ویسے بھی ٹونگو زبان کافی میٹھی زبان ہے۔

میں نے یہاں رہتے ہوئے ایک ماہ میں چینل کی حسب منشا ڈاکومینٹری بنائی جو چینل والوں کو بہت پسند آئی۔ کام ختم کر کے میں برازویلی گھوم رہا تھا تو میری ملاقات ڈاکٹر ونود سے ہوئی ڈاکٹر ونود ایک انڈین تھا اور پچھلے پانچ سال سے برازویلی میں رہائش پذیر تھا۔ کسی دوسرے ملک میں اپنے ہم زبان کا مل جانا یقیناً خوشی کی بات ہوتی ہے لہذا میں اور ڈاکٹر ونود دوست بن گئے۔ ڈاکٹر ونود نے اپنے گھر مجھے کھانے کی دعوت دی تو میں انکار نہ کرسکا جب میں ڈاکٹر ونود کے گھر سے دعوت کھا کر نکلا تو میری ملاقات سوہانہ سے ہوگئی۔ میں ڈاکٹر ونود سے رخصت لیکر اپنی کار کی جانب بڑھ رہا تھا تو مجھے ایک آواز آئی، میں نے نظر اٹھا کر دیکھا ڈاکٹر ونود کے گھر کی اوپری کھڑکی میں سوہانہ کھڑی تھی اس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں ایک خوف تھا۔

میں یک ٹک اس کو دیکھتا رہا، سوہانہ کے ریشمی بال اس کے چہرے پر کھیل رہے تھے میں نے اپنے پروفیشن کی وجہ سے سینکڑوں حسین عورتیں دیکھی تھیں مگر سوہانہ میں کچھ الگ بات تھی، میں اس کی رعنائیاں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا، اس کا معصومانہ انداز میرا دل کھینچ رہا تھا میں ٹکٹکی باندھے اس کو دیکھتا رہا سوہانہ نے جو مجھے اپنے جانب دیکھتا ہوا پایا تو ہاتھ کا اشارہ کیا، جو میری سمجھ میں نہیں آیا میں نے اشارے سے اس سے پوچھا کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو باہر آکر بات کرو۔''

سوہانہ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے ٹھہرنے کا کہا اور پھر کھڑکی سے ہٹ کر اندر چلی گئی جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس کو اس نے گولہ سا بنا کر میری جانب پھینکا میں نے اس کاغذ کو اٹھا کر سیدھا کیا اس میں سوہانہ نے لکھا تھا۔

''میرا نام سوہانہ ہے ڈاکٹر ونود نے مجھے قید کر رکھا ہے وہ روزانہ میرے اوپر تشدد کرتا ہے اور میرے اوپر تجربات کرتا ہے اور مجھے مختلف انجکشن لگاتا اور زبردستی مجھے دوائیاں کھلاتا ہے۔ جس سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے پلیز۔۔۔ پلیز میری مدد کرو۔''

سوہانہ کا خط پڑھنے کے بعد میں نے سوہانہ کو ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی اور کہا۔ ''میں کل آؤں گا اور اسے یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔''

پھر میں اپنے ہوٹل آگیا میرے دماغ میں کھچڑی سی پک رہی تھی ایک طرف سوہانہ کا حسن مجھے کھینچ رہا تھا تو دوسری طرف دماغ سمجھا رہا تھا کہ میں ایک دوسرے ملک میں ہوں اگر کوئی اونچ نیچ ہوگئی اور میں قانون کی گرفت میں آگیا تو ساری عمر جیل میں کاٹنی پڑ جائے گی۔ مگر دل سوہانہ کی جانب جھک رہا تھا۔ آخر اس دل و دماغ کی جنگ میں جیت دل کی ہوئی اور اگلے دن میں نے چند ضروری کام

کیے اور شام ڈھلتے ہی ڈاکٹر ونود کے گھر کے سامنے پہنچ گیا وہاں پہنچ کر میں نے ہارن دیا تو اوپر کھڑکی کھل گئی اور کھڑکی میں سوہانہ کا حسین چہرہ نظر آنے لگا۔ سوہانہ کو دیکھ کر میں نے اپنی گاڑی میں سے ایک مضبوط رسی نکالی اور اسے کھڑکی میں کھڑی سوہانہ کی جانب پھینکا، دو تین کوششوں کے بعد میں رسی کھڑکی میں کھڑی سوہانہ تک پہنچانے میں کامیاب ہوگیا۔

"اس رسی کو کسی مضبوط چیز سے باندھ کر اس کے سہارے نیچے اتر آؤ۔" میں نے سوہانہ سے کہا تو سوہانہ نے کھڑکی کی مضبوط چوکھٹ سے رسی کا ایک سرا باندھا اور دوسرا سرا نیچے پھینک دیا رسی کا دوسرا سرا زمین سے آلگا۔

"شاباش اب اس رسی کے سہارے نیچے آجاؤ۔"

"مم۔۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے اگر میں گر گئی تو۔"

"آزادی کے لئے جان کی بازی لگانی پڑتی ہے۔۔ جلدی کرو ایسا نہ ہو کہ کوئی آجائے۔" میں نے کہا تو سوہانہ رسی کے سہارے نیچے اترنے لگی، رسی بری طرح ہل رہی تھی اس کے ہاتھ بار بار پھسل رہے تھے وہ آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی میں رسی کے ٹھیک نیچے کھڑا تھا تاکہ اگر اس کے ہاتھ سے رسی چھوٹ جائے تو میں اسے زمین پر گرنے سے پہلے کیچ کرسکوں۔ وہ آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی، جیسے ہی اس کے پیر زمین پر لگے کھڑکی میں ڈاکٹر ونود کا چہرہ نمودار ہوا۔

"سوہانہ میری بچی میری بیٹی تم کہاں جارہی ہو؟" ڈاکٹر ونود زور سے چیخا میں نے سوہانہ کا ہاتھ پکڑا اور اپنی کار کی جانب بھاگا۔

"رک جاؤ سعدی۔ تم غلط کر رہے ہو۔ تم بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہو۔" ڈاکٹر ونود نے چیخ کر مجھے مخاطب کیا مگر میں نے سنی ان سنی کردی اور اپنی کار تک پہنچتے ہی، میں نے سوہانہ کو کار میں بیٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار آگے بڑھادی، ڈاکٹر ونود مسلسل چیخ رہا تھا

"مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے کہ میں آزاد ہوگئی ہوں۔" سوہانہ نے بے یقینی سے پھر کہا۔

"تم آزاد ہو اس بات کا یقین کرلو۔ مگر ڈاکٹر ونود نے تمہیں قید کیوں کر رکھا تھا؟ اور وہ تمہیں بیٹی کیوں کہہ رہا تھا۔" میں نے اچنبھے سے پوچھا۔

"وہ اپنے آپ کو میرا باپ کہتا ہے مگر باپ ایسے ہوتے ہے وہ روزانہ مجھے زبردستی نہ جانے کون کون سی دوائیاں کھلاتا تھا اور انجکشن لگاتا تھا جس سے مجھے بہت تکلیف ہوتی تھی کچھ دنوں پہلے تک تو وہ مجھے زنجیروں سے باندھ کر رکھتا تھا کچھ ہی دن ہوئے اس نے میری زنجیریں کھولی ہیں مگر وہ مجھے اس کمرے سے کبھی باہر نہیں نکلنے دیتا تھا۔" سوہانہ نے تفصیل سے جواب دیا۔

"بہت ظالم آدمی ہے ڈاکٹر ونود۔" میں نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "اور تمہاری ماں۔۔۔" تھوڑی دیر بعد میں نے پوچھا۔

"مجھے یاد نہیں۔۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اپنے آپ کو اسی کمرے میں بند پایا، ڈاکٹر ونود کے علاوہ ایک بوڑھی عورت میرے پاس آتی تھی جو میرے کپڑے وغیرہ تبدیل کرتی تھی اور مجھے لکھنا پڑھنا سیکھاتی تھی اس کے علاوہ مجھے کچھ یاد نہیں۔۔۔ نہ جانے میں کب سے اس کی قید میں ہوں۔" سوہانہ نے جواب دیا۔

"وہ تمہیں کون سی دوائیاں کھلاتا تھا۔" میں نے پھر پوچھا۔

"معلوم نہیں۔۔۔ وہ کہتا تھا کہ میں بہت خطرناک ہوں۔"

"ہاں ابھی بھی وہ یہی کہہ رہا تھا مگر۔ مگر تم تو خطرناک نہیں ہو۔۔۔" میں بغور اس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"پلیز مجھ سے وہاں کی باتیں نہیں کرو میں پہلی بار دنیا کو دیکھ رہی ہو مجھے دنیا دیکھ لینے دو۔" سوہانہ کار کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی وہ بہت اشتیاق سے سائین بورڈز پر جلتی بجھتی روشنیاں دیکھ رہی تھی، میں خاموش ہوگیا اور بغور اس کو دیکھنے لگا۔ میں نے کار کی رفتار دھیمی کرلی تاکہ اپنے ساتھ بیٹھی حسن مجسم کو غور سے دیکھ سکوں، کار میں مدھم روشنی تھی اس روشنی میں سوہانہ کا پرکشش چہرہ چمک رہا تھا اس کے نقوش بڑے ہی تیکھے اور جاذب نظر تھے اس کے چہرے پر عجیب سی کشش تھی نظریں اس کے چہرے سے

ہنتی ہی نہیں تھیں، سانسوں کے زیروبم سے اس کی جوانی چھلکتی تھی، دل چاہ رہا تھا کہ اس کے معصوم چہرے کو ہاتھوں میں تھام کر چوم لیا جائے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک معصومانہ مسکراہٹ تھی وہ کہیں سے خطرناک نظر نہیں آرہی تھی اگر ڈاکٹر ونود اس کی چڑھتی جوانی کو خطرناک کہہ رہا تھا تو صحیح کہہ رہا تھا ورنہ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جسے خطرناک کہا جائے

ساری رات کی ڈرائیونگ کے بعد ہم ڈانگو شہر پہنچ گئے، میں نے پہلے سے ہی رہائش کا انتظام کررکھا تھا۔ شہر کے مضافات میں ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ یہ مکان ڈانگو شہر کے مضافات میں ایسی جگہ پر واقع تھا کہ اس مکان کے اطراف میں آبادی بہت کم تھی اور مکان کے عقب میں بہت بڑا گھنا جنگل تھا یہ چھپنے کے لحاظ سے ایک آئیڈیل مکان تھا میرا ارادہ تھا کہ چند دن یہاں چھپ کر گزارے جائیں اور اس دوران میں سوہانہ کے کاغذات وغیرہ بنوا لوں تاکہ اسے اپنے ملک لے جاسکوں۔

مکان کے پاس پہنچ کر میں نے کار روکی اور اس کو ساتھ لے کر مکان کے اندر داخل ہوگیا۔

''تم فریش ہوکر تھوڑا آرام کرلو۔'' میں نے اس سے کہا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے اس کے کمرے کا بتایا۔ ابھی وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھی ہی تھی کہ بیرونی دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ کھلا اور میں اچھل پڑا، میں نے گھوم کر دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازے پر ایک نیگرو کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی سفاکانہ مسکراہٹ تھی جس طرح وہ دروازے کو لات مار کر اندر داخل ہوا تھا اسی طرح اس نے لات مار کر دروازے کو بند کیا۔

''کک۔۔۔کون ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''خاموشی سے جیبیں خالی کردو۔۔۔ورنہ۔۔۔''

نیگرو نے ریوالور والا ہاتھ لہرایا تو سوہانہ سہم کر دیوار سے چپک گئی تھی نیگرو دھیرے دھیرے آگے بڑھا اور اس نے سوہانہ کو پکڑ کر اپنے سامنے کرلیا اور ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے لگادی اور اپنا دوسرا ہاتھ پیچھے سے اس کے گلے میں ڈال کر اس کو اپنے آپ سے چپکالیا۔

''چھوڑ دو اسے۔'' میں چیخا۔

''تمہیں ایسا برا لگ رہا ہے جیسے یہ تمہاری بیوی ہو۔'' نیگرو خباثت سے مسکرایا۔

''ہاں یہ میری بیوی ہے۔'' میں دوبارہ چیخا اسی وقت سوہانہ نے نیگرو کے اس ہاتھ پر جس سے اس نے اس کو گلے سے پکڑ رکھا تھا اس ہاتھ پر اس نے زور سے کاٹ لیا۔

نیگرو کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور اس نے سوہانہ کو زور سے دھکا دیا ساتھ ہی اس کے منہ سے انتہائی غلیظ گالیاں نکلنے لگیں، سوہانہ بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ نیگرو نے اپنی کلائی دیکھی جہاں پر سوہانہ کے دانتوں کے نشان صاف نظر آرہے تھے اچانک نیگرو کی رنگت بدلنے لگی اس کے دیدے اوپر چڑھنے لگے اور وہ فرش پر گر کر جان کنی کی حالت میں تڑپنے لگا اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا وہ میری جانب دیکھ کر نہایت اذیت سے بولا۔'' یہ۔۔۔یہ لڑکی زہریلی ہے۔۔۔ تو اس ناگن سے شادی کر کے اب تک زندہ کیسے ہے۔۔۔؟''

نیگرو کے دیدے پھیل گئے اس کا جسم نیلا پڑ گیا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دم توڑ دیا۔

''یہ۔۔۔یہ کیسے مرگیا۔۔۔؟'' سوہانہ دہشت زدہ انداز میں بولی، سوہانہ سے زیادہ دہشت میں میں تھا ایک تو نیگرو مرگیا دوسرے سوہانہ کی حقیقت مجھ پر کھل چکی تھی۔ اب میری سمجھ میں آرہا تھا کہ ڈاکٹر ونود سوہانہ کو کیوں خطرناک کہہ رہا تھا وہ کیوں کہہ رہا تھا کہ ''میں بہت بڑا خطرمول لے رہا ہوں۔''

''یہ۔۔۔یہ کیسے مرگیا؟'' سوہانہ پھر بولی میں نیگرو کے قریب گیا میں نے اسے ہلا جلا کر دیکھا وہ مرچکا تھا اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا میں نے مڑکر سوہانہ کے جانب دیکھا وہ ابھی تک خوفزدہ تھی اس کے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نیگرو کیسے مرگیا۔

''سوہانہ اپنے زہر سے لاعلم ہے۔'' میں نے سوچا اور سوہانہ کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے تسلی دی۔

"سوہانہ تم نہیں جانتی کہ ڈاکٹر ونود نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے اس نے تم پر ایک زہریلا تجربہ کیا ہے جس سے تم نصف عورت اور نصف ناگن بن گئی ہو۔" میں نے سوہانہ کو اعتماد میں لینا بہتر سمجھا تاکہ وہ بھی محتاط رہے۔

"ناگن۔۔۔سانپ۔۔۔ میں لیکن وہ تو زہریلے ہوتے ہیں۔" سوہانہ نے حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم بھی زہریلی ہو۔۔۔ دیکھو تم نے اس نیگرو کی کلائی پر اپنے دانتوں سے کاٹا تو یہ مرگیا۔"

"میں زہریلی مگر۔۔۔ کیسے۔۔۔؟"

"یہ معلوم نہیں مگر ڈاکٹر ونود جو دوائیاں تمہیں دیتا تھا اور جو انجکشن تمہیں لگاتا تھا اس کی وجہ سے تمہارے اندر زہر بھر گیا۔" میں نے سوہانہ کو سمجھانے کے انداز میں جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے میں عام لڑکی نہیں ہوں۔"

"تم میرے لئے بہت خاص لڑکی ہو۔" میں نے ماحول کا تناؤ کم کرنا چاہا۔ "تم فکر نہ کرو میں تمہارا علاج کرواؤں گا اور تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔" میں نے اس کو گلے سے لگایا تو اس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔۔۔ پلیز مجھے بچالو وہ۔"

"تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے تم اپنے کمرے میں جاکر فریش ہو جاؤ میں لاش کو ٹھکانے لگاتا ہوں۔۔۔ پھر کچھ کھانے کا بندوبست بھی کرتے ہے۔" میں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں مجھے بھی بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔۔۔ ڈاکٹر ونود مجھے کھانے میں صرف دودھ دیتا تھا اس لئے مجھے دودھ ہی دے دو۔" وہ معصومیت سے بولی

"دودھ تو شائد فریج میں ہو۔" میں نے کچن کی جانب گھومتے ہوئے کہا اور تھوڑی دیر میں، میں دودھ سے بھرا ایک بڑا سا گلاس لیکر اس کی جانب آیا۔

"لو یہ پی لو۔۔۔ پھر تھوڑی دیر آرام کرلو۔" میں نے دودھ سے بھرا گلاس اس کی جانب بڑھایا تو اس نے میرے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لے لیا اور ایک ہی سانس میں سارا دودھ پی لیا۔ دودھ پی کر جب اس نے گلاس میرے ہاتھ میں واپس تھمایا تو میں نے دیکھا گلاس میں بچ جانے والا تھوڑا سا دودھ سفید کے بجائے نیلے رنگ کا ہے۔ "اس کا مطلب ہے زہر سوہانہ کے دانتوں سے خارج ہوتا ہے۔"

میں مسلسل سوچ میں ڈوبا ہوا تھا سوہانہ دودھ پی کر اپنے کمرے میں چلی گئی تو میں نے نیگرو کی لاش کو اپنے کندھے پر اٹھایا اور مکان کے پیچھے حصے میں لیکر گیا میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ مکان کے پیچھے ایک خشک کنواں ہے میں نے نیگرو کی لاش اس کنویں میں ڈال دی اور اس کا ریوالور بھی اس کنویں میں پھینک دیا۔ ساری رات کی ڈرائیونگ اور لاش ٹھکانے لگانے کی مشقت کے بعد میرا جسم بھی ٹوٹ رہا تھا لہذا میں بھی اپنے کمرے میں آکر بے سدھ سو گیا۔

شام تک میں سوتا رہا شام کو اٹھ کر میں نہا دھو کر فریش ہوا اور اپنے کمرے سے نکل کر سوہانہ کے کمرے میں آیا تو دیکھا کہ سوہانہ اپنے بیڈ پر پرسکون نیند سو رہی تھی سوتے میں وہ اتنی معصوم لگ رہی تھی کہ یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنی خطرناک ہے اس کے اندر اتنا زہر بھرا ہے جو کسی بھی جاندار کی جان لے سکتا ہے حالانکہ میرے سامنے اس نے ایک آدمی کو اپنے زہر سے موت کی گھاٹ اتارا مگر میں دل کا کیا کروں جو ماننے کو تیار ہی نہیں تھا میں کچھ دیر سوہانہ کے حسین چہرے کو دیکھتا رہا پھر دروازہ بند کر کے لاؤنج میں آگیا، اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک ہوئی میں نے جب دروازہ کھولا تو دیکھا دروازے کے باہر ڈاکٹر ونود کھڑا ہے۔

"اگر تم سوہانہ کو لینے آئے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔" میں نے ڈاکٹر ونود کو دیکھتے ہی درشت لہجے میں کہا مگر ڈاکٹر ونود نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور اندر داخل ہو گیا۔

"میں جلد ہی سوہانہ سے شادی کرنے والا ہوں۔" کچھ دیر بعد میں پھر گویا ہوا۔

"تم سوہانہ کی حقیقت نہیں جانتے اس لئے اس طرح کی باتیں کر رہے ہو۔" ڈاکٹر ونود نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

"میں سوہانہ کی حقیقت سے واقف ہوں میرے سامنے اس نے ایک آدمی کو کاٹا تو وہ تڑپ تڑپ کر مرگیا۔" میں نے ڈاکٹر ونود کی غلط فہمی رفع کی میری بات سن کر ڈاکٹر

ڈنوو خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔

"تم نے سوہانہ کو زہریلی بنا کر بہت بری حرکت کی ہے اور تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا، میں تمہارا یہ تجربہ دنیا کے سامنے بے نقاب کردوں گا۔ میں سوہانہ کا علاج بڑے سے بڑے ڈاکٹر سے کرواؤں گا۔" میں نے انتہائی زہر بھرے لہجے میں ڈاکٹر ڈنوو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے سوہانہ کو زہریلی نہیں بنایا بلکہ میں تو اسے اس زہر سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔" میری بات سن کر بے اختیار ڈاکٹر ڈنوو چیخ پڑا۔

"کیوں۔ تم کیوں سوہانہ پر اتنے مہربان ہو۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کیونکہ سوہانہ میری بیٹی ہے اور ہر باپ کی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ وہ عام لڑکیوں کی طرح زندگی گزارے۔"

"اگر۔ اگر تم نے سوہانہ کو زہریلی نہیں بنایا تو وہ زہریلی کیسے بنی؟" میں ڈاکٹر ڈنوو پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے اگر ایک کپ چائے مل جائے تو میں پوری تفصیل بتاتا ہوں۔" ڈاکٹر ڈنوو نے کہا تو میں چائے بنانے کے لئے کچن میں چلا گیا تھوڑی دیر بعد میں دو کپ چائے لیکر واپس لاؤنج میں آیا۔ ڈاکٹر ڈنوو اپنی کرسی پر بیٹھا چھت کو گھور رہا تھا آہٹ سن کر اس نے میری جانب دیکھا اور زخمی مسکراہٹ کے ساتھ میرے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا اور چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بولا۔

"یہ آج سے بیس سال پہلے کی بات ہے جب میں جوان تھا۔" ڈاکٹر ڈنوو نے کہنا شروع کیا۔ "میں نے امریکن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی مجھے سانپ اور سانپ کے زہر کے بارے میں جاننے کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا اس شوق کی خاطر میں نے دنیا بھر کی سیر کی۔ اسی دوران مجھے معلوم ہوا کہ کانگو کے جنگلوں میں ایک وحشی قبیلہ رہتا ہے جس کے پاس انتہائی نایاب قسم کے سانپ ہیں یہ باتیں سن کے مجھ سے رہا نہ گیا اور میں فوراً یہاں پہنچا اور اس وحشی قبیلے کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو مجھے پتا چلا کہ وہ قبیلہ ڈونگا کہلاتا ہے اور وہاں مرد کے بجائے عورت سردار ہوتی ہے جسے سب ممبارانی کہتے ہیں۔

میں نے ڈونگا قبیلے تک جانے کا فیصلہ کیا اور ایک دن میں اس قبیلے تک جا پہنچا۔ ڈونگا قبیلہ وحشی ضرور تھا مگر آدم خور نہیں تھا اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر اس قبیلے کی حدود میں پہنچ جاتا تو قبیلے کے محافظ اسے صحیح راستہ بتا کر رخصت کر دیتے لیکن اگر مسافر کوئی غلط کام کرے یا قبیلے کا قانون توڑے تو قبیلے کے لوگ غضبناک ہو جاتے ہیں اور ایسے مجرم کو سانپ سے ڈسوا کر مار دیا جاتا ہے۔

جب میں اس ڈونگا قبیلے کی حدود میں پہنچا تو قبیلے کے محافظوں نے پہلے تو مجھے بھی بھٹکا ہوا مسافر سمجھا مگر میں نے انہیں بتایا کہ میں جان بوجھ کر اس قبیلے میں آیا ہوں اور میرا مقصد ان کے نایاب سانپ دیکھنا ہے۔

یہ سن کر محافظوں نے مجھے ممبارانی کے روبرو پیش کیا، ممبارانی کو دیکھ کر میں واقعی ڈر گیا، ممبارانی چھ فٹ سے لمبی اور ورزشی جسم کی حامل عورت تھی اس کا سر مونڈھا ہوا تھا وہ بہت زیادہ سیاہ رنگت کی حامل تھی اور سب سے خوفناک چیز اس کے دانت تھے جو نیلے رنگ کے تھے اس نے اپنے چہرے پر مختلف رنگ لگائے ہوئے تھے اور اس کے گلے میں اور اس کے دونوں ہاتھوں پر خطرناک سانپ لپٹے ہوئے تھے۔

سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ ممبارانی کے گلے سے جو سانپ لپٹا ہوا تھا وہ دنیا کا خطرناک ترین سانپ کوبرا ناگ تھا جسے قبیلے کے لوگ ناگ دیوتا کہتے تھے اور اس کی پوجا کرتے تھے۔

ممبارانی خود اتنی زہریلی تھی کہ اگر وہ کسی کو کاٹ لے تو وہ اسی طرح مر جائے گا جیسے اسے کسی سانپ نے کاٹا ہو، ممبارانی کی سانسوں سے اتنی تیز بو آرہی تھی کہ اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے چکر آنے لگا، ڈونگا قبیلے میں رہتے ہوئے مجھے پتا چلا کہ جس لڑکی کو ممبارانی کے لئے منتخب کیا جاتا ہے اسے بچپن سے ہی چند خاص جڑی بوٹیوں کے ساتھ زہر کھلایا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ لڑکی زہریلی ہو جاتی ہے۔

ممبارانی نے جب میرے آنے کا مقصد سنا تو اس

نے مجھے اپنے سانپوں کا نظارا کرایا، واقعی وہاں دنیا کے نایاب ترین سانپ تھے۔ خاص طور پر کوبرا ناگ کو دیکھنا میرے لئے حیرت انگیز تجربہ رہا، میں نے وہاں رہتے ہوئے ایک مجرم کو سزا کے طور پر کوبرا ناگ سے ڈسے جانے کا منظر بھی دیکھا وہ بہت دردناک منظر تھا، جس شخص کو کوبرا ناگ نے ڈسا تھا اس کا سارا بدن دھیرے دھیرے پانی بن کر بہہ گیا تھا اور بہت ہی تکلیف سے اس شخص کا دم نکلا تھا، ایسی موت دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔''

ڈاکٹر ونود اپنی بات جاری رکھنا چاہتا تھا مگر میں نے بیچ میں دخل اندازی کی۔

''مجھے سانپوں یا ان کے زہر کے بارے میں کچھ نہیں سننا مجھے سوہانہ کے بارے میں بتاؤ۔'' میں نے بیزار کن لہجے میں کہا۔

''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سوہانہ کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔'' ڈاکٹر ونود نے جواب دیا پھر چائے کا کپ منہ کو لگایا اور کپ میں موجود ساری چائے اپنے حلق میں انڈیل لی اور پھر اپنی داستان شروع کی۔

''میں چار دن وہاں رہا، رات گزارنے کے لئے مجھے ایک جھونپڑی دی گئی، میں دن میں سانپوں کی کھوج کرتا اور رات کو اپنی جھونپڑی میں آرام کرتا میری جھونپڑی کی صفائی کا کام ایک قبائلی لڑکی کرتی تھی وہ گونگی اور بہری تھی۔

ایک رات میں نے کافی شراب پی لی شراب میں اپنے ساتھ ہی لیکر گیا تھا شراب واقعی بہت بری چیز ہے تمہارا مذہب بہت اچھا ہے۔ جس میں شراب حرام ہے۔ تو اس رات میں نے کافی مقدار میں شراب پی لی تھی نشے میں میں بالکل بھول گیا کہ میں کہاں ہوں بس اسی نشے کی حالت میں میں نے اس قبائلی لڑکی کے ساتھ رات گزار لی۔

جب صبح میرا نشہ اترا تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے کتنی بھیانک غلطی کر دی ہے اور اس کا انجام کیا ہوسکتا ہے وہ لڑکی بھی نظر نہیں آرہی تھی میں بہت ڈر گیا مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ اگر اس لڑکی نے ممبارانی کو میری غلطی کا بتا دیا تو میرا انجام کیا ہوگا، ڈونگا قبیلے کی روایت کے مطابق ہر جرم کی ایک ہی سزا تھی اور وہ سزا تھی کوبرا ناگ سے ڈسوانا۔

میں بہت ڈر گیا اور اسی ڈر کی وجہ سے صبح روشنی ہونے سے پہلے پہلے میں ڈونگا قبیلے کی سرحد سے دور آگیا۔ ڈونگا قبیلے سے زندہ بچ آنے کے بعد میں نے کان پکڑے کے آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا مگر آدمی سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔

ہوتا وہی ہے جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ میں اس واقعے کو بھول چلا تھا۔ مگر پندرہ سال بعد ایک سرکاری وفد کے ساتھ میرا انگو آنا ہوا تو یہاں کے ایک وزیر سے میری دوستی ہوگئی اس نے مجھے بتایا کہ میری شکل سے ملتی جلتی ایک لڑکی اس نے ڈونگا قبیلے میں دیکھی ہے، اس وزیر کے پاس اس لڑکی کی تصویر بھی تھی۔

جب میں نے تصویر دیکھی تو میں حیران رہ گیا اس لڑکی کی شکل بہت حد تک مجھ سے ملتی تھی اور اس لڑکی کے نقوش انڈین تھے اس وزیر نے مجھے بتایا کہ ڈونگا قبیلے والے اس لڑکی کو ناگ دیوتا کا اوتار سمجھتے ہیں کیونکہ وہ لڑکی ایک کنواری کے بدن سے پیدا ہوئی ہے، وزیر کے پاس اس لڑکی کی ماں کی تصویر بھی تھی، جب وزیر نے مجھے اس لڑکی کی ماں کی تصویر دکھائی تو مجھے یقین ہوگیا کہ وہ لڑکی میری بیٹی ہے کیونکہ اس لڑکی کی ماں وہی گونگی خادمہ تھی جس کے ساتھ میں نے رات بسر کی تھی۔

''اور وہ لڑکی سوہانہ ہے۔'' میں نے ڈاکٹر ونود سے پوچھا۔

''ہاں۔ وہ لڑکی سوہانہ ہے۔۔۔'' ڈاکٹر ونود نے جواب دیا۔

''مگر اب تک یہ نہیں پتا چلا کہ سوہانہ زہریلی کیسے بنی۔'' میں نے پھر پوچھا تو میری بات سن کر ڈاکٹر ونود مسکرانے لگا اور پھر بولا۔

''سوہانہ ڈونگا قبیلے کی ہونے والی ممبارانی ہے۔'' ڈاکٹر ونود اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد پھر کہنے لگا۔

''جب مجھے پتا لگ گیا کہ سوہانہ میری بیٹی ہے تو میرا خون جوش مارنے لگا میں نہیں چاہتا تھا کہ میری بیٹی میرا خون اس جنگلی ماحول میں پروان چڑھے اور پھر میری بیٹی کو

زہریلا بھی بنا دیا گیا تھا جو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے دل میں ٹھان لی کہ میں اپنی بیٹی کو اس زہریلے ماحول سے نکال لاؤں گا اور اسے تہذیب یافتہ دنیا میں لا کر ایک عام لڑکی بناؤں گا۔" اتنا کہہ کر ڈاکٹر ونود سانس لینے کے لئے رکا اور پھر کہنے لگا۔

"اپنے کام سے فارغ ہو کر میں نے کانگو کے جرائم پیشہ لوگوں سے رابطہ کیا اور بھاری رقم پر انہیں اس کام پر راضی کیا پھر میں نے ایک مسلح دستہ تیار کیا اور ڈونگا قبیلے کی جانب پیش قدمی کی۔ اب یہ میری خوش قسمتی یا ڈونگا قبیلے کی بدقسمتی کہ جب میں اپنے مسلح آدمیوں کے ساتھ ڈونگا قبیلے پہنچا تو اس دن ڈونگا قبیلے کے سارے مرد کسی قصے کے تصفیے کے لئے دوسرے قبیلے گئے ہوئے تھے لہٰذا مجھے خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا میں نے ایک جال کے ذریعے ممبارانی اور سوہانہ کو قابو کیا اور سوہانہ کو اپنے ساتھ لے کر برازویلی چلا آیا۔

جب میں سوہانہ کو برازویلی لیکر آیا تھا تو وہ چودہ سال کی تھی میں پانچ برس تک اس کا علاج کرتا رہا مجھے ڈونگا قبیلے کے لوگوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے قبیلے کی حدود سے باہر نہیں نکلتے تھے لیکن اکیلی سوہانہ میرے لئے دردسر بنی ہوئی تھی وہ اتنی خونخوار تھی کہ مجھے دیکھتے ہی مجھ پر جھپٹ پڑتی تھی اور وہ اتنی زہریلی تھیں کہ اس کے پاس جانے سے مجھے چکر آنے لگتے تھے اس کی سانسیں تک زہریلی تھیں اس کی سانسیں اتنی زہریلی تھیں کہ کوئی کیڑا مکوڑا بھی اس کے پاس آ کر زندہ نہیں رہ پاتا تھا۔

شروع شروع میں میں نے سوہانہ کو زنجیروں سے باندھ کر رکھا حالانکہ سوہانہ کو زنجیروں سے بندھا دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ میں نے سوہانہ کا علاج شروع کیا میرے علاج سے سوہانہ کا زہریلا پن کم ہونے لگا مگر اس کے ساتھ وہ اپنی یادداشت بھی بھولنے لگی اس کی پچھلی زندگی کے نقوش اس کے ذہن سے مدہم ہونے لگے یہ بات میرے حق میں جاتی تھی لہٰذا میں نے اس کا علاج جاری رکھا گزشتہ پانچ سالوں سے میں اس کا علاج کر رہا ہوں جس میں مجھے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی مگر سوہانہ ابھی بھی مکمل طور پر زہر سے خالی نہیں ہوئی اس کے دانتوں اور ناخن سے ابھی بھی زہر کا اخراج ہوتا ہے وہ کسی کو کاٹ لے یا ناخن سے گہری خراش ڈال دے تو کوئی بھی شخص مر سکتا ہے جیسا کہ تم نے دیکھا کہ سوہانہ کے کاٹنے سے ایک شخص مر گیا۔" اتنا کہہ کر ڈاکٹر ونود خاموش ہو گیا۔

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے ڈاکٹر ونود کی بات پوری سننے کے بعد پوچھا۔

"تم نے سوہانہ کو یہاں لا کر بہت بڑی غلطی کی ہے کیونکہ اسی شہر کے جنگل میں ڈونگا قبیلہ رہتا ہے میں سوہانہ کو اسی جنگل سے لے کر گیا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ سوہانہ کو دوبارہ برازویلی لے کر جاؤں اور اس کا علاج مکمل کروں تاکہ وہ زہر سے پاک ایک عام لڑکی بن جائے۔۔۔۔ پھر بے شک تم اس سے شادی کر لینا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔۔ بلکہ مجھے خوشی ہو گی کہ میری بیٹی کو تم جیسا بہادر اور پیار کرنے والا شوہر ملا۔" اتنا کہہ کر ڈاکٹر ونود پھر خاموش ہو گیا۔

اسی وقت فضا میں ڈھول بجنے کی آوازیں گونجنے لگیں، ڈھول بجنے کی آوازیں سن کر ڈاکٹر ونود اچھل پڑا۔

"انہیں معلوم ہو گیا انہیں معلوم ہو گیا وہ۔۔۔ وہ سوہانہ کو بلا رہے ہے۔" ڈاکٹر ونود نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کون بلا رہے ہیں تم کس کی بات کر رہے ہو؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"ڈونگا۔ ڈونگا قبیلے کے لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ سوہانہ یہاں ہے۔۔۔ یہ ڈھول کی آواز ان ہی لوگوں کی ہے وہ سوہانہ کو بلا رہے ہیں۔" ڈاکٹر ونود بولا۔

"کیا بکواس ہے انہیں کیسے معلوم کہ سوہانہ یہاں پر ہے۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"ان جنگلی لوگوں کی سونگھنے کی حس جانوروں کی طرح ہوتی ہے انہوں نے سوہانہ کی بو سونگھ لی ہے۔" ڈاکٹر ونود نے مجھے جواب دیا۔

اسی وقت ڈھول کی آواز تیز ہو گئی اور ساتھ ہی ایک دھماکے سے سوہانہ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سوہانہ باہر آ گئی مگر۔۔۔ مگر اس کی حالت عجیب تھی اس کی آنکھیں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں اس کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے اور وہ

بری طرح جھوم رہی تھی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا وہ اس طرح جھوم رہی تھی جیسے نشے میں ہو۔

''سوہانہ۔۔۔سوہانہ کیا ہوا؟'' میں سوہانہ کی جانب بڑھا مگر اس سے پہلے کے میں سوہانہ کر پکڑتا سوہانہ نے مجھ پر حملہ کر دیا وہ اپنے ناخنوں سے میرا منہ نوچ لینا چاہتی تھی مگر میں نے جھکائی دے کر اپنے آپ کو اس کے حملے سے بچایا

''سعدی۔اس کے ناخنوں سے بچنا۔'' ڈاکٹر ونود نے مجھے خبردار کیا۔

سوہانہ دیوانہ وار رقص کرتی ہوئی بیرونی دروازے کی جانب بڑھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی، میں اور ڈاکٹر ونود بھی سوہانہ کے پیچھے گھر سے باہر نکل آئے سوہانہ گھر سے نکلتے ہی جنگل کی جانب دوڑ پڑی۔

''سوہانہ رک جاؤ۔ سوہانہ میری بات سنو۔'' میں زور سے چیخا مگر سوہانہ میری آواز سے دور جا چکی تھی لہذا میں نے سوہانہ کے پیچھے دوڑ لگا دی میرے ساتھ ہی ڈاکٹر ونود نے بھی دوڑ لگائی ہم دونوں سوہانہ کے پیچھے بھاگ رہے تھے میں سوہانہ کو مسلسل آواز دے رہا تھا مگر ایسا لگتا تھا جیسے سوہانہ کے کان بند ہو وہ میری آواز ہی نہ سن رہی ہو حیرت انگیز طور پر سوہانہ کی بھاگنے کی رفتار بہت تیز تھی وہ تیزی کے ساتھ دوڑتی ہوئی جنگل میں داخل ہو گئی، میں اور ڈاکٹر ونود بھی اس کے پیچھے جنگل میں داخل ہو گئے اب ڈھول بجنے کی آواز بند ہو چکی تھی شام بھی ڈھلتی جا رہی تھی اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

ہم اچانک سوہانہ کے پیچھے بھاگتے ہوئے جنگل میں داخل ہو گئے تھے لہذا ہمارے پاس نہ کوئی ہتھیار تھا اور نہ کوئی ایسا سامان تھا جس سے ہم روشنی کر سکیں۔

''سعدی۔ ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ اگر اندھیرا پھیل گیا تو ہم مصیبت میں پھنس سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر ونود نے کہا۔

''نہیں میں سوہانہ کے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ آپ واپس جایئے اور مدد لے کر آیئے۔'' میں نے ڈاکٹر ونود کو جواب دیا اور سوہانہ کو آوازیں دینے لگا۔ اسی وقت درختوں سے بہت سے آدمی زمین پر کودے ان لوگوں کے ہاتھ میں بھالے تھے جن کا رخ ہماری جانب تھا وہ ننگ دھڑنگ لوگ نہایت وحشیانہ انداز میں بھالے لہراتے ہوئے ہمارے جانب بڑھے چلے آرہے تھے ان کے چہروں پر رنگ لگا ہوا تھا اور وہ انتہائی وحشیانہ انداز میں بھالے سنبھالے ہمارے جانب ایک دائرے کی صورت میں بڑھے چلے آرہے تھے ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم ہاتھ اٹھا کر سرینڈر کر دیں، میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور زور سے چیخا۔ ''مجھے سوہانہ کے پاس لے کر چلو''

ان جنگلیوں نے مجھے اور ڈاکٹر ونود کو اپنے بھالوں کے حصار میں لے لیا اور ایک جانب چلنے کا اشارہ کیا ہمارے پاس ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لہذا ہم دونوں ان جنگلیوں کے بتائے راستے پر چلنے لگے کتنی ہی دیر ہم چلتے رہے اس کا ہمیں اندازہ نہیں تھا، کافی دیر چلنے کے بعد ہمیں ایک جگہ روشنی نظر آئی ایک بڑے سے میدان میں سینکڑوں جنگلی مرد اور عورتیں جمع تھیں ڈھول پیٹے جا رہے تھے عورتیں ناچ رہی تھیں سب خوشی کا اظہار کر رہے تھے، چاروں طرف بڑی بڑی مشعلیں جل رہی تھیں، جن کی وجہ سے میدان میں اچھی خاصی روشنی تھی، اس روشنی میں میں نے دیکھا سوہانہ ایک بڑے سے تخت پر سر اٹھائے بڑے شان و وقار سے بیٹھی ہے اس کے ساتھ ممبارانی بھی بیٹھی تھی، ممبارانی کے گلے میں ایک کالے رنگ کا بڑا سا سانپ لپٹا ہوا تھا جو پھن پھیلائے ہر آنے جانے والے کو گھور رہا تھا اس کے لال لال آنکھیں مجھے اپنے جسم میں گھستی محسوس ہو رہی تھیں۔

بڑا ہی خوفناک منظر تھا ایک لمحے کو میں دہشت زدہ ہو گیا مگر اگلے ہی لمحے مجھ پر سوہانہ کی محبت حاوی ہو گئی اور ماحول کا ڈر وخوف مجھ پر سے جاتا رہا میں زور سے چیخا۔

''سوہانہ میں آگیا ہوں۔ میں تمہارا سعدی ہوں۔''

مگر میری آواز ڈھول کی اونچی آواز میں دب گئی مجھے اور ڈاکٹر ونود کو ایک درخت سے باندھ دیا گیا، میں مسلسل سوہانہ کو آوازیں دے رہا تھا۔

آخر کار میری آواز سوہانہ تک پہنچ گئی اس نے میری جانب دیکھا اور اپنا ہاتھ بلند کیا سوہانہ کے ہاتھ بلند کرتے

ہی ناچتی ہوئی عورتیں رک گئیں اور ڈھول بجنا بھی بند ہوگیا چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔" سوہانہ تخت سے اٹھی اور میری جانب بڑھی اس کے اٹھنے اور چلنے میں ایک شاہی وقار تھا وہ مغرورانہ انداز میں گردن اٹھائے میری جانب آئی اس کے انداز میں ایک غرور تھا مگر اس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ وہ میرے پاس آ کر مجھے دیکھنے لگی وہ مجھے اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

"سوہانہ میں تمہارا سعدی ہوں تم نے مجھ سے پیار کا وعدہ کیا تھا۔ تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔" میں نے سوہانہ کو یاد دلانے کی کوشش کی

سوہانہ خوابیدہ نظروں سے مجھے گھورنے لگی تھوڑی دیر وہ مجھے گھورتی رہی پھر بولی۔ "تم۔ تم سعدی۔۔۔ تم نے مجھے قید سے رہائی دلائی ہے۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ تم بہت اچھے ہو۔۔۔" سوہانہ اتنا کہہ کر ممبارانی کی جانب مڑی اور ممبارانی سے کہنے لگی۔

"رانی اس کو کھول دو۔"

"یہ ہمیں نقصان تو نہیں پہنچائے گا۔"

"یہ میرا دیوانہ ہے خود مر جائے گا مگر مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا۔" سوہانہ نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"اسے کھول کر ایک جھونپڑی میں بند کردو۔" ممبا رانی نے حکم دیا تو میری رسیاں کھول دی گئی اور مجھے ایک جھونپڑی میں بند کر دیا گیا گھاس پھونس کی اس جھونپڑی سے میدان کا منظر صاف نظر آرہا تھا مجھے جھونپڑی میں بند کرنے کے بعد ممبارانی نے اپنے گلے سے کوبرا ناگ کو نکالا اور زمین پر چھوڑ دیا ناگ رینگتا ہوا ڈاکٹر ونود کی جانب بڑھنے لگا۔

ڈاکٹر ونود مسلسل چیخ رہا تھا ڈاکٹر ونود کی چیخیں سن کر میں برداشت نہ کر سکا اور جھونپڑی کا دروازہ کھول کر ڈاکٹر ونود کی مدد کے باہر جانا چاہا مگر اسی وقت میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی کسی نے پیچھے سے زور سے کوئی چیز میرے سر پر ماری میری، آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

نہ جانے میں کتنی دیر بے ہوش رہا جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا سوہانہ مجھے جھنجھوڑ کر اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے میں نے پوری طرح آنکھیں کھولیں اور اردگرد دیکھا میں گھاس پھونس کے ایک آرام دہ بستر پر لیٹا تھا، سوہانہ مجھے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر سوہانہ بولی۔" مجھے افسوس ہے سعدی انہوں نے تمہیں زخمی کردیا۔"

میں نے بستر سے اٹھنا چاہا تو میرے سر میں درد کی ایک شدید لہر دوڑ گئی مگر میں برداشت کر کے اٹھ گیا اور بستر پر بیٹھ گیا میں نے اپنے سر کے پچھلے حصے پر ہاتھ پھیرا میرے سر کے پچھلے حصے میں ایک بڑا سا گومڑ نکل آیا تھا جس میں شدید درد ہو رہا تھا مگر میں برداشت کیے بیٹھا رہا مجھے اٹھتا دیکھ کر سوہانہ بولی۔" میں بھی کتنی بدنصیب ہوں تمہارے پیار کا جواب پیار سے بھی نہیں دے سکتی۔" سوہانہ میرے سینے پر اپنا سر رکھ کر رونے لگی، اسی وقت جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور ممبارانی اندر داخل ہوئی۔ تھوڑی دیر ممبارانی ہم دونوں کو گھورتی رہی پھر بولی۔

"سعدی۔ سوہانہ نادان ہے وہ کچھ نہیں سمجھ رہی مگر تم سمجھدار ہو، تم جانتے ہو کہ سوہانہ ڈونگا قبیلے کی ہونے والی ممبا رانی ہے یہ زہریلی ہے اور کسی سے شادی کے لائق نہیں، لہٰذا تم عقل سے کام لو اور سوہانہ کو چھوڑ کر یہاں سے چلے جاؤ۔"

ممبارانی کی بات سن کر میں نے انکار میں سر ہلایا۔" سوہانہ جیسی بھی ہے میری ہے میں اسے سینے سے لگا کر رکھوں گا اس کا علاج کراؤں گا میں ہر حالت میں سوہانہ کو یہاں سے لے کر جاؤں گا۔" میں نے اٹل لہجے میں ممبارانی کو جواب دیا اور سوہانہ کا ہاتھ پکڑ کر ممبارانی کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

"تمہیں ہم سے دشمنی بہت مہنگی پڑے گی ڈاکٹر ونود کا انجام یاد رکھو۔" ممبارانی نے غرا کر مجھے دھمکی دی۔

"رانی۔۔۔ سعدی کو دھمکی مت دو۔۔۔" سوہانہ مجھ سے الگ ہو کر ممبارانی کے سامنے ڈٹ گئی۔ ممبارانی دانت کچکچا کر سوہانہ کی جانب بڑھی جیسے سوہانہ کو ڈس لے گی مگر پھر رک گئی وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کا زہر سوہانہ پر اثر نہیں کرے گا بھلا سانپ سانپ کو کاٹ کر کیا کرے گا۔

میں نے سوہانہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور جھونپڑی سے باہر نکل آیا اور تیز قدموں کے ساتھ قبیلے سے باہر جانے والے راستے پر چل دیا میں جلد از جلد ڈونگا قبیلے سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ سارا قبیلہ جمع ہو گیا تھا سب ہمیں جاتا ہوا دیکھ رہے تھے میں نے سوہانہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا میرے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔

اسی وقت مجھے اپنے پاس سرسراہٹ کی آواز آئی، میں نے چونک کر نیچے دیکھا مگر مجھے دیر ہو چکی تھی کوبرا ناگ نے میری پنڈلی پر اپنے دانت مارے اور مجھے ڈس لیا، میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں گر پڑا، میری چیخ سن کر اور مجھے گرتا دیکھ کر سوہانہ رک گئی اور جلدی سے میرے پاس بیٹھ گئی، اس نے بھی کوبرا ناگ کو دیکھ لیا وہ زور سے چیخی۔

''ممبارانی۔''

''ہم سے دشمنی بہت مہنگی پڑتی ہے۔'' ممبارانی نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جسم میں انگارے بھر دیئے گئے ہو میرے پورے جسم میں آگ سی لگ رہی تھی میرا چہرہ سفید پڑ رہا تھا میرا دل ڈوبنے لگا تھا میرے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

سوہانہ نے نیچے بیٹھ کر میری پینٹ کا پائنچہ پھاڑا میری پنڈلی پر کوبرا ناگ کے دانتوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے میں نے ایک زخمی مسکراہٹ کے ساتھ سوہانہ کو دیکھا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہنے لگا۔'' سوہانہ میرا اور تمہارا ساتھ یہیں تک تھا۔''

''نہیں۔۔۔'' سوہانہ زور سے چیخی اور اس نے اپنے ہونٹ کوبرا ناگ کے کاٹے ہوئے زخم پر رکھنا چاہے تا کہ وہ زہر چوس سکے مگر ممبارانی نے آگے بڑھ کر سوہانہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگی۔'' سوہانہ تم زہریلی ہو مگر ناگ دیوتا سے زیادہ نہیں تم جانتی ہو کہ ناگ دیوتا کا زہر تم پر کتنی جلدی اثر کرے گا اگر تم نے ناگ دیوتا کا زہر چوسنے کی کوشش کی تو تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔''

''مجھے پروا نہیں۔ میں اپنی جان دے کر بھی سعدی کی جان بچاؤں گی۔'' اتنا کہہ کر سوہانہ نے اپنے ہونٹ میرے زخم پر رکھ دیئے اور زہر چوسنے لگی۔ میرا سر گھوم رہا تھا، میں سوہانہ کو روکنا چاہتا تھا مگر مجھ پر مدہوشی طاری ہو رہی تھی اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔

میں کب تک بے ہوش رہا مجھے یاد نہیں جب مجھے ہوش آیا تو کچھ دیر، میں خالی الذہن لیٹا رہا پھر مجھے ایک ایک کر کے سارے واقعات یاد آنے لگے، سوہانہ کی یاد آتے ہی میں جھٹکے سے اٹھ بیٹھا، میں نے اپنے اردگرد دیکھا، میں ایک جھونپڑی میں تھا جھونپڑی میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا، میں نے اپنے پیر کی جانب دیکھا جہاں کوبرا ناگ نے کاٹا تھا اب وہاں کوئی لیپ لگا ہوا تھا، میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا کھڑے ہونے پر مجھے کمزوری کا احساس ہوا میرا سر چکرا رہا تھا مگر میں نے ہمت کر کے اپنے قدم جھونپڑی سے باہر نکالے، مجھے باہر آتا دیکھ کر ممبارانی اور چند دوسرے لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟'' ممبارانی نے مجھے مخاطب کیا۔

''سوہانہ کہاں ہے۔۔؟'' میں نے ممبارانی کا سوال نظر انداز کر کے پوچھا۔

''اس نے اپنی زندگی کے بدلے تمہاری زندگی خرید لی ہے۔'' ممبارانی کے لہجے میں یاسیت بھری ہوئی تھی۔

''میں نے پوچھا سوہانہ کہاں ہے؟'' میں نے ایک بار پھر تیز لہجے میں پوچھا تو ممبارانی نے ایک شخص کو اشارہ کیا وہ شخص مجھے سہارا دے کر ایک جھونپڑی میں لے کر گیا، ممبارانی اور تمام لوگ بھی میرے پیچھے جھونپڑی میں داخل ہوئے، جھونپڑی میں داخل ہو کر میں نے دیکھا سوہانہ گھاس کے ایک بستر پر لیٹی ہے اس کا حسین چہرہ سفید پڑا ہوا ہے وہ نہایت نقاہت کی حالت میں کراہ رہی ہے، اس کی نشیلی آنکھیں بند تھیں۔

''سوہانہ۔'' میں نے نہایت بے تابی سے اسے پکارا تو اس نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھولیں اور مجھے صحیح سلامت دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ آ گئی۔

''سوہانہ۔ یہ تم نے کیا کیا۔ م۔ مجھے مر جانے دیا ہوتا۔۔۔'' میں سوہانہ کے پاس بیٹھ گیا، میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

’’محبت قربانی مانگتی ہے۔‘‘ سوہانہ دھیرے سے مسکرائی۔

’’میں۔۔۔ میں تمہارا یہ احسان کیسے اتاروں گا۔‘‘ میں نے رونے والے انداز میں کہا

’’سعدی۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے تم میرا ایک کام کرو گے۔‘‘ سوہانہ نے اٹک اٹک کر جملہ مکمل کیا۔

’’بولو سوہانہ۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کرسکتا ہوں؟‘‘ میں نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

’’سعدی۔ مجھے اپنے مذہب میں داخل کرلو مجھے اپنی بیوی بنالو۔ بس میں چند لمحوں کی مہمان ہوں۔‘‘

’’نہیں سوہانہ۔ ایسامت کہو۔‘‘ میں رو دیا۔

’’جلدی کرو سعدی۔ کہیں دیر نہ ہوجائے۔‘‘ سوہانہ نے بے قراری سے کہا تو میں نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھ ڈالے اور سوہانہ کو اپنے بازوؤں کے سہارے اٹھایا اور اسے کلمہ پڑھایا، سوہانہ نے اٹکتے ہوئے کلمہ پڑھا۔

زہر سوہانہ کے رگ رگ میں پھیل چکا تھا جو اسے دھیرے دھیرے موت کے قریب لے جارہا تھا، سوہانہ کو کلمہ پڑھانے کے بعد میں نے سوہانہ کو اپنے سینے سے لگایا اور کہا۔ ’’میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر تمام لوگوں کی موجودگی میں تمہیں یعنی سوہانہ کو اپنی بیوی تسلیم کرتا ہوں۔‘‘

میری بات سن کر سوہانہ کے ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ آئی، اس کے ہونٹ نیم وا انداز میں کھلے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی یا میرا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی مگر موت کے فرشتے نے اسے مہلت نہیں دی اور اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی، اس کی بے نور آنکھوں میں میرے لئے تشکر کے جذبات تھے وہ بے جان ہوکر میری بانہوں میں جھول گئی میرے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی اور آنسو میری آنکھوں سے بہہ نکلے اور میں زاروقطار رونے لگا میں روتا رہا کچھ دیر بعد ممبارانی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

’’یہ مرچکی ہے سعدی۔‘‘ ممبارانی نے مجھے سوہانہ سے الگ کرنا چاہا۔

’’دور ہوجاؤ تم سب۔‘‘ میں نے ممبارانی کا ہاتھ زور سے جھٹکا۔ ’’تم لوگوں نے سن لیا ہے نا کہ سوہانہ مسلمان ہوگئی تھی اور وہ میری بیوی بن چکی تھی لہٰذا اب تم لوگوں کا سوہانہ پر کوئی حق نہیں ہے، میں اپنے مذہب کے حساب سے اس کی آخری رسومات ادا کروں گا۔‘‘

میں نے اتنا کہہ کر سوہانہ کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور جھونپڑی سے باہر آگیا، میں سوہانہ کو لے کر میدان کے وسعت میں آیا۔ تمام قبیلے والے سوہانہ کی موت پر آنسو بہا رہے تھے، عورتیں باقاعدہ بین کررہی تھیں۔ میں نے سوہانہ کا لاشہ میدان کے ایک کونے میں رکھا اور وضو کرکے اکیلے ہی اس کی نماز جنازہ پڑھی اور قبیلے کے لوگوں کے ساتھ مل کر قبر کھودی اور آنسوؤں کے ساتھ سوہانہ کو دفنایا اور اس کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔

’’وہ تم سے بہت محبت کرتی تھی۔ کاش وہ عام لڑکی ہوتی تو میں خود اس کی شادی تمہارے ساتھ کردیتی۔ مگر افسوس۔۔۔ اس نے اپنی زندگی دے کر تمہاری زندگی بچائی۔‘‘ جب میں ڈونگا قبیلے سے رخصت ہورہا تھا تو ممبارانی نے آخری الفاظ کہے۔

میں بوجھل دل کے ساتھ شہر آگیا اور چند دن کے بعد میں اپنے ملک واپس پہنچ گیا، ائیرپورٹ پر اشفاق مجھے ریسیو کرنے آیا، مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

’’اللہ کا شکر ہے کہ میں تمہیں زندہ سلامت دیکھ رہا ہوں ورنہ میرے علم کے مطابق تمہارا زندہ آنا ممکن نہیں تھا، شکر ہے میرا حساب غلط نکلا۔۔۔‘‘ اشفاق نے خوشی سے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

’’تمہارا حساب غلط نہیں تھا۔‘‘ میں نے دھیرے سے کہا۔

’’کیا مطلب۔‘‘

’’یہ تو جسم ہے جو واپس آگیا مگر میری روح ڈونگا قبیلے میں بنی ایک قبر کے سرہانے بیٹھی ہے۔‘‘ میں نے رندھے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور اشفاق کو حیران و پریشان چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

دلہن کی روح

احسان سحر۔میانوالی

اچانک ایک کریہہ اور خوفناک چیخ بلند ہوئی تو گہری نیند میں سویا ہوا نوجوان اٹھ بیٹھا اور اس کی نظر جب سامنے دیوار پر پڑی تو وہ دہشت سے دوچار ہوکر اپنے حواس کھو بیٹھا اور پھر......

رات کے سناٹے میں خوف وہراس پھیلاتی حقیقت سے قریب تر دماغ کو مبہوت کرتی کہانی

ہم چند دوست جب ایف ایس سی کے فائنل ایگزام سے فارغ ہوئے تو سیر کے لئے مری جانے کا پروگرام بنایا، ابتداء میں گھر والوں نے باز رکھنے کی کوشش کی مگر بعد میں ہماری ضد کے آگے جھک گئے، ان کی بے پناہ نصیحتوں اور ہدایتوں کے ساتھ ساتھ ہم سب دوست مری کے لئے روانہ ہوئے، جب مری پہنچے تو ابو کے ایک دوست کے آفس کے اوپر بنے آفیشل ریسٹ ہاؤس میں ہم سب کی رہائش کا بندوبست تھا، ہمارے لئے دو بیڈروم تھے، ایک نسبتاً بڑا بیڈروم تھا، جس میں تین ڈبل بیڈ لگے ہوئے تھے، اس کے ساتھ کا بیڈروم چھوٹا تھا، وہاں دو سنگل بیڈ لگے ہوئے تھے، ان کمروں کے باہر چھوٹی سی جگہ تھی، یہاں سے پانچ پانچ سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ اوپر حال میں شاندار میوزک سسٹم اور سٹنگ ارینج منٹ دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ ہال کے سامنے بڑے بڑے سلائیڈنگ ڈورز

تھے یعنی ایک طرف ہال میں دیواریں نہ تھیں بڑے بڑے شیشے لگے تھے، اور شیشوں کے دوسری طرف چھت تھی، بہت بڑی سی، شام کو ہم وہ سلائیڈنگ ڈورز ہٹا کر چھت پر بیٹھ گئے۔ بہت اچھی اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، اونچی آواز میں ڈیگ سننے کا مزہ آ گیا، حسن کچن سے چائے بنا لایا، ہم پانچوں نے کچھ دیر تو عمر کا انتظار کیا لیکن پھر نوید اسے بلانے کے لئے چلا گیا اور آ کر کہا کہ وہ نہا رہا ہے، ہم سب چائے پینے لگے، میوزک سننے باتیں کرنے میں خیال ہی نہ رہا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ جب سوا گھنٹہ گزر گیا تو اچانک نوید بولا۔ ”یار عمر نہیں آیا۔“

میں اٹھ کر نیچے گیا۔ اسے آواز دی تو غسل خانے سے مغلظات کا سیلاب امڈنے لگا، مجھے پہلے تو کچھ سمجھ نہ آئی، پھر احساس ہوا کہ وہ چلا رہا ہے، کسی نے شرارت سے باتھ روم کا دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ میں نے فوری طور پر دروازے کا ناب گھمایا، دروازہ کھل گیا، باہر آتے ہی وہ چیخا۔

”ایک گھنٹے سے چیخ رہا ہوں، حد ہو گئی۔“

”سوری یار ہم باہر تھے، چھت پر ڈیگ بھی بلند آواز میں بج رہا تھا، ہم نے سوچا شاید اتنے خوب صورت باتھ ٹب سے نکلنے کا تیرا دل نہیں کر رہا۔“ وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یہ بتاؤ کنڈی کس نے لگائی تھی باہر کی؟“

اب سب چپ عمر چپ چاپ نوید کو گھور رہا تھا، نوید قسمیں کھانے لگا کہ وہ اسے بلانے ضرور گیا تھا پر کنڈی لگا کر نہیں آیا۔ بڑی مشکل سے دونوں کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا، عمر کا موڈ بڑی دیر بعد بحال ہوا۔ سفر کی تھکان تھی سب نے کھانا کھا کر آرام کو ہی ترجیح دی۔ ویسے بھی مری کے دوستوں سے اگلے روز ملاقات ہونا تھی اور پھر پروگرام طے کرنا تھے، میں رات کے کپڑے تبدیل کر کے غسل خانے میں گیا تو دروازہ غالباً بند تھا اندر سے، میں بے خیالی میں آ کر ٹی وی دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر گزری کہ عمر کہنے لگا۔

”آ کر لیٹ بھی جا، لیٹ کر ٹی وی دیکھ لے۔“

میں اٹھا اور باتھ روم کا دروازہ کھولا، وہ ہنوز بند تھا۔ میں نے ہینڈل کو گھماتے ہوئے دستک دی، اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ دوبارہ دستک دی تب بھی خاموشی، حسن اور عمر اکٹھے بولے۔ ”کیا ہوا......؟“

”کچھ نہیں، دروازہ کافی دیر سے بند ہے، میں نے زور سے ہینڈل گھماتے ہوئے کہا۔“ اور اندر کوئی ہے تو بول نہیں رہا......“

”یار چلو اب ختم کرو بحث کو غسل خانے کو بھی چمٹ گئے دونوں۔“ نوید بڑبڑایا۔

میں بھی آ کر لیٹ گیا۔ آدھے پونے گھنٹے میں شاید سب ہی سو گئے ہوں گے مگر مجھے عجیب سی بے چینی تھی، جیسے نئی جگہ کا نیا پن اور تھکاوٹ کی وجہ جان کر کروٹیں بدلتا رہا، اچانک مجھے ایسا لگا جیسے باتھ روم سے کوئی نکلا ہو۔ میں نے سر اونچا کر کے ادھر دیکھا۔ نوید، عمر اور احسن سب گہری نیند میں تھے۔ کمرے میں کوئی بھی نہ تھا، میں اسے اپنا وہم قرار دے کر سونے کی کوشش کرنے لگا، میں سونا چاہتا تھا اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے پیاس کا احساس ہوا، پھر ایسا لگنے لگا کہ پیاس کی شدت سے حلق خشک ہونے لگا ہے۔

مجھے لیٹے لیٹے خیال آیا کہ پانی کی بوتل میرے بیگ کے پاس ہی پڑی تھی۔ میں اٹھا اور ہاتھ بڑھا کر بوتل اٹھانے لگا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ نوید کے پاؤں کے پاس کوئی گھٹنوں میں سر دیے کر بیٹھا تھا، سیاہ، تاریک، مجسم نگیٹو باڈی کی آؤٹ لائن قدرے واضح تھی، میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت، مجھے ہاتھ پاؤں سرد محسوس ہونے لگے، اگلے ہی لمحے میں وہ نگیٹو غائب ہو گیا۔

میں اب بھی آنکھیں پھاڑے نوید کی پائنتی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ پر اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

میں بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا، پھر نا معلوم کب آنکھ لگ گئی۔

میں دن چڑھے تک سوتا رہا، زور زور سے بولنے پر میری آنکھ کھل گئی، میں نے اٹھ کر مندی مندی آنکھوں سے دیکھا، سارے کمرے میں ہم لوگوں کا سامان پھیلا ہوا تھا۔ سب کے بیگ اوندھے پڑے تھے۔ میں ماتھے سے

بال ہٹاتا جمائیاں لیتا اٹھا اور بولا۔ ''یہ سب کیا ہے......؟''

عمر بولا۔ ''یہی بات تو ہم سب کر رہے ہیں کہ یہ کس کی شرارت ہے؟'' سارا سامان مکس ہوگیا۔

نوید بولا۔ ''یار ادھر کہیں جن بھوت تو نہیں......؟''

یہ سن کر سب ہنسنے لگے۔ مجھے باتھ روم جاتے ہوئے رات کی یاد آئی، میں ایک لمحے رکا کہ وہ رات کو نوید کی پائنتی کے پاس...... پھر سوچا، خاموش ہی رہوں ہوسکتا ہے وہ میرا وہم ہو اور یہ سب ڈر گئے تو سارا مزہ کرکرا ہوجائے گا، حسن جو کافی دیر سے اٹھا ہوا تھا، آہستہ سے بولا۔

''یار جو ہوا سو ہوا، اگر یہ کسی کی شرارت ہے تو بہت ہی واہیات شرارت ہے۔ اب گھومنے پھرنے کا وقت چیزیں درست کرنے میں لگ جائے گا، ہم سیر وتفریح کے لئے آئے ہیں نا کہ ٹینشن دینے اور لینے، جس کسی نے بھی کیا ہے پلیز دوبارہ نہ کرے......''

وہ میری طرف مخاطب ہوا۔ ''احسان تو باتھ روم سے ہو کر آ پھر سب مل کر چیزیں درست کریں گے۔'' پہلے میں چوکیدار کو بلا کر ناشتے کا کہتا ہوں۔ فصیح بھائی کو 1 بجے کا ٹائم دیا ہے اچھا نہیں لگتا کہ ہم لوگ لیٹ ہوں، ابھی سب کے تیار ہونے میں وقت لگے گا......''

حسن ڈیڑھ دو سال ہم سے بڑا تھا۔ معاملہ فہم بھی تھا۔ اکثر چھوٹی موٹی بگڑی صورتحال کو وہ ایسے ہی سنبھال لیتا تھا۔ جتنی دیر میں ناشتہ بنا ہم سب، سب کچھ سنبھال کر تیار بھی ہوگئے، باقی پورا دن فصیح بھائی کے ساتھ گھومنے پھرنے میں گزرا، رات کا کھانا ایک اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھایا اور رات گئے واپس لوٹے، سب کا موڈ بے حد خوشگوار تھا، ہوا بہت اچھی چل رہی تھی۔ ہم سب اوپر چھت پر کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ سلائیڈنگ ڈورز ہٹائے اور ڈیگ آن کرلیا۔

دوسرے روز فصیح بھائی نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ ہمارا لنچ رکھا تھا۔ باتیں کرتے کرتے ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ دن بھر کی تھکن سب پر غالب آنے لگی۔ ایک ایک کر کے سب نیچے اترنے لگے۔ میں اور عمر آخر میں اترے، سسٹم بند کیا اور سارے دروازے بند کر کے ہم بھی کمرے میں آگئے۔ کمرے کی لائیٹیں بند تھیں، ہم خاموشی سے بستر پر لیٹ گئے، مجھے سوتے ہوئے کچھ دیر گزری تھی کہ نیند اچٹ گئی۔ ایسا لگا جیسے کوئی چہل قدمی کر رہا ہو، مجھ پر پورے دن کی تھکاوٹ تھی، آنکھیں کھولنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی، اتنے میں پھر کپڑوں کی سرسراہٹ ہوئی، بالکل میرے پاس اور نتھنوں میں ہلکی ہلکی خوشبو بھی آئی، پھولوں کی یا کاسمیٹکس کی مگر میں سوتا رہا۔

پھر اچانک نیند میں خیال آیا کہ پھر کوئی لڑکا سامان کے ساتھ شرارت تو نہیں کر رہا، ورنہ صبح پھر ہمیں چیزیں اکٹھی کرنا پڑیں گی۔ جھنجھلاہٹ میں، میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تبھی سامنے جو صورت نظر آئی، اسے دیکھتے کا دیکھتا ہی رہ گیا، ایک بے حد خوب صورت لڑکی دلہن کے لباس میں سامنے کاؤچ پر بیٹھی تھی، میں نے آنکھیں ملیں پھر دیکھا تو وہ ہلکا سا مسکرائی اور اپنے شرارے کو ٹھیک کرنے لگی پورا کمرہ اس کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

میں نے بوکھلا کر حسن عمر کو آواز دینی چاہی پر حلق خشک ہو رہا تھا ہاتھ اور پاؤں بے جان، میں ساکت بیٹھا تھا، ارد گرد ایک معنی خیز سی خاموشی تھی، جیسے سب کچھ تھم گیا ہو، پھر اچانک وہ طلسم ٹوٹ گیا، اب سامنے کاؤچ خالی پڑا تھا اور ارد گرد سے حسن عمر اور نوید کے خراٹوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

''حسن، حسن بات سن یار......'' میں نے حسن کو زور زور سے پکارا۔ اسے نیند بہت پیاری تھی اٹھاتے ہوئے بھی مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ اٹھتے ہوئے وہ چیخنے نہ لگے۔ ''حسن......'' میں دھیرے سے بولا۔ ''تجھے دن کافی نہیں ہوتا باتیں کرنے کو...... ایک نہیں سنوں گا تیری......'' حسن سرخ آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ پھر دوسری طرف کروٹ لے لی۔

''عمر......نوید......'' میں نے شانہ ہلایا۔ ''نوید یار بات تو سن......؟'' وہ دونوں بالکل سیدھے بے سدھ لیٹے تھے۔

ان کا اس طرح لیٹنا عجیب سا لگا۔ میں اٹھا فرید اور ریحان کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ تبھی اچانک باہر

سے کتوں کے غرانے کی آوازیں آنے لگیں، جیسے آٹھ دس کتے اپنے پنجوں سے دروازے کھرچ رہے ہوں، میں تیزی سے دروازے ہی طرف بڑھا، دروازہ اندر سے لاک تھا۔ یہ دیکھ کر تھوڑا سا اطمینان ہوا کہ فرید اور ریحان بھی سیدھے لیٹے ہوئے تھے۔ ان کو بھی عمر اور نوید کی طرح بے سدھ لیٹا دیکھ کر میرے پسینے چھوٹ گئے۔ اب کتوں کے پنجوں کی آوازیں باہر کھڑکیوں کے شیشوں پر سے آرہی تھیں، میں تھوک نگلتا کھڑکیوں تک آیا۔ ہلکا سا پردہ ہٹا کر دیکھا تو نہ کتا اور نہ کسی کتے کا نشان، اچانک مجھے خیال آیا کہ ہم تیسری منزل پر ہیں اور...... اور یہ کہ یہاں تو ہمارے علاوہ کوئی نہیں، پھر یہ کتے......؟

میں نے جلدی سے موبائل نکال کر چوکیدار کو فون کیا، بیل جارہی تھی، نامعلوم وہ کیوں اٹھا نہیں رہا تھا۔ میں نے فون کا نمبر دوبارہ ملاتے ہوئے کاؤچ کی طرف دیکھا، کاؤچ اسی طرح خالی پڑا تھا، عجیب صورتحال سے واسطہ پڑا تھا۔ اب ہر طرف سناٹا اور خاموشی تھی، سب پڑے سو رہے تھے، میں پھر بستر پر آکر لیٹ گیا اور بازو کو آنکھوں پر رکھ لیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد نظریں کاؤچ کی طرف اٹھ جاتیں۔

مسلسل لاحول ولاقوۃ پڑھ کر سونے کی کوشش کررہا تھا، اچانک ہلکی سی آواز آئی جیسے دروازہ کھلا ہو۔ میں نے چونک کر دیکھا اور ایسا لگا جیسے کوئی باتھ روم میں گیا ہو۔ میں دم سادھے باتھ روم سے نکلتی روشنی کی لکیر کو تک رہا تھا۔ جو ہلکا سا دروازہ کھلا رہ جانے سے باہر آرہی تھی۔ تبھی کپڑوں کی سرسراہٹ ہوئی، میں نے چونک کر نظریں پھر اٹھائیں، کوئی اب باتھ روم کے دروازے پر کھڑا تھا، سرخ لہنگے کی جھلک صاف نظر آرہی تھی۔

''احسن، احسن...... عمر...... نوید...... نوید......'' میں نے پکارنا شروع کیا مگر میرا پکارنا بے سود تھا، وہ سب سکون سے ایسے سوئے ہوئے تھے جیسے بے ہوش پڑے ہوں، باتھ روم کا دروازہ خالی تھا۔ اور دور کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں اپنے بیڈ کے ساتھ لیمپ روشن کئے آلتی پالتی مار کر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مجھے اتنی بار تو ہم نہیں ہوسکتا اور اس چوکیدار کی بھی خبر لوں گا جو فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ یقیناً یہ جگہ آسیب زدہ ہے۔ صبح ناشتے پر ان سب سے بات کروں گا، خود سے باتیں کرتے ہوئے میں آیت الکرسی اور چاروں قل پڑھ کر سو گیا۔

اچانک میری آنکھ ایک ہولا دینے والی چیخ سے کھل گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عمر درد کی وجہ سے بیڈ سے نیچے پڑا چیخ رہا تھا۔ نوید اور حسن ویسے ہی بے خبر سو رہے تھے۔ عمر کی چیخوں کے درمیان ایک اونچا نسوانی قہقہہ گونجا۔ میں نے بے ساختہ کاؤچ کی طرف نظر ڈالی، اب وہ دلہن اپنے ہاتھوں میں اپنا سر تھامے اونچے اونچے قہقہے لگا رہی تھی اور اس کی گردن سے بھل بھل کرتا خون پورے فرش کو رنگین کررہا تھا۔

میں نے بمشکل اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے اونچی آواز میں آیت الکرسی پڑھنی شروع کردی۔ میں نے عمر کو اٹھا کر بیڈ پر لٹاتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی آیت الکرسی پڑھو، وہ سامنے دیکھ رہے ہو کاؤچ پر......؟''

''کاؤچ پر......'' عمر نے حیرت سے کہا۔ ''کاؤچ تو خالی پڑا ہے۔ پر یہ ہنسنے کی آوازیں کہاں سے آرہی ہیں......؟'' میں نے سوئچ پر ہاتھ مار کر روشنی کردی، عمر کا رنگ کسی مردے کی طرح سفید پڑ گیا۔ ''حسن...... حسن جلدی اٹھ جا۔''

خلاف توقع وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دلہن کے قہقہوں اور عمر کی چیخوں کے درمیان اس کی گھگھیائی ہوئی آواز آئی۔

''یہ...... یہ کیا ہے؟''

اتنے میں کاؤچ کے ساتھ ٹیبل پر پڑی پانی کی بوتل لہراتی نوید کے سر پر ہوا میں الٹی معلق ہوگئی، سارا پانی اس کے سر پر گرا تھا اور وہ بے خبر پڑا تھا پھر ہنستی ہوئی دلہن کے قہقہے بند ہوگئے اور اس نے ایک زوردار چیخ ماری پھر اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھامے غسل خانے کی طرف بھاگی۔

پھٹی پھٹی آنکھوں میں حیرت اور خوف اور لہو سے سرخ ہوتا ہوا فرش، پتہ نہیں میں بے ہوش کیوں نہیں ہوا تھا۔ حسن سامنے بیٹھا مجھے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور پھر اس نے گلاس میں پانی ڈال کر خود بھی پیا اور مجھے بھی دیا۔ ''یہ بوریا بستر اٹھاؤ۔ اور یہ فرید اور ریحان کو بھی اٹھاؤ۔ اتنے

قیامت کا شور مچا ہے اور وہ پڑے سو رہے ہیں۔" وہ بولا۔

ان دونوں کو اٹھا کر سارا حال بتایا تو ان کے چہرے بھی فق پڑ گئے۔ ریحان تھوڑی دیر بعد گھبرا کر بولا "سچ بتاؤ، تم لوگ کہیں مذاق تو نہیں کر رہے......؟" میں، حسن اور عمر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ حسن کہنے لگا "وہ دیکھو نوید صاحب سوتے رہے اور باجی منہ بھی دھلا گئیں۔"

نوید گیلے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ سب نے ڈرتے ڈرتے بیڈ کی طرف دیکھا، تکیہ اور چادر ابھی تک گیلے تھے، میں نے ریحان سے کہا "میں جا رہا ہوں تم لوگوں کے باتھ روم میں، اس باتھ روم میں کوئی بھول کر بھی نہ جائے۔" میں نے اپنے باتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔ منہ ہاتھ دھو کر میرے حواس لوٹے، چوکیدار اب بھی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔

"ذرا نیچے جا کر اس کو تو جھاڑ پلاؤں" میں نے نیچے جانے والا واحد دروازہ کھولا وہ لاک تھا، لفٹ کا دروازہ اس کے ساتھ تھا، پر اپنا دروازہ کھلتا تو لفٹ تک جاتا، دور سے کتوں کی آوازیں پھر آنے لگیں۔ ریحان...... "حسن ذرا ادھر آنا دروازہ نہیں کھل رہا......" میں نے سب کو آواز دی۔ وہ سب اٹھ کر میری طرف چلے آئے، سب نے باری باری دروازے کے ساتھ زور آزمائی کی، پر اس کو نہ کھلنا تھا وہ نہ کھلا، یہ سب جان کر ہم اوپر کی منزل پر ہیں اور نیچے جانے والا واحد دروازہ لاک ہے، ہم سب کے چہرے زرد پڑ گئے...... کھڑکیوں پر پھر کتوں کے پنجوں کی آوازیں آنے لگیں......

"یہاں کتا کہاں سے آ گیا......؟" عمر نے کہا اور پھر بے ہوش ہو گیا......

"یار احسان تم اپنے ابو کو فون کرو، ان سے انکل کا نمبر لو، جن کی یہ بلڈنگ اور آفس ہے۔"

"ان کا نمبر تو میرے پاس ہے، پر انہیں کل شام ابو ظہبی جانا تھا اور میں ابو کو فون نہیں کر رہا، وقت دیکھو پونے تین بج رہے ہیں رات کے، وہ ڈانٹیں گے، ذرا حوصلہ کرو، کرتے ہیں کچھ۔"

"چلو فصیح بھائی کو فون کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور موبائل سے فصیح کا نمبر ڈائل کیا اور موبائل کو کان سے لگا لیا، ان کا نمبر ملایا اور انہیں بڑی مشکل سے قائل کیا ورنہ پہلے وہ بھی سمجھتے رہے کہ ہم مذاق کر رہے ہیں، ان سے ریکویسٹ کی کہ "وہ یہاں پہنچ کر اوپر آئیں۔"

عمر کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ عمر کے بعد ریحان تھا جو بہت زیادہ خوفزدہ لگ رہا تھا۔ اسے دو قدم چلنا دوبھر تھا، فصیح بھائی سے بات کر کے تسلی ہوئی، دروازہ اسی طرح لاک تھا، ہم نے فیصلہ کیا کہ اس کمرے میں نہیں بیٹھیں گے، سب اوپر چھت پر چلتے ہیں۔ شاید کسی پڑوس والے کی مدد مل جائے۔

ہم سب اکٹھے ہال میں آئے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہال کی بتیاں روشن تھیں، حالاں کہ مجھے اچھی طرح یاد تھا، میں ساری بتیاں بند کر کے باہر نکلا تھا۔ سلائیڈنگ ڈورز کھولے، ہر طرف عجیب وحشت ناک سناٹا تھا، ارد گرد اتنی اونچی کوئی بلڈنگ نہ تھی، اور جو تھیں وہ بہت نیچے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں، میں چھت کے کنارے تک آیا، تبھی سلائیڈنگ ڈور ایک ہولناک آواز کے ساتھ بند ہو گیا، میں ایک جست میں دروازے تک پہنچا اور پوری قوت لگا کر دروازہ کھولا مگر وہ بہت آرام سے کھل گیا، مجھے ٹھنڈے پسینے کی لکیریں اپنی ایڑیوں تک محسوس ہوئیں، پھر ایسا لگنے لگا کہ چھت پر کسی نے وحشی کتوں کو کھول دیا ہو، ہر طرف سے خوفناک غراہٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ جس میں کبھی کبھی چوڑیوں کی کھنک اور ہلکی نسوانی ہنسی بھی شامل ہو جاتی۔

سب ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے آیت الکرسی پڑھ رہے تھے، حلق خشک تھے اور خوف سے زبان بار بار اینٹھ رہی تھی، حسن نے کہا۔ "پوچھو تو سہی فصیح بھائی کہاں تک پہنچے ہیں......؟" فصیح بھائی نے موبائل پر بتایا تھا۔ "بس آ رہا ہوں، کچھ دیر میں ہم لوگ پہنچ رہے ہیں، میرے دوست بھی ساتھ ہیں، تم لوگ فکر مت کرو۔" عمر اور ریحان کو تھوڑی دیر بعد غش آ جاتا تھا، ہم سب دعائیں بھی پڑھ رہے تھے، اور ان دونوں کو سنبھال بھی رہے تھے۔

خدا خدا کر کے 20 منٹ بعد فصیح بھائی کی کال آئی کہ وہ نیچے پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے سوئے ہوئے

چوکیدار کو اٹھایا۔ اسے چابی لانے کو کہا پھر بقول ان کے چابی لگانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ دروازہ تو آدھا کھلا ہوا تھا ہم کیا کہہ سکتے تھے سوائے ایک دوسرے کا منہ تکنے کے، چوکیدار کو مختصر سارے حالات بتاتے، وہ بظاہر حیرت کا اظہار کرنے لگا، اس کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ بظاہر کچھ نہ کچھ جانتا ضرور ہے۔

فصیح بھائی کے زور دینے پر بولا۔ ''لڑکے سیر و تفریح کو آئے ہیں، آپس میں مستی کرتے ہوں گے۔''

ریحان نے چوکیدار کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''یہاں مہمان نہ ہوتے تو تجھے مزہ چکھاتا، خیر مزہ تو تم اب بھی چکھ لوگے جب تمہارے مالکوں کو بتائیں گے کہ تم رات بھر سوتے رہتے ہو۔'' چوکیدار چپ کر کے کھڑا رہا۔

یہ طے ہوا کہ پانچ تو بجنے کو ہے، جیسے تیسے دو ڈھائی گھنٹے گزار کے ابو کے اٹھنے کا انتظار کیا جائے اور ان سے آگے کا پوچھیں گے، فصیح بھائی نے بہت کہا کہ ان کے فلیٹ پر چلیں، پر ان کے گھر پہلے بھی مہمان رہے تھے، ہمیں منہ اٹھا کر ان کی طرف جانا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ چوکیدار نے آفس کھول دیا تھا۔ فصیح بھائی کے ساتھ جا کر حسن باہر سے جوس ڈھونڈ لایا تھا۔ سب نے پیا تو ذرا حواس بحال ہوئے۔

ہم واپس اسلام آباد آئے تو ابو نے بتایا کہ ''میری رضا سے بات ہوئی تھی'' اس نے بتایا تھا کہ ''سات آٹھ برس قبل وہاں کسی دلہن کا قتل ہوا تھا۔''

''کیا......؟'' میں اچھل پڑا۔ ''کیا واقعی......؟''

''ہاں۔'' اس نے بتایا تھا کہ ''اس کے دوست بحرین سے آئے تھے، وہ اسی حصے میں مہمان ٹھہرے تھے، ان میں سے ایک لڑکے کی شادی ہوئی تھی، وہ اپنی دلہن کو لے کر ادھر ہی آ گیا۔ نامعلوم کیا قصہ ہوا، زیادہ تفصیلات معلوم نہیں پر یہ پتہ ہے کہ پہلی رات ہی دلہن کا قتل ہو گیا تھا۔ ان لڑکوں پر پولیس کیس بھی بنا تھا۔ پھر بعد ازاں معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ دراصل، اصل بات دبا دی گئی تھی، رضا کا کہنا ہے کہ ''ہوسکتا ہے آپ کے بیٹے اور دوستوں کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ اسی سلسلے کی کڑی ہو......''

میں دم بخود ابو کی بات سن رہا تھا۔ اس نوعمر لڑکی کے ماتھے پر جڑا ٹیکا اور گردن سے ابلتا ہوا خون۔ اف نہ جانے بے چاری کے ساتھ کیا بیتی ہوگی اس کی روح اب تک بھٹکتی پھر رہی ہے۔ میں اور ابو افسوس کرتے رہے، ابو یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ ''کب، کس کے ساتھ کیا پیش آجائے؟ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔''

قصہ ختم ہونے سے پہلے امی کی بھی سن لیں۔ میں نے ان کی پریشانی کے خیال سے ان سے اس واقعے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ مجھے لوٹے تیسرا روز تھا۔ میں ان کے کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے آلیٹا، مجھے آئے آج تیسرا روز تھا وہ کچھ سلائی کر رہی تھیں مجھ سے کہنے لگیں۔

''مری میں سب ٹھیک تو رہا تھا......؟''

''جی...... امی......'' میں نے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

کہنے لگیں۔ ''وہ جس روز صبح پونے آٹھ بجے تم نے فون کیا تھا اپنے ابو کو، میں اس رات بہت پریشان تھی، میں نے بہت عجیب سا خواب دیکھا تھا کہ جیسے رات کا وقت ہے اور ایک ویران سی عمارت ہے، بہت اونچی، بہت سنسان، دھندلے، بڑے بڑے شیشوں والی......اور...... اور جیسے وہ جگہ اس عمارت کی چھت ہے، اس کے سامنے والے حصے میں ذرا نیچے کسی کے بیٹھے ہونے کا گمان ہو رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ سوائے کتوں کے غرانے کے......اور پھر جس خوف سے میری آنکھ کھلی۔ وہ یہ کہ مجھے لگا جیسے خدانخواستہ تم اس بلڈنگ میں ہو۔ اوہ خدایا...... ڈراؤنا خواب تھا۔ میں اٹھی تو خوف سے حلق خشک ہو رہا تھا۔ بمشکل تین مرتبہ لاحول ولا قوۃ پڑھی۔ ذرا حواس قائم ہوئے تو تم پر دعا پڑھ کر دور سے پھونکی......''

''واقعی امی...... ماں ماں ہوتی ہے۔ بچے کی ہر پریشانی کا اسے قبل از وقت اندازہ ہو جاتا ہے۔ اللہ پاک ہم سب کی ماؤں کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ آمین......'' میں نے کہا۔

موت کا تحفہ

مدثر بخاری۔ شہر سلطان

کیا یہ حقیقت ہے کہ کسی کو کسی کی موت کی خبر قبل از وقت ہوجاتی ہے اور پھر وہ ببانگ دھل اعلان کردیتا ہے کہ مرنے والا فلاں وقت مرجائے گا، کہانی میں حقیقت پنہاں ہے اور ایسا ممکن ہے؟

خوفناک کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے دل دہلاتی عجیب وغریب متاثر کہانی

ایسا ہرگز نہیں تھا کہ ماہم ڈرپوک یا کمزور دل کی مالک تھی اور نہ ہی اس کی فیلڈ کا کسی بھی لحاظ سے خوفناک قسم کی چیزوں سے تعلق تھا۔ وہ ایک بینک میں برانچ منیجر کے عہدے پر فائز تھی۔ بینکنگ اینڈ فنانس میں ایم بی اے پاس کرنے کے بعد اس نے اپنی فیلڈ کو ترجیح دی اور میرٹ کی بنیاد پر آر بی او بھرتی ہوئی۔ بہت جلد اس نے بینکنگ کو اچھی طرح سمجھنا شروع کردیا، بے پناہ محبت کی وجہ سے آپریشنز کے شعبے میں پروموٹ ہوگئی۔ لیکن یہ اس کی منزل نہ تھی۔ اسے مزید ترقی کرنی تھی۔ اپنی بے پناہ محنت، قابلیت اور اعلیٰ کمیونی کیشن کی اوصاف پر وہ جلد ہی مین برانچ کی منیجر مقرر ہوگئی۔

وہ دن اس کی کامیابی کا سنہرا دن تھا۔ سارے اسٹاف نے اسے گفٹ دیئے اور پھول پیش کئے اور ساتھ ہی ڈھیر ساری مبارکباد بھی۔

وہ دن کچھ اس لئے بھی یادگار بن گیا کہ وہ اس کی پیدائش کا دن بھی تھا۔ اس طرح خوشیوں کے ڈبل مزے میسر آ گئے۔

وہ بہت خوش تھی اس دن، اسی خوشی میں اس نے گھر پر تمام اسٹاف اور چند ایک سہیلیوں کو بھی مدعو کیا...... وہ شاندار پروقار مگر سادہ سی تقریب تھی۔

رات آٹھ بجے کیک کاٹا گیا تھا۔ شاہی بریانی اور مٹن کے ساتھ کھیر کا پرلطف انتظام بھی کیا تھا...... رات دس بجے تک گھر مہمانوں سے خالی ہو گیا تھا۔ لوگ گھروں کو جا چکے تھے۔ وہ ملازمہ صفیہ کے ساتھ گفٹ اٹھوا کے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس کا کمرا دوسری منزل پر تھا۔ سادہ کمرا مگر صاف ستھرا۔ سنگل بیڈ، کونے میں رکھی سنگھار میز سب سے نمایاں تھی۔ اس کی سنگھار میز پر دنیا کے مہنگے پرفیوم موجود تھے۔ یہ اس کا واحد شوق تھا جس پر کمپرومائز کرنا اسے پسند نہ تھا۔

ماہم نے سارے گفٹ پیکٹ بیڈ پر رکھے۔ کچھ پیکٹ ملازم نے اٹھا رکھے تھے۔ ''یہاں رکھو...... اور ایک کپ چائے بنا لاؤ......''

ماہم نے ملازمہ سے کہا...... اور خود واش روم میں گھس گئی۔ کپڑے بدلنے کے بعد وہ بیڈ پر آ بیٹھی، اتنی دیر تک ملازمہ چائے بنا کر لے آئی......!

''ٹھیک ہے...... چوکیدار سے کہو کہ گیٹ بند کردے اور پھر سو جاؤ......'' ماہم نے ہدایت دی۔

''جی بی بی جی......'' ملازمہ نے کہا اور واپس چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد ماہم نے ایک ایک کر کے تمام گفٹس کھول لئے۔ اس کے قریبی دوستوں نے اسے بہترین پرفیوم گفٹ کئے تھے۔ کچھ دوست پسند کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے۔ سارے گفٹ کھول لئے گئے مگر صرف ایک گفٹ باقی رہ گیا تھا۔ نجانے کیوں اس گفٹ کو کھولتے ہوئے اس کا دل خوف سے بہت تیز دھڑکنے لگا تھا......

جونہی اس نے گفٹ کھولا...... سنگھار میز پر رکھے سارے پرفیوم ایک ساتھ ہی فرش پر آ گرے تھے۔ اس نے اپنے کمرے سے قالین کچھ دن پہلے ہی نکال باہر کی تھی، اگر قالین ہوتی تو کچھ بچت ہو جاتی، مگر شیشے کے بنے پرفیوم بوتل سنگ مرمر کے فرش پر گرتے ہی ٹوٹ گئے تھے۔

وہ فوراً بیڈ سے اٹھی اور کرچی کرچی ہوئے بوتلوں کو یک ٹک دیکھنے لگی۔ محلول فرش پر پھیل گیا تھا۔ یہ سب اچانک ہوا تھا۔ اسی لمحے لائٹ بھی چلی گئی۔ اس نے کچھ دیر بعد یو پی ایس چلنے کا انتظار کیا مگر لوڈشیڈنگ کی وجہ سے یو پی ایس بھی چارج نہ ہوا تھا پھر وہ گھپ اندھیرے میں بیٹھی اس اچانک افتاد کے بارے میں سوچ رہی تھی...... آج وہ پہلی دفعہ خوف محسوس کر رہی تھی، ایک انجانے خوف، جو رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے، دماغ پر چھائے سارے اندوہناک خدشے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی لہر کی مانند لحہ لحہ سرایت کرنے لگے۔

اس نے موبائل کی ٹارچ آن کی تو آنکھوں کو چیزیں جھائی دینے لگیں۔ وہ بیڈ پر ہی دبکی بیٹھی تھی۔ نیچے فرش پر شیشے کے تیز دھار ٹکڑے پڑے تھے، اگر وہ نیچے اترتی تو پاؤں زخمی ہو جانے کے چانسز تھے۔ اس نے پورے کمرے کا جائزہ لیا، ہر چیز جوں کی توں تھی، مگر وہ آخری گفٹ پیک بیڈ سے غائب تھا، وہ خوف سے اچھل پڑی۔ اس نے ٹارچ سے بیڈ کی ہر جگہ پر روشنی کی، مگر وہ گفٹ کہیں نظر نہ آیا۔ وہ حیرت کے سمندر میں ڈوبتی چلی گئی۔ ''یہ کیسے ممکن تھا کہ گفٹ پیک خود بخود گم ہو گیا ہو؟ گم تو ہو سکتا ہے مگر سامنے رکھی ہوئی چیز غائب کیسے ہو سکتی تھی......؟''

یہ کیسے ممکن تھا...... کہ گفٹ اوپن کرتے ہوئے اس کا دل انجانے خوف سے دھڑک اٹھا تھا اسے ایسا لگا تھا، جیسے وہ کسی ایٹم بم کو اٹھائے بیٹھی ہو، جو کسی بھی لمحے پھٹ سکتا تھا۔ اور جونہی اس نے کھولنے کی کوشش کی ادھر ایک جھٹکا لگا تھا اور اس کے سارے من پسند پرفیوم فرش پر اتنی زور سے گرے تھے کہ کرچی کرچی ہو گئے تھے۔ اسے لگا جیسے وہ پسینے سے بھیگ گئی ہو۔ حالانکہ سردیوں کا ٹھنڈا موسم تھا...... مگر اس چھوٹے سے واقعے نے اسے

خوف کے اندھے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ کچھ لمحے تک وہ خاموش اور خالی الذہن کے ساتھ تنہا ہی اندھیرے کمرے میں بیٹھی رہی۔ مگر پھر بیڈ کی دوسری طرف اتر کر باہر نکل آئی...... سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں تیرس کراس ہوتی گراؤنڈ فلور پر آ گئی...... اس کا رخ صفیہ کے کمرے کی طرف تھا......

☆......☆......☆

اگلی صبح نکھری نکھری سی تھی۔ وہ صبح اپنے مقررہ وقت پر اٹھ گئی تھی۔ اس نے خالی سنگھار میز کو دیکھا جہاں اس کے مہنگے پرفیوم رکھے ہوئے تھے۔ مگر پچھلی رات سارے ہی فنا ہو گئے تھے۔ اسے افسوس تھا کیونکہ وہ پرفیوم بہت سوں کی یاد دلاتے تھے۔ اپنوں کی یاد تو بنا گفٹ کے بھی آ جاتی تھی مگر یہ اس کا شوق تھا۔ اور جب شوق کے راستے میں کوئی آئے تو تکلیف ہوتی ہے۔ اس میں بہت سے پرفیوم اس لمحے والد، والدہ اور بہن نے مختلف مواقع پر گفٹ کیے تھے۔ یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ ایک حادثے میں اس کے تینوں رشتے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے تھے۔ گو کہ اس حادثے میں وہ خود بھی شامل تھی، مگر خدا نے اسے زندگی دی تھی۔ آج بھی وہ اس خوفناک حادثے کو بھول نہ پائی تھی۔ لیکن اس حادثے نے اسے بہادر بنا دیا تھا۔ لوگ مایوس ہو جاتے ہیں۔ خودکشی کرنا چاہتے ہیں، ایسے حادثے کے بعد، مگر اس نے اپنے ابو کے سارے خواب پورے کرنے تھے۔ تبھی اس کا اسکالر شپ لگا۔ یوں وہ سرکاری تحویل میں آ گئی۔ یونیورسٹی کے فوراً بعد ہی جاب آفر ہو گئی۔ یوں بینک نے اس کو نہ صرف پروٹیکشن دی بلکہ زندگی کو اچھے طریقے سے آگے بڑھانے کا حوصلہ بھی دیا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسا نہ آیا تھا جو اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا وعدہ کرتا...... حالاں کہ برانچ میں ایک شخص اس کے بہت قریب تھا مگر وہ باکردار لڑکی کچھ وقت چاہتی تھی کوئی ایسا جو صرف اسے ہی چاہتا...... مگر فی الحال اس نے اس معاملے کو زیادہ سوچا ہی نہ تھا۔

اس نے رات کو صفیہ کو جگا کے روم کی صفائی کرا لی تھی۔ وہ فریش ہو کر ڈریس اپ ہونے لگی۔ اچھی طرح تیار ہو جانے کے بعد وہ کھانے کی ٹیبل پر آ بیٹھی تھی۔ صفیہ نے ناشتہ لگا دیا تھا۔

اس نے سلائس پر جیم لگائی تھی کہ یکایک جیم اس کے ہاتھ سے چھوٹی اور فرش پر جا گری۔ شیشے سے بنا جیم گلاس فرش پر بکھر گیا۔

”اوہو...... کیا ہو گیا ہے آج......!“ وہ بڑبڑائی۔

اس نے صفیہ کو آواز لگائی...... جلد ہی فرش صاف ہو گیا۔

اس نے ہلکا سا ناشتہ کیا اور پورچ میں آ گئی۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر سے باہر نکل گئی۔

صبح اسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ رات ایک گفٹ بغیر کھلے کہیں کھو گیا تھا...... ایک تجسس سا تھا اس کے دماغ میں...... کیا ہو سکتا تھا......! ایک بات یہ کہ اس کا دل کیوں دھڑکا تھا۔ خوفناک انداز میں کیوں اس کو پسینہ آ گیا تھا اور جسم کانپنے لگا تھا۔ وہ انہی خیالوں میں ڈرائیو کرتی ہوئی سڑک کے سپاٹ سینے پر جا رہی تھی کہ اس کا ہاتھ بہکا اور گاڑی کا کنٹرول ایک لمحے کو اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ اسپیڈ ہلکی نہ کرتی اور گیئر بدلنے کے ساتھ ہینڈل کو سیدھی نہ رکھتی تو خوفناک حادثہ پیش آ جاتا...... خوفناک حادثے سے وہ بال بال بچی تھی!

مگر چند میٹر کے فاصلے پر جا کر اس کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا......! اس نے گاڑی سائیڈ پر کھڑی کی۔ ٹیکسی لی اور برانچ پہنچ گئی۔

پھر شام میں وہ ٹیکسی سے ہی واپس آئی تھی۔

اس کا چوکیدار گاڑی ٹھیک کروا کے گھر لے آیا تھا۔

اس کا مصروفیات سے بھرپور دن تھکا دینے کے لئے کافی تھا۔ وہ سیدھی اپنے روم میں گئی۔ فریش ہو کر کھانا کھایا اور ٹی وی لگا کے بیٹھ گئی...... صفیہ نے سارے دن کا احوال سنایا جو کچھ عجیب سا تھا......

”بی بی...... آج دو بجے کے قریب ایک آدمی آیا۔ آپ کا نام لیا اور ایک پیکٹ دے گیا، وہ جی کافی

موٹا اور ڈراؤنا آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور آواز بھاری.....!'' صفیہ نے آنکھیں حیرت سے گھماتے ہوئے کہا۔

''کہاں ہے وہ پیکٹ؟''

''جی ابھی لائی.....!'' وہ کمرے سے باہر چلی گئی..... تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں سرخ رنگ کا پیکٹ تھا.....!

''یہ لیں جی.....!'' صفیہ نے گفٹ پیک کی طرح پیڈ گفٹ اسے تھمادیا۔ ''نام پوچھا تھا اس کا؟''

''جی..... پوچھا تھا مگر اس نے صرف اتنا کہا کہ ''یہ پیکٹ ماہم بی بی کو دے دینا!''

''ٹھیک ہے..... جاؤ تم..... ضرورت پڑے گی تو بلا لوں گی تمہیں.....!'' صفیہ باہر چلی گئی.....

اس نے دروازہ بند کیا اور اس بھاری سے پیکٹ کو کھولنے لگی..... اسے کھولتے ہوئے اس کا دل دھڑک رہا تھا.....

''کون ہوسکتا ہے جو یہ پیکٹ دے گیا.....؟'' وہ بڑبڑائی تھی۔

جلد ہی پیکٹ کھل گیا..... مگر وہ پیکٹ میں موجود چیز کو دیکھ کر اچھل پڑی..... وہ سفید رنگ کا دو گز کا کپڑا تھا، وہ کپڑا جو مرنے والے کو پہنایا جاتا ہے۔ کفن نما لباس، بالکل کفن کے سے انداز میں سلا ہوا، تیار کفن.....!

وہ گھبرا گئی..... کسی نے اسے کفن بھیجا تھا۔ وہ گھبرائی ہوئی صفیہ کے کمرے میں جا پہنچی۔

''آج رات میرے پاس سو جاؤ..... مجھے اکیلے نیند نہیں آرہی۔''

صفیہ اس کے کمرے میں آگئی۔ تو کچھ خوف کم ہوا.....! اسی رات اس نے خواب میں اپنا مرا چہرہ دیکھا۔ اس نے دیکھا وہ مرچکی ہے اور اس کا جنازہ قبرستان کی طرف جارہا ہے۔ رات کا عالم اور قبرستان کی تاریکی، قبر تیار ہوچکی تھی، وہ اندھیری قبر تھی جہاں صرف مردہ ہی دفن ہوسکتا تھا۔ وہ چیخ مار کے اٹھ بیٹھی..... اس نے اپنے آپ کو چونٹیاں کاٹ کے چیک کیا کہ وہ زندہ ہے یا مردہ.....! لیکن وہ ابھی زندہ تھی..... صفیہ بھی جاگ گئی تھی۔

''کیا ہوا بی بی جی؟''

''کچھ نہیں..... بس خواب میں ڈر گئی.....'' وہ بولی۔

صفیہ پانی لے آئی..... اس نے پانی پیا..... کچھ حوصلے بحال ہوئے..... صفیہ اس کے ساتھ بیٹھی رہی..... اور وہ کچھ سوچتے ہوئے بیڈ پر سے اتر گئی اور صفیہ اس کو دیکھتی رہ گئی۔

''اس پیکٹ کو تلاش کرو..... وہی سب مسئلوں کی جڑ ہے۔'' وہ بڑبڑائی..... مگر تلاش کے باوجود وہ گم شدہ پیکٹ نہ ملا۔

اگلی صبح معمول کے مطابق تھی مگر پچھلے تمام واقعات نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا تھا..... وہ آفس میں بیٹھی ایک اکاؤنٹ اوپن کررہی تھی کہ اس کے پرسنل نمبر کی گھنٹی بج اٹھی..... نمبر نیا تھا۔ عموماً وہ ان نمبرز کو اگنور کرتی تھی۔ مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اٹینڈ کرنا پڑا..... کیونکہ اس نمبر سے یہ پانچویں کال تھی۔

''ہیلو.....!'' وہ بولی۔

''شکریہ..... کال اٹینڈ کرنے کا..... کہنا صرف اتنا ہے کہ زندگی بہت چھوٹی ہے..... اور آپ کی تو ختم ہونے کو ہے.....!''

''کون ہیں آپ..... اور کیوں مجھے تنگ کررہے ہیں..... ضرور آپ کا تعلق اس کفن سے ہے، جو آپ نے مجھے بھیجا تھا۔'' مگر رابطہ کٹ گیا۔

اس نے سر پکڑ لیا۔ پچھلے چند دنوں سے اس کے ساتھ عجیب و غریب واقعات پیش آرہے تھے۔ کچھ سمجھ نہ آرہا تھا کہ وہ کون تھا جو اسے ذہنی طور پر پریشان کررہا تھا اور کیا چاہتا تھا.....!

وہ اپنی گاڑی میں واپس جارہی تھی کہ اچانک اسے بریک دبانے پڑے کیونکہ وہاں ایک لمبا اور تگڑا انسان اوور کوٹ پہنے سڑک کے درمیان میں کھڑا ہوا

تھا۔ وہ عجیب سا انسان...... غیر محسوس انداز سے کسی بت کی مانند بلا خوف و خطر سر جھکائے کھڑا تھا۔

''عجیب پاگل آدمی ہے مرنا ہے تو کسی اور طریقے سے مرے، میری گاڑی کے نیچے لازمی آنا ہے......'' وہ غصے سے سرخ ہوتی ہوئی گاڑی سے باہر نکل آئی، یہ سڑک عام طور پر مصروف رہتی تھی مگر آج گاڑیوں کا نام و نشان تک نہ تھا...... وہ بڑی تیزی سے اس کی جان لپکی۔

''او مسٹر...... مرنا ہے کیا......؟ کیا مسئلہ ہے تمہارا......! کچھ ہو جاتا تو کون ذمے دار تھا......!''

وہ منہ دوسری طرف کئے خاموشی سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ قد میں بہت لمبا اور موٹا سا تھا۔ اس کے سر پر بلیک ہیٹ تھا۔ ماہم کو ایسے لگا وہ بہرہ تھا جو اس کی آواز کو سن نہ رہا تھا......!

''مجھے مت دیکھو...... اور نہ ہی سوچو...... یہ پیکٹ پکڑو اور گھر جا کر کھولنا......!'' وہ بھاری آواز میں بولا۔

''وہ سرخ پیکٹ تھا...... جو اس نے ماہم کی جانب بڑھا دیا تھا۔

''میں نہیں لے رہی یہ پیکٹ......! تم وہی شخص ہو جو میرے گھر پر کفن دے گئے تھے، اور آج فون بھی کیا تھا......''

مگر وہ اجنبی شخص اس کی آنکھوں سے ایسے غائب ہوا جیسے کوئی تھا ہی نہیں...... مگر وہ سرخ پیکٹ اس کے ہاتھ میں تھا جو اس نے لیا ہی نہیں تھا...... اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا کہ یہ میرے ہاتھ میں کیسے موجود ہے......'' یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ......!'' وہ بڑبڑائی۔

''یہ شخص کون ہے...... جو ہر بار مجھے کوئی نہ کوئی گفٹ دے جاتا ہے۔''

وہ گھبرائی تو سرخ پیکٹ کو کھول کر دیکھا۔ ''اور اس کی چیخ جیسے نکل گئی۔ سرخ پیکٹ میں اس کا اسٹیچو موجود تھا ہو بہو اس کی شکل کا اسٹیچو جس کی گردن کٹی ہوئی تھی اور گردن کے نزدیک سرخ سرخ خون تھا۔ اس نے دیکھتے ہی پیکٹ دور پھینک دیا۔ یہ بھونڈا انداق تھا۔ مگر وہ شخص کیوں اسے ہراساں کر رہا تھا۔ کیا چاہتا تھا وہ......؟ کیوں اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی......؟

اس رات عجیب معاملہ ہوا، وہ روم میں تھی کہ لائٹ چلی گئی تھی مگر یو پی ایس نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا، وہ کتابوں کے ریک کے پاس کھڑی تھی کہ اچانک ایک کتاب ریک سے نکل کر فرش پر گر گئی...... اس نے کتاب اٹھائی مگر ٹائٹل دیکھ کر اس کا دل خوف سے دھڑک اٹھا۔ کتاب کے ٹائٹل پر موت کا منظر تھا، اس نے کتاب اٹھا کر ریک میں رکھی...... نجانے کیوں موت اس کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔

وہ الماری کی طرف بڑھی...... ایک لمحے کو اسے اپنے ابو اور امی یاد آ گئے۔ آج وہ اس کے ساتھ ہوتے تو وہ خوش رہتی، غم نہ ہوتے، کوئی خوف ڈر نہ ہوتا مگر اب زندگی کتنی مشکل ہو گئی تھی۔ اس نے الماری کھولی اور تصویروں کا البم نکال لیا۔ اور تصویریں دیکھنے لگی۔ مختلف جگہوں پر مختلف یادوں کے ساتھ...... اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے ساری تصویریں دیکھ ڈالیں مگر ایک بات حیرت انگیز تھی۔ اس کی اپنی تصویریں کٹی پھٹی سی ہو گئی تھیں۔ ہر تصویر میں اس کی تصویر پر سرخ کراس بنا ہوا تھا۔ یہ کراس پہلے تو نہ تھا اچانک کہاں سے آ گئے تھے......

☆......☆......☆

موسم کے تیور اتنے بدلے کہ بادل آئے اور چند ہی منٹوں میں بارش شروع ہو چکی تھی، برانچ کلوز کرنے کا وقت ہو گیا تھا، آج جمعرات تھی اور کسٹمرز کا بہت کم ہجوم رہا تھا، لہٰذا ڈیبٹ اور کریڈٹ بہت جلد Equale ہو گئے، تمام اسٹاف ایک ہی وقت فری ہوتا تھا، شام ہو چلی تھی اور بارش زوروں پر تھی اور آج وہ گاڑی بھی نہیں لائی تھی...... یقیناً اسے ٹیکسی لینی تھی، برانچ کلوز ہوئی تو وہ پارکنگ شیڈ میں ٹھہر گئی تھی۔

باسط اپنی گاڑی نکال کر اس کے پاس سے گزرا مگر پھر ریورس گیئر لگا کے اس کے پاس گاڑی لے آیا۔ باسط آپریشن منیجر تھا اور اسی نے ماہم کو پرپوز کیا

تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ باسط ایک سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ اچھے کردار اور خاندان کا چشم و چراغ کافی میچور تھا اور ماہم کے ساتھ سیریس بھی.....! ''اس موسم میں ٹیکسی ملنا محال ہے۔ آپ کو برا نہ لگے تو میں چھوڑ دیتا ہوں آپ کو.....!'' اس نے مسکراتے ہوئے آفر کی۔

ماہم کو اعتراض تو نہ تھا مگر ایک جھجک تھی..... وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ واقعی موسم کافی خراب تھا اور ٹیکسی کا ملنا محال تھا..... ''سوچئے مت میڈم..... اور بیٹھ جائیے.....'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے.....!'' وہ بولی۔

باسط گاڑی سے باہر نکل آیا تھا اور بھاگ کر دوسری طرف کا دروازہ کھول لیا۔ ماہم ڈرائیور سائیڈ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جبکہ باسط ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

''میں خود بیٹھ جاتی، آپ نے تکلف کیا گیٹ کھولنے کا!'' ماہم نے کہا۔

''آپ میری باس بھی ہیں، آپ کی عزت میرا فرض ہے۔'' وہ بولا۔

''ایک بات یاد رکھنا، میں صرف آفس میں باس ہوں، آفس سے باہر عام دوستوں کی طرح ٹریٹ کیا کرو۔'' وہ بولی۔

''ذرہ نوازی ہے آپ کی..... ورنہ ہم اس قابل کہاں کہ ہمارے ساتھ سفر کریں آپ..... اور دوست ہونے کا بھی.....!''

''آپ بہت اچھے انسان ہیں..... ٹرسٹ ہے مجھے آپ پر.....!'' وہ بولی۔

باسط کو محسوس ہوا! ماہم کچھ پریشان سی تھی۔ اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ نے ماہم کو وارن کیا تھا کیونکہ وہ کچھ اچھا ورک نہیں کر رہی تھی، اور اس کی بہت سی غلطیاں سامنے آ رہی تھیں۔

''ماہم! آپ آج کل الجھی الجھی سی ہیں۔ لگتا ہے کہ آپ کچھ پریشان ہیں.....!'' وہ بولا۔

سوچ میں ڈوبی ماہم چونکی۔

''آں..... نہیں..... بس طبیعت کچھ خراب ہے، آپ نے کیا کہا.....'' وہ بے خیالی سے بولی۔

''خیریت.....! طبیعت کو کیا ہوا.....؟''

''باسط..... آپ میرے گھر چل سکتے ہیں کچھ دیر کے لئے..... میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''ضرور..... میں ضرور سننا چاہوں گا کیا مسئلہ ہے.....؟'' وہ بولا۔

گھر آ کر باسط نے ساری بات غور سے سنی..... اور پھر دونوں نے مل کر وہ گمشدہ گفٹ ڈھونڈا جو تلاش کے باوجود کہیں نہ ملا..... ہر جگہ تلاش کیا مگر سرخ پیک کہیں نہ ملا.....

''یہ کسی کی شرارت ہے۔ فکر نہ کریں ہم ٹریس کریں گے۔ جو کوئی بھی ہے سامنے آ جائے گا..... کوئی ہراساں کرنے کی کوشش کر رہا ہے، آپ تنہا سفر نہ کریں اور احتیاط کریں.....!'' وہ بولا۔

''میں خوفزدہ نہیں ہوں مگر اس رات جب میں نے گفٹ پیک جونہی کھولا تھا، کھلنے سے پہلے ایک دھماکہ ہوا اور سنگھار میز پر رکھے سارے پرفیوم ایک دم سے فرش پر جا گرے تھے۔ لائٹ جا چکی تھی۔ میں نے موبائل ٹارچ سے روشنی کی۔ سارے گفٹ موجود تھے مگر آخری والا گفٹ غائب تھا جو اب تک معمہ بنا ہوا ہے۔ اس کے بعد کفن کا تحفہ، اور پھر کار کے سامنے آنے والے لمبے بھدے شخص کا پیکٹ جس میں کٹی ہوئی گردن تھی، جو میری شکل کی تھی..... پیکٹ دیتے ہوئے وہ شخص میرے مخالف سائیڈ پر تھا اور پھر اس کا پلک جھپکتے غائب ہونا..... یہ سارا معاملہ کسی حقیقی مطلب کی طرف جا رہا ہے..... اور انہی وجوہات کی بنا پر میں الجھی الجھی رہتی ہوں۔'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رو پڑی تھی۔

انسان آخر کب تک تنہا سارے مسائل برداشت کرتا ہے، دکھ بانٹنے کے لئے انسان کو انسان کی ضرورت ہوتی ہے اور باسط اسے اپنا سا لگا تھا، تبھی تو وہ اس سے سب کچھ بیان کر بیٹھی، حقیقت تو یہ تھی کہ وہ خود باسط کو اپنی زندگی میں لانا چاہتی تھی۔ وہ خود کو تنہا محسوس

کرتی تھی۔ اور زندگی کے اس موڑ پر کسی ہمسفر کا ہونا لازمی تھا، مگر فی الحال تو وہ صرف اسی گفٹ کے معاملے میں پھنسی ہوئی تھی اور باسط ہی اس لائق تھا کہ سارے مسئلے حل کرسکے۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ باسط اس مسئلے کو اچھی طرح ہینڈل کرلے گا۔

باسط رات گئے تک اس کے گھر رہا۔ اس کے ہوتے ہوئے اسے کوئی خوف یا ڈر محسوس نہ ہوا، یہ اس کی اندر کی کیفیت تھی جو وہ محسوس کررہی تھی۔

☆......☆......☆

وہ صفیہ کے روم میں گئی۔ رات کافی ہوگئی تھی اور اسے تھکن سی ہوگئی تھی۔ مگر اس نے ایک فیصلہ کرلیا تھا کہ زندگی میں مزید تنہائی ختم کی جائے اور باسط کو اپنا ہمسفر بنالیا جائے اس معاملے میں صفیہ کی خدمات لینا لازمی تھا۔

وہ صفیہ کے روم میں داخل ہوئی تو صفیہ احتراماً کھڑی ہوگئی۔

''بیٹھو......!'' وہ خود بیڈ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

''صفیہ! میری بات غور سے سنو، اپنے منہ سے یہ بات کرتے ہوئے مجھے شرم آرہی ہے مگر جس کے ماں باپ نہ ہوں وہ کر ہی کیا سکتے ہیں، میں نے شادی کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' اور اس طرح اس نے صفیہ کو سب کچھ سمجھا دیا، صفیہ بھی خوش تھی کے رونق ہوجائے گی۔ اور ماہم کی زندگی میں بہار آجائے گی۔

اگلی صبح وہ مطمئن اور خوش تھی کیونکہ بہت جلد اس کی تنہائی ختم ہونے والی تھی، اور ڈر بھی انجام کو پہنچنے والا تھا، ناشتہ کرنے کے بعد وہ آفس پہنچ گئی۔ نجانے کیوں اس کا دل مطمئن تھا۔ نہ ڈر، نہ خوف...... عجیب سرشاری تھی۔ اس کے انگ انگ میں۔

ادھر گھر میں صفیہ کو صفائی کے دوران ایک سرخ پیکٹ ملا۔ وہ عجیب سا گفٹ پیک تھا جسے ہاتھ لگاتے ہی اس کا دل خوف سے دھڑکا، اس کو علم تھا کہ یہی وہ گفٹ پیک تھا جسے ماہم نے بہت ڈھونڈا تھا مگر نہیں ملا تھا۔ مگر آج اچانک سامنے آگیا تھا۔ اس نے حفاظت سے اپنے کمرے میں رکھ لیا کہ ماہم جب واپس آئے گی تو اسے سرپرائز دے گی۔

شام ہوچلی تھی۔ ماہم آفس سے باہر نکل آئی تھی۔ آج وہ خود کار ڈرائیو کررہی تھی...... ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے مہدی حسن کی غزل پلے کردی۔

نجانے اسے کیا سوچا کہ ایکسیلیٹر پر پاؤں بڑھتا گیا۔ سڑک ویران تھی اور اس نے اسی وجہ سے اسپیڈ بڑھادی تھی۔ گاڑی ہوا ہوگئی، گویا ہوا سے باتیں کرنے لگی تھی۔

اچانک ہی ایک ٹرک سامنے آیا تھا اور اسے بریک لگانے چاہئے تھے۔ مگر بدقسمتی کہ بریک فیل ہوگئے تھے۔ اور اس کی کار زناٹے دار انداز سے ٹرک سے جا ٹکرائی...... تبھی اسے وہی لمبا موٹا آدمی نظر آیا...... اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی...... اور پھر اسے آخری احساس یہی محسوس ہوا کہ جیسے اندھیرا سا آنکھوں کے آگے چھا گیا ہو......

ماہم روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہوگئی تھی، باسط اور اس کے تمام اسٹاف کو افسوس تھا، ماہم باسط کی پہلی محبت تھی، اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا، آخری رسومات کے بعد وہ صفیہ سے ملا۔

''صاحب، بی جی آپ سے شادی کرنے کا فیصلہ کرچکی تھیں اور جی ان کی موت والے دن یہ گفٹ پیک ملا تھا۔ آپ اسے کھول کر دیکھ لیں۔ شاید یہی وہ گفٹ ہے جسے ان کو تلاش تھی......''

صفیہ گفٹ لے آئی...... باسط نے اسے کھولا...... اندر صرف ایک پرچی رکھی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا...... ''ماہم علی بنت سجاد علی تاریخ وفات 22 دسمبر 2004ء وجہ موت کار حادثہ......!''

باسط اچھل پڑا کیونکہ جس دن ماہم کی وفات ہوئی، 22 دسمبر کی تاریخ تھی، اور وہ بھی کار حادثے میں......

سوالیہ نشان تھا کہ کون تھا وہ، جس نے ماہم کو ''موت کا تحفہ'' دیا تھا۔

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 120

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

سپہ سالار خوشحال پور کی طرز زندگی دیکھ کر بہت خوش ہوا، وہاں کی خوشحالی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے راجہ کو کہلا بھیجا کہ میں تمہاری سپہ سالاری سے الگ ہوگیا ہوں، مجھے اب سپہ سالاری سے کوئی غرض نہیں اور میں اب آئندہ پوری زندگی خوشحال پور میں ہی رہوں گا۔ سپہ سالار خوش حال پور میں اپنی فوجی طاقت بڑھانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی فوجی طاقت بہت زیادہ ہوگئی، راجہ سپہ سالار سے بہت متاثر ہوا، اور ایک وقت آیا کہ راجہ سپہ سالار سے ملا تو سپہ سالار نے اپنی زندگی کی پوری کہانی سنادی اور بولا کہ میرا اصل نام شوکت خان ہے اور پھر ایک وقت آیا کہ راجہ نے اپنی بڑی لڑکی رجنی کی شادی شوکت سے کردی۔ رجنی مسلمان ہوگئی تھی۔ سپہ سالار نے گلشن کو بتادیا تھا کہ میں وہی چور ہوں جو کہ چوری کی نیت سے بارش والے دن تمہارے چھجے کے نیچے کھڑا ٹپکا بن کر شیر کو متاثر کیا اور پھر گلشن کمہار نے بھی اصل حقیقت بتادی۔ پھر گلشن کے مشورے سے سپہ سالار چور نے شیر کو آزاد کردیا اور پھر ایک دن گلشن کے کہنے پر ٹپکا سے ملا تو ٹپکا نے بھی ساری حقیقت عیاں کردی اور ٹپکا مٹی پر گر کر غائب ہوگیا اور اس طرح چور ٹپکا اور شیر کی کہانی ختم ہوگئی، شوکت خان عرف سپہ سالار خوش حال پور کی مزید ترقی میں لگ گیا، اس کے تمام دشمن منہ کی کھا کر غائب ہوگئے۔ مکمل کہانی پڑھ کر حکیم وقار خاموش ہوگئے اور پھر رولوکا سے پوچھا۔ ''حکیم صاحب کہانی کیسی لگی۔ رولوکا بولا۔ ''مصنف کی سوچ کا جواب نہیں۔ جب آپ نے کہانی کا نام ''چور ٹپکا اور شیر بتایا تو میرے ذہن میں آیا کہ کوئی مزاحیہ کہانی ہے، مگر جوں جوں آگے بڑھتے رہے میں اچنبھے میں پڑتا گیا۔ مصنف نے جو مزاحیہ نام سے حقیقت بیان کی ہے اس کا جواب نہیں اور ہمیشہ ایک اچھا مصنف ہر تحریر میں سبق کا پہلو ضرور رکھتا ہے۔ مجھے یہ کہانی دلی طور پر بہت اچھی لگی ہے۔ اور پھر رولوکا اور حکیم وقار دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔

(اب آگے پڑھیں)

حکیم وقار چار پانچ ماہ بعد قیمتی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں اپنے تین چار ملازموں کے ہمراہ گھنے جنگل یا پھر پہاڑی علاقے میں جایا کرتے تھے۔ جب انہوں نے اپنا پروگرام رولوکا کو سنایا تو رولوکا بولا۔

''حکیم صاحب اس مرتبہ آپ نہیں جائیں گے بلکہ میں خود جاکر جڑی بوٹیاں لاؤں گا۔'' یہ سن کر حکیم وقار بولے۔ ''حکیم صاحب یہ کام آپ کا نہیں، آپ تو ویسے بھی آئے دن خوف ناک اور جان لیوا مسائل میں الجھے رہتے ہیں، آج کل آپ چند دن سے فارغ ہیں کوئی خطرناک مسائلہ آپ کے سامنے نہیں اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں آپ کو تکلیف دوں، آپ مطب میں رہیں، دو دن کی تو بات ہے میں خود یہ کام کروں گا۔''

پھر رولوکا کی ضد کے آگے حکیم وقار خاموش ہوگئے اور اس طرح اگلے دن صبح ہوتے ہی رولوکا، مطب کے تین ملازموں کے ہمراہ جڑی بوٹیوں کی تلاش کے لئے گھنے جنگل میں آگیا۔

جنگل میں پہنچ کر رولوکا ملازموں کے ساتھ مل کر جڑی بوٹی تلاش کرنے لگا اور دوپہر ہونے پر چاروں نے مل کر کھانا کھایا پھر تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد دوبارہ تلاش کے کام میں جت گئے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے تلاش کا کام سب نے ختم کردیا اور سفری خیمہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے لگادیا۔

رات کا کھانا کھایا اور تھوڑی دیر گپ شپ کے بعد تینوں ملازم نیند کی وادی میں اتر گئے۔

جب تینوں گہری نیند سو گئے تو رولوکا اٹھا اور درخت کے گرد ایک مضبوط حصار کھینچ دیا تا کہ رات کے وقت کوئی نادیدہ ہستی یا کوئی بلا انہیں تنگ نہ کرے اور پھر رولوکا اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔

آدھی رات کے قریب اچانک رولوکا کے کان میں ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی عورت سسک رہی ہو، آواز میں درد نمایاں تھا۔

آواز کے سنتے ہی فوراً رولوکا کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک عورت اس سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھی ہے اور یک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔

اس عورت کو دیکھ کر رولوکا اچنبھے میں پڑ گیا اور پھر بولا۔

''خاتون آپ کون ہیں اور اس اندھیری رات میں یہاں کیوں رکی ہیں؟ آپ روئیں نہیں اگر کوئی مسئلہ ہے تو بتائیں، شاید میں آپ کی مدد کرسکوں۔''

یہ سن کر وہ عورت بولی۔ محترم بزرگوار میں ایک بدنصیب بھٹکی ہوئی روح ہوں، تھک ہار کر میں نے اس درخت کو اپنا مسکن بنالیا ہے اور آج آپ نے اس درخت کے گرد حصار کھینچ کر مجھے قید کردیا ہے، جس کی وجہ سے میں بہت اذیت میں ہوں اور میں حصار سے باہر جا نہیں سکتی۔''

یہ سن کر رولوکا بولا۔ ''آپ گھبرائیں نہیں، میں نے حفاظت کے طور پر حصار کھینچا ہے آپ کی تکلیف کو مدنظر رکھ کر میں حصار ہٹادوں گا تا کہ آپ کی تکلیف ختم ہو اور آپ یہاں سے باہر جاسکیں۔ آپ نے ابھی ابھی یہ کہا کہ ''میں ایک بدنصیب بھٹکی ہوئی روح ہوں۔

''اگر آپ یہ بتانا پسند کریں کہ آپ کی روح بھٹکی کیوں، اور ہوسکتا ہے کہ اصل حقیقت جاننے کے بعد میں آپ کے لئے کچھ کرسکوں تا کہ آئندہ کے لئے آپ کو سکون مل جائے، یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ مجھ سے جو کچھ بھی ہوسکا آپ کے سکون کے لئے ضرور کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کروں گا آپ اپنے حالات بیان کریں۔''

رولوکا کی باتیں سن کر اس کو کافی ڈھارس ہوئی اور پھر وہ یوں گویا ہوئی۔

''اس دن بارش ہورہی تھی۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ آسمان پر سیاہ گھٹائیں امنڈ کر آرہی تھیں اور بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ یہ موسم بڑا پرلطف ہوتا ہے اور ایسے موسم میں نہ جانے کیا کیفیت ہوجاتی ہے۔

ایک انسانی بدن سامنے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گر رہا تھا۔ فضا میں لڑھکنیاں کھاتا ہوا گہرائیوں کی جانب آرہا تھا، میں نے چاہا میں لپک کر اس بدن کو پکڑلوں۔ وہ میرا ہی جسم تو تھا زندگی سے بھرپور، جوانی کی رعنائیوں سے سجا ہوا۔

بھوری چٹانیں پانی میں نہا کر نکھر رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے تمام گڑھے بھر کر جل تھل ہورہے تھے، اور حشرات الارض زمین کے سوارخوں سے باہر نکل آئے تھے۔ تاحد نگاہ پانی کے دھوئیں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں جس کے ساتھ ساتھ فضا میں چل رہی تھی کہ دفعتاً اس نے مجھے مخاطب کیا۔

''فری! وہ دیکھو، وہ کیا ہے؟'' میں نے اس کے اشارے کی سمت دیکھا تو ایک بلندوبالا سیاہ پہاڑ کے دامن میں سوکھی ہوئی ہڈیوں کا ایک پنجر پڑا ہوا تھا۔ اس کے نیچے پانی جمع ہوچکا تھا اور وہ ادھر ادھر تیر رہا تھا، جمی پھڑ پھڑاتا ہوا نیچے اتر گیا وہ اس ڈھانچے سے کچھ فاصلے پر پتھر کی ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور پانی میں بہتے ہوئے اس ڈھانچے کو بغور دیکھنے لگا۔ بے حس انسان اسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ میں اس کے نزدیک جا کھڑی ہوئی لیکن نجانے کیوں میرے ذہن پر ایک بوجھ سا طاری ہوگیا۔ میں خود کو مضطرب محسوس کررہی تھی۔

نادیدہ ہاتھ اس وجود کو نہ پکڑ سکے۔ میں نے دیکھا کہ وہ پہاڑ کے دامن میں بہتے ہوئے ایک برساتی

نالے میں آ گرا۔ یہی نالہ تھا جس میں اب بارش کی وجہ سے پانی بھر گیا تھا۔ اس وقت بھی شاید بارش ہو چکی تھی اور برساتی نالہ اپنے جوبن پر تھا۔

انسانی بدن اس نالے میں آ گرا۔

میں اس سے الگ کھڑی ہوئی تھی اور میری نگاہوں میں تاسف کے آثار تھے۔ تب ہی جمی کی کریہہ چیخ نے مجھے جیسے جگایا۔ میں خیالات سے باہر آ گئی۔

''فری! فری! کیا سوچنے لگیں؟''

''کچھ نہیں جمی! کوئی خاص بات نہیں۔''

''فری! دیکھو یہ انسانی ڈھانچہ کس طرح پانی کی لہروں سے کھیل رہا ہے۔ فری آؤ کیوں نہ ایک تجربہ کریں۔'' جمی نے حسب معمول پھر ایک تجویز پیش کر دی۔

''کیسا تجربہ؟'' میں نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''تم اس ڈھانچے میں داخل ہو جاؤ، دیکھیں تو سہی اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟''

''اونہوں میں ایسی غلیظ چیزوں کو پسند نہیں کرتی۔ اگر مجھے ایسا ہی کوئی بدن حاصل کرنا ہوتا تو تمہاری طرح کسی چمگادڑ کا بدن حاصل کر لیتی اور فضا میں تمہارے ساتھ پرواز کرنے لگتی۔ لیکن مجھے ایسے منحوس بدن پسند نہیں ہیں۔ چھی چھی، کبھی اپنے آپ کو دیکھو تو فوراً اس خول سے نکل بھاگو۔'' میں نے کہا اور جمی پھر ہنسنے لگا۔

''تم تو بس فری انوکھی ہو۔ ارے یہ بدن کیا حیثیت رکھتے ہیں ہمارے لئے، جب چاہو چھوڑ دو اور اس سے نکل کر کسی دوسرے جسم میں داخل ہو جاؤ۔ لیکن ہر جگہ ایک ہی کیفیت ملتی ہے۔ فری! مان لو میری بات ذرا تجربہ ہی سہی۔ دیکھیں تو سہی کہ اس جسم میں داخل ہو کر تمہاری کیا کیفیت ہوتی ہے؟''

جمی نے مجھے کچھ اس طرح مجبور کیا کہ میں تیار ہو گئی۔ آگے بڑھ کر میں نے اس پانی پر کھیلتے ہوئے انسانی ڈھانچے کو پکڑ لیا۔ چاروں طرف سے اس کا جائزہ لیا اور پھر اسے پانی سے کھینچ لیا۔ اگر یہ برساتی نالہ پوری طرح بھر جاتا تو یہ پانی اس انسانی ڈھانچے کو لے کر نجانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔ بہر صورت میں نے جمی کی ہدایت پر عمل کیا اور اس ڈھانچے میں داخل ہو گئی۔

عجیب سی گھٹن کا احساس ہوا تھا۔ ڈھانچے میں داخل ہوتے ہی اس کے خلا پر ہونے لگے۔ ہڈیوں کے درمیان کھال پیدا ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے میں اس حصار میں بند ہو گئی۔ میں نے چیخ چیخ کر جمی کو آوازیں دیں، لیکن جمی کے قہقہے میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ تب میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''شریر آدمی ہمیشہ ایسی ہی فضول حرکتیں کرتے رہتے ہو تم۔ میں باہر آ رہی ہوں۔''

''ارے نہیں نہیں فری! سنو تو سہی۔ آخر ایسی کیا جلدی ہے جب چاہو اس سے باہر آ سکتی ہو۔ تم قیدی تو نہیں بن گئیں۔ دیکھو کیسی انوکھی تبدیلیاں ہو رہی ہیں اس میں۔ واہ! اس پر تو گوشت آتا جا رہا ہے۔ بڑا دلچسپ تجربہ ہے فری۔''

میں نے ڈھانچے کو دیکھا۔ سوکھی ہوئی ہڈیاں گوشت سے بھر گئی تھیں۔ ان کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔ گورا گورا سفید اور گلابی، آہ کتنا خوبصورت بدن تھا۔ لیکن لباس سے بے نیاز۔ مجھے شرم آنے لگی۔ انوکھے ہوتے ہیں یہ بدن۔ نہ جانے کیسے کیسے بوجھ لاد لیتے ہیں خود پر۔''

''جمی! کمینے! اپنا رخ بدل لو۔ ورنہ میں باہر آ جاؤں گی۔''

''میں سمجھ گیا۔ تمہیں بے لباسی کا احساس ہو رہا ہے۔ انسانی بدن میں بس یہی خرابی ہے۔ وجود میں آتے ہی مصنوعی ضرورتوں کا شکار ہو جاتا ہے مگر ہم اس تجربے کو مکمل کریں گے۔ تم چند لمحے توقف کرو۔ میں ابھی تمہارے لئے لباس مہیا کرتا ہوں۔''

جمی نے اپنے بدن کو تولا اور فضا میں بلند ہو گیا۔ میں برساتی نالے سے ہٹ کر اس چٹان پر آ بیٹھی جہاں تھوڑی دیر قبل جمی بیٹھا ہوا تھا۔ پانی کی بوندیں میرے بے لباس بدن کو بھگو رہی تھیں۔ لمبے لمبے بال ذرا سی

دیر میں بھیگ کر میری گردن اور سینے پر آپڑے تھے۔
میں ان لمبے بالوں سے اپنے بدن کو چھپانے لگی۔ حالانکہ یہاں کوئی نہیں تھا لیکن بس ایک احساس ایک فطری احساس مجھے شرم دلا رہا تھا۔

فضا میں جمی نظر آیا اور میں سمٹ گئی۔ اس نے ایک لباس میرے اوپر ڈال دیا۔ ''اب تم یہاں سے تھوڑی دور چلے جاؤ۔ میں یہ لباس پہن لوں۔'' میں نے کہا اور جمی نے مجھ سے یہ اخلاقی تعاون کیا، تب میں نے لباس پہن لیا۔

''اب میں تمہارے پاس آسکتا ہوں؟'' جمی کی آواز ابھری اور میری اجازت سے وہ میرے پاس آگیا۔ اس نے شرارت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور اپنے نوکیلے دانت نمایاں کردیئے۔

''تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟'' میں غصیلے انداز میں بولی۔

''اوہ، نہیں فری! یقین کرو ایسی بات نہیں ہے۔ تم بہت خوبصورت نظر آرہی ہو۔ کیا یہ تجربہ انوکھا نہیں ہے۔ سوکھی ہوئی ہڈیوں کا پنجر ایک دم سرسبز وشاداب ہوگیا۔''

''ہونا ہی تھا۔ مٹی کے اس وجود میں روح کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ ساری شادابی روح کی ہوتی ہے۔ تم یہ لباس کہاں سے لے آئے؟''

''میری نہ پوچھو۔ میری دنیا ان کھنڈرات تک محدود نہیں ہے۔ میں تو نہ جانے کہاں کہاں گھومتا پھرتا ہوں۔ ان پہاڑوں سے کچھ دور سرسبز جنگلوں سے پرے ایک خوبصورت شہر آباد ہے۔ حسین عمارتوں کا شہر جہاں بے شمار لوگ رہتے ہیں۔''

''آہ، میں اس شہر کو جانتی ہوں۔ میں نے وہاں بیس سال گزارے ہیں۔ مجھے وہ شہر یاد ہے۔''

''وہ تمہارا شہر تھا؟''

''ہاں، وہ میرا شہر ہے۔'' مجھے اپنے دل میں حسرتیں تڑپتی محسوس ہو رہی تھیں۔ نہ جانے کیا کیا یاد آتا جا رہا تھا۔ ذہن کے دریچے کھل رہے تھے اور ان سے یادوں کی ہوا آرہی تھی۔

''کیا تمہارے دل میں اس شہر کو دوبارہ دیکھنے کی آرزو نہیں ہے فری؟''

جمی نے پوچھا اور پھر جلدی سے بولا۔ ''اب تو تمہارے سینے میں دل ہوگا؟''

''آرزو۔'' میں نے حسرت بھری آواز میں کہا۔

''کیوں، کیا تمہارے احساسات نہیں جاگے؟'' کیا تمہارا دل اب بھی مردہ ہے؟''

''اس شہر میں تمہارے اپنے لوگ ہوں گے۔ وہ سب ہوں گے جن کے درمیان تم رہی ہو؟''

''میرے اپنے۔'' میں حسرت بھی آواز میں بولی۔ ''تھے! مگر اب ان سے میرا کیا تعلق ہے۔ میرے اور ان کے رشتوں کے تو سارے دھاگے ٹوٹ چکے ہیں۔ میں فطرت سے بغاوت کی جرأت کہاں کرسکتی ہوں۔''

''بغاوت تو کوئی بھی نہیں کرسکتا لیکن تفریحاً، تجربتاً دیکھو تو سہی، وہ لوگ کیا کررہے ہیں؟ دیکھو تو سہی ان میں سے کوئی تمہیں یاد کرتا ہے یا سب بھول چکے ہیں۔ بس تفریحاً۔ پھر ہم وہاں سے چلے آئیں گے۔ بالآخر ہمیں انہی کھنڈرات میں آجانا ہوگا۔''

یادوں کی ہوائیں تیز ہوگئیں اور ذہن کے دریچوں میں گزرا ہوا ماضی ابھرنے لگا۔ پھر میری آواز ابھری۔

''دل تو میرا بھی چاہتا ہے! مگر کیا کروں ان لوگوں کے درمیان جا کر، کوئی بھی نہیں ہے میرا اور کوئی ہوتا بھی تو اب ان میں میرا فاصلہ کسی طور ممکن نہ تھا۔ دنیا سے میرا ناطہ ٹوٹ چکا ہے پھر اس دنیا سے جی لگانے سے کیا فائدہ؟ تم ہمیشہ ایسی ہی کوئی شرارت کرتے ہو لیکن یقین کرو، تمہاری یہ شرارت میرے لئے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی ہے میں تمہیں بتاؤں جمی، یہ بدن یہ انسانی ڈھانچہ جو نہ جانے کتنے عرصے کے بعد تم نے مجھے دکھایا ہے، میرا اپنا ہی ہے۔ ہاں، میں اسے بھول چکی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ یہ کہاں پڑا ہوا ہے، لیکن

یہ شاید میرا انتظار کر رہا تھا اور تمہاری شرارت نے مجھے ماضی کے تنگ غاروں میں دھکیل دیا۔ جبھی مجھے اجازت دو کہ میں یہ ناپاک بدن چھوڑ دوں، جس کی کثافتیں مجھ پر مسلط ہوگئی ہیں۔ مجھے وہ آزادی پسند ہے جبھی! جو مجھے فطرت کی جانب سے ملی ہے ہاں، میں آزاد رہنا چاہتی ہوں۔ میں یہ بدن چھوڑ رہی ہوں۔“

”ارے، ارے سنو تو سہی! دیکھو یہ تو ہمارے دائرہ اختیار میں ہے۔ بھلا ہمیں یہ بدن چھوڑنے سے کون روک سکتا ہے۔ جن چیزوں سے ہمارا ناطہ کٹ چکا ہے اب ہمیں کوئی بھی ان سے رابطہ رکھنے کے لئے مجبور نہیں کرسکتا۔ یہ تو بس ایک تجربہ ہے ایک تفریح ہے جس کے بارے میں ہم عرصہ تک باتیں کرتے رہیں گے۔ آخر کوئی نہ کوئی موضوع تو تلاش کرنا ہی ہوگا۔ پرانی باتیں دہراتے دہراتے کتنا وقت بیت چکا ہے۔“

”ہاں، نجانے کتنا، شاید پچیس سال، ہاں پچیس سال پہلے ہی کی تو بات ہے۔ چھوٹی سی تھی۔ میں۔ ہاں بڑا خوبصورت تھا میرا گھر۔ حسین ترین اور وہ بوڑھا، جواب نجانے کہاں ہے؟ اور اب سے پہلے مجھے یاد نہیں آیا جسے میں نے کہیں تلاش نہیں کیا۔ زمین کے ناطے وہ میرا باپ تھا۔ مجھ سے بے پناہ محبت کرتا تھا مجھے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا اس کی آنکھوں سے محبت طوفان بن کر امنڈتی تھی اور میں اس طوفان میں ڈوب جایا کرتی تھی بے پناہ چاہتا تھا مجھے، اور میں بھی اسے اتنا چاہتی تھی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے میری ماں سے پیار تھا۔ اتنا چاہتا تھا وہ، میری ماں نے اس کا ساتھ چھوڑا تو وہ کئی سال تک اسپتال میں داخل رہا۔ نیم دیوانہ ہوگیا تھا وہ اور اگر میں اپنی ماں کے خدوخال اختیار نہ کرلیتی تو شاید اس کی یہ دیوانگی اسے بہت پہلے موت کی وادیوں میں لے جاتی، لیکن ڈاکٹروں نے مجھے اس کے سامنے پیش کیا، شاید یہ کوئی نفسیاتی علاج تھا اور مجھے دیکھ کر وہ پھر سے جی اٹھا۔ اس نے اپنی تمام محبتیں میرے لئے وقف کردیں۔ یہ دہری محبت تھی۔ میرے خدوخال اس کی محبوبہ سے ملتے تھے اور میں اس کی بیٹی تھی۔ یہ دونوں محبتیں مجھے حاصل ہوگئیں اور وہ زندگی کی جانب لوٹ آیا۔

دولت مند آدمی تھا۔ دولت کی کمی نہ تھی۔ اس کے ہرکاروں نے اس کا کاروبار اس کی عدم موجودگی میں بھی بڑی وفاداری سے سنبھال رکھا تھا اور بعد میں بھی یہی ہوا۔

اس کی محبتیں میرے لئے وقف تھیں اور وہ مجھے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ زندگی میں کبھی اس نے کسی دوسری عورت کی آرزو نہ کی۔ بس میری ذات کا ایک ایک لمحہ اس کی زندگی تھا اور میں بھی اس محبت کرنے والے باپ کو بے پناہ چاہتی تھی۔

سو پھر یوں ہوا، زمانے کی ضرورتوں کا خیال اسے آیا۔ میں بڑی ہوچکی تھی اور میرے بدن کی رعنائیاں میری جوانی کی آمد کا اعلان کررہی تھیں۔

سو اس نے سوچا کہ دستور زمانہ تو نبھانا ضروری ہے، مجھے بھی زندگی کے اس محور میں شامل کردے جو ماہ وسال سے انسانوں کے گرد مسلط ہے۔ سو اس نے تلاش کیا میرے لئے کسی ایسے نوجوان کو، جو دولت مند نہ ہو اور میرے ساتھ اس کی کوٹھی میں زندگی گزارنا پسند کرلے، حالانکہ میرا باپ اس قدر دولت مند تھا کہ اگر وہ چاہتا تو میرے لئے بہت سے اچھے گھرانے مل سکتے تھے۔ ایسے گھرانے جو بخوشی مجھے اپنا لیتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شکل وصورت میں، میں سینکڑوں لڑکیوں میں ایک تھی اور لڑکی ہونے کے ساتھ ساتھ دولت بھی رکھتی تھی، جس کی ضرورت ہر شخص کو ہوتی ہے۔ لیکن نجانے میرے باپ کی سوچ کیسی تھی، وہ صرف ایسا لڑکا چاہتا تھا جو اس کی بیٹی کے ساتھ اسی کے گھر میں رہ سکے، اور اسے اپنی بیٹی سے جدا نہ ہونا پڑے۔ اور یہ نوجوان حامد تھا۔ اس کی ایک فرم کا منیجر، ایک خوبصورت اور اسمارٹ نوجوان۔ میرے باپ کی نگاہ اس پر پڑی اور جب اسے معلوم ہوا کہ حامد اس دنیا میں تنہا ہے تو وہ بہت خوش ہوا، اور اس نے دل میں تہیہ کرلیا کہ وہ حامد کو شیشے میں اتار لے گا۔ یہ شخص اس کے تصورات کے عین مطابق تھا۔

پھر یوں ہونے لگا کہ حامد ہمارے گھر آنے لگا۔ وہ فرم کے کاموں سے ہی آتا تھا۔ سہما سہما سا ڈرا ڈرا سا۔ میرے والد اپنے ملازمین کے ساتھ بہت سخت تھے اور ان کے سارے ملازم ان کی سخت مزاجی سے واقف تھے اس لئے ان سے خوف زدہ رہتے تھے۔

پھر ایک شام میں نے اس خوف زدہ نوجوان کو دیکھا۔ میں اس وقت اپنی کوٹھی کے لان میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ میرے والد گھر پر موجود نہیں تھے۔ وہ نیلے رنگ کی ایک کار سے اترا۔ شربتی رنگ کے خوبصورت لباس میں ملبوس چھریرے بدن کا مالک۔ سیاہ بالوں کے خشک گچھے اس کے دودھ جیسے سفید چہرے پر خوب سج رہے تھے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جوانی کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ وہ میری طرف ہی آ گیا۔

''معاف کیجیے گا، سیٹھ ابرار صاحب گھر پر موجود ہیں؟''

''آپ کو نظر آ رہے ہیں؟'' میں نے سوال کیا اور میرے سوال پر وہ بوکھلا گیا۔

''م...... میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو ڈسٹرب کیا۔'' اس نے کہا۔

''کتنی بار معافی مانگیں گے آپ؟'' میں نے پوچھا اور وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

پھر بولا۔ ''آپ کون ہیں؟''

''سیٹھ ابرار بہرطور نہیں ہوں۔'' میں اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''مس ابرار ہیں؟'' وہ مسکرایا۔

''اس میں مسکرانے کی کیا بات ہے؟''

''دیکھئے خاتون! مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ سیٹھ صاحب گھر پر تشریف نہیں رکھتے۔ اس سے قبل اگر آپ نے مجھے کسی قدر بدحواس محسوس کیا ہے تو وہ صرف سیٹھ صاحب کی وجہ سے۔ میں ان کے علاوہ کسی اور سے مرعوب نہیں ہوتا اور پھر آپ تو ڈرنے کی چیز ہی نہیں ہیں۔''

''بے تکلف ہونا چاہتے ہیں؟'' میں نے اسے گھور کر کہا۔

''ہرج بھی کیا ہے۔ صرف اتنا بتا دیں کہ سیٹھ صاحب کتنی دیر میں آئیں گے تاکہ میرے رکنے کا جواز پیدا ہو جائے یوں بھی بہت ضروری کام ہے ان سے۔''

''مگر میں آپ سے بے تکلف نہیں ہو سکتی۔''

''میں مجبور نہیں کروں گا آپ کو۔''

''ڈیڈی ایک گھنٹے میں آ جائیں گے۔ انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔''

''گویا میرا اندازہ درست نکلا۔ آپ مس ابرار ہیں۔ خادم کو حامد کہتے ہیں۔''

''آپ ڈرائنگ روم میں ان کا انتظار کریں۔ اندر چلے جائیں۔''

''اوہ...... وہاں گھٹن ہو گی۔ آپ اجازت دیں تو میں اسی بنچ پر بیٹھ جاؤں؟'' اس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا اور میں ناک سکوڑ کر خاموش ہو گئی۔ وہ مسکراتا ہوا بینچ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ میں پھر چہل قدمی کرنے لگی۔ لیکن ذہن اسی کی طرف تھا۔ تب اس کی آواز ابھری۔

''آپ میرا قرض نہیں ادا کریں گی مس ابرار؟''

''کیا؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

''میں نے آپ کو اپنا نام بتایا ہے۔ آپ پر بھی فرض ہو گیا ہے کہ آپ اپنا نام مجھے بتائیں۔ یہ ایک طرح کا اخلاقی قرض ہے۔'' اسی وقت ایک ملازم ہمارے پاس آ گیا۔

''فری بی بی چائے لگا دوں، یا صاحب کا انتظار کریں گی؟''

''انتظار کروں گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''حامد بابو آپ کے لئے چائے لے آؤں؟'' ملازم اسے پہچانتا تھا۔

''ضرور فضل بابا! میں انتظار کروں گا۔'' اس نے جواب دیا اور ملازم چلا گیا۔

میں اسے گھورتی رہی پھر بولی۔ ''یہ فضل تمہیں کیسے جانتا ہے؟''

''میں اکثر یہاں آتا رہتا ہوں مس فری! خادم

ہوں آپ کا۔ سیٹھ صاحب کی فرم کا منیجر ہوں۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ملازم کی وجہ سے اسے میرا نام معلوم ہوگیا تھا۔ کم بخت مجھے جلاتا رہا۔ چائے پیتا رہا۔ اس دوران میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ پھر ڈیڈی آگئے وہ وقت سے پہلے ہی آگئے تھے۔ میں کسی قدر پریشان ہوگئی تھی لیکن ڈیڈی کا موڈ بے حد خوشگوار تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے اور چائے منگوالی تھی۔

کافی دیر تک وہ بیٹھا رہا کچھ دیر کاروباری گفتگو ہوئی اور پھر ڈیڈی سے اجازت لے کر چلا گیا۔ میرے ذہن پر کوئی تاثر نہیں تھا لیکن اس کے جانے کے بعد ڈیڈی اس کی تعریفیں کرتے رہے۔ وہ اس سے بہت متاثر تھے۔

دوسرے دن مجھے اس کا فون ملا وہی شرارت بھری باتیں، ویسی ہی گفتگو مجھے اس کی گفتگو دلچسپ معلوم ہوئی تھی۔ پھر وہ اکثر ہمارے ہاں آتا رہا۔ ڈیڈی اسے بہت زیادہ لفٹ دینے لگے تھے۔ شاید ڈیڈی نے اس سے کوئی بات بھی کرلی تھی اور اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ مجھ سے گھل مل جائے۔ ایک آدھ بار ڈیڈی نے خود بھی مجھ سے اس کے ساتھ جانے کی سفارش کی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس سے مانوس ہونے لگی۔ غالباً یہی میرے ڈیڈی کا مقصد تھا۔ انہوں نے اس کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بس اپنے طور پر فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ ان کے خیالات پر پورا اترتا ہے۔ میں چونکہ زندگی کے اس رخ سے واقف نہیں تھی اس لئے یہ پہلا شخص میری دلچسپی کا باعث بن گیا اور جب ڈیڈی نے اس کے بارے میں مجھ سے سوال کیا تو میرے چہرے پر شرم کے تاثرات پھیل گئے۔

’’کیسا لگتا ہے وہ تمہیں؟‘‘ ڈیڈی نے پوچھا۔

’’عجیب سوال ہے ڈیڈی! شریف آدمی ہے اچھا ہے اور بس۔‘‘ میں نے جواب دیا اور ڈیڈی سنجیدہ ہوگئے۔ پھر پرخیال انداز میں بولے۔

’’دراصل فری بیٹے! تم میری دلی خواہشات سے اچھی طرح واقف ہو۔ ہم ان غم آلود قصوں کی جانب نہیں جائیں گے، جن کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہے لیکن اتنا میں تمہیں ضرور بتانا پسند کروں گا کہ تمہارے علاوہ میری زندگی میں کچھ بھی نہیں ہے۔ شادی ایک اہم فریضہ ہے اور میں جانتا ہوں کہ مجھے ایک نہ ایک دن یہ فریضہ پورا کرنا ہے۔ البتہ میری خواہش تھی کہ کوئی ایسا نوجوان مجھے مل جائے جو تمہارے معیار پر بھی پورا اترے اور میں اسے اپنے ساتھ رکھ سکوں۔ شاید اس سلسلے میں میرے لئے باعث دلچسپی ہے۔ وہ تنہا ہے اور کوئی بھی نہیں ہے اس کا۔ اگر تم پسند کرو تو میں اس سے تمہاری زندگی کے بارے میں بات چیت کروں؟‘‘

میں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن ڈیڈی نے خود ہی میری مرضی کا تعین کرلیا تھا۔ مجھے خاموش پاکر وہ بولے۔

’’تو میں یہ سمجھوں کہ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے؟‘‘

’’میں نے آپ کی کسی بات پر بھی اعتراض نہیں کیا ڈیڈی!‘‘ میں نے مسکرا کر کہا۔ اور پھر حامد میری زندگی میں داخل ہوگیا۔ کھلنڈرا اور شوخ سا نوجوان۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ زندگی میں محرومیوں کا شکار رہا ہے۔ کوئی بھی نہیں ہے اس کا، اور میرے مل جانے سے اسے دلی مسرت ہوئی ہے۔ چنانچہ میں خلوص دل سے اس کی شریک زندگی بن گئی۔ میں نے اپنی تمام تر محبت اس پر نچھاور کردی۔ اور حامد ہم میں گھل مل گیا۔

ڈیڈی نے اسے ہر سہولت فراہم کردی تھی۔ اب وہ اس فرم کا منیجر نہیں بلکہ ایک طرح سے مالک تھا، البتہ ڈیڈی اصول پرست آدمی تھے۔ اخراجات کے معاملے میں وہ ہمیشہ ہی سنجیدہ رہے تھے اور ایک حد پسند کرتے تھے لیکن یہ حدود حامد کو پسند نہیں تھیں۔

’’کیسی تکلیف دہ بات ہے فری! ہم لوگ اتنی بڑی دولت اتنی وسیع جائیداد کے مالک ہیں لیکن شادی کے بعد ایک بار بھی اس کا موقع نہیں ملا کہ ملک سے باہر جاتے، دنیا دیکھنے کی میرے دل میں بڑی آرزو ہے کہ

میں ملک ملک کی سیر کروں۔''

''تو ڈیڈی سے بات کرو۔''

''میں بات کروں؟ میں تمہیں ایک بات بتادوں فری لیکن شرط یہ ہے کہ تم محسوس نہیں کرو گی؟''

''کیا بات ہے؟''

''پہلے اس کا وعدہ کرو کہ تم کبیدہ خاطر نہ ہوگی اور نہ ہی میری طرف سے کسی غلط فہمی کا شکار۔''

''چلو وعدہ!''

''تمہارے ڈیڈی نے تمہارے ساتھ میری شادی کر کے ایک گھر داماد خریدا ہے اور وہی مثالی روایت قائم کر رہے ہیں جو گھر دامادوں کے ساتھ کی جاتی ہے۔ میں آج بھی ان کی فرم کا منیجر ہوں اور مجھے وہ حیثیت حاصل نہیں ہے جو کہ ہونی چاہیے تھی۔''

''تمہیں کہاں اس کا احساس ہوتا ہے حامد؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہر جگہ، مجھے بتاؤ تمہارا شوہر ہونے کے باوجود کسی چیز پر حق ہے؟ میں تو اپنی پسند کی ایک کار بھی نہیں خرید سکتا۔''

''تم اپنی پسند کی چار کاریں خرید لو حامد۔ میں تمہیں رقم دوں گی۔''

''تم دو گی نا۔ یہ فرق ہے مجھ میں اور تم میں!'' وہ تلخی سے مسکرایا۔

''تم ان باتوں کو محسوس مت کرو حامد! میں ڈیڈی سے بات کروں گی۔''

''نہیں فری! میری سبکی ہوگی۔ تم ان سے کوئی بات نہ کرنا۔'' اس نے کہا اور میں خاموش ہوگئی لیکن میں نے بعد میں ڈیڈی سے اس موضوع پر بات کی اور ڈیڈی مسکرانے لگے۔

''شوہر کی حمایت میں لڑنے آئی ہو مجھ سے۔ پگلی یہ بتاؤ کہ میں اس دولت کا کیا کروں گا میرے کس کام آئے گی یہ تم دونوں کے لئے ہی ہے لیکن کچھ توقف کرو حامد بہت اچھا لڑکا ہے لیکن بہر حال اجنبی ہے۔ پہلے اس سے پرکھ لوں یہ کام جاری ہے۔ میرے چند خاص آدمی اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اس کے بعد سب کچھ تم دونوں کو سونپ دوں گا۔''

''عجیب بات ہے ڈیڈی! آپ اب اسے پرکھ رہے ہیں جب وہ میری تقدیر کا مالک بن چکا ہے۔ میں کہتی ہوں وہ اچھا انسان ہے، کوئی خرابی نہیں ہے اس میں۔ اسے کسی محرومی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔''

''مگر وہ کیا چاہتا ہے؟''

''اسے کوئی حیثیت دی جائے۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ ملک سے باہر جانا چاہتا ہے۔ دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔''

''تم بھی اس کے ساتھ جاؤ گی؟''

''جی ڈیڈی!''

''اور میں؟'' ڈیڈی نے درد بھرے لہجے میں پوچھا۔ اور میں ایک دم خاموش ہوگئی۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ میں نے خود غرضی کی ہے۔

''آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے ڈیڈی!''

''ارے نہیں بھئی! میں تو مذاق کر رہا تھا۔ ٹھیک ہے تم دونوں گھوم آؤ میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

''نہیں ڈیڈی! میں آپ کے بغیر نہیں جاؤں گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔'' میں نے کہا تو ڈیڈی ہنسنے لگے۔ بہر حال ڈیڈی نے اسے کچھ اختیارات دیئے اور وہ خوش ہوگیا چند ہفتوں کے بعد اس نے دوبارہ باہر جانے کی ضد شروع کردی۔

''میں کب منع کرتی ہوں حامد! لیکن ہم ڈیڈی کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔''

''کیا؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، میں ڈیڈی کو تنہا نہیں چھوڑوں گی۔''

''تو پھر کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں کیا برا ہے؟'' اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

''تم ڈیڈی کو ناپسند کرتے ہو حامد؟''

''یہ بات نہیں ہے فری بس، ہمیں وہ آزادی نہیں مل سکے گی۔ بات یہ ہے کہ میں ذہنی طور پر آج بھی خود کو ان کا ملازم سمجھتا ہوں اور ان سے بے تکلف

نہیں ہو پاتا۔‘‘

’’بہر حال جیسا تم پسند کرو۔‘‘

ہم نے باہر جانے کا پروگرام بنالیا۔ خود ہی ڈیڈی ہمارے ساتھ جانے پر تیار نہیں ہوئے تھے۔ ہم دنیا دیکھنے نکل گئے استنبول، روم، پیرس، لندن، سوئٹزر لینڈ اور نہ جانے کہاں، کہاں ڈیڈی اس دوران مجھے بہت یاد آتے رہے تھے۔ مجھے ان کی کوئی خبر نہیں ملی تھی، اس کے علاوہ حامد میں بھی کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔

ایک رات اس نے شراب بھی پی تھی جس پر پہلے تو مجھے حیرت ہوئی اور پھر شدید غصہ آیا۔ اس نے مجھ سے معافی مانگ لی تھی لیکن میں نے اچھی طرح محسوس کیا تھا کہ اب اس کے وہ جذبات نہ رہے تھے جو چند روز پہلے تھے۔ وہ مجھ سے کترانے لگا تھا اور اکثر تنہا گھومنے نکل جاتا تھا۔ طرح طرح کے بہانے تراشتا تھا۔ ایک بار مجھے شبہ ہوا تو میں نے اس کا تعاقب کیا اور پہلی بار میرا دل خون ہوگیا۔ میں نے حامد کو ایک فرانسیسی عورت کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ دونوں بالآخر ایک ہوٹل کے کمرے میں بند ہوگئے تھے۔

میں نے کوئی گھٹیا حرکت نہیں کی اور خاموشی سے واپس آگئی۔ اس رات حامد ہوٹل سے واپس نہیں آیا تھا۔ رات کو تیز بارش ہوئی تھی اور میں ساری رات ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھی خاموش سڑکوں کو گھورتی رہی تھی۔ اس رات مجھے ڈیڈی کی باتیں یاد آئی تھیں۔ وہ ٹھیک ہی کہتے تھے پہلے حامد کو پرکھ لیا جائے اس کے بعد اسے آزادی دی جائے۔ حامد میں آوارگی کے جراثیم تھے۔ وہ چھوٹا انسان تھا۔ ذہنی طور پر چھوٹا تھا اور ذہنی طور پر چھوٹے انسان کو جب دولت مل جاتی ہے تو وہ بہت پست ہو جاتا ہے۔

لیکن قصور ڈیڈی کا بھی تھا۔ یہ سب کچھ تو انہیں شادی سے قبل سوچنا چاہئے تھا۔ حامد میری پسند تو نہیں تھا، میں نے اس سے محبت تو نہیں کی تھی۔ بس ڈیڈی اسے میرے سامنے لائے اور ایک خاص مقصد کے تحت لائے۔ میں نے ان سے اعتراض نہیں کیا اور وہی کچھ کیا جو ان کی اپنی خواہش تھی لیکن اس خواہش کی تکمیل کے بعد حامد کے بارے میں شک وشبہ کیا معنی رکھتا تھا۔ یہ تو ان کا فرض تھا کہ وہ اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرتے اس کے بعد فیصلہ کرتے اور حقیقت وہی نکلی۔

حامد اب دولت میں کھیلنے لگا تھا اور یہ دولت اب اس کی آنکھوں پر پردے گراتی جارہی تھی۔

وہ صبح کو واپس آیا۔ چہرے پر شرمندگی اور گزری ہوئی رات کی نحوست کے آثار منجمد تھے۔ مجھ سے آنکھیں نہیں ملا پارہا تھا۔ وہ پشیمان سے لہجے میں بولا۔

’’مجھے احساس ہے کہ تمہیں بڑی تکلیف سے یہ رات گزارنی پڑی ہوگی۔ لیکن میں کیا کروں، چند لوگوں سے شناسائی ہوگئی، یہ ہمارے کاروباری بھی ہیں، بس انہوں نے دعوت دے ڈالی تھی۔ پھر اسی دعوت میں تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ اور کچھ ایسی تیز ہوئی کہ میں واپس نہ آسکا۔‘‘

بڑا گھٹیا سا بہانہ کیا تھا اس نے، لیکن میں اس پر حقیقت منکشف نہیں کی۔ یہ نہیں بتایا میں نے اسے کہ میں اس کی اصلیت سے واقف ہو چکی ہوں۔ بس میں نے ایک ہی بات کی۔

’’حامد ہم واپس چلیں گے۔‘‘

’’میرا مقصد ہے، ابھی سے، ابھی وقت ہی کتنا گزرا ہے؟‘‘ وہ بولا۔

’’حامد ہم واپس چلیں گے۔‘‘ میں نے سرد لہجے میں کہا اور وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ اس وقت تو اس نے کچھ نہیں کہا لیکن بعد میں خاصی برہمی کا اظہار کیا تھا۔

’’ابھی تو ہمارے پاس کافی وقت ہے فری! اتنی جلدی کیا ہے۔ ابھی دل بھی نہیں بھرا اور تم واپس جانے کی بات کررہی ہو۔‘‘

’’میں نے تم سے آخری بات کہہ دی ہے حامد! اگر تم نہیں جانا چاہتے تو تم یہاں رک جاؤ، میں واپس چلی جاتی ہوں۔‘‘ میں نے بدستور سختی سے کہا۔

’’یہ کیسے ممکن ہے بھلا، خیر اگر تم واپس ہی

جانا چاہتی ہو تو میں تیار ہوں۔'' اس نے بے دلی سے کہا اور پھر نہایت بیدلی سے وہ واپس چل پڑا۔

میرا ذہن سپاٹ تھا، کوئی بات نہیں سوچ رہی تھی، لیکن میں نے یہ فیصلہ ضرور کرلیا تھا کہ ڈیڈی سے اس بارے میں بات کروں گی اور ان سے کہوں گی۔

''ڈیڈی! حامد کی طرف سے محتاط رہنا بے حد ضروری ہے۔ وہ اس مزاج کا انسان نہیں ہے جس کا ہم نے سمجھا تھا۔ وہ چھوٹا آدمی ہے اور یقیناً آئندہ بھی وہ چھوٹی حرکتیں کرے گا۔''

گھر واپس پہنچی تو ایک عجیب سا ماحول پایا۔ ملازم سہمے سہمے تھے اور مجھے دیکھ کر بھونچکے سے ہوگئے تھے پھر ہمارے دو دیرینہ ملازم میرے پاس آکر رونے لگے اور میں دھک سے رہ گئی۔

''کیا بات ہے؟''

''آپ...... آپ...... آپ کو نہیں معلوم ہو سکا بی بی!'' فضل بابا نے پوچھا۔

''کیا نہیں معلوم ہوسکا؟'' میں متحیرانہ انداز میں بولی اور فضل کی بھیگی ہوئی آنکھیں مجھے کچھ اور بتانے لگیں۔ میں نے وحشت زدہ انداز میں فضل بابا کو جھنجھوڑ دیا۔ ''کس بارے میں کہہ رہے ہو فضل بابا! بتاتے کیوں نہیں؟''

''صاحب ...... صاحب ......'' فضل بابا گھٹی ہوئی آواز میں بولے۔

''ہاں کیا ہوگیا صاحب کو؟''

''بی بی! وہ تو آپ کے جانے کے دس دن کے بعد ہی...... بس دل کا دورہ پڑا تھا آپ کو یاد کرتے کرتے۔'' فضل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور میرے حواس گم ہوگئے۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ میں نے کیا کچھ کیا اور کب تک کرتی رہی۔

ہوش آیا تو تنہا تھی بس ملازمین کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا میرے پاس۔

حامد بھی نہیں تھا۔ میں نے نقاہت بھرے لہجے میں حامد کے بارے میں پوچھا تو بوا بشیرن نے بتایا کہ

''صاحب تو بہت کم گھر آتے ہیں بس کبھی دن میں آجاتے ہیں کبھی رات کو دفتری کاموں میں الجھے رہتے ہیں۔''

غم والم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے مجھ پر۔ ڈیڈی نے ساری زندگی مجھے تنہا نہیں چھوڑا تھا، دنیا ترک کردی تھی انہوں نے میرے لئے، لیکن میں نے نئی زندگی پاتے ہی انہیں نظرانداز کردیا تھا۔ میں انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی اور میری جدائی وہ برداشت نہ کرسکے، لیکن ڈیڈی کے انتقال کو کتنے دن گزر گئے تھے۔ ہمیں خبر بھی نہ دی گئی حالانکہ بے شمار لوگ موجود تھے۔ ملازم تھے، ہمارے مجھے ان لوگوں پر شدید غصہ آیا۔ میں نے اسی وقت تنویر صاحب کو فون کیا۔ تنویر صاحب ہماری ایک فیکٹری کے نگراں تھے۔ میں نے بچپن سے انہیں دیکھا تھا ڈیڈی ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔

''تنویر صاحب! میں فری بول رہی ہوں۔''

''کیسی طبیعت ہے فری بیٹی! ڈاکٹر صاحب بتا رہے تھے۔''

''ڈاکٹر اور طبیعت کو جہنم میں جھونکیں مجھے اس بات کا جواب دیں کہ آپ کو ہمارے بارے میں معلوم نہیں تھا؟''

''میں سمجھا نہیں بیٹی؟''

''مجھے ڈیڈی کی موت کی اطلاع کیوں نہیں دی گئی تھی؟''

''اطلاع؟ وہ تو دے دی گئی تھی۔'' تنویر صاحب تعجب سے بولے۔

''کیسے دے دی گئی تھی؟''

''آپ سوئٹزرلینڈ میں تھیں جواب بھی ملا تھا، حامد صاحب کی طرف سے۔''

''آپ جھوٹ بول رہے ہیں تنویر صاحب!''

''جوابی تار میرے پاس موجود ہے فری بیٹی!''

''لے کر آئیں میرے پاس۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا اور فون بند کردیا۔ غم وغصے سے میری کیفیت بہت خراب ہو رہی تھی۔ تنویر صاحب اتنا بڑا جھوٹ

تو نہیں بول سکتے تھے لیکن حامد نے یہ بات کیوں چھپائی مجھ سے۔ اس نے اتنے عرصہ تک مجھے کچھ نہیں بتایا اور پھر خود ہی میں نے اس کا جواب بھی حاصل کرلیا۔

حامد تو رنگ رلیاں منانے آیا تھا۔ وہ بھلا فوری واپسی کب پسند کرتا۔ اسے خود بھی تو واپس آنا پڑتا۔

تنویر صاحب نے حامد کا جواب میرے سامنے رکھ دیا۔ لکھا تھا۔ ''سخت غم ہوا۔ فری نڈھال ہے۔ ابھی اسے واپس لانا ٹھیک نہیں ہے۔ اسے بہلانے کے لئے رکنا ضروری ہے۔ آپ تمام امور کی نگرانی کریں۔'' حامد۔

''فریبی حامد! کہاں ہے وہ؟ وہ کہاں ہے تنویر صاحب؟''

''معلوم نہیں بیٹی! وہ بہت کم نظر آتے ہیں۔ تمام کام ان دنوں ان کا سیکریٹری جمال دیکھ رہا ہے۔ بڑی پریشانیاں ہوتی ہیں حامد صاحب کے بغیر۔'' تنویر صاحب نے جواب دیا۔

باقاعدہ نظر نہیں آتا، پھر کہاں رہتا ہے؟''

''خدا جانے۔''

میں سوچ میں ڈوب گئی۔ حامد کی فطرت سے واقف ہوگئی تھی ورنہ خوش فہمیوں کا شکار رہتی۔ تنویر صاحب کے جانے کے بعد نہ جانے کب تک سوچتی رہی۔ پھر ملازموں کو بلا کر حامد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگی۔ پتہ چلا کہ وہ گھر میں بھی بہت کم نظر آتا ہے۔

بہر حال اس شام وہ واپس آگیا۔ مجھے ہوش وحواس میں دیکھ کر اس نے کسی خاص جذبے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بس یونہی رسمی طور پر طبیعت پوچھ لی۔ لیکن میں نے تار اس کے سامنے رکھ دیا۔

''تم نے مجھے ڈیڈی کی موت کی اطلاع کیوں نہیں دی حامد؟''

''اوہ...... یہ...... یہ کہاں سے آیا تمہارے پاس؟''

''یہ جواب ہے تمہارا؟''

''نہیں، بس پوچھ رہا ہوں۔ میری ہمت نہیں پڑی تھی فری! یہ غم ناک خبر میں تمہیں نہ سنا سکا۔ تمہیں صدمہ ہوتا۔''

''ڈیڈی مر چکے تھے اور ہم رنگ رلیاں مناتے پھر رہے تھے۔'' میں نے کہا۔

''یہ کیوں نہیں کہتے حامد کہ تمہاری تفریحات ترک ہو جاتیں۔ تمہیں واپس آنا پڑتا۔ اس کا اعتراف کیوں نہیں کرتے؟''

''تمہیں میری نیک نیتی پر شک نہیں کرنا چاہئے فری!''

''میں جانتی ہوں تم کتنے نیک نیت ہو۔ اچھی طرح جانتی ہوں۔''

''مجھے افسوس ہے فری! لیکن میری طرف سے غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ مجھے اندازہ ہے کہ لوگ تمہیں بہکا رہے ہیں، تمہاری صحت پہلے ہی خراب ہے۔''

''کتنے دن کے بعد گھر آئے ہو؟'' میں نے طنز سے پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونک کر بولا۔

''میری صحت کی طرف سے بہت فکر مند لگتے ہو۔'' میں بدستور طنزیہ انداز میں بولی۔

''فری میں سمجھ گیا ہوں، میں جان گیا ہوں کہ کون تمہیں میرے خلاف بھڑکا رہا ہے لیکن فری ایک بات بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ گھر کے ملازمین اور دفتروں میں کام کرنے والے طبقے گھٹیا ہوتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں صرف ایک بات ہوتی ہے کہ مالکان کی ہمدردیاں حاصل کریں اور اپنا مالی مفاد پورا کریں۔ تنویر صاحب بھی اسی قسم کے لوگوں میں سے ہیں۔ اب میرا تجربہ اتنا بھی محدود نہیں ہے کہ میں انسانوں کے بارے میں اندازہ نہ لگا سکوں۔ یہ تار انہوں نے محفوظ رکھا اور بالآخر تم تک پہنچا دیا۔ اس کی وجہ پر غور کیا تم نے؟ وہ صرف تمہاری توجہ چاہتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ تم ان کی ہمدردی پر غور کرو، ان پر بھروسہ کرو۔ اس کے بعد وہ اپنے مسائل تمہارے سامنے لائیں گے اور ظاہر ہے اس

کے بعد تم اپنے ہمدردوں کے بارے میں نہ سوچو گی تو کس کے بارے میں سوچو گی۔ یہ لوگ میری طرف سے تمہیں بہت زیادہ بہکادیں گے چونکہ اسی میں ان کی جیت ہے۔''

''نہیں حامد صاحب ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کیا آپ نے تنویر صاحب کو یہ بھی لکھ دیا تھا کہ آپ نے مجھے ڈیڈی کی موت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

اور حامد لاجواب ہوگیا، ظاہر ہے بے چارے تنویر صاحب کو یہ بات کیا معلوم تھی کہ حامد نے مجھے ڈیڈی کی موت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اس لئے حامد کا یہ اعتراض خود بخود ختم ہوگیا تھا۔

''بہرصورت۔'' حامد نے گہری سانس لے کر کہا۔'' میں محسوس کررہا ہوں فری کے میرے لئے حالات بہت ناسازگار ہوتے جارہے ہیں۔ میں یہ بھی محسوس کررہا ہوں کہ شروع سے لے کر اب تک میں صرف ایک کھلونے کی حیثیت رکھتا ہوں۔ ڈیڈی مرحوم نے مجھے ایک تنہا آدمی پایا اپنی بیٹی کے لئے ایک گھر داماد حاصل کرلیا۔ یہ سوچ کر کہ میں ان کا دست نگر رہوں گا اور ان کے احکامات پر عمل کرتا رہوں گا۔ انتقال ہوگیا ان کا تو ساری دولت اور ساری جائیداد وہ تمہارے نام کرگئے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ میں ایک اجنبی شخص ہوں اور اسی طرح ان کی بیٹی کا غلام بن کر رہ سکتا ہوں کہ اس کا دست نگر رہوں مجھے اس پر اعتراض نہیں ہے فری!

لیکن ایک حقیقت میں تمہارے گوش گزار کردینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ میں وہ حیثیت حاصل نہیں کرسکا جو مجھے ملنی چاہئے تھی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں تمہارے گھر میں صرف ایک ڈمی ہوں اور ڈمی بن کر انسان خوش نہیں رہ سکتا۔ بس مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔ تم اپنے ملازمین سے رابطہ رکھو، ان سے دوستیاں کرو۔ جو کچھ وہ کہیں اس پر غور کرتی رہو مجھے ذلیل ورسوا سمجھو میں تمہیں اس سے نہیں روک سکتا۔''

حامد یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور میں اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔ میں اس مکار آدمی پر بھروسا نہیں کرسکتی تھی، فرانس میں اگر میں اسے اس انداز میں نے دیکھ لیتی تو شاید یہی سمجھتی کہ حامد کے ساتھ زیادتی ہورہی ہے لیکن جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ اور اس کے بعد میں کسی حماقت کی شکار نہیں ہوسکتی تھی۔ حامد پر قابو رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ میں اس کی لگام میں کھینچے رکھوں اور لگام کو کبھی ڈھیلا نہ ہونے دوں۔

یہ بات اس سے قبل مجھے نہیں معلوم تھی کہ ڈیڈی جائیداد کے بارے میں کوئی وصیت نامہ چھوڑ گئے ہیں نہ ہی میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی میری تو حالت ہی درست نہیں تھی لیکن حامد یہ بات بھی مجھے بتا گیا تھا۔ یقیناً اسے ان ساری چیزوں سے دلچسپی ہوگی۔ ڈیڈی کی بات نہ مان کر میں نے شدید نقصان اٹھایا تھا۔

اگر حامد کو باہر کی دنیا کی ہوا نہ لگتی تو وہ انسان ہی رہتا لیکن میں نے اس کی اصلی تصویر دیکھ لی تھی۔ اور اب میں شاید اس پر کبھی بھی بھروسہ نہیں کرسکتی تھی۔ جواب سے پہلے مجھے اس کی ذات پر تھا چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ جو کچھ ڈیڈی کرگئے ہیں اب اس سے قطعاً انحراف نہ ہوگا۔

حامد حسب معمول اپنی رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔ میں اسے کسی بات کا پابند نہیں کرسکی تھی۔ جب دل چاہتا وہ گھر آجاتا۔ جب دل چاہتا چلا جاتا۔ ابتدا میں، میں نے اس سے پوچھا مگر کوئی تسلی بخش جواب نہ پاسکی۔ کئی بار اس نے مجھ سے بڑی بڑی رقمیں وصول کی تھیں۔ اس کے علاوہ دفتر سے بھی وہ رقمیں حاصل کرتا رہتا تھا۔ جس کی اطلاع مجھے مل جاتی تھی۔ لیکن میں چشم پوشی کرتی رہی۔ البتہ اس دن میں خود پر قابو نہ رکھ سکی جب مجھے حامد کی دوسری شادی کی خبر ملی۔

حامد نے ایک اور شادی کرلی تھی، نہ جانے کب۔ ممکن ہے مجھ سے شادی سے قبل ہی وہ شادی شدہ ہو۔ اس جیسے شخص کے بارے میں کیا کہا جاسکتا تھا۔ یہ خبر

مجھے ایک بالکل غیر متعلق آدمی سے ملی تھی۔ یہ ایک اسٹیٹ بروکر تھا۔ جو حامد سے ملاقات کے لئے آیا تھا، حامد نے اپنی بیوی کے لئے ایک بنگلہ خرید اتھا۔ اس کے کاغذات کی تکمیل کے لئے بروکر یہاں آ گیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میں بھی حامد کی بیوی ہوں۔ لیکن چند ایسی باتیں ہوئیں کہ مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ حامد نے یہ بنگلہ اپنے بیٹے کے نام سے خریدا ہے، کامران حامد یہ اس کے بیٹے کا نام تھا۔ اسی بات سے میں نے سوچا تھا کہ ممکن ہے مجھ سے قبل ہی وہ شادی شدہ ہو۔

غم و غصے سے میں پاگل ہو گئی۔ حامد آیا تو میں طوفان بنی بیٹھی تھی جو اسے دیکھتے ہی بپھر گیا۔

''تم پہلے سے شادی شدہ ہو حامد یا میری تقدیر پھوڑنے کے بعد تم نے یہ شادی کی تھی؟'' جواب دو حامد!'' اور حامد کا چہرہ اتر گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا لیکن پھر سنبھل گیا۔

''تمہیں یہ خبر کس نے دی ہے؟''

''مجھے میری بات کا جواب دو حامد! مجھے صرف جواب درکار ہے۔''

''وقت آ گیا ہے فری کہ میں تم پر اپنی حقیقت کھول دوں۔ ہمارے دشمنوں نے ہمارے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر دی ہے۔ اتنی وسیع کہ اگر میں تمہیں حقیقت حال سے روشناس نہ کر دوں تو نہ جانے کیا ہو جائے۔ آؤ فری! براہ کرم اس وقت تک کے لئے برے خیالات ذہن سے نکال دو جب تک تم پر میری حقیقت واضح نہ ہو جائے۔ آؤ میں اس سے قبل تم سے کچھ نہ کہوں گا۔''

کچھ ایسی اداکاری کی تھی اس نے کہ میں بے وقوف بن گئی میں اس اسرار کو جاننے کی خواہاں ہو گئی جس کے بارے میں حامد نے کہا تھا اور حامد مجھے اپنی کار میں لے آیا۔ وہ بہت سنجیدہ تھا اور میرے استفسار کے باوجود خاموش رہا تھا۔ بس اس نے ایک جملہ کہا تھا۔ ''چند لمحات توقف کرو فری! تم پر تمام حقیقتیں عیاں ہو جائیں گی۔''

میں اس کا فریب نہیں سمجھی تھی اور تجسس میں ڈوبی میں یہاں تک آ گئی تھی۔ آخری وقت تک میں اس کی چال نہ سمجھی۔ مجھے تو اس وقت احساس ہوا جب حامد نے مجھے اس پہاڑ کی چوٹی سے نیچے دھکیل دیا تھا۔

میں گہرائیوں میں جا رہی تھی لیکن شاید میری روح نیچے پہنچنے سے قبل ہی بدن کی قید سے آزاد ہو گئی تھی۔ میں نیچے گرتے بدن کو دیکھ رہی تھی اور میرا دل چاہا تھا کہ میں اسے اپنے ہاتھوں میں لپک لوں لیکن ان نادیدہ ہاتھوں میں اتنی قوت نہیں تھی۔ میرا بدن پانی میں آ گرا اور یہاں لگی ہوئی جھاڑیوں میں اٹک گیا۔ یہ جھاڑیاں اب یہاں نہیں ہیں پہلے تھیں۔ میرا وجود بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ میں ہر فکر سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اور...... اور اس کے بعد سے آج تک میں نے کبھی اپنے بارے میں نہیں سوچا کوئی خیال ہی نہیں آیا مجھے۔ لیکن جمی اس وقت نہ جانے کیوں مجھے سب یاد آ رہا ہے...... یہ سب کچھ۔''

ہمیشہ شرارتوں پر آمادہ رہنے والا جمی بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''آؤ دیکھیں فری! اب وہ لوگ کیا کر رہے ہیں دیکھو تو سہی! پتہ تو چلے کہ حامد اب کس حال میں ہے۔''

دفعتاً میرے دل میں بھی حامد کو دیکھنے کی خواہش جاگ اٹھی اور اس بار میں تیار ہو گئی۔ جمی میرے ساتھ پرواز کر رہا تھا۔

''ہم اس تک کیسے پہنچ سکیں گے جمی؟''

''ہمارے لئے کیا مشکل ہے۔ چلتی رہو میرے ساتھ۔ میں تمہیں حامد کی رہائش گاہ کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دوں گا۔ چلتی رہو۔''

یہ وہ گھر نہیں تھا جہاں میں اپنے ڈیڈی کے ساتھ رہتی تھی کوئی نئی جگہ تھی۔ لیکن بے حد خوبصورت پہلی کوٹھی سے ہزار درجے حسین اور کشادہ۔ سامنے کی سمت بڑا لان تھا۔ ایک طرف چھوٹے چھوٹے کوارٹر بنے ہوئے تھے جو ملازمین کے لئے تھے۔ مالکان کے

حصے کی رونق دیکھنے کے قابل تھی۔ ملازم ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ خوب چہل پہل تھی۔

جبھی ایک گھنے درخت کی شاخ پر الٹا جالٹکا۔ ''اب تم جانو تمہارا کام۔ یہ دنیا تمہاری ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہ حامد کی کوٹھی ہے۔ مگر حامد کہاں ہے؟''

''تلاش کرو۔'' منحوس جبھی پھر ہنس پڑا۔ اس کی ہنسنے کی عادت بھلا کہاں جاسکتی تھی۔ میں اس اجنبی ماحول میں حیران تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جاؤں کیا کروں۔ بہرحال وہاں سے آگے بڑھ گئی اور اصل رہائش گاہ کی عقبی سمت نکل آئی۔ اس سمت ایک اور عمارت بنی ہوئی تھی۔ چھوٹی سی عمارت جو الگ تھلگ تھی۔ اس کا بڑا سا دروازہ بند تھا مجھے حامد کی تلاش تھی۔ حامد کہاں ہے؟

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ مجھے کچھ لوگ اس طرف آتے نظر آئے۔ وہ اچانک گھوم کر سامنے آگئے تھے اس لئے میں خود کو ان سے چھپا بھی نہیں سکی۔ چند نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں اور انہیں میں حامد بھی تھا۔ خوبصورت، خوبرو حامد جو پہلے سے زیادہ حسین، پہلے سے زیادہ جوان نظر آرہا تھا میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ آہ! کس قدر خوبصورت لگ رہا تھا وہ۔

ان لوگوں نے مجھے دیکھا اور ٹھٹک گئے۔ پھر آگے بڑھ آئے۔

''آپ...... آپ شاید بھٹک کر ادھر آگئی ہیں خاتون۔ ملازموں نے آپ کو گائیڈ نہیں کیا، کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' حامد نے معصومیت سے پوچھا۔

میں بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ میرے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا کمبخت کو گمان بھی نہیں ہوگا کہ میں فری ہوں۔

''کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' حامد نے پھر پوچھا۔

''کسی سے نہیں۔ بس یوں ہی آگئی تھی۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''یوں ہی؟'' حامد حیرانی سے بولا۔

''تم حامد ہو نا؟'' میں نے تلخ مسکراہٹ سے پوچھا اور حامد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کامران حامد...... حامد میرے والد کا نام ہے۔'' اس نے جواب دیا اور میں چونک پڑی۔ مجھ سے بھی تو حماقت ہوئی تھی۔ بھول ہی گئی تھی کوئی آج کی بات تھی۔ سالہا سال بیت گئے تھے۔ طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ میں نہیں بدلی تھی لیکن حامد تو بدل گیا ہوگا۔ بوڑھا ہو گیا ہوگا، پچیس سال کم تو نہیں ہوتے۔ تو یہ حامد کا بیٹا کامران ہے۔

وہ سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے، پھر کامران نے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟''

''میں...... میں آپ کے والد سے ملنا چاہتی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ! خاتون شاید آپ کسی دوسرے شہر سے آئی ہیں اور شاید آپ کو میرے والد کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔'' کامران نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بیمار ہیں، شدید بیمار...... ٹی بی ہے انہیں، دونوں پھیپھڑے گل چکے ہیں، ہر وقت خون تھوکتے ہیں، دراصل انہوں نے اپنی صحت اپنے ہاتھوں تباہ کی ہے۔ شراب کی زیادتی۔ اور اب بھی باز نہیں آتے۔'' نوجوان کے لہجے میں بیزاری تھی۔

''تو وہ کسی اسپتال میں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں گھر پر ہیں، موت کا انتظار کر رہے ہیں۔'' نوجوان نے کہا۔

''میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اپنی دشمن ہیں آپ؟''

''کیوں؟'' میں نے کہا۔

''ان کا مرض شدت اختیار کر چکا ہے۔ ڈاکٹروں نے ہدایت کر دی ہے کہ ان سے قطعاً دور رہا جائے، ورنہ کوئی بھی اس مرض کا شکار ہو سکتا ہے۔''

''اسپتال میں کیوں نہیں رکھا آپ نے انہیں؟''

''اسپتال...... وہ انہیں موت گھر کہتے ہیں۔ موت سے انہیں شدید خوف محسوس ہوتا ہے، ان کا خیال ہے کہ اسپتال میں انہیں قتل کردیا جائے گا۔ کئی بار انہیں اسپتال اور سینی ٹوریم بھیجا لیکن بھاگ آتے ہیں وہاں سے۔ بس یہ بوڑھے لوگ بعض اوقات اولاد کے لئے دردسر بن جاتے ہیں لاپرواہ ہوجاؤ تو زمانہ اخلاقیات کے لاکھوں سبق دہرادے گا لیکن......''

میرے ذہنوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ حامد کا بیٹا بول رہا تھا۔ حامد کا گناہ بول رہا تھا۔ یہ حامد کی حیثیت تھی اس گھر میں جو میری دولت غصب کر کے حاصل کیا گیا تھا۔ ان کے لئے حامد نے مجھے قتل کیا تھا اسے اس کے کئے کی سزا تو ملنی ہی چاہئے تھی۔ قدرت کسی ظالم کو اس طرح تو نہیں چھوڑ دیتی۔ مجھے انوکھا سکون محسوس ہوا۔

''تو حامد کی تیمارداری کون کرتا ہے؟''

''بس ایک بڑے میاں ہیں ہمارے پرانے ملازم۔ بچپن سے ساتھ ہیں۔ دونوں بوڑھے موت کے منتظر ہیں۔'' کامران مسکرا کر بولا۔

''کہاں ہیں وہ؟'' میں نے پوچھا۔ اور کامران نے اس الگ تھلگ عمارت کی طرف اشارہ کردیا جو میرے عقب میں تھی۔

''وہاں...... شاید ڈیڈی نے یہ عمارت اسی لئے تعمیر کرائی تھی اور کوئی مصرف تو نہیں ہوسکتا اس کا۔ مگر خاتون! میں نے آپ کے سوالات کے جواب تو دے دیئے اب میری باری ہے، اپنے بارے میں تو کچھ بتائیں۔ آپ، آپ کا محل وقوع کیا ہے؟''

''میں؟'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ جھوٹ ہی بولا جاسکتا تھا ان سب سے حقیقتوں کو برداشت کرنے کی ہمت کہاں ہوگی ان میں چنانچہ میں نے کہا۔'' میں ایک ستم رسیدہ ہوں، بے حد بدنصیب۔ یورپ میں رہتی تھی۔ میرے والد صاحب حامد صاحب کے دوست تھے۔ ان کے سوا میرا کوئی نہیں تھا اس جہاں میں۔ لاکھوں روپے کی دولت کی وارث ہوں لیکن اس جہاں میں یک وتنہا ہوں، اپنوں کے لئے ترستی ہوں۔ مرتے ہوئے والد صاحب نے کہا تھا کہ ان کے دوست حامد کے پاس چلی جاؤں۔ نہ جانے کتنی دقتوں کے بعد یہاں تک آئی ہوں لیکن اب...... اب کیا کروں۔''

کامران کے چہرے پر ہمدردی کے آثار پھیل گئے۔ وہ بڑی اپنائیت سے آگے بڑھ کر بولا۔ ''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے آپ صحیح جگہ پہنچ گئیں بس اتنا ہی کافی ہے کہ آپ یہاں تک آگئیں۔ ہم سب آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔'' پھر کامران نے اپنی ساتھی لڑکیوں سے میرا تعارف کرایا۔

''یہ میری بہن عذرا حامد ہے، یہ جبیں حامد اور یہ خواتین ان دونوں لڑکیوں کی سہیلیاں ہیں اور آپ......؟'' اس نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔ میں اس جھرمٹ میں ایک نام بھی گھڑ چکی تھی۔

''میرا نام ماریا ہے۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر ماریا۔'' کامران نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''اور خاص طور سے اب آپ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ آیئے میں آپ کو ممی سے ملاؤں۔ نگریوں کریں۔ عذرا تم گیسٹ روم کھلوادو۔ مس ماریا کو پہلے غسل وغیرہ سے فارغ ہونے دیں۔ اس کے بعد انہیں ممی سے ملائیں گے۔ جاؤ کوئی تکلیف نہ ہو مس ماریا کو۔''

''آیئے۔'' عذرا نامی لڑکی نے کہا جو کامران کی بہن تھی۔ اور میں اس کے ساتھ چل پڑی۔

جمی کا قہقہہ پھر میرے کانوں میں ابھرا تھا۔ یہ شریر شخص تو میری اس حرکت سے بہت خوش ہوا ہوگا۔ میں اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھی۔

لیڈیز گیسٹ روم اس کوٹھی کے شایان شان تھا۔ عذرا مجھے ایک خوبصورت کمرے میں چھوڑ گئی اس نے میرے سامان کے بارے میں پوچھا۔

''بس بے سروسامانی کی حالت میں ہوں۔

دوسرا کوئی لباس بھی ساتھ نہیں لاسکی۔''

''کیا ہرج ہے۔ میرے کپڑے آپ کے لئے بالکل درست ہوں گے۔'' اس نے کہا اور مجھے لباس مہیا کردیئے گئے۔ میں باتھ روم میں داخل ہوگئی۔ بدن کی کثافت نے میرے ذہن میں بھی فوری تبدیلیاں پیدا کردی تھیں اور میرے اندر سے خواہشات بیدار ہوگئی تھیں چنانچہ میں نے ایک عمدہ لباس پہنا۔ چہرہ اور بال درست کئے اور جب باہر آئی تو عذرا میری منتظر تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

''بہت خوبصورت ہیں آپ مس ماریا۔''

''شکریہ۔''

''یورپ میں آپ کہاں مقیم تھیں؟''

''فرانس میں۔''

''اس کے باوجود آپ بے حد سادہ ہیں۔ آیئے آپ کو ممی کے پاس لے چلوں سب لوگ وہاں آپ کے منتظر ہیں۔''

''کیا آپ نے اپنی ممی کو میرے بارے میں بتادیا؟''

''ہاں کامران بھیا نے تو نہ جانے کیا کیا کہا ہے ممی سے۔ انہوں نے کہا ہے کہ انہیں آپ کے آنے کی اطلاع تھی۔ ایک بات عرض کردوں آپ سے۔'' عذرا بولی۔

''جی۔''

''ممی دولت پسند ہیں ان سے اپنی امارات کے خوب تذکرے کریں وہ آپ سے بہت خوش ہوں گی، دیکھیے ہر انسان کی کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں۔ آپ محسوس نہ کریں۔''

''کوئی بات نہیں ہے آپ فکر نہ کریں۔'' میں نے جواب دیا۔ اور پھر میں نے اپنی سوکن کو دیکھا۔ اس عورت کو جس کی خاطر حامد نے مجھے قتل کردیا تھا۔ کسی دور میں بے شک حسین ہوگی اب تو کھنڈرات باقی تھے جن میں اس نے چراغاں کر رکھا تھا۔

اس نے کھڑے ہوکر میرا استقبال کیا۔ میک اپ سے لتھڑی ہوئی تھی مجھے اس کے سینے سے لگ کر سخت کراہیت محسوس ہوئی۔ اس نے دل جوئی کے بے شمار کلمات کہے۔ اور مجھے تسلیاں دیتی رہی کہ میں کوئی فکر نہ کروں یہ میرا خاندان ہے۔ ساتھ ساتھ وہ مجھ سے میرے بارے میں بھی پوچھتی جارہی تھی اور میں مسلسل جھوٹ بول رہی تھی۔ لیکن میرا ہر جھوٹ اس کی آنکھوں میں چمک بڑھا دیتا تھا۔

یہاں میری بڑی خاطر مدارت ہوئی۔ کافی رات گزرے مجھے ان لوگوں سے چھٹکارا ملا تھا اور عذرا مجھے میرے خواب گاہ میں پہنچا گئی تھی۔ اندر داخل ہوکر مجھے عجیب سا احساس ہونے لگا۔ میں کس چکر میں پڑگئی تھی۔ میری روح پر جھوٹ کے انبار لگتے جارہے تھے اور میں بوجھل ہوتی جارہی تھی دل چاہ رہا تھا یہاں سے بھاگ نکلوں میری اپنی دنیا کس قدر پرسکون ہے۔ کوئی جھوٹ، کوئی فریب، کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

جبھی ایک روشن دان سے اندر داخل ہوگیا اور میں غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ''اب بولو کیا کروں؟''

''کیسا محسوس کررہی ہو؟''

''بہت برا۔ میں خوش نہیں ہوں۔''

''ہر زندہ انسان ناخوش ہے، بے سکون ہے، سکون صرف ہماری دنیا میں ہے۔ زندگی اور سکون دو مختلف چیزیں ہیں۔''

''بدن کا بوجھ لاتعداد کثافتوں کا حامل ہوتا ہے۔ جب زندہ تھی تو اتنا غور نہیں کیا تھا۔ اب سوچتی ہوں تو عجیب سا لگتا ہے حسد، جلن، فریب نہ جانے کون کون سے جذبے چھپے ہوئے ہیں ہڈیوں کے اس خول میں۔ وہ عورت میری سوکن ہے دل چاہتا ہے اس کا خون پی جاؤں۔ میری دولت پر عیش کررہی ہے ورنہ حامد کے پاس کیا تھا۔''

''حامد سے ملاقات ہوئی؟''

''نہیں، لیکن سنا ہے اس کی بری حالت ہے۔''

''ملو اس سے۔ کیا تمہارے دل میں اس کے لئے ہمدردی ابھرتی ہے۔''

اور میں حامد سے ملی۔ وہ بولا ''تم کون ہو؟''

''بدحواس ہونے کی ضرورت نہیں ہے حامد! میں جو کوئی بھی ہوں تمہیں کھا تو نہیں جاؤں گی۔ اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟'' میں نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور پھر بولی۔ ''لیکن تمہارا خوف بھی ٹھیک ہی ہے ہر مجرم بزدل ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک اپنے جرم کو فراموش نہیں کرسکتا۔ شاید یقیناً تمہاری بھی یہی کیفیت ہوگی۔ اس طرح تو تم اپنے خوف میں حق بجانب ہو۔''

''ت...... تو...... تم میرا وہم نہیں ہوسکتیں۔ تمہارے خدوخال تمہاری شکل، تمہاری آواز سب کچھ وہی ہے۔ سب کچھ وہی۔''

''اگر تمہیں اس قدر اعتماد ہے تو ٹھیک ہے۔ چلو میں مان لیتی ہوں کہ میں فری ہوں۔''

''م مگر مگر تم...... تم زندہ کیسے ہوگئیں؟ تمہاری یہ شکل صورت! تم بوڑھی بھی نہیں ہوئیں۔''

''مرنے والے اپنی جگہ رک جاتے ہیں حامد! پھر ان کی عمر نہیں بڑھتی۔ میری عمر وہی ہے۔ جس عمر میں تم نے مجھے اس دنیا سے رخصت کردیا تھا۔''

''ت...... ت...... تو تم روح ہو، بدروح ہو؟''

''بدروح۔'' میرے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔'' ہاں تم مجھے ایک بدی روح کہہ سکتے ہو اور تمہارے اندر جو روح موجود ہے وہ یقیناً نیکیوں کی جانب راغب ہوگی، کیا خیال ہے حامد! کیسی پائی یہ جرم کی زندگی تم نے؟ میں تمہارے اہل خاندان سے بھی مل چکی ہوں۔ میں نے ان سے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کیں ہیں اور محسوس کیا ہے کہ سب تم سے نفرت کرتے ہیں کوئی تمہارے پاس پھٹکنے کو تیار نہیں۔ اس لئے کہ تم ٹی بی کے آخری اسٹیج کے مریض ہو۔ تمہارے بیٹے تمہاری بیٹیاں، کوئی بھی تمہارا نام محبت سے نہیں لیتا۔ یہ وہی لوگ ہیں نا حامد جن کے لئے تم نے مجھے اس دنیا کو چھوڑ دینے پر مجبور کردیا تھا۔ تم نے مجھے اس عمر میں قتل کردیا تھا حامد، جس عمر کو امنگوں کی عمر کہا جاتا ہے۔ کچھ ملا تمہیں اس قتل کے بعد۔ میری دولت سے تم نے ان لوگوں کو عیش کرادیے، کیا خیال ہے یہ دولت تمہارے بھی کسی کام آئی؟ کیسا پایا حامد تم نے اس دنیا کو؟''

''تم...... ت...... تو...... آہ...... تم...... آہ یہ نہیں ہوسکتا یہ نہیں ہوسکتا، تم مجھے خوف زدہ نہیں کرسکتیں فری...... آخر تم پچیس سال کے بعد میرے پاس کیوں آگئیں؟''

''بس دل چاہا تھا کہ جاکر تمہاری حالت تمہاری کیفیت دیکھوں، تم نے میرے باپ کی موت سے مجھے بے خبر رکھا، اس باپ کی موت سے جس نے مجھے ماں بن کر پالا تھا۔

''بتاؤ کیا انتقام لوگی مجھ سے، بولو۔ جواب دو۔'' اس نے کہا۔

''جب میں اس عمارت میں داخل ہوئی تھی تو میں نے تمہیں دیکھا، جوان، خوبصورت پہلے سے زیادہ دیدہ زیب، پہلے سے زیادہ دلکش۔ اور میں نے تمہیں حامد کہہ کر مخاطب کیا۔ لیکن حامد وہ تم نہیں تھے۔''

''پھر...... پھر کون تھا وہ؟''

''تمہارا بیٹا کامران...... تمہارا ہم شکل...... بالکل تمہاری طرح......'' میں نے مسکرا کر کہا پھر بولی۔ ''لیکن میں اسے حامد سمجھ لوں گی۔ میں اسے حامد بنالوں گی۔ میں اسے اپنے پیار کے جال میں پھانس لوں گی میں اسے زندہ درگور کردوں گی اور! یہ سب تمہاری زندگی میں ہوگا۔ یہ سب کچھ تمہارے سامنے ہوگا، کیا خیال ہے، کیسی ترکیب ہے یہ؟''

''آہ! نہیں...... خدا کے لئے نہیں...... ایسا مت کرنا۔ میری زندگی چند روزہ ہے۔ میں تو یونہی لب گور ہوں۔ میرے ساتھ یہ سلوک مت کرو۔''

زندگی کی ہر خوشی تج دی تھی، اپنا سکون اور آرام حرام کرلیا تھا۔ تم نے مجھے اس شفیق باپ کی موت سے لاعلم رکھا۔ اپنی خودغرضی کی بنا پر، اور اس کے بعد تم نے ایک اور عورت کے لئے مجھے بھی ہلاک کردیا۔ میرا کیا

قصور تھا، مجھے جواب دو۔ کیا میں تم سے انتقام لینے میں حق بجانب نہیں ہوں؟"

"انتقام!" حامد اچھل پڑا۔ "تو تم..... تو تم مجھ سے انتقام لوگی، کیا تم مجھے ہلاک کردوگی؟"

"ارے نہیں....." میں ہنس پڑی۔ "تم تو ویسے ہی نیم مردہ ہو تمہیں ہلاک کرنے سے کیا فائدہ اور پھر کسی کو موت کے حوالے کردینا تو اس کے ساتھ رحم اور ہمدردی ہے، یہ دنیا، یہ زندگی، جس قدر ناپائیدار اور جس قدر تکلیف دہ ہے اس کا تمہیں پورا پورا احساس ہوگا۔ تمہیں اس زندگی سے نجات دلانے کا مقصد تو یہ ہے کہ تمہارے ساتھ ہمدردی کی گئی..... ہاں! میں تمہارے کرب میں کچھ اور اضافہ کرنا چاہتی ہوں حامد، اور یہی میرا انتقام ہوگا۔"

"اوہ! تم کیا کروگی، مجھے بتاؤ تم کیا کروگی؟" حامد نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں..... اب سے پہلے تو میرے ذہن میں کوئی..... ایسا کوئی خیال نہیں آیا تھا لیکن اچانک ایک ترکیب آئی ہے میرے ذہن میں اور بڑا ہی دلچسپ مشغلہ ہوگا یہ۔ کیا خیال ہے اس بارے میں؟" میں نے مسکراتے ہوئے حامد سے پوچھا۔

"کاش! اس سے اچھی کوئی ترکیب میرے ذہن میں آسکتی۔ کاش میں تمہیں اس سے زیادہ اذیت دے سکتی! میں تو پھر بھی تمہارے مقابلے میں رحم دل ہوں تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ جواب دو۔ تم نے کیا کیا تھا۔ پہلے مجھے ذہنی اذیتیں دیں پھر اس وقت موت کے منہ میں دھکیل دیا جب میں نے زندگی کا آغاز کیا تھا۔ میں نے کچھ بھی تو نہیں دیکھا تھا اس دنیا میں۔ بولو تم نے یہ سب کچھ میرے ساتھ نہیں کیا تھا؟"

"مجھے معاف کردو فری! مجھے معاف کردو۔ میں مریض ہوں میں زندگی کی آخری سانسیں پوری کررہا ہوں۔ میں چند روز کا اور مہمان ہوں اس دنیا میں، مجھے یہ اذیت نہ دو۔"

"مجھے تم سے نفرت ہے، بے پناہ نفرت۔ تم مجھ سے معافی مانگ رہے ہو، شرم نہیں آتی تمہیں۔ یہ سب کچھ جس پر یہ لوگ عیش کررہے ہیں میرا ہے، یہ زندگی تو میری تھی لیکن اب یہ سب..... تم اس سے بھی کڑی سزا کے مستحق ہو کاش کوئی اس سے اچھی ترکیب میرے ذہن میں آجاتی۔ بس اتنا ہی بتانا تھا تمہیں..... چلتی ہوں....." میں نے کہا۔

"معاف کردو فری! معاف کردو۔ مجھے معاف کردو۔" وہ چیختا رہا اور میں دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

میرا دل خوشی سے اچھل رہا تھا۔ میں بے حد مسرور تھی۔ حامد کی یہ کیفیت میرے لئے بہت مسرور کن تھی۔ اس شخص نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کے عوض یہ انتقام بہت ہلکا تھا۔ میں اسے معاف نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے میری دولت، میری زندگی چھین کر دوسروں کے قبضے میں دے دی تھی اور میں بس اسے معاف کردیتی۔ ناممکن تھا، قطعی ناممکن تھا۔

ملازم فضل وفائیں نبھا رہا تھا۔ وہ بے چارا اب کسی قابل نہیں رہا تھا۔ میں اس کے سامنے سے گزر کر چلی آئی لیکن اسے یہ بھی نہیں چل سکا۔

عمارت سے باہر نکلی تو کامران نظر آگیا۔ اسی طرف آرہا تھا مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا اور پھر تیزی سے میرے پاس آگیا۔ "آپ..... آپ ڈیڈی سے ملنے گئی تھیں، مل لیں آپ ان سے؟"

"ہاں۔"

"آپ کو ہماری باتوں سے خوف نہیں محسوس ہوا؟"

"خوف!"

"ڈیڈی کا مرض چھوت کا مرض ہے۔"

"میں ان باتوں پر بھروسہ نہیں کرتی۔"

"میں بھی نہیں کرتا، بس ممی کے احکامات ہیں کہ کوئی ان کے قریب نہ جائے، کوئی ان سے نہ ملے۔"

"اوہ کامران کیا آپ کی ممی حامد صاحب سے نفرت کرتی ہیں؟"

''یہ بات نہیں۔ بس ممی نفاست پسند ہیں اور حفظان صحت کے اصولوں کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ آیئے اس درخت کے نیچے بیٹھیں گے۔'' کامران نے ایک طرف اشارہ کیا اور میں اس کے ساتھ چل پڑی قرب وجوار کا ماحول بے حد خوبصورت تھا۔ آسمان ابر آلود تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کامران بہت خوش نظر آرہا تھا۔

''اگر ممی حفظان صحت کے اصولوں کا خیال رکھتی ہیں تو حامد صاحب کی یہ حالت کیسے ہوئی، ان پر توجہ کیوں نہیں دی گئی؟''

کامران کسی سوچ میں گم ہوگیا تھا پھر اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرادیا۔

''چھوڑیئے مس ماریا! آپ کہاں ان الجھنوں میں پڑ گئیں۔ میں آپ کو بہت جگہ تلاش کرکے اس طرف نکل آیا تھا۔ بس یوں ہی میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں آپ اس طرف نہ نکل آئی ہوں۔''

''حامد صاحب میرے ڈیڈی کے دوست ہیں مجھے ان سے ہمدردی ہے۔''

''ڈیڈی اپنی فطرت کے شکار ہوئے ہیں ممی کی ان کی طرف سے بے توجہی بلاوجہ نہیں ہے۔''

''تم سب لوگ بہت اچھے ہو کامران مجھے تم نے بڑی اپنائیت بخشی ہے اس لئے میں اس گھر کے معاملات سے پوری پوری دلچسپی رکھتی ہوں مجھے بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟''

''ڈیڈی کبھی اس گھر سے مخلص نہیں رہے۔ ضدی اور عیش پرست، شراب اور عورت ان کی زندگی رہی۔ یہ بیماری بھی ان کی...... عیش کوشیوں کا شاخسانہ ہے۔ ممی نے ہمیشہ انہیں ان تمام چیزوں سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کبھی کسی کی بات مانی۔''

''وہ اب بھی شراب نوشی کرتے ہیں؟''

''ہاں، اب بھی۔''

''کوئی غم تو نہیں ہے انہیں؟''

''نہیں مس ماریا! وہ غم پالنے والے لوگوں میں سے نہیں ہیں۔''

''تم لوگ بھی ان سے ہمدردی نہیں رکھتے؟''

''حالات ہی ایسے رہے ہیں مس ماریا! انہوں نے ہمیں کبھی خود سے قریب نہیں ہونے دیا۔ ہم ہمیشہ ان کی محبت سے محروم رہے ہیں اس لئے اب ہم بھی اس کے عادی ہیں۔''

''کیا نشے کے عالم میں ان کی ذہنی کیفیت کچھ خراب ہوجاتی ہے۔''

''کبھی غور نہیں کیا...... کیوں؟''

''اس وقت بھی وہ حواس میں نہیں تھے۔'' میں نے پیش بندی شروع کردی۔

''اوہ! آپ کو کیسے اندازہ ہوا؟'' کامران نے چونک کر پوچھا۔

وہ مجھے نہیں پہچان سکے کہنے لگے۔ ''ان کا کوئی دوست نہیں ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں، بے وقوف بنارہی ہوں سب کو، میں بدروح ہوں۔ میں فری ہوں۔ یہ فری کیا ہے کامران؟'' میں نے غور سے کامران کو دیکھا اس کے چہرے کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی ہوئی تھی لیکن دوسرے لمحے اس نے سنبھل کر کہا۔

''ان کے ذہن کی اختراع ہوگی ویسے ان کی یہ کیفیت نئی ہے بہرحال مس ماریا! براہ کرم ان کے لئے پریشان نہ ہوں، یہ بتائیں آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟''

''آپ جیسے مخلص لوگوں کی موجودگی میں مجھے کیا تکلیف ہوسکتی ہے۔ بہت خوبصورت کوٹھی ہے آپ کی۔''

''اگر آپ کو پسند آگئی ہے تو واقعی خوبصورت ہے۔'' کامران بولا۔ حامد کی آواز تھی حامد کا انداز تھا۔ پھر وہ سب لڑکیاں آئیں حامد کی بیٹیاں اور دوسری رشتہ دار لڑکیاں۔

''ہوں! یہ تنہائیاں کیا کہہ رہی ہیں؟''

''کیوں کامران بھائی؟''

''ابھی تو چند گھنٹے ہی گزرے ہیں، تم سب

کیسی باتیں کرنے لگیں۔'' کامران بوکھلانے لگا۔ میں انجان بن گئی جیسے ان کا مذاق سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتی ہوں، یورپ سے جو آئی تھی لیکن ان تمام باتوں سے میں خوش تھی۔ وہ شروع ہوگیا تھا جو میں چاہتی تھی۔

ایک لڑکی نے کہا۔''یورپ کی زندگی کیسی ہے ماریا!''

''بس زندگی جیسی ہوتی ہے۔''

''سنا ہے وہاں بڑی آزادی ہے۔''

''ہاں، جہاں سے میں آئی ہوں وہاں بڑی آزادی ہے، کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ ہلکا پھلکا خوشگوار سکوت فضاؤں میں ہوتا ہے۔''

''کسی سے محبت نہیں کی؟'' ایک لڑکی نے سوال کیا اور میں مسکرا کر خاموش ہوگئی۔

''جواب نہیں دیا تم نے ماریا؟''

''اس بات کا جواب نہیں دے سکتی۔''

''خیر، اب کرلینا، ارادہ ہے؟'' عذرا نے اپنی دانست میں مجھے گھسیٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں ارادہ ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا اور لڑکیاں کامران کو مبارکباد دینے لگیں۔ میں البتہ اسی طرح انجان بنی رہی جیسے ان کے مافی ضمیر سے ناواقف ہوں۔ کامران انہیں ڈانٹنے لگا اور یوں یہ تفریحی شغل دیر تک جاری رہا۔

رات کے کھانے پر میں نے مسز حامد کو مطمئن کرنے کے لئے کچھ فضول گفتگو کی میں نے کامران سے کہا۔

''مسٹر کامران اب تو میں یہاں آ ہی گئی ہوں اور آپ لوگوں نے مجھے اپنے درمیان جگہ دے دی ہے۔ میں چاہتی ہوں اپنی دولت یہاں منتقل کرلوں لیکن اس کے لئے بہتر یہ ہوگا کہ آپ کسی اچھے سے وکیل سے مشورہ کر کے میرا سرمایہ یہاں منگوانے کی کوشش کریں۔''

''ہاں کامران بہتر ہوگا تم نورالدین صاحب سے رابطہ قائم کرو اور بے چاری ماریا کی یہ مشکل حل کردو۔ ہر چند کہ یہاں رہ کر اسے دولت کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن بہر صورت وہ اس کا سامیہ ہے جس قدر جلد منتقل ہو جائے بہتر ہے اور ہاں ماریا! مجھے تم سے کچھ اور گفتگو بھی کرنی ہے تم ایک ایسی معزز ہستی کی بیٹی ہو جس کی ہم سب بے حد عزت کرتے ہیں۔ اور ماریا تم میرے بچوں سے مختلف نہیں ہو۔ تمہارے بہتر مستقبل کے لئے میں نہیں سوچوں گی تو اور کون سوچے گا۔ میں چاہتی ہوں اب تم بقیہ زندگی ہمارے ساتھ ہی بسر کرو۔'' مسز حامد نے کامران کے کچھ بولنے سے پیشتر ہی یہ ساری باتیں کرڈالیں۔

''اس کے انتظامات ہورہے ہیں ممی آپ فکر نہ کریں۔'' عذرا نے ممی کی باتوں کے جواب میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' مسز حامد نے تعجب سے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے میرا مطلب ہے آپ سب لوگ انتظامات کرتو رہے ہیں۔'' عذرا نے مسکرا کر کہا اور دوسری لڑکیاں بھی زیر لب مسکرانے لگیں عذرا کا مطلب کچھ اور تھا، کامران اسے گھورنے لگا۔ لیکن عذرا ان سب باتوں سے انجان بن گئی تھی۔ یہ رات بھی خاموشی سے گزر گئی اور پھر دوسرا دن شروع ہوگیا۔

وہی تفریحات وہی معمولات، میں فیصلہ نہیں کرپارہی تھی کہ میں یہاں خوش ہوں یا ناخوش بس جو جذبہ میرے دل میں پیدا ہو چکا تھا اس کی تکمیل چاہتی تھی اور اس کے بعد شاید میرے لئے یہاں رکنا ممکن نہ ہوتا البتہ اس دن دوپہر ایک چھوٹا سا دلچسپ واقعہ ہوا۔ کامران نے حسب معمول مجھے تلاش کرلیا تھا اور یہ وقت نہایت موزوں تھا کیونکہ دوسرے تمام لوگ دوپہر کو سوجایا کرتے تھے۔ اس نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور میں نے اسے اندر بلالیا۔

''یہاں نہیں رکیں گے ورنہ صورتحال یکسر غیر مناسب ہوجائے گی تم ابھی مقامی ماحول سے واقف نہیں ہو ماریا! یوں کرو، لان میں آجاؤ، اسی جگہ جہاں کل ہم لوگ بیٹھے تھے۔ میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔'' کامران نے کہا اور میں نے گردن ہلادی۔

وہ چلا گیا اور میں نے اپنے بال وغیرہ درست کئے اور مسکراتی ہوئی اس جگہ پہنچ گئی۔ ہم دونوں درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے اور کامران مجھ سے باتیں کرنے لگا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دفعتاً ہم نے حامد کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ کھڑکی جس کے پاس میں نے حامد کو بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ اسی جانب کھلتی تھی اور یقیناً حامد نے ہمیں یہاں بیٹھے دیکھ لیا ہوگا۔ وہ ہانپتا کانپتا اسی طرف آرہا تھا۔ غصے کی شدت سے اس کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔

''یہ نہیں ہوسکتا، یہ نہیں ہوسکتا، کامران! یہ بدروح ہے۔ یہ بری روح ہے۔ اس سے بچو، تم بھاگ جاؤ۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ یہ...... یہ تمہیں نقصان پہنچادے گی۔ بھاگ جاؤ کامران یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اس کے فریب میں مت آؤ۔ یہ...... یہ بے حد خوفناک ہے......'' وہ پاگلوں کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ کامران کے ہونٹ بھینچ گئے وہ ناخوشگواری کے سے انداز میں حامد کو گھورنے لگا۔

''آپ باہر کیوں چلے آئے ڈیڈی! آپ کو علم ہے کہ ڈاکٹروں نے آپ کو چلنے پھرنے سے منع کیا ہوا ہے۔''

''میں...... میں تمہارا باپ ہوں کامران! میں تمہاری بہتری چاہتا ہوں۔ خدا کے واسطے میری بات مان لو۔ اس بدروح کے پاس سے بھاگ جاؤ۔ ورنہ یہ ہم سب کو تباہ و برباد کردے گی۔ بھاگ جاؤ کامران! تمہیں انتباہ کرتا ہوں ورنہ، ورنہ شدید نقصان اٹھاؤ گے۔'' حامد نے کہا اور کامران کا موڈ سخت خراب ہوگیا۔

''ڈیڈی! آپ اندر جائیے۔ آرام کیجیے۔ ورنہ میں ممی کو آپ کے بارے میں بتادوں گا۔''

''آہ! میری بات مان لو کامران۔ کامران میری مان لو، خدا کے لئے میری مان لو...... یہ تمہیں زندہ درگور کردے گی۔'' حامد نے درد بھرے لہجے میں کہا، پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

''خدا کے لئے معاف کردو فری! ہمیں معاف کردے، جو کچھ ہوچکا ہے، اسے بھول جاؤ، اپنی دنیا میں واپس چلی جاؤ۔ خدا کے لئے ہمیں معاف کردو فری...... خدا کے لئے۔''

کامران آگے بڑھا اور اس نے حامد کا بازو پکڑلیا۔ ''ڈیڈی! آپ اس کی توہین کررہے ہیں۔ یہ ہماری مہمان ہے براہ کرم آپ اندر جائیے، چلئے جلدی چلئے۔''

کامران نے سخت لہجے میں کہا، اس نے حامد کا بازو پکڑلیا تھا پھر وہ اسے دھکیلتے ہوئے انداز میں لے کر آگے بڑھ گیا اور اس عمارت کے دروازے پر چھوڑ آیا جہاں سے حامد باہر نکل آیا تھا۔

میرے ہونٹوں پر پرسکون مسکراہٹ کھل رہی تھی۔ میں اس ساری کارروائی سے بے حد مطمئن تھی۔ کامران تھوڑی ہی دیر میں واپس آگیا اور مجھ سے معافی مانگنے لگا لیکن میں نے لاپروائی سے شانے ہلادیئے تھے۔

''میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا کامران کہ اب شاید ان کی ذہنی حالت بھی خراب ہوتی جارہی ہے بہتر یہ ہوگا کہ ڈاکٹر کو ان کی ذہنی کیفیت کے بارے میں بتادیا جائے۔''

''ممی خود یہ کارروائی کریں گی مجھے تو صرف اس بات کا افسوس ہے کہ ہماری پرسکون گفتگو میں انہوں نے خلل اندازی کی۔ آؤ موڈ خراب ہوگیا ہے چلتے ہیں یہاں سے۔'' کامران نے کہا اور ہم دونوں کوٹھی کی جانب بڑھ گئے۔

دوسرا واقعہ رات کے کھانے کے بعد پیش آیا۔

ہم رات کے کھانے سے فارغ ہوئے تھے اور بیرونی برآمدے میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے کہ مسز حامد چونک پڑیں۔ انہوں نے سامنے دیکھا اور متحیر رہ گئیں۔

''ارے یہ اپنی رہائش گاہ سے کیسے نکل آئے؟'' ان کے لہجے میں درشتی تھی۔ سب کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ حامد تھا اس کی حالت کچھ اور خراب

نظر آرہی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں وہ خشک پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔ وہ تیز تیز چلتا یہاں پہنچ گیا۔

"اوہ! تو یہاں موجود ہے، تو موجود ہے۔ نہیں جائے گی تو یہاں سے۔ نہیں جائے گی۔ اس خاندان کو تباہ کئے بغیر نہیں چھوڑے گی، بیگم، کامران کو بچاؤ یہ فری ہے اس کی روح ہے جو ہم سے انتقام لینے آئی ہے، اسے یہاں سے بھگا دو۔ میں سچ بول رہا ہوں۔"

"کیا مصیبت ہے ممی! اب تو پانی سر سے اونچا ہوگیا ہے۔ ڈیڈی پاگل ہوگئے ہیں۔ انہوں نے خود کو تباہ کرلیا ہے تو ہمیں کیوں تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ دوپہر کو بھی انہوں نے ماریا کی انسلٹ کی تھی۔ اور اب بھی وہی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ ممی! آپ انتظام کریں ان کا ورنہ میں اس کوٹھی سے چلا جاؤں گا۔" کامران نے سخت لہجے میں کہا۔

"آخر تم کیا چاہتے ہو حامد، فری پھر تمہارے ذہن میں زندہ ہوگئی ہے۔ وہ مرچکی ہے اور تم بھی اگر اس کی یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے تو خودکشی کرلو۔ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ جاؤ اپنی موت گاہ میں موت کا انتظار کرو۔"

دو قوی ہیکل ملازم حامد کو زبردستی باہر لے گئے تھے۔ بیگم صاحبہ کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے معافی مانگی اور فری کی کہانی سنائی۔

"یہ سب گناہوں کی سزا ہے ماریا بیٹی، حامد نے پوری زندگی جھوٹ اور فریب کے درمیان گزاری ہے۔ اس نے مجھ سے شادی کی اور چند ماہ کے بعد ہی اکتا گیا۔ گھر سے غائب رہنے لگا۔ میں فاقے کرتی رہی۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ اس نے فری نامی کسی لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ اس کے بعد وہ ملک سے باہر چلا گیا۔ طویل عرصے کے بعد وہ میرے پاس پناہ لینے آیا۔ کوئی اور اس کے فریب کا شکار ہوگیا تھا اور اس کی زندگی خطرے میں پڑگئی تھی۔ میں سب کچھ بھول کر اس کے لئے سینہ سپر ہوگئی۔ میں نے ہر خطرہ مول لیا اور اسے بچالیا اور پھر کچھ دن ٹھیک رہنے کے بعد وہ دوبارہ بھاگ گیا۔ میری اس جانفروشی کے صلے میں اس نے مجھے ایک چھوٹا سا بنگلہ خرید کر دے دیا تھا۔ پھر اس کمینہ صفت انسان نے اس لڑکی کو قتل کردیا جس سے اس نے شادی کی تھی اور اپنے مجرم ضمیر کو دھوکہ دینے کے لئے شراب کا بے تحاشہ استعمال شروع کردیا۔ میں پھر اس کا سہارا بنی لیکن اس سے وفا کی کوئی امید نہیں تھی اور وہی ہوا۔

شراب اور عورت میری ساری زندگی دکھوں میں گزری۔ اس نے کہیں سے دولت حاصل کرلی، لیکن دولت سکون تو نہیں دیتی۔ اگر میرے بچے میرا سہارا نہ ہوتے تو میں کب کی خودکشی کرچکی ہوتی۔ اور اب میرا وقت ہے، میرا دور ہے اور میں اس سے انتقام لے رہی ہوں۔ میں نے اسے بے حیثیت کردیا ہے وہ اسی قابل ہے۔"

"ہاں، وہ اسی قابل ہے۔"، میں نے نفرت سے سوچا۔

☆......☆......☆

کئی دن گزر گئے۔ اس کے بعد حامد نہیں نظر آیا تھا اس کی رہائش گاہ کا دروازہ باہر سے بند کردیا گیا تھا۔ اسے وہاں سے باہر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ میری دولت کی منتقلی کے انتظامات ہو رہے تھے۔ لیکن میں بے سکون تھی۔ میں تو چاہتی تھی کہ حامد بار بار میرے سامنے آئے اذیت سے تڑپے بلبلائے اور میں اس کے کرب سے لطف اندوز ہوسکوں۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، جمی زور سے چیخا اور میں چونک پڑی۔ میں نے اس دروازے کو آگ کی لپیٹ میں دیکھا جو اس کمرے میں داخل ہونے کا واحد راستہ تھا کھڑکیاں، کمرے کا فرنیچر، قالین، سب کچھ جل رہا تھا چاروں طرف آگ لگ رہی تھی میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی جمی روشندان میں بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ کیا ہوا جمی؟"

"آگ لگی ہے۔" جمی نے کہا اور ہنس دیا۔

"میں مصیبت میں ہوں اور تم ہنس رہے ہو۔"

میں جل کر بولی۔ اور جمی روشندان سے اڑ کر میرے

پاس آ بیٹھا۔ وہ بدستور ہنس رہا تھا۔ ''جی جی کمینے اب کیا ہوگا؟''

''آگ اسی پاگل بوڑھے نے لگائی ہے، باہر بہت سے لوگ جمع ہیں اور وہ آگ کے درمیان گھرا چیخ رہا ہے، وہ کہہ رہا ہے کہ وہ فری ہے ایک روح ہے، وہ جو انہیں تباہ کرنے آئی ہے وہ ان سے انتقام لے رہی ہے، اسے جل جانے دو۔ ورنہ سب اس کے انتقام کا شکار ہو جاؤ گے۔''

''اوہ۔'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا تب جی بولا۔

''آؤ فری! یہاں گھٹن بڑھتی جا رہی ہے آگ پھیل رہی ہے آؤ باہر چلیں۔''

''ایں۔'' میں چونک پڑی۔ پھر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ میں ہڈیوں اور گوشت کے اس پنجرے سے باہر نکل آئی اور بڑے سکون کا احساس ہوا۔ ایک دم کیفیت بدل گئی تھی میری، مجھے دکھ ہونے لگا۔ افسوس کس ناپاک کثافت میں داخل ہو گئی تھی میں۔ بلاوجہ میرے ذہن میں ایسے فاسد خیالات پیدا ہو گئے تھے بھلا مجھ کو اس سے انتقام لینے کی کیا ضرورت تھی۔ انتقام لینے والا تو کوئی اور ہی ہے۔ اس کی مرضی، توبہ توبہ کیسا گناہ کیا ہے میں نے، بے چارہ حامد تو خود ہی زندہ در گور ہے۔ اسے دکھ پہنچا کر مجھے کیا ملا۔

میں نے آگ میں لپٹے اپنے بدن کو دیکھا۔ اگر میری ہڈیاں چاٹ رہی تھیں۔ ناپاک خاکی کثافت۔ قصور میرا بھی نہیں تھا۔ بدن کی قید ایسے ہی گندے خیالات کی محرک ہوتی ہے۔ روح کتنی ہلکی پھلکی ہوتی ہے اس میں کوئی برا جذبہ نہیں پیدا ہوتا۔ یہ صرف اس خاک کے قید خانے کی غلاظت تھی۔

شریر جی آئندہ میرے ساتھ ایسا مذاق نہ کرنا۔ آؤ اب واپس چلیں یہاں سے۔''

میں باہر نکل آئی اور اب ہمارا رخ اپنے سکون گاہ کی طرف تھا جس میں ایک گہری خاموشی پھیلی ہوئی تھی جہاں سکون ہی سکون تھا۔ گہرا بے کراں سکون اور خاموشی اور جب میں اپنی جگہ پر پہنچی تو اچانک جی ایک دودھیا ہالا میں قید ہو گیا۔ یہ دیکھ کر میں بدحواس ہو گئی اور ایسی حالت میں ایک انجان منزل کی طرف بھاگتی گئی جب میرے حواس ذرا بحال ہوئے تو مجھے پتہ چلا کہ جی پر ایک عامل نے اپنا قبلہ جما لیا تھا۔

اور پھر اس وقت سے آج تک میں بھٹکتی پھر رہی ہوں اور اسی درخت پر اپنا مسکن بنا لیا ہے۔

محترم بزرگوار! میری التجا ہے کہ آپ میری مدد کریں تاکہ میں آئندہ بھٹکنے سے بچ جاؤں اور مجھے منزل اور سکون مل جائے۔''

یہاں تک بول کر وہ روح کرب و اذیت سے مزید سسکنے لگی۔

اس روح کی آہ و زاری رولوکا کے دل و دماغ پر کافی اثر کر گئی رولوکا چند لمحے سوچتا رہا پھر گویا ہوا۔ ''آپ گھبرائیں نہیں مجھ سے جہاں تک ہو سکا میں آپ کی ابدی سکون کے لئے سب کچھ کروں گا اب صبح کا اجالا پھیلنے والا ہے میں بہت جلد عملی قدم اٹھاؤں گا۔''

رولوکا کی بات سن کر اس روح نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور بولی۔

''محترم بزرگوار! آپ کا مجھ پر احسان ہوگا، میں آپ کا بے چینی سے انتظار کروں گی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

اور پھر رولوکا نے جس درخت کے نیچے موجود تھا اس درخت کے گرد سے حصار ختم کر دیا اور بولا۔ ''میں نے درخت کے گرد سے حصار ختم کر دیا ہے اب آپ بے خوف و خطر درخت پر رہیں۔

میں چند دن میں آپ کو خوش خبری ضرور سناؤں گا۔''

ایک مرتبہ پھر اس روح نے رولوکا کا شکریہ ادا کیا اور ایک طرف کو پرواز کر گئی۔

(جاری ہے)

موت کا بدلہ

مریم فاطمہ۔ حیدر آباد

ہیولہ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلیں اور سامنے موجود عورت کی آنکھوں میں پیوست ہوگئیں اس کے بعد عورت ہوا میں معلق ہوئی اور بڑی تیزی سے دیوار سے ٹکرائی تو اس کا سر پاش پاش ہوگیا اور پھر......

خوف وہراس کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ایک دہشت ناک، خوف ناک، تحیر انگیز کہانی

صائمہ اور نائلہ کافی شاپ میں بیٹھی کافی پی رہی تھیں سردیوں کے دن تھے ایسے میں راتیں لمبی اور دن چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس وقت شام کے پانچ بجے تھے۔

''اچھا یار میں تو چلتی ہوں ورنہ میری ممی دیر ہوجانے پر بہت ناراض ہوں گی۔'' صائمہ نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''یار! حد ہوتی ہے، جب سے آئی ہو بار بار گھڑی دیکھے جارہی ہو، کوئی دیر نہیں ہوئی کچھ دیر مزید بیٹھ جاؤ پھر چلی جانا۔'' نائلہ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

دونوں کچھ ہی عرصے میں پکی سہیلیاں بن گئی تھیں۔ اپنے دل کی بات بھی ایک دوسرے سے شیئر کرنے لگی تھیں

''سمجھا کرو نائلہ میری ممی تمہاری ممی کی طرح نہیں ہیں۔ وہ بہت سخت ہیں اگر مجھے دیر ہوگئی تو وہ بہت ناراض ہوں گی۔''

''ایک تو تمہاری ممی کی باتیں بھی میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ ہر بات پر ناراض ہوتی رہتی ہیں۔''

''خاموش ہوجاؤ نائلہ وہ میری ممی ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ بولا تو تمہاری خیر نہیں۔''

''اچھا بھئی ٹھیک ہے لیکن جانے سے پہلے دومنٹ کو میری بات تو سن جاؤ۔''

''بکو۔'' صائمہ مسکرا کر بولی اور ایک بار پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تمہیں شاید یاد ہو کہ آج سے تقریباً ایک ماہ پہلے میں نے تمہیں اپنی اولڈ دادی کے بارے میں بتایا تھا۔''

''ہاں یاد آیا بہت بیمار تھیں وہ، اب طبیعت کیسی ہے ان کی؟''

''ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔''

''اوہ! مائی گاڈ، آئی ایم سوری۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔''

''ارے افسوس کس بات کا، یار مجھے تو خوشی ہوتی ہے کہ وہ مرگئیں چلو جان تو چھوٹی نا۔''

''او یوشٹ اپ نائلہ بکواس کرتے کرتے تھکتی نہیں تم۔ دادی تھیں وہ تمہاری۔''

''دادی میری تھیں نا تجھے کیوں رونا آرہا ہے۔ اور ویسے بھی میں نے تجھے کوئی افسردہ خبر دینے کے لئے نہیں روکا تھا۔ بڑی دلچسپ بات ہے جو میں تجھے بتانے والی ہوں۔ میری دادی جس بنگلے میں رہتی ہیں، بلکہ رہتی تھیں وہ، بہت ہی خوبصورت اور شاندار ہے جب تک وہ زندہ رہیں، ہمیں وہ نہ مل سکا، ظاہر ہے ان کی ملکیت جو تھا میری ممی تو ان سے اتنی تنگ تھیں کہ الگ گھر میں رہتی تھیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگ ہمیشہ سے یہی چاہتے تھے کہ وہ گھر ہمیں مل جائے لیکن ان کے زندہ رہتے یہ ممکن نہیں تھا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہیں تو وہ بنگلہ خود بخود ہمارے حصے میں آگیا ہے، اب بہت جلد ہم لوگ وہاں شفٹ ہوجائیں گے۔

تو میں یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ نئے گھر کی خوشی میں میں پارٹی دوں گی۔ شاندار اور جاندار قسم کی پارٹی اور تجھے ہر صورت میں آنا ہوگا بلکہ تجھ کو تو میں روک لوں گی وہاں پر۔''

نا بابا ایک تو تم اپنی دادی کی ڈیتھ پر پارٹی رکھ رہی ہو، اوپر سے میں تمہارے گھر میں رہوں۔ یہ بھول جاؤ، میں نہیں رہنے والی تمہارے بھوت بنگلے میں۔''

''کیا......؟ کیا کہا......اسے بھوت بنگلہ، کیا سوچ کر کہہ دیا تم نے اس گھر کو۔''

''بھئی ظاہری بات ہے جب اتنے اچھے گھر میں تمہاری جیسی چڑیل راج کرے گی تو وہ بھوت بنگلہ ہی کہلائے گا ناں۔''

صائمہ بول کر چپ ہوئی تو دونوں ہنسنے لگیں۔

''اچھا چلو ٹھیک ہے میں اپنی ممی سے پوچھوں گی اگر وہ مجھے کچھ دن تمہارے گھر ٹھہرنے کی اجازت دے دیں تو۔'' صائمہ نے نائلہ کو گڈبائے کہا اور اپنے گھر چلی گئی۔

صائمہ اور نائلہ دونوں انٹر کی طالبہ تھیں صائمہ نہایت ذہین اور محنت سے پڑھنے والی لڑکی تھی۔ جبکہ نائلہ بہت ہی شوخ و چنچل قسم کی لڑکی تھی۔ لیکن پھر بھی دونوں میں بہت سی باتیں Common تھیں اس لئے بڑی جلدی گہری دوست بن بیٹھیں۔

دو دن بعد نائلہ کا فون آیا یہ بتانے کے لئے کہ ''اس نے پارٹی کے تمام انتظامات کرلئے ہیں اور کل رات پارٹی ہے۔'' صائمہ نے جھٹ اپنی ممی سے اجازت مانگی، پہلے تو وہ انکار کرتی رہیں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ نائلہ اچھی لڑکی ہے انہوں نے حامی بھرلی، صائمہ نے خوشی خوشی یہ بات نائلہ کو بتائی تو وہ بھی بہت خوش ہوئی۔

صائمہ نے چار اچھے سے جوڑے اپنے سامان میں پیک کیے اور ضرورت کی چند چیزیں رکھیں اور اگلے دن کا انتظار کرنے لگی۔

اگلے روز دوپہر کو کھانے کے بعد نائلہ نے صائمہ کو پک کرلیا کیونکہ وہ بنگلہ شہر کی آبادی سے بہت دور تھا۔ اس لئے وہاں پہنچتے پہنچتے ہی دو گھنٹے لگ جانے تھے۔

پورے راستے دونوں خوش گپیوں میں مصروف رہیں۔ گھر پہنچ کر باہر بڑے سے گیٹ کے سامنے نائلہ

نے گاڑی روک دی۔ صائمہ تو اس گھر کی خوبصورتی میں کھو سی گئی۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا وہ اندر داخل ہوئیں۔ سامنے بہت بڑا لان تھا۔

نجانے کیوں کچھ دیر کے لئے تو صائمہ کو واقعی وہ بنگلہ کسی بھوت بنگلے کی طرح معلوم ہوا۔ لیکن پھر اگلے ہی پل وہ تیزی سے گاڑی سے باہر نکلی اور بچوں کی طرح لان کی گھاس پر ٹہلنے لگی۔

نائلہ اس کی یہ حرکت دیکھ کر ہنسنے لگی۔ ''اب اندر چلو کیا سارے مزے باہر ہی لینے ہیں۔'' نائلہ بولی تو صائمہ نے گاڑی سے اپنا بیگ نکالا اور نائلہ کے ساتھ ساتھ اندر آ گئی۔

نائلہ نے اسے اپنے کمرے میں لے جا کر بیٹھایا ابھی کوئی اور مہمان نہیں آیا تھا۔ ''تم بیٹھ جاؤ۔ میں اپنی ممی کو بلاتی ہوں۔'' نائلہ اپنی ممی کو بلانے چلی گئی۔ اور صائمہ آرام سے بستر پر بیٹھ کر نائلہ کا کمرہ غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے مختلف فلم اسٹارز کی تصویریں اپنے کمرے میں لگا رکھی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں اس کی ممی زبیدہ کمرے میں آئیں۔ بڑے ماڈرن لوگ تھے وہ۔ انہوں نے بھی اپنی بیٹی نائلہ کی طرح خوب فیشن کر رکھا تھا اور اسٹائلش کپڑے پہن رکھے تھے۔

''کیسی ہو بیٹا؟ ہماری پہلی مہمان تم ہی ہو۔ مت پوچھو مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے تمہارے یہاں آنے سے۔'' وہ بری خوش اخلاقی سے بولیں۔

''اوہ! تھینک یو آنٹی۔'' صائمہ نے بھی اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔

''اچھا نائلہ تم ایسا کرو کہ صائمہ کو اس کا کمرہ دکھاؤ میں ذرا اپنے روم میں جا رہی ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ رکی نہیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں نائلہ نے صائمہ کا بیگ اٹھایا اور اسے اپنے پیچھے آنے کا کہا۔ وہ اسے لے کر اس کے کمرے تک آ گئی۔ ''یار نائلہ یہ کیا مجھے اتنی دور کمرہ کیوں دیا ہے۔'' وہ شکوہ کر بیٹھی۔

''سوری صائمہ لیکن جو کمرے میرے روم کے پاس ہیں وہ ابھی سیٹ نہیں کئے'' نائلہ نے جواب دیا تو صائمہ چپ ہو رہی۔ ''ویسے ایک بات تو بتا یہ تو میرے روم کے پاس روم کیوں لینا چاہ رہی ہے۔ کہیں تجھے ڈر تو نہیں لگ رہا۔''

''نہیں مجھے تو تم جیسی چڑیل سے بھی خوف محسوس نہیں ہوتا تو یہ تو پھر پیارا سا گھر ہے۔'' نائلہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''اچھا ٹھیک ہے میں چلتی ہوں۔ مجھے پارٹی کی تیاریاں بھی کرنی ہیں۔ تم آرام سے بیٹھو۔'' نائلہ باہر جا چکی تو صائمہ نے اپنا بیگ ایک طرف رکھا اور بستر پر لیٹ گئی۔ یہ کمرہ نہایت شاندار تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ ''اس گھر میں نائلہ کی دادی کتنے مزے سے رہتی ہوں گی۔'' لیکن پھر فوراً ہی اسے خیال آ گیا کہ وہ تو بے چاری بیمار تھیں۔ اور اکیلے گھر میں بس ملازموں کے ساتھ رہتی تھیں۔

اچانک اس کی نظر سامنے میز پر رکھی ہوئی ڈائری پر پڑی وہ بلیک کلر کی لیدر کی ڈائری تھی بے اختیار ہو کر اس نے اسے اٹھایا اور صفحات الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور زبیدہ اندر داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھ کر صائمہ بری طرح بوکھلا گئی۔ اور جلدی سے ڈائری واپس میز پر رکھ دی۔ ''اوہ آئی ایم سوری۔ مجھے اس طرح آپ کی چیزیں نہیں چھیڑنی چاہئیں تھیں۔''

''نہیں مائی چائلڈ اٹس او کے تمہارا جہاں دل چاہے آؤ جاؤ کیونکہ ویسے بھی ابھی ہم نے نائلہ کی دادی کے انتقال کے بعد اس گھر کی سیٹنگ نہیں کی ہے۔ اس کمرے کی ترتیب بھی ابھی صحیح نہیں ہوئی اور یہ ڈائری جو تمہارے ہاتھ میں ہے ہماری نہیں ہے بلکہ نائلہ کی دادی یعنی میری ساس کی ہے۔'' وہ کچھ دیر یونہی اس سے باتیں کرتی رہیں پھر اٹھ کر چلی گئیں۔

صائمہ یہ سوچ کر بہت خوش ہوئی کہ اب وہ سارے گھر میں آزادی سے گھوم پھر سکتی ہے اور پھر وہ شام میں ہونے والی پارٹی کی تیاری کرنے لگی۔

شام کو نائلہ کی تمام سہیلیاں آ گئیں، خوب ہلہ گلہ ہوا۔ اس کی ساری سہیلیاں بھی اس کی طرح نہایت شوخ

چنچل قسم کی تھیں۔ انہوں نے مل کر خوب ادھم مچایا۔ اتنی سخت سردی میں بھی وہ کولڈ ڈرنک کے گلاس غٹاغٹ پیتی رہیں جبکہ صائمہ ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی کافی کے سپ لے رہی تھی۔

اچانک لائٹ چلی گئی پورے گھر میں گھپ اندھیرا چھا گیا اندھیرا ہوتے ہی تمام لڑکیاں ڈر گئیں ان میں صائمہ سب سے زیادہ ڈری ہوئی تھی اس دوران اس کے کندھے پر پیچھے سے کسی نے ہاتھ رکھا تو وہ اچھل پڑی۔ ''نائلہ یہ کیا بدتمیزی ہے ڈرانا بند کرو مجھے۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا۔'' نائلہ بولی۔

''تو پھر کس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔''

''مجھے کیا پتا میں تمہارے پاس تھوڑی بیٹھی ہوں۔'' نائلہ بولی۔

ابھی یہ بحث جاری تھی کہ لائٹ دوبارہ آگئی۔

''اوہ! شکر ہے لائٹ آگئی۔'' نائلہ نے سکھ کا سانس لیا کہ اچانک ہی صائمہ کی نظر سامنے سے گزرتے ہوئے ایک سائے پر پڑی اس جگہ تھا تو کوئی نہیں لیکن بس ایک سایہ تھا جو چل رہا تھا اس سائے کو دیکھ کر صائمہ کو جھرجھری آگئی وہ بار بار پلک جھپک کر دیکھنے لگی مگر وہاں اب کوئی ہوتا تو نظر آتا۔

بڑی دیر تک پارٹی چلتی رہی اور ہلا گلا ہوتا رہا اور پھر سب کی سب شانت ہوگئیں۔

تھوڑی دیر بعد نائلہ نے کہا ''چلو ایک گیم کھیلتے ہیں یعنی کسی بھٹکی ہوئی روح کو بلاتے ہیں۔''

یہ سنتے ہی تمام لڑکیاں خوش ہوگئیں۔ بڑی گول میز پر سے انہوں نے تمام چیزیں ہٹائیں اور ایک بڑا کاغذ میز پر بچھادیا اس کے بعد نائلہ نے تمام تفصیل سے لڑکیوں کو آگاہ کیا کنول نام کی ایک لڑکی پنسل لے کر بیٹھ گئی اور پنسل کی نوک کاغذ پر ٹکادیا۔ تمام لڑکیاں یک زبان ہوکر ہلکی ٹھہری ہوئی آواز میں بولنے لگیں۔ ''اس کمرے میں یا قرب وجوار میں کوئی بھٹکی ہوئی روح ہے تو ہم اس سے مخاطب ہیں، اے بھٹکی ہوئی روح ہمارے سوال کا جواب دو اور اپنی موجودگی ثابت کرو، اے بھٹکی ہوئی روح جواب دو اور اپنا نام بتاؤ...... اپنا نام بتاؤ...... اپنا نام بتاؤ...'' سب کی سب لڑکیاں اس جملے کی تکرار کرنے لگیں اور کافی دیر تک......

پھر اچانک پنسل حرکت میں آئی اور کاغذ پر ایک نام لکھا گیا وہ نام تھا ''ہما''

نائلہ بری طرح ڈر گئی اور اندرونی طور پر اس پر کپکپی طاری ہوگئی۔ ''بس کرو، ختم کرو یہ سب کچھ۔'' اتنی سخت سردی میں بھی اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔

کنول حیران وپریشان سب کو دیکھنے لگی اس پر خوف سوار ہوگیا تھا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا تم سب یقین کرو کسی ان دیکھی طاقت کے تحت خود بخود میرا ہاتھ چل رہا تھا۔''

''جھوٹ مت بولو۔'' نائلہ نے سختی سے کہا تو کنول کو غصہ آگیا۔ ''حد ہوتی ہے ایک تو پہلے خود ہی کہا کہ کسی روح کو بلاتے ہیں اور اب آگے سے بدتمیزی کر رہی ہو۔'' دونوں میں خوب بحث چھڑ گئی یہاں تک کہ باقی لڑکیوں نے بیچ میں پڑ کے انہیں الگ کیا۔

بہت بدمزگی ہوئی اور پھر سب لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔

صائمہ کو نائلہ کے ایسے رویے پر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ ''آخر بات کیا ہے؟ وہ اچانک اتنی اپ سیٹ کیوں ہوگئی ہے۔'' مگر وہ ابھی اس سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھ رہی تھی۔ اگر کہیں اسے اس پر بھی غصہ آگیا تو۔ اس لئے وہ چپ ہی رہی۔

اچانک اسے لگا کہ کمرے کے باہر کوئی ہے۔ ہلکی سی آہٹ سنائی دے رہی تھی وہ بستر سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکلی اور کمرے کا دروازہ کھول کر ادھر ادھر دیکھنے لگی کہ اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی وہ صائمہ کی عمر کی ہی ہوگی وہ چلتی ہوئی اس کی طرف آرہی تھی۔ نزدیک آکر وہ صائمہ کو گھورنے لگی۔ ''تم کون ہو؟'' صائمہ نے پوچھا۔ ''اور اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''میرا نام ہما ہے۔ میں یہاں کام کرتی ہوں اور اسی جگہ رہتی ہوں۔'' وہ بڑے مودبانہ لہجے میں بولی۔

''خیر اب اتنی رات ہوگئی ہے تم جاکر سوجاؤ ضرور

تھک گئی ہوں گی۔"

"مجھے تھکن محسوس نہیں ہوتی، میں تو ویسے بھی......
خیر چھوڑیں، آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔" وہ بولی۔

"تم تو بڑی اچھی لڑکی لگتی ہو۔ مجھ سے دوستی
کروگی؟" صائمہ نے اس سے دوستی کے لئے ہاتھ آگے
بڑھایا تو اس نے بھی مسکرا کر ہاتھ ملایا تو ایک لمحے کو
صائمہ خوف زدہ ہوگئی۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا
تھا۔ صائمہ نے فوراً ہی بہانہ بنایا۔ "اچھا اب مجھے نیند
آرہی ہے، میں چلتی ہوں۔" اور پھر وہ تیزی سے اپنے
کمرے میں چلی گئی۔ اور دروازہ اندر سے لاک کرلیا، وہ
بستر پر بیٹھ کر ہما کے بارے میں سونے لگی۔

پھر تھوڑی دیر ہی ہوئی ہوگی کہ دروازے پر دستک
ہوئی تو وہ بری طرح اچھل پڑی۔ "کک......کون ہے؟"

"صائمہ میں ہوں نائلہ......دروازہ کھولو۔" نائلہ کی
آواز سن کر اس کی جان میں جان آئی جاکر دروازہ کھولا۔

"اوہ شکر ہے کہ تم آگئیں مجھے اکیلے میں بہت
ڈر لگ رہا تھا۔" صائمہ بولی۔

"سچ؟ ڈر تو مجھے بھی لگ رہا تھا۔ اچھا یہ لو
چلغوزے۔" نائلہ نے اسے چلغوزوں کا لفافہ تھمایا۔
پھر وہ بستر پر بیٹھ کر کھانے لگی۔ نائلہ بھی پاس پڑی کرسی
پر بیٹھ گئی۔ "تم ضرور سوچ رہی ہوں گی کہ آج شام پارٹی
کے وقت مجھے کیا ہوگیا تھا۔ میں اتنے غصے میں کیوں
آگئی تھی۔ اور ڈر کیوں گئی تھی دراصل بات ہی کچھ ایسی
ہے صائمہ کہ تم بھی سنو گی تو ڈر جاؤ گی۔

میں تمہیں اپنا ایک راز بتارہی ہوں کچھ عرصہ
پہلے "ہما" اس گھر میں ملازمہ ہوا کرتی تھی، یہ تب کی بات
ہے جب میں اور ممی اس گھر میں رہتی تھیں۔ ایک دن
میری دادی نے اپنے لئے سونے کی ایک بہت
خوبصورت انگوٹھی خریدی۔ مجھے وہ اتنی اچھی لگی کہ میں
نے اسے چرا لیا۔ اور وہ میری سب سے بڑی بھول تھی۔
جیسے ہی دادی کو انگوٹھی کی گمشدگی کا علم ہوا تو انہوں نے
ایک مصیبت ہی کھڑی کردی۔

جب میں نے یہ بات اپنی ممی کو بتائی، پہلے تو وہ
مجھ سے بہت ناراض ہوئیں اور پھر انہوں نے چوکیدار
سے کہہ کر وہ انگوٹھی ہما کے کمرے میں چھپا کر رکھوادی۔
اور چوکیدار کو اپنا منہ بند رکھنے کے لئے ایک ہزار روپے
دیئے۔

پھر جب دادی نے ہما کے کمرے کی تلاشی لی تو
وہاں سے ان کی انگوٹھی نکلی تو انہوں نے اسی وقت ہما
کو کام سے نکال دیا۔ پھر نجانے ہما کو کیسے شک ہوگیا۔
وہ میری ممی سے لڑنے لگی۔ کہنے لگی "آپ نے
مجھ پر یہ جھوٹا الزام لگایا ہے، آپ نے مجھے جان بوجھ
کر پھنسایا ہے۔"

ممی نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا تو وہ
تیورا کر فرش پر گر پڑی اور اس کا سر میز سے ٹکرایا اور خون
نکلنے لگا۔ میں اور ممی گھبرا کر اسے دیکھنے لگیں مگر افسوس کہ
وہ ہمیشہ کے لئے بہت دور جا چکی تھی۔

تب مجھے بہت افسوس ہوا کہ یہ ہم نے کیا کردیا
کیونکہ ہما سے میری بڑی اچھی دوستی تھی۔ ہم نے اس کے
ماں باپ سے۔" یہ ہی کہا کہ وہ نجانے خود بخود کیسے
گرگئی۔" اور اس کی ڈ-تھ ہوگئی۔ غربت بہت بری ہوتی
ہے، ممی نے اس کے والدین کو پانچ ہزار روپے دیئے کہ
وہ کفن دفن کا انتظام کردیں اور وہ لوگ خاموش ہوگئے۔

اور آج پارٹی میں جب ہما کا نام کنول نے لکھا تو
میں بہت بری طرح گھبرا گئی۔

"ویسے ایک ہما کو تو میں بھی جانتی ہوں۔"
صائمہ بولی تو نائلہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کون ہے
وہ؟" نائلہ نے جلدی سے پوچھا۔

"ارے اتنے تجسس کی کیا بات ہے تمہاری
ملازمہ ہے وہ۔ ابھی تم سے پہلے میری اس سے ملاقات
ہوئی تھی۔ اور ہم میں دوستی بھی ہوگئی ہے لیکن پتا نہیں
کیوں مجھے کچھ عجیب سی لگی وہ لڑکی۔" صائمہ نے کہا۔

"کیا کہہ رہی تھی وہ؟" نائلہ تقریباً چیختے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔! اتنا ڈر کیوں رہی
ہو؟" صائمہ نے نائلہ سے پوچھا۔

"ڈرنے کی بات ہے صائمہ، اب ہما نام کی کوئی

لڑکی ہمارے پاس کام نہیں کرتی۔ مجھے لگتا ہے کہ ہما کی روح لوٹ آئی ہے، میری دادی کہا کرتی تھیں۔ ''بعض اوقات روحیں کسی وجہ سے مر کر پھر لوٹ آتی ہیں۔'' ٹھہرو مجھے ممی کو بتانا ہوگا۔

''لیکن نائلہ وہ تو سچ مچ کی لڑکی تھی کوئی روح نہیں تھی۔'' صائمہ بولی۔

''اگر سچ مچ کی لڑکی تھی بھی تو، میں نے تم سے کیا کہا، اب کوئی ہما نام کی لڑکی اس گھر میں نہیں ہے۔'' اتنا کہہ کر نائلہ نے صائمہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر اپنی ممی کے کمرے میں آئی اور اس کی ممی کو ساری بات بتائی تو وہ پہلے تو روحوں والی بات پر یقین کرنے سے انکار کرنے لگیں پھر بولیں۔ ''چل کر ہاشم (چوکیدار) سے پوچھتے ہیں کہ کیا اس نے کسی کو اندر داخل ہوتے دیکھا ہے۔'' پھر وہ تینوں چوکیدار کے پاس پہنچیں مگر سامنے کا منظر دیکھ کر ان کے ہوش اڑ گئے وہ دروازے کے پاس فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کا گلا کٹا ہوا تھا۔

تینوں اسے دیکھ کر چیخنے چلانے لگیں پھر بدحواسی کے عالم میں بولیں۔ ''لڑکیوں اس طرح چیخنے سے کچھ نہیں ہوگا ہمیں پولیس کو اطلاع کرنی ہوگی ضرور کوئی چور ڈاکو گھر میں گھس آیا ہے۔''

تینوں بھاگتی ہوئی واپس آئیں نائلہ کی ممی زبیدہ نے کئی بار پولیس کو فون کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار ناکامی ہوئی۔ کوئی بھی فون نہیں اٹھا رہا تھا اور پھر جب ایک بار انہوں نے فون ملانے کی کوشش کی تو دیکھا کہ تار کٹی پڑی ہے۔

''یہ کب ہوا؟ کیسے ہوا؟'' زبیدہ حیرت سے چیخیں۔ ''اوہ! میرے خدا یہاں تو میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' نائلہ روتے ہوئے بولی۔

اچانک ہی راہداری میں کسی کے چلنے کی آہٹ ہوئی۔ تینوں سہم گئیں۔ ''تم لوگ ٹھہرو میں دیکھتی ہوں۔'' زبیدہ نے صائمہ اور نائلہ کو ایک طرف کیا اور کمرے سے باہر نکل آئیں۔ ادھر ادھر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ ''کوئی بھی نہیں ہے۔'' وہ بولیں۔ واپس اندر آئی ہی تھیں کہ اچانک انہیں کسی نادیدہ وجود نے ہوا میں اچھال دیا۔ اور وہ ہوا میں اڑتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائیں۔

ٹکر اتنی زوردار تھی کہ ان کا سر کئی حصوں میں بٹ گیا اور وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتی ہوئی بے سدھ ہوگئیں۔

صائمہ اور نائلہ خوف سے چیخیں مارنے لگیں پھر اچانک سارے کمرے کی چیزیں ہلنے لگیں تو وہ دونوں گھبرا کر کمرے سے باہر آئیں تو دیکھا کہ سامنے ہما کھڑی ہے وہی ہما جس سے صائمہ نے بات کی تھی۔

نائلہ نے بتایا کہ ''یہ وہی ہما ہے جو کہ مر چکی ہے۔''

وہ دونوں خوف سے دیوانوں کی طرح سارے گھر میں بھاگنے لگیں کہ کہیں چھپنے کی جگہ مل جائے مگر وہ جہاں جاتیں نامعلوم کس طرح ہما بھی وہاں پہنچ جاتی۔ آخر تھک کر دونوں زمین پر بیٹھ گئیں دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''اچانک انہیں اپنے پیچھے سے آواز سنائی دی۔

''میں لوٹ آئی ہوں نائلہ۔'' دونوں نے بری طرح ڈر کر پیچھے دیکھا، وہاں ہما ہاتھ میں تیز دھار بڑی چھری لئے کھڑی تھی۔

پھر ہما کی روح ہوا کی سی تیزی سے آگے بڑھی، اور اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل کر نائلہ کی آنکھوں میں پیوست ہونے لگیں، دیکھتے ہی دیکھتے نائلہ بے خود اور مبہوت ہو کر فرش پر ڈھے گئی، تو وہ روح آگے بڑھی اور چھری نائلہ کی گردن پر پھیر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نائلہ کا وجود ٹھنڈا پڑ گیا۔

''میں اپنا بدلہ لینے آئی تھی۔ وہ پورا ہوا اب میں جا رہی ہوں۔ اتنا کہہ کر ہما وہاں سے چلی گئی۔

صائمہ نائلہ سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا، اس رات کو جب انہوں نے روحوں کو بلایا تو ہما کی بھٹکی ہوئی روح وہاں آ پہنچی اپنی موت کا بدلہ لینے کے لئے اور اپنے مقصد میں وہ کامیاب رہی۔

سکتے کی موت

ایس امتیاز احمد-کراچی

سترہ سال پہلے مرنے والی لڑکی اچانک زندہ ہوگئی اور زندگی کے شب و روز میں رواں دواں ہوگئی، اور پھر وہ دوبارہ ستاون سال بعد ایک مرتبہ پھر مرگئی اور چتا کے سپرد ہوگئی، ناقابل یقین مگر حقیقت کھانی میں موجود ھے۔

ایک عجیب وغریب عقل کو اچنبھے میں ڈالتی ناقابل یقین سوچ سے بالاتر حقیقت

کسی مرے ہوئے انسان کا زندہ ہو جانا کسی بھی ڈاکٹر کے لئے قابل یقین نہیں ہوسکتا لیکن محترم سید محمود شاہ من گھڑت قصے سنانے والے نہیں۔ ان کی ہر کہانی سچی ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے طور پر تحقیقات کی تو انکشاف ہوا کہ یہ کالے عمل کے اثرات تھے۔ ایسے واقعات پاکستان میں بھی ہوئے ہیں۔ کالے عمل کا عامل مطلوبہ فرد پر سکتہ طاری کردیتا ہے جسے موت سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد عامل سکتے کی یہ کیفیت خود ختم کرتا ہے یا یہ کیفیت اس وقت کے بعد خود ختم ہوجاتی ہے جو وقت عامل نے مقرر کیا ہو۔

آپ نے ایسا کوئی نہ کوئی واقعہ سنا ہوگا کہ ایک آدمی مرگیا اسے قبر میں اتارنے لگے تو وہ زندہ ہوگیا۔ یہ سکتہ ہوتا ہے جو از خود بھی ختم ہوسکتا ہے اور کالے عمل

سے طاری کیا ہوا سکتہ بھی ہوسکتا ہے۔ بہر حال یہ ایک الگ موضوع ہے جہاں تک اس کہانی کا تعلق ہے یہ سچی ہے۔

ایک سرکاری کام کے سلسلے میں مجھے پٹیالہ جانا پڑا۔ یہ میرا ایک عام سا سفر تھا جسے ایک ہندو نے یادگار بنا دیا۔ گاڑی سبک رفتاری سے اپنی منزل کی جانب گامزن تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ فضا میں خنکی تھی۔ موسم تو اچھا خاصا دلکش تھا مگر میں بور ہو رہا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ ٹرین کا سفر مجھے کبھی اچھا ہی نہیں لگا اور دوسری بات یہ کہ ڈبے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اکثریت ایسے ہندوؤں کی تھی جنھوں نے اپنے ہاتھوں میں تھیلیاں اٹھا رکھی تھیں۔ ان تھیلیوں میں ان کے مرے ہوئے عزیزوں کی ہڈیاں تھیں جنہیں وہ دریائے گنگا میں پھینکنے کے لئے ہردوار جا رہے تھے۔

ہردوار کے بارے میں بتا تا چلوں کہ ہردوار ضلع سہارن پور کا ایک قدیم قصبہ ہے۔ بھارت کے صوبہ اتر پردیش کا یہ قصبہ مذہبی لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ قدیم زمانے میں ہردوار کا نام کپیلا تھا۔ ہندوؤں کا مقدس دریا گنگا اس قصبے کے پاس بہتا ہے۔ وہاں ایک گھاٹ ہے جس کو ''ہری کا چرن'' کہتے ہیں۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ صدیوں پہلے ان کے دیوتا نے یہاں اشنان کیا تھا اور دیوتا کے قدموں کے نشان آج بھی موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قصبہ ہندوؤں کے لئے بہت مقدس ہے۔ تقریباً ہر ہندو کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی ہڈیاں ہردوار جا کر گنگا برد کی جائیں کیونکہ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جس کی ہڈیاں ہردوار جا کر ''ہری کے چرن'' کے پاس دریا میں پھینکی جاتی ہیں۔ اس مردے کی آتما کو سکون ملتا ہے اور اس کے گناہ بخشے جاتے ہیں۔

میرے ساتھ جو شخص بیٹھا تھا اس نے ہڈیوں والی تھیلی اپنے گلے میں لٹکا رکھی تھی۔ اداسی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس نے میرے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ میں بوریت کم کرنے کے لئے کسی ہم سفر کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔

''لالہ جی......!'' میں نے خاموشی کو توڑا......

''آپ ہردوار جا رہے ہیں......؟''

''ہاں جی......!'' اس نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا اور بات ختم کردی۔

اس کے بعد میں نے کوئی بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں دل میں دعا کر رہا تھا کہ ''یا اللہ پٹیالہ جلدی آئے تاکہ میں اس ماتمی ماحول سے نکل کر بھاگ سکوں۔''

یہ سفر میری زندگی میں بدترین سفر ثابت ہو رہا تھا۔

پٹیالہ سے پہلے گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی، ہمارے ڈبے سے ایک دو مسافر اتر گئے ایک مسافر ہمارے ڈبے میں آیا۔ وہ اپنی ہیت کذائی سے مکمل ہندو بنیا نظر آتا تھا۔ قد درمیانہ، ٹانگیں پتلی، مٹکے جیسی توند جو اس کے داخل ہونے سے پہلے ڈبے میں داخل ہوئی۔ اس نے سرسری طور پر تمام ڈبے کا جائزہ لیا۔ اس کی نگاہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر پر پڑی۔

''سکھ دیو......!'' اس نے پکارا...... ''تم کدھر؟'' اور آ کر اس سے لپٹ گیا۔

ان دونوں کے ایک دوسرے سے ملنے کے انداز سے ہی معلوم ہو گیا کہ برسوں کی آشنائی ہے۔

گاڑی نے وسل دی اور ایک جھٹکے سے چل پڑی۔ نو وارد مسافر ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ پھر وہ آپس میں باتیں کرنے لگے جو مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''سکھ دیو......!'' نو وارد مسافر نے کہا......

''تمہاری پتنی کی مرتیو کا سن کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں نے تمہیں خط ڈال دیا تھا مگر کاروباری مصروفیات کی وجہ سے نہ آسکا۔ معاف کرنا۔''

''کاروبار میں اتنا مصروف ہونا بھی درست نہیں کہ عزیزوں کی موت پر بھی انسان نہ آسکے۔'' سکھ دیو نے شکوے کے انداز میں کہا۔

''میں تو اطلاع کو صحیح نہ سمجھا تھا۔'' نو وارد نے کہا۔ ''میں تو سوچ رہا تھا کہ تمہاری طرف سے دوسری اطلاع آئے گی کہ پشپا بھابی مرگئی اور زندہ ہوگئی تھی۔''

اس ہندو کی یہ بات سن کر میں نے غیرارادی طور پر حیرت ناک نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ دونوں بھی سمجھ گئے اور میری طرف متوجہ ہوئے۔

''بابوجی......!'' بوڑھے سکھدیو نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس کی بات سن کر شاید حیران ہوگئے ہیں۔ یہ ٹھیک کہتا ہے، دنیا میں ہرانسان کو ایک دفعہ مرنا ہے مگر میری پتنی دوبار مری ہے۔ ایک دفعہ وہ اس وقت مری جب اس کی عمر سترہ سال تھی اور پھر وہ آج سے چند ماہ قبل ستاون سال کی عمر پاکر مری ہے۔''

میری حیرت کا اندازہ آپ کرسکتے ہیں...... کوئی مردہ زندہ ہوا ہو، نہ کبھی دیکھا نہ سنا تھا۔ ''ایک لمحہ کے لئے مجھے ایسے لگا جیسے یہ دونوں ہندو کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہوں اور پاگل پن میں بہکی بہکی باتیں کررہے ہوں۔ سکھدیو کا پاگل پن تو سمجھ میں آتا تھا...... اس کی بیوی مرگئی تھی۔ بیوی اسے بہت پیاری ہوگی اور اس صدمے کا اثر اس کے دماغ پر پڑا ہوگا مگر دوسرے کا پاگل پن ناقابل فہم تھا۔

''آپ کی پتنی پہلی بار مری تھی تو پھر زندہ کیسے ہوئی......؟'' میں نے سکھدیو سے پوچھا۔

''بابوجی......!'' اس نے جواب دیا۔ ''میری شادی کو چند ماہ ہوئے تھے کہ ایک دن میری پتنی کو قولنج ہوا۔ وہ درد کی شدت کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسی۔ ہم اس کی ارتھی شمشان گھاٹ لے گئے۔ اس کی چتا کو آگ لگادی گئی مگر بھگوان کی کرپا سے۔''

وہ زندہ ہوگئی اور ہم اسے گھر لے آئے۔ پھر ہم نے زندگی کے چالیس سال اکٹھے گزارے۔ اس سے میرا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اب میرے بچے جوان ہیں اور اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ تقریباً تین ماہ قبل میری پتنی کو ٹھنڈ لگ گئی پھر تیز بخار ہوگیا۔ حکیم سے دوائی لی مگر چوتھے دن وہ مرگئی۔ میرے گلے میں آپ جو تھیلی دیکھ رہے ہیں اس میں اس کی ہڈیاں ہیں جنہیں میں ہردوارے لے جارہا ہوں۔''

''لالہ جی!'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ سب ہوا کیسے؟''

''بابوجی......!'' اس نے آہ بھر کر کہا۔ ''یہ بڑی لمبی داستان ہے۔ اگر میں تمہیں سنا بھی دوں تو شاید تمہاری عقل اس حقیقت کو سچ تسلیم نہ کرے۔ مگر یہ حقیقت ہے میرا سارا گاؤں اس کا گواہ ہے۔''

ابھی اس کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ ٹرین ایک جھٹکے سے رک گئی۔ یہ پٹیالہ کا اسٹیشن تھا اور مجھے یہاں اترنا تھا میں نے اپنا سامان اٹھایا اور گاڑی سے اتر گیا۔ ایک تشنگی تھی جو میں محسوس کررہا تھا۔ وہ اپنی کہانی شروع ہی نہ کرتا تو اچھا تھا۔

''موت کے بعد پھر زندگی ایک غیر فطری عمل تھا۔'' مجھے تو یقین تھا کہ اس کی کہانی سچائی سے خالی ہوگی۔

میری تعیناتی جلال پور میں تھی۔ میں نے پٹیالہ میں دو دن گزارے۔ سرکاری کام نپٹایا اور واپس جلال پور چلا گیا۔ کچھ عرصے بعد میرا تبادلہ جلال پور سے مکتسر ہوگیا۔ مکتسر اب انڈیا کے صوبہ پنجاب میں ہے۔ ایک شام میں اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ گشت پر نکلا۔ مکتسر کے مین بازار میں کچھ لوگ جمع تھے۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ دو آدمی آپس میں گتھم گتھا ہیں اور لوگ انہیں چھڑانے کی کوشش کررہے ہیں۔ میں نے جاتے ہی دونوں کو دو دو ڈنڈے لگائے۔ وہ فوراً ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے۔ ایک سپاہی سے کہا۔ ''ان دونوں کو تھانے لے جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد آتا ہوں۔'' سپاہی ان دونوں کو لے کر تھانے چلا گیا اور میں تھوڑی دیر پوچھ گچھ کے لئے وہاں رک گیا۔ ان کے مابین لڑائی کی وجہ یہ تھی کہ دونوں کی بازار میں کپڑے کی دکانیں تھیں ان میں اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ اس روز معاملہ ذرا سنگین ہوگیا تھا۔

دو تین گھنٹے بعد میں جب تھانے میں داخل ہوا تو تھانے میں ان دونوں کے علاوہ ان کے چند عزیز بھی موجود تھے۔ چونکہ کیس معمولی نوعیت کا تھا اس لئے

میں نے یہی مناسب سمجھا کہ دونوں دکانداروں کو ڈانٹ پلا کر ان کی آپس میں صلح کروادی جائے ایسے واقعات تو پولیس والوں کا روز مرہ کا معمول ہوتے ہیں۔ ان دونوں دکانداروں کے سرپرست باہر موجود تھے۔ انہیں بلایا ان میں سے ایک شخص کو دیکھ کر مجھے شک ہوا کہ اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟ کب دیکھا ہے کچھ یاد نہ تھا۔

بہرحال میں نے اس سے پوچھا۔ ''وہ کون ہے؟''

اس نے ایک دکاندار کا نام لے کر کہا۔ ''وہ اس کا پتا ہے۔''

اس نے اپنے بیٹے کی وکالت میں بولنا شروع کردیا۔ ''ہم شریف لوگ ہیں۔ میرا شہر میں کپڑے کا کاروبار ہے۔ عرصہ دراز سے ہم نہایت ایمانداری سے کاروبار کررہے ہیں۔ اس کی تصدیق آپ بازار سے کرسکتے ہیں۔''

میں اس کی باتیں سننے کی بجائے اس کا چہرہ یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ کوئی خاص بات تھی جو اس شخص سے وابستہ تھی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ کر پوچھا۔

''میرا نام سکھد یو ہے، تھانیدار صاحب......!''

اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ ''آپ پورے بازار کے دکانداروں سے پتہ کرلیں جی......!''

مجھے یاد آگیا کہ یہ وہی سکھد یو ہے جو کچھ عرصہ قبل مجھے پٹیالہ جاتے ہوئے ٹرین میں ملا تھا اور وہ ہردوار جارہا تھا۔

ایک رسمی سی کارروائی کے بعد میں نے فریقین میں صلح کرادی اور آئندہ دنگا فساد نہ کرنے کا وعدہ لے لیا۔ تمام لوگوں کو تھانے سے چلے جانے کا کہہ کر سکھد یو کو تھوڑی دیر کے لئے رک جانے کو کہا۔ سب چلے گئے تو میں نے سکھد یو کو ہردوار والا سفر یاد دلایا اور اپنی خفگی کا اظہار کیا۔ اس کی جان میں جان آئی ورنہ مارے خوف کے اس کا برا حال تھا۔ میں نے اسے اگلے دو دن مصروف ہونے کی وجہ سے کہا کہ ''دو دن کے بعد شام کو آنا، تمہاری کہانی تفصیل سے سنوں گا۔''

تیسرے دن شام کو سکھد یو وعدے کے مطابق آگیا، تھوڑی گپ شپ کے بعد اس نے اپنی کہانی شروع کی جو میں اسی کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

''میں جوان ہوا تو میرے پتا نے مجھے اسکول سے اٹھالیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ آٹھویں جماعت تک پڑھ لینا ہی بہت ہے۔ مجھے اپنے پتا کے ساتھ دکان پر بیٹھنا پڑا۔ گاؤں میں ہماری کپڑے کی دکان تھی۔ چار پانچ سال کے مختصر عرصے میں بھگوان کی مہربانی اور ہماری محنت سے ہمارا کاروبار چمک اٹھا پھر ہم نے ایک دکان مکتسر کے مین بازار میں بھی کھول لی۔ گاؤں والی دکان پر پتا جی بیٹھتے تھے اور شہر والی دکان میں نے سنبھال لی۔ اب میرے ماتا پتا میرے بیاہ کی فکر کرنے لگے۔ میں بیاہ کے بارے میں سنجیدہ نہ تھا۔ سچ پوچھیں تو میں نے کاروبار میں اپنے آپ کو اتنا الجھا رکھا تھا کہ سوائے روپیہ کمانے کے مجھے کوئی اور سوچ ہی نہ تھی۔ میری ماں میرے سر پر سہرا سجانا چاہتی تھی لیکن میں بیاہ سے دامن بچا کر اپنے کاروبار کو بڑھانے اور پھیلانے کی کوشش میں تھا۔ یہی میری ضد تھی جس کے آگے میرے گھر والے بے بس تھے۔

ایک دن ایک لڑکی اپنی نوکرانی کے ہمراہ میری دکان پر آئی۔ میرا واسطہ ہر طرح کے گاہکوں سے رہتا تھا۔ مگر میں نے اس لڑکی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بہت زیادہ خوبصورت نہ تھی۔ رنگ بھی سانولا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایسی کشش تھی بلکہ جادو کا سا اثر تھا۔ میں اس کو بیان نہیں کرسکتا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے یہ لڑکی نہیں دیوی ہے۔ اس کی آنکھوں کی کشش مجھے مسحور کررہی تھی۔ شاید میں ہونق لگ رہا تھا۔ وہ مسکرادی اور بولی۔ ''آپ کے پاس بوسکی ہوگی؟''

آپ جانتے ہیں کہ ہماری نوجوانی کے زمانے بوسکی بہت مہنگا اور مشہور کپڑا ہوا کرتا تھا۔ میں نے فوراً بوسکی کے تھان نکالے اور اس کے آگے ڈھیر کردیئے۔ اس نے دو سوٹ خریدے اور چلی گئی۔

''وہ چلی گئی مگر مجھے لگا کہ میرا سب کچھ اپنے ساتھ

لے گئی ہو۔ میں آج تک حیران ہوں کہ مجھ جیسے مکمل کاروباری شخص پر اس کے عشق کا بھوت کیسے سوار ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا جادو تھا جس نے میرے اندر کے نوجوان سکھد یو کو جگادیا۔ اب تو کسی پہلو چین نہ تھا۔

اس کو دیکھنے کی خواہش من میں مچلنے لگی۔ مگر یہ کیسے ممکن ہو؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ گھر گیا تو طبیعت بوجھل بوجھل تھی۔ وہ رات صحیح طریقے سے میں سو بھی نہ سکا، صبح صبح نہا کر مندر بھی گیا۔ بھگوان سے اس کے ملن کی پرارتھنا کی اور یہ امید لئے دکان پر آیا کہ شاید وہ دیوی پھر آجائے مگر یہ ممکن نہ تھا۔ ابھی تو کل کپڑا لے کر گئی تھی۔

کئی دنوں کے مسلسل انتظار کے بعد میری دکان کے بھاگ جاگے۔ اس دفعہ وہ اپنی ایک سہیلی کے ہمراہ آئی۔ میں نے اپنے ہوش وحواس قائم رکھے۔ میرے چہرے پر ایک انجانی سی مسرت آگئی۔ ایسے لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔

وہ بول پڑی...... ''اس دن تم نے غلطی سے کپڑا بہت ستا دے دیا تھا۔ مجھے تو شاید پتہ بھی نہ چلتا میری اس سہیلی پریم کور کو جب میں نے سوٹ دکھائے اور قیمت بتائی تو یہ حیران رہ گئی۔ اس نے یہی کپڑا چند دن گزرے کہ خریدا تھا۔ آج پھر ہم نے بازار سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ اس کپڑے کا ریٹ واقعی زیادہ تھا۔ لگتا ہے تم سے بھول ہوگئی ہے۔'' یہ ساری باتیں وہ ایک ساتھ کہہ گئی۔

''دیوی جی! آپ نے اور کپڑا لینا ہے تو لے جائیں۔ اس سے بھی آدھے ریٹ پر دوں گا۔''

یہ سنتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ ''بکواس بند کرو تم نے مجھے کیا سمجھ لیا ہے۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں جو کپڑے کے ٹکڑے پر بک جاتی ہیں۔'' اس نے اپنا بٹوا کھولا۔ باقی رقم میرے منہ پر ماری اور بکتی جھکتی، غصے میں پیر پٹختی دکان سے چلی گئی۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہوگیا اور میں اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں کھڑا سوچتا رہا کہ میں نے آخر کون سی خطا کی ہے۔ میں غلط کردار کا آدمی نہ تھا۔ یہ سوچ کر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

منجو میرا ایک جگری یار تھا۔ اکثر شام کو میری دکان پر آتا تھا۔ شام کو منجو آیا تو میں نے اسے پوری رام کہانی سنا ڈالی۔ وہ جگت استاد تھا۔ کہنے لگا۔ ''سکھد یو اپنا کاروبار آرام سے کرو۔ لڑکیوں کے چکر میں نہ پڑو۔ اپنا کاروبار بھی برباد کرو گے اور بدنامی مفت میں ملے گی۔''

مگر میری حالت میرے قابو سے باہر تھی۔ میں نے منجو کی بہت منت سماجت کی پھر اس نے میری مدد کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ شاید وہ بھی معاملے کی سنگینی کو سمجھ چکا تھا۔ اس کی دکان پر ایک بڑھیا آیا کرتی تھی جس کی لڑکیاں سوزن کاری میں مہارت رکھتی تھیں۔ وہ ان کے کاڑھے ہوئے کپڑے منجو کی دکان پر لاتی تھی۔ اس کا شہر کے کئی گھروں میں آنا جانا تھا۔ منجو نے اس سے رازداری کا وعدہ لے کر بات کی۔

''شاہ صاحب! وہ بڑھیا بڑی تیز نکلی۔ اس نے لڑکی کا مکمل پتہ معلوم کرلیا۔ وہ لڑکی سیٹھ بھگوان داس کی سب سے بڑی بیٹی پشپا تھی۔ پشپا سے چھوٹی تین بہنیں اور تھیں۔ بھائی کوئی نہ تھا۔ بڑھیا کے بقول پشپا پاکیزہ اور نیک لڑکی تھی۔'' میں نے بڑھیا کو اس کی توقع سے بڑھ کر انعام سے نوازا، بڑھیا کی خواہش تھی کہ وہ میرے اور پشپا کے درمیان تعلق پیدا کردے گی مگر میں ہر قدم پھونک کر رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے بڑھیا کو اس کام سے روک دیا۔

ایک دن میں نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ ''میں سیٹھ بھگوان داس کی بڑی بیٹی پشپا سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوسکا تو میں ساری عمر بیاہ نہ کروں گا۔''

''بیاہ کا سن کر میری ماں بہت خوش ہوئی۔ اگلے ہی دن میرے ماں باپ سیٹھ بھگوان داس کی حویلی میں میرے رشتے کے لئے گئے۔ میں اس کام کو بہت دشوار سمجھ رہا تھا۔ اتفاق سے سیٹھ بھگوان داس میرے باپ کا پرانا جاننے والا نکلا اور پلک جھپکتے میری اور پشپا کی بات پکی ہوگئی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد میری شادی پشپا سے ہوگئی۔

شادی سے پہلے اسے میرے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ شادی کے بعد جب اسے پوری کہانی کا علم ہوا تو وہ میری محبت کی قائل ہوگئی۔

ہماری شادی کو چند ہی ماہ گزرے تھے۔ پوہ کا مہینہ تھا۔ سردی بہت تھی۔ اس دن میں گھر پر ہی تھا، باہر دروازے پر ایک جوگی نے صدا لگائی۔ دروازہ کھلا تھا اور جوگی کشکول لئے کھڑا تھا۔ میری ماں نے پشپا سے کہا کہ ''جا بیٹی! جوگی بادشاہ کو اپنے ہاتھ سے کچھ دے آؤ۔''

پشپا نے کچھ پیسے لئے اور جوگی کو دینے گئی۔ جوگی نے اپنا کشکول آگے کرنے کی بجائے پیچھے کرلیا اور نگاہیں پشپا پر مرکوز کردیں۔ اتنے میں میری ماں بولی۔ ''جوگی بادشاہ، نئی دلہن ہے۔ اس کو دعا دے دو۔''

جوگی بولا۔ ''دعا رحم کی یا قہر کی؟''

میری ماں دوڑی گئی اور کہا۔ ''مہاراج! رحم کی دعا کرو۔''

میں صحن میں بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ جوگی نے اپنے کشکول سے گندم کے چند دانے اٹھا کر پشپا کے منہ پر مارے اور بغیر کچھ کہے چلا گیا۔ میری ماں گھبرا گئی میں نے اٹھ کر ماں کو تسلی دی مگر وہ کہہ رہی تھی کہ ''ایسے لگتا ہے جوگی ہم سے ناراض ہوگیا ہے۔''

جوگی کے جانے کے تھوڑی دیر بعد پشپا کے پیٹ میں بائیں جانب درد شروع ہوگیا جو بڑھ گیا۔ میں دوڑ کر گاؤں کے حکیم کے گھر گیا۔ حکیم صاحب بہت ہی ہمدرد اور نیک انسان تھے فوراً میرے ہمراہ آگئے۔ پشپا درد سے تڑپ رہی تھی۔ حکیم صاحب نے ایک سفوف پانی میں گھول کر پشپا کے منہ میں ڈالا جس سے درد کی شدت میں کمی آگئی مگر وہ بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ مجھے پتہ نہیں کہ حکیم صاحب کی دوائی کا اثر تھا یا وہ درد کو برداشت کرتے کرتے تھک گئی تھی۔

حکیم صاحب نے مجھ سے کہا ''اپنی بیوی کو شہر لے جاؤ وہاں اسپتال میں ایک انگریز ڈاکٹر ہے جو بہت مشہور ہے۔ اس سے اس کا علاج کرواؤ۔''

میں نے فوراً ایک بیل گاڑی کا انتظام کیا، پشپا کو اس میں ڈالا اور شہر کو روانہ ہوئے۔ ابھی شہر کچھ دور تھا کہ پشپا نے آنکھیں کھولیں۔ ایک نظر بھر کر دیکھا اور آنکھیں موند لیں۔ اس کے ساتھ ہی سانس کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ میری دنیا اندھیر ہوگئی۔

وہیں سے بیل گاڑی واپس موڑی۔ میری حالت غیر ہو رہی تھی۔

بہرحال موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ پشپا کو میں نے بڑی چاہت سے حاصل کیا تھا۔ محبت کی جیتی ہوئی بازی میں اتنی جلدی ہار جاؤں گا اس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

میں اس شام کو کبھی نہیں بھول سکتا جب پشپا کی ارتھی شمشان بھومی لے جائی جا رہی تھی۔ پھر میری پشپا کو بہت ساری خشک لکڑیوں میں دفن کردیا گیا۔ کئی کنستر دیسی گھی لکڑیوں پر انڈیل دیا گیا۔ شام گہری ہوگئی۔ سردی زیادہ تھی اور آسمان گہرے کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میرے باپ نے مجھے چتا کو آگ لگانے کے لئے کہا۔ مذہبی فرض کی بجا آوری کی خاطر میں نے اپنی محبوب پتنی کی چتا کو آگ لگادی۔ اب پشپا کی چتا بڑے دھیمے انداز میں جل رہی تھی حالانکہ اس پر خاصی مقدار میں گھی ڈالا گیا تھا۔ سردی اور تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ چتا کی آگ نے تھوڑی سی جگہ کو روشن کر رکھا تھا۔ ورنہ ہر سو گھپ اندھیرا تھا۔ آہستہ آہستہ سارے رشتہ دار کھسکنے لگے۔ پتا نے مجھے کہا کہ ''تم بھی چلو صبح آ کر پھول چن لیں گے۔''

شاہ صاحب! ہم ہندو لوگ مردے کی جلی ہوئی ہڈیوں کو پھول کہتے ہیں۔ میرا دل وہاں سے جانے کو نہ کر رہا تھا۔ پتا سے کہا۔ ''آپ لوگ چلیں، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' وہ چلے گئے۔ میں تنہا اس ہیبت ناک مقام پر موجود رہا۔ میرے سامنے پشپا کی چتا جل رہی تھی۔ نہ جانے کتنی چتائیں اس جگہ جلی ہوں گی۔ میں نے اپنی زندگی میں کئی چتائیں جلتی دیکھی تھیں۔ مگر میری پتنی کی چتا اس طرح نہیں جل رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے آگ میری پتنی کو جلانا نہیں چاہتی تھی۔

تیز ہوا سے جھاڑیوں میں جو سرسراہٹ پیدا ہوتی اس سے خوف آتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے گردونواح میں بہت ساری آتمائیں بے چین پھر رہی ہوں۔ میرا جسم سردی سے سن ہو رہا تھا۔ میں ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھا رو رہا تھا۔ شدید سردی کے علاوہ جو دوسری پریشانی مجھے لاحق تھی وہ یہ کہ چتا کی آگ ہوا کے جھونکوں سے بھڑکنے کی بجائے بجھتی جا رہی تھی۔

میں واپس جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ میرے سامنے کی جھاڑیوں میں مجھے ایک سایہ دکھائی دیا۔ میں نے اپنی نگاہیں اس سائے پر مرکوز کر دیں۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میری حالت یہ تھی کہ اگر میں اپنی جگہ سے معمولی سی حرکت کرنا بھی چاہتا تو نہ کر سکتا تھا۔

وہ سایہ آہستہ آہستہ چتا کی جانب بڑھنے لگا۔ جونہی وہ چتا کے قریب پہنچا تو چتا کی آگ کی روشنی میں اسے دیکھا۔ ایسے لگا جیسے میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا ہو۔ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ یہ وہی جوگی تھا جو دن کو ہمارے گھر آیا تھا۔ اس نے پشپا کے چہرے پر گندم کے دانے مارے تھے۔ وہ پوری فلم میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔

جوگی نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر دھیمی آواز میں کوئی منتر پڑھنا شروع کیا۔ کچھ دیر منتر پڑھنے کے بعد اس نے چتا کے گرد آہستہ آہستہ چکر لگانے شروع کر دیئے۔ اس کے کشکول میں کچھ دانے تھے جن کو وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے چتا پر پھینکتا جا رہا تھا۔ چتا کی آگ پہلے بھی صحیح طریقے سے نہیں جل رہی تھی۔ اب جوگی کے منتر نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اب آگ مکمل طور پر بجھ چکی تھی۔ جوگی کے منہ سے غیر مبہم سی آوازیں مسلسل نکل رہی تھیں۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ میرے دل میں خوف کی شدت میں بھی کمی آ رہی تھی۔

جب آگ اچھی طرح بجھ گئی تو جوگی نے اپنا کشکول زمین پر رکھ دیا اور چتا کی لکڑیوں کو ہٹانا شروع کر دیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ پشپا کی لاش تک آگ پہنچی تھی یا نہیں کیونکہ اندھیرے میں نظر نہ آتا تھا۔ اس نے پشپا کی لاش کو اٹھا کر چتا کے ساتھ زمین پر رکھ دیا اور خود لاش کے سر کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر وہی غیر مبہم سی آوازیں اس کے منہ سے نکلنے لگیں۔ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر جوگی نے اٹھ کر پانی کی طرح کا کوئی محلول پشپا کی لاش پر پھینکنا شروع کیا۔

شاہ صاحب! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ پھر میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جس کو میں مرتے دم تک فراموش نہ کر سکوں گا۔

میرے سامنے پڑی ہوئی پشپا کی لاش نے حرکت کی۔ پھر جوگی نے اسے ایسے اٹھایا جیسے کوئی کسی کو سوتے میں جگاتا ہے۔ پشپا اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرے جسم میں خون جم گیا ہو۔

میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رک گئی۔ میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ یہ کیا ہے کہ جوگی ایک طرف چل پڑا اور اس کے پیچھے پیچھے پشپا اس طرح چلنے لگی جیسے کوئی سدھایا ہوا جانور اپنے مالک کے پیچھے چلتا ہے۔

کچھ دیر تو میں وہاں شمشان بھومی میں بیٹھا رہا۔ میرے ہوش ٹھکانے آئے تو میں ان کے پیچھے چل پڑا۔ شمشان بھومی سے تھوڑی دور راستے کے ساتھ چند مسلمان کسانوں کے گھر تھے۔ ان لوگوں کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ راستے کے بالکل ساتھ والا گھر شمشاد خان کا تھا۔ جب جوگی ان مسلمان کسانوں کے گھروں کے پاس سے گزرنے لگا تو میری نگاہ ایک کسان پڑی جو اس بلا کی سردی میں لالٹین لے کر مویشیوں کے باڑے میں نہ جانے کیا کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر کوئی قوت بیدار ہو گئی ہو۔ میں نے پورے زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ جتنا شور مچا سکتا تھا مچایا اور ساتھ ہی جست لگا کر پشپا کو پکڑ لیا۔

جونہی میں نے پشپا کو چھوا تو وہ ایک بے جان مجسمے کی طرح زمین پر گر پڑی۔ چند کسان لاٹھیاں لے

کر دوڑتے ہوئے میری طرف آئے۔ شمشاد خان آگے آگے تھا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے گھر میں چارپائی پر پڑا تھا۔ حکیم امجد علی میرے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ رشتہ دار ہمارے گھر میں جمع تھے۔ سب سے پہلے میں نے پشپا کے متعلق پوچھا۔ پتہ چلا کہ وہ گھر میں ہے اور ہوش میں آچکی ہے۔

شمشان بھومی کے باہر جب میں چیختے چیختے بے ہوش ہوگیا تھا تو شمشاد خان اور اس کے ساتھیوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ مجھے اور پشپا کو اٹھا کر ہمارے گھر لے آئے تھے۔ جہاں میں اور پشپا کچھ گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد ہوش میں آگئے تھے۔ اس جوگی کا کسی کو پتہ نہ چلا کہ کدھر غائب ہوگیا تھا۔

جب میرے اوسان بحال ہوئے تو میں نے تمام حالات تفصیل سے بیان کیے۔ تمام لوگ حیران رہ گئے۔ اگر وہ میری کہانی پر یقین نہ بھی کرتے تو کیا کرتے کیونکہ ان میں سے بہت سارے لوگ ایسے موجود تھے جن کے سامنے پشپا مری تھی اور انہوں نے اس کی آخری رسومات میں شرکت کی تھی۔

شاہ صاحب! آپ یہ سن کر اور زیادہ حیران ہوں گے کہ پشپا نے اس کہانی پر بالکل یقین نہ کیا۔ وہ کہنے لگی کہ ''اسے اتنا ہی یاد ہے کہ جوگی ہمارے دروازے پر آیا تو وہ اس کے پاس گئی۔ جوگی نے اپنی نگاہیں اس پر گاڑ دیں۔ اس کو اپنے اندر بجلیاں سی کوندتی محسوس ہوئیں پھر جوگی نے گندم کے چند دانے کشکول سے اٹھا کر اس کے منہ پر مارے اور وہ چلا گیا۔ اس کے بعد پشپا کے پیٹ میں درد اٹھا جو بڑھتا ہی گیا۔'' پشپا نے کہا کہ ''اسے یہ بھی یاد ہے کہ حکیم صاحب نے اسے دوائی دی تھی اور پھر وہ سوگئی یا بے ہوش ہوگئی تھی۔'' پشپا نے کہا۔ ''اسے ہوش آیا تو وہ گھر میں اپنی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اسے کچھ معلوم نہیں۔''

آپ یقین کریں! یہ واقعہ بالکل سچا تھا اور اس کے بہت سارے عینی گواہ اب بھی زندہ ہیں۔ آپ پولیس آفیسر ہیں۔ ان کے نام میں بتا دیتا ہوں۔ ان کو بلوا کر تصدیق کرلیں۔''

''پشپا اور تمہارا پھر کتنے عرصے کا ساتھ رہا؟'' میں نے سکھدیو سے پوچھا۔

''ہم دونوں تقریباً چالیس برس اکٹھے رہے۔''

چند لمحے اس نے خلاء میں گھورنے کے بعد کہا۔ ''اس کے بطن سے میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا۔ ان چالیس برسوں میں، میں نے کئی بار اس سے اس واقعہ کے بارے میں پوچھا مگر ہر بار اس کا یہی جواب تھا۔ ''مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' مرنے سے تین چار دن قبل اس کو ٹھنڈ لگ گئی اور تیز بخار ہوگیا۔ یہی بخار اس کی موت کا باعث بن گیا۔

''اس کی آخری رسومات میں شرکت کرنے والے کئی لوگ ایسے بھی تھے جو چالیس برس پہلے بھی پشپا کی ان رسومات میں شرکت کر چکے تھے۔ اس بار بھی چتا کو میں نے آگ لگائی۔ اب کوئی غیر معمولی واقعہ نہ ہوا آگ نے پشپا کو جلا کر راکھ کر دیا۔''

سکھدیو نے مزید بتایا کہ ''پشپا کی خواہش تھی کہ اس کے پھول ہردوارے جا کر گنگا میں بہائے جائیں۔'' چنانچہ وہ اس کے پھول (ہڈیاں) لے جا رہا تھا تو مجھ سے ٹرین میں اس کی ملاقات ہوئی۔

بوڑھے سکھدیو کی یہ حیران کن کہانی میں نے سن لی اور وہ چلا گیا۔ میں خاصی دیر سوچتا رہا، کیا ایسا ممکن ہے؟ یہ کہانی میں کبھی فراموش نہ کرسکا۔ ایک دفعہ سکھدیو کے گاؤں کا ایک جہاندیدہ شخص مجھے مل گیا۔ اس کہانی کے متعلق اس سے پوچھا۔

''تھانیدار صاحب!'' اس شخص نے کہا۔ ''واقعی ہمارے گاؤں میں یہ واقعہ ہوا تھا۔ سکھدیو نامی شخص کی پتنی کو سکتہ ہوگیا تھا۔ لوگ سمجھے وہ مرگئی ہے۔ اس کی چتا کو آگ لگا دی گئی پھر ایک جوگی نے منتر پڑھا اور وہ پھر ہوش میں آگئی۔''

خوف کا شکار

خلیل جبار۔حیدر آباد

آدھی رات کے وقت کمرے میں ایک گرجدار کھردری آواز ابھری، اس مکان کو فوراً خالی کردو، ورنہ مرنے کے لئے تیار ہوجائو، آواز اتنی دھشت ناک تھی کہ سننے والوں کے پسینے چھوٹ گئے کہ اتنے میں

حقیقت سے فرار انسان کو نا قابل اذیت سے دوچار کر دیتا ہے، کہانی پڑھ کر تو دیکھیں

جب سے روی کی شادی ہوئی تھی، وہ ایک عجیب خوف کا شکار تھی۔ جب تک اس کا شوہر عمران اس کے ساتھ تھا اسے اپنے کمرے سے اتنا خوف نہیں آتا تھا۔ جتنا اب آنے لگا تھا۔ عمران جس کمپنی میں کام کرتا تھا۔ اس کمپنی نے اسے دو سال کے لئے بیرون ملک بھیج دیا۔ وہ بھی بہت خوش تھا۔ اس طرح عمران کو زیادہ رقم کمانے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ دو سال کا معاہدہ پورا ہوجانے پر اسے واپس اپنے ملک آ جانا تھا اور دو سال میں وہ اتنی دولت کمانے میں کامیاب ہوجاتا کہ اپنا ذاتی گھر خرید لے۔

عمران کے والد شرف الدین کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اپنا ذاتی مکان خرید کر اس میں اپنی زندگی گزاریں مگر ساری زندگی ان کی کرائے کے مکانات میں ہی گزری تھی۔ زندگی میں انہوں نے یہ اچھا کام کیا تھا کہ

اپنے بیٹے عمران کو پڑھا لکھا دیا تھا۔ اس کی اعلیٰ تعلیم کے سبب ہی پرائیویٹ کمپنی میں اچھے عہدے کی نوکری مل گئی تھی، شرف الدین اچھی تعلیم نہ ہونے کے سبب ساری زندگی محنت مزدوری کرتے رہے، ایک مزدور آدمی گھر کا چولہا جلالے وہی بڑی بات ہوتی ہے۔ ایسے میں وہ ذاتی مکان کیسے خرید سکتا ہے۔ جس مکان میں وہ رہ رہے تھے یہ ان کی زندگی کا آخری مکان تھا۔ جو انہوں نے بدلا تھا۔ عمران کی شادی کے چھ ماہ بعد کی زندگی نے شرفو کو مہلت نہ دی اور ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

جس مکان میں رومی رہتی تھی وہ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے میں اس کی ساس رحمت بی بی سوتی تھیں جبکہ دوسرے کمرے میں رومی خود سوتی تھی۔ وہ رات کو جب کمرے میں سوتی اسے محسوس ہوتا کہ جیسے کمرے میں کوئی ہے۔

آج بھی وہ تھکی ہاری بستر پر لیٹی تو فوراً ہی نیند آ گئی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک انتہائی بدصورت آدمی گھوڑے پر سوار ہے اور رومی اسے دیکھ کر بھاگ رہی ہے۔ وہ اپنی تیز دھار تلوار سے اسے ہلاک کر دینا چاہتا تھا۔ گھوڑا بہت تیز دوڑ رہا تھا لیکن پھر بھی رومی کے قریب نہیں آ پا رہا تھا۔

اچانک رومی کو ٹھوکر لگی اور وہ زمین پر گر پڑی۔ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے شخص نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا اور تلوار سمیت گھوڑے سے کود پڑا۔ رومی اسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر چیخ پڑی۔ اسے رومی کی چیخ کی کیا پرواہ تھی۔ اس آدمی نے ایک بھرپور وار سے اس کی گردن جسم سے جدا کر دی اور اس نے بالوں سے رومی کے تن سے جدا سر کو فضا میں بلند کیا اور غور سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کا چہرہ انتہائی مکروہ نظر آ رہا تھا۔

ایک جھٹکے سے رومی کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا پورا بدن پسینے سے نہا رہا تھا۔ ابھی وہ چارپائی سے اٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے بدن پر کوئی بھاری شے رینگ رہی ہو۔ اس کے وزن سے رومی کا سانس گھٹنے لگا تھا۔ بڑی مشکل سے اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ رومی کے منہ سے چیخ کا نکلنا تھا کہ وہ شے اس کے بدن پر سے اپنا وزن کم کرتی چلی گئی۔ رومی نے جیسے ہی محسوس کیا اس کے بدن سے وزن کم ہو گیا ہے وہ فوراً بستر سے اٹھی اور اپنی ساس رحمت بی بی کے کمرے کی طرف لپکی۔ اس کی بے ترتیب سانسوں اور گھبراہٹ کو دیکھ کر ساس بھی گھبرا گئی۔

”کیا بات ہے۔ بہو خیریت ہے نا تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“

”وہ...... وہ...... وہ...... آ...... امی...... وا...... وہاں......“

”ہاں، ہاں بولو کیا بات ہے۔ وہ کیا ہے لیکن پہلے ٹھہرو تم یہ پانی پی لو تاکہ تمہاری گھبراہٹ دور ہو۔“ رحمت بی بی نے ایک گلاس رومی کی طرف بڑھایا۔

رومی نے جیسے تیسے کر کے پانی کا گلاس پی لیا۔ چند لمحوں میں وہ اس قابل ہو گئی کہ ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات بیان کر سکے جب اس نے اپنے ساتھ ہونے والے واقعہ کا ذکر کیا۔ رحمت بی بی مسکرا دیں۔

”بس اتنی سی بات...... خواب دیکھ کر اتنا خوف زدہ ہو گئی ارے بھئی ایسے خواب کبھی کبھار آ جاتے ہیں اس میں اتنا گھبرانے کی کون سی بات ہے۔“

”میں جب نیند سے بیدار ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ کوئی بھاری شے میرے جسم پر چل رہی ہے۔ میرے چیخنے پر وہ شے میرا جسم چھوڑ کر چلی گئی۔“ رومی نے بتایا۔

”یہ تمہارا وہم ہے ایسا کس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی بھاری شے تمہارے جسم پر چلے اور تمہیں کچھ نہ ہو۔“ رحمت بی بی نے کہا۔

”میری بات کو جھوٹ نہ سمجھیں یہ حقیقت ہے۔“ رومی روہانسی ہوتے ہوئے بولی۔

”اچھا تم کیا چاہ رہی ہو وہ بتا دو۔“

”میں اس کمرے میں اب نہیں سوؤں گی۔“ رومی نے فیصلہ سنا دیا۔

”بس اتنی سی بات، ٹھیک ہے تم مت سونا۔“

”ہاں بس یہی بات ہے۔“

''ٹھیک ہے کل میں تمہارا خوف دور کرنے کے لئے اکیلی اس کمرے میں سوؤں گی۔''

''ایسا نہیں کریں، کہیں وہ شے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچادے۔''

''تم بالکل بے فکر رہو مجھے ایسا کچھ نہیں ہوگا جو تم سوچ رہی ہو۔'' رحمت بی بی نے رومی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

دوسری رات آنے پر رومی کے بار بار منع کرنے پر بھی رحمت بی بی اس کمرے میں سوگئیں۔ وہ رومی کو مطمئن کرنے کو کمرے میں بظاہر سو رہی تھیں لیکن وہ جاگ رہی تھیں۔ اندر سے وہ بھی خوف زدہ تھیں کہ کہیں واقعی اس کمرے میں آسیب نہ ہو کیونکہ آسیب ہی مختلف شکل میں آکر تنگ کرتے ہیں۔

آدھی رات بیت چکی تھی ان کی آنکھوں سے نیند دور تھی۔ بار بار کروٹیں بدل بدل کر نیند کو لانے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو رہی تھیں۔ پھر نجانے کب انہیں نیند آگئی۔ ایک خوفناک شکل کا کالا بلا تیزی سے اس کی جانب آیا۔ اسے دیکھ کر رحمت بی بی کی گھگھی بندھ گئی۔ بے اختیار ان کا دل چاہا کہ وہ بستر سے اٹھ کر بھاگ جائیں مگر ہمت ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ کالا بلا چھلانگ لگا کر ان کے پیٹ پر سوار ہوگیا۔ وہ بہت وزنی تھا۔ انہیں اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھیں باہر کو ابلنے لگیں۔ کالا بلا اپنے پچھلے دونوں پاؤں پر کھڑا ہوگیا۔ آگے کے دونوں پاؤں کے پنجے اس نے رحمت بی بی کے سامنے لہرائے ان پنجوں میں تیز دھار ناخن چمک رہے تھے۔ وہ حیرت سے ان ناخنوں کو دیکھنے لگیں۔ کالا بلا تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے وہ ناخن رحمت بی بی کے پیٹ میں داخل کر کے پیٹ پھاڑ ڈالا۔ پیٹ پھٹنے کی دیر تھی کہ اس میں سے سرخ خون تیزی سے بہنے لگا۔ بڑی بی میں نجانے کہاں سے اتنی ہمت آگئی تھی کہ انہوں نے زور سے کالے بلے کو دھکا دیا اور خود اپنے پیٹ کو پکڑ کر چیختی ہوئی تیزی سے کمرے سے باہر دوڑ پڑیں ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوگیا۔

''کیا ہوا امی؟'' رومی نے کمرے سے باہر آتے ہوئے پوچھا۔

''ارے کمبخت بلے نے میرا پیٹ پھاڑ دیا ہے۔''

''لیکن پیٹ تو ٹھیک لگ رہا ہے۔''

''ارے ہاں واقعی میرا پیٹ بالکل ٹھیک ہے مگر کمرے میں مجھے ایسا لگا تھا کہ اس منحوس کالے بلے نے پیٹ پھاڑ دیا ہے اور سرخ خون بھی تیزی سے بہہ رہا ہے۔''

''میں نے کہا تھا نا کہ اس کمرے میں کچھ ہے۔'' رومی نے کہا۔

''ہاں بیٹی تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ تمہارا کمرہ آسیبی ہے عمران بھی ملک سے باہر چلا گیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا کیا کریں۔''

''کہیں ہمیں یہ آسیب نقصان نہ پہنچادے۔'' رومی نے کہا۔

''ہاں تنگ کرنا تو شروع کر دیا ہے۔ کسی دن نقصان بھی پہنچا سکتا ہے ہمیں آسیب سے بچنے کے لئے کچھ نہ کرنا پڑے گا۔'' رحمت بی بی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ جیسے انہیں کچھ یاد آگیا اور پھر وہ بولیں۔ ''آؤ بیٹی تمہارے کمرے میں چل کر کچھ سوچتے ہیں۔'' رحمت بی بی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''امی کیا بات ہے مجھے آپ زیادہ گھبرائی ہوئی لگ رہی ہیں۔''

''ہاں ایسی ہی بات ہے مجھے کچھ یاد آگیا ہے۔''

''کیا یاد آگیا ہے؟'' رومی نے پوچھا۔

''آج سے پندرہ سال پہلے میں جہاں رہتی تھی۔ وہاں ہمارے پڑوس میں بھی ایسے ہی واقعات رونما ہونے لگے تھے۔''

''کیسے واقعات؟''

''اس طرح کے جیسے اب ہمارے ساتھ ہو رہے ہیں۔ اس گھر کے لوگوں کو ڈرایا جانے لگا تھا۔ جب انہوں نے اس کا نوٹس نہیں لیا تو پھر ایک دن اس گھر میں

جو آسیب تھا وہ ان کی جوان لڑکی کے جسم میں داخل ہوگیا۔ اور اس نے گھر میں توڑ پھوڑ کرنا اپنا معمول بنالیا تھا۔ کبھی وہ لڑکی گھر کے لڑکوں کو مارتی، کبھی انہیں دبوچ کر ان کی پیٹھ پر سوار ہو جاتی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اتنی طاقتور ہوجاتی تھی کہ کسی کے قابو میں نہیں آتی تھی، کئی کئی لوگ مل کر اس لڑکی کو قابو کرتے تھے۔ اُسے رسیوں میں جکڑ دیتے تھے۔ تب کہیں جا کر قابو میں آتی تھی۔

''پھر کیا ہوا؟''

''ان لوگوں نے کسی مولوی سے لڑکی کا علاج کرایا۔ لڑکی کا علاج ہو جانے پر وہ گھر خالی کر کے چلے گئے۔''

''جب لڑکی کا علاج ہوگیا تھا پھر وہ گھر چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔'' رومی نے حیرت سے پوچھا۔

''اس لئے کہ مولوی صاحب نے بتایا تھا کہ انہوں نے لڑکی کا علاج ضرور کردیا ہے مگر اس گھر میں جو مخلوق رہتی ہے وہ پھر کسی اور کے جسم میں داخل ہوکر اس لڑکی سے زیادہ تمہیں پریشان کرے گی اس لئے ان لوگوں کا گھر خالی کردینا ہی ان کے حق میں بہتر ہے اور آج تک وہ گھر انسانوں سے آباد نہیں ہوسکا۔ ابھی تک خالی ہے۔''

''تو کیا ہمیں بھی یہ گھر خالی کرنا پڑے گا۔'' رومی سوچ میں پڑ گئی۔

''تم پریشان مت ہو، مجھے کچھ سوچنے دو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ خاموش ہوگئی تھیں۔

صبح ناشتے سے فارغ ہوکر وہ رومی کے پاس آئیں۔

''رومی بیٹی میں عمران کے ماموں کے پاس جارہی ہوں۔''

''امی مجھے اکیلے میں ڈر لگے گا۔'' رومی نے کہا۔

''تم ڈرو نہیں، اگر ڈر محسوس ہو تو برابر والے گھر سے لطیفن آپا کو بلالینا۔'' وہ بولیں۔

رومی اچھا کہہ کر خاموش ہوگئی۔ رحمت بی بی کے جانے پر رومی دوپہر کے کھانے کی تیاری میں ایسی مصروف ہوئی کہ اسے ڈر خوف کا احساس ہی نہیں ہوا۔

وہ اس وقت چونکی جب ساس گھر میں داخل ہوئیں۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

''ہاں بھئی میرے جانے پر کچھ ہوا تو نہیں۔''

''امی جان مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ دن میں ویسے بھی ڈر کہاں لگتا ہے، رات کی تاریکی میں خوف محسوس ہوتا ہے۔ کیا ماموں سے ملاقات ہوئی؟''

''ہاں بھئی ملاقات ہوگئی اور ملاقات کیسے نہ ہوتی۔ سارا دن وہ گھر میں بنائے ہوئے آستانے میں آنے والے لوگوں کے بچوں پر جھاڑ پھونک کرتے رہتے ہیں، یہی ان کی مصروفیت اور یہی ان کا روزگار ہے۔'' رحمت بی بی نے بتایا۔

''ماموں نے کیا بتایا۔''

''انہوں نے یہی کہا ہے کہ ہمیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے وہ خود کسی دن گھر پر آئیں گے اور دیکھیں کہ آسیب ہمیں کیوں تنگ کررہے ہیں۔ یہ چار تعویذ جلانے کے لئے دیئے ہیں روزانہ ایک تعویذ جلانا ہوگا۔'' رحمت بی بی نے بتایا۔

''ماموں سے کہیں جلدی آجائیں، خدانخواستہ کچھ ہو نہ جائے۔'' رومی نے کہا۔

''تم فکر نہ کرو کچھ نہیں ہوگا۔ ماموں بہت پہنچے ہوئے عامل ہیں ان کے آگے بڑے سے بڑا جن بھی ناک رگڑنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔'' رحمت بی بی نے بتایا۔

''کیا واقعی؟'' رومی چونکی۔

''ہاں، ہاں، بھئی مجھے تم سے جھوٹ بول کر کیا ملے گا۔''

''پھر ٹھیک ہے۔'' رومی مطمئن ہوتے ہوئے بولی۔

عصر کے فوراً بعد رحمت بی بی نے ماموں کا دیا ہوا ایک تعویذ صحن میں جلادیا اور اس کی راکھ کو نالی میں بہادیا۔ وہ مطمئن تھیں کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ وہ مخلوق انہیں پریشان نہیں کرے گی۔ جب رات وہ سونے کو بستر پر لیٹیں۔ گھر میں سناٹا تھا وہ پرسکون نیند سوگئیں اچانک رات کا وہ نجانے کون سا پہر تھا کہ انہیں ایسا محسوس ہوا کہ گھر میں جیسے بھونچال سا آگیا ہے۔ رومی

کے کمرے سے برتن پھینکنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔
رات کی تاریکی میں وہ آوازیں بہت زور سے سنائی دے رہی تھیں۔ برتنوں کے زمین پر گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔
خوف کے مارے وہ دونوں لرز کر رہ گئی تھیں۔
خوف و دہشت سے ان کے منہ سے کچھ نہیں نکل رہا تھا۔
وہ زور زور سے چیخ کر محلے والوں کو گھر میں بلانا چاہ رہی تھیں مگر ان کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکل پا رہا تھا۔
پوری رات ایسے ہی ڈرتے ہوئے گزری۔ رومی کے کمرے میں اتنے برتن نہیں تھے جتنے برتن رات بھر گرتے اور ٹوٹتے رہے۔ فجر کی اذانیں ہونے پر یہ سلسلہ بند ہوا۔ اور ان دونوں نے سکون کا سانس لیا۔ رات بھر جاگتے رہنے سے ان کی آنکھیں بوجھل تھیں۔ چند لمحے کو سکون میسر آنے پر وہ بستر پر ایسے سوئیں کہ دن چڑھے ہی ان کی آنکھیں کھلیں دوپہر کے دو بج رہے تھے۔
رومی نے باتھ روم جاتے ہوئے اپنے کمرے میں ایک نظر ڈالی اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا رات بھر برتن گرتے اور ٹوٹتے رہنے کی آواز ان دونوں ساس بہو نے سنی تھی۔ مگر کمرے میں ایک برتن زمین پر ٹوٹا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بالکل اسی طرح صاف ستھرا دکھائی دے رہا تھا جیسے رات میں اس کمرے میں کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ رومی کے ساس کو بتانے پر انہوں نے بھی کمرے میں ایک نظر ڈالی اور اسے رومی کی بات سچ ثابت ہوئی۔
''حیرت کی بات ہے رات کو ایسا لگ رہا تھا کہ پتا نہیں کتنے برتن ٹوٹ رہے ہیں۔ مگر کمرے میں ایک برتن بھی نہیں ٹوٹا۔'' رحمت بی بی نے کہا۔
''امی یہ بڑے ہی خطرناک قسم کے آسیب ہیں جو ہمیں اس طرح تنگ کر رہے ہیں۔'' رومی نے کہا۔
''بیٹی تم فکر مت کرو، عمران کے ماموں بھی کوئی کم نہیں وہ بھی پہنچے ہوئے ہیں۔ اگر اس آسیب کو بھگانا آسان نہ ہوتا تو وہ پہلے ہی بتا دیتے۔'' ساس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عصر کے وقت دوسرا تعویذ بھی جلا دیا گیا۔ رات ہونے پر وہ دونوں ساس بہو ایک ہی کمرے میں سو گئیں۔ آدھی رات گزر جانے پر شور سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے چھت پر کوئی شادی کی تقریب ہو اور لوگ خوشیاں مناتے ہوئے رقص و محفل کی تقریب سجائے ہوئے ہوں پھر کچھ دیر گزر جانے پر ایسا لگا کہ یک وقت بہت سارے لوگوں نے چھت پر اچھل کود شروع کر دی۔ وہ دونوں سہمی ہوئی بستر پر لیٹی رہیں۔ جیسے ہی فجر کی اذانوں کی آوازیں آئیں۔ چھت پر ایسا سناٹا چھا گیا جیسے کوئی موجود ہی نہ ہو۔ ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اس لئے سکون ہونے پر انہیں نیند آ گئی اور صبح ہونے پر ہی وہ بیدار ہوئیں۔
ناشتے سے فارغ ہو کر رومی چھت پر ڈرتے ڈرتے گئی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی رات کو چھت پر شادی کی تقریب منعقد تھی ضرور چھت پر پھول وغیرہ پڑے ہوں گے مگر وہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ چھت بالکل صاف پڑی تھی۔
شام میں تیسرا تعویذ بھی جلا دیا گیا۔ حسب معمول رات میں آسیب نے انہیں ڈرانے کے لئے زور زور سے کبھی کھڑکی، کبھی دروازہ بجانا شروع کر دیا۔ دروازے اور کھڑکی کو اتنے زور سے بجایا جا رہا تھا کہ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی ٹوٹ کر گر پڑیں گے، خاصی دیر دروازہ اور کھڑکی بجنے کے بعد خود ہی بجنا بند ہو گئے تھے۔ روزانہ کی طرح آج انہیں آسیب سے ڈر کم محسوس ہوا تھا۔ صبح بیدار ہونے پر وہ دونوں معمول کے کام میں مشغول ہو گئی تھیں۔ شام ہوئی اور چوتھا تعویذ بھی جلا دیا گیا۔ رات ہوئی اور آسیب کی موجودگی ظاہر ہو گئی۔ وہ انتہائی بدصورت شخص تھا جو بند دروازے کے اندر سے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ بہت غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔
''ایسے ہمیں کیا دیکھ رہا ہے، چل یہاں سے دفع ہو جا۔'' رحمت بی بی نے اسے غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے جواب میں کچھ کہا۔ مگر وہ ایسی زبان میں تھا جو ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ بولتا رہا اور رحمت بی بی وہاں سے اسے چلے جانے کو کہتی رہیں۔ وہ بھی ڈھیٹ بنا کھڑا رہا جب رحمت بی بی نے عمران کے ماموں کی دھمکی دی کہ وہ آکر ان سے خوب نبٹے گا تو وہ خاموشی سے چلا گیا۔ اسے جاتا دیکھ کر ساس اور بہو دونوں خوش ہوگئیں۔ انہیں عمران کے ماموں کی طاقت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ آسیب پر ماموں کی دھمکی کام کرگئی تھی۔ وہ انہیں مزید خوف زدہ کرنے کے بجائے خاموشی سے چلا گیا۔ وہ اس کے جانے پر سکون سے سوگئیں۔

شام ہونے پر دروازے پر دستک ہوئی۔ رومی نے لپک کر دروازہ کھولا، دروازے پر عمران کے ماموں کھڑے تھے۔ اس نے انہیں اندر آنے کو راستہ دیا۔ ماموں اندر چلے آئے۔ دونوں نے چار دن کی تفصیل پوچھی ان پر جو گزری تھی وہ سب انہوں نے بیان کردی۔

"میرا شک درست تھا۔" وہ بولے۔

"کیسا شک؟" وہ دونوں چونکی۔

"یہی کہ وہ آسیب تمہیں محض خوف زدہ کرکے بھگانا چاہتا ہے، وہ تمہیں کسی بھی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" ماموں نے کہا۔

"کیا ایسا بھی ہوتا ہے۔" رومی نے پوچھا۔

"ہاں بیٹی یہ حقیقت ہے، جنات کے وجود کو ہم جھٹلا نہیں سکتے۔ جنات کی دو قسم ہیں ایک قسم شریف ہے جو کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی جبکہ دوسری قسم جو شریر ہوتی ہے وہ ویران گھروں اور درختوں پر بسیرا کرتے ہیں، وہ انسانوں کی کمزوری سے واقف ہوتے ہیں اس لئے انہیں خوف زدہ کرنے کو ڈراتے ہیں۔ انسانوں کو ڈرانے کے لئے یہ مختلف روپ اختیار کرلینے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان سے بچنے کا آسان طریقہ یہی ہوتا ہے کہ ان سے ڈرا نہ جائے۔ تم نے دیکھا جب آسیب سے نہیں ڈریں تو وہ میری صرف دھمکی دینے پر فوراً ہی دفع ہوگیا۔ یہ بات میں اس وقت بھی تمہیں بتا سکتا تھا لیکن تمہیں میری بات کا یقین نہ آتا اور تم کسی اور ٹھگ کے پاس چلی جاتی اور اپنی جمع پونجی لٹا بیٹھتیں، میں نے تمہیں چار تعویذ اس لئے دیئے تھے، میرے دیئے تعویذ جلانے سے تم میں اعتماد پیدا ہوا اور تم نے آسیب سے ڈرنا چھوڑ دیا اور دھمکی بھی دے دی۔ بس میں یہی چاہتا تھا کہ تم آسیب سے ڈرنا چھوڑ دو اور وہ تمہیں ڈرانا چھوڑ دے گا۔" ماموں نے کہا۔

"ہاں ماموں واقعی ہم تعویذ جلانے سے پہلے آسیب سے بہت خوفزدہ تھے اور اس گھر کو چھوڑنے کا پروگرام بنا رہے تھے اب ہم میں اعتماد آگیا ہے اور جب اس کے ڈرانے پر ہم خوف زدہ نہیں ہوں گے تو وہ بھی ڈرانا چھوڑ دے گا۔" رومی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

رومی کی بات سن کر ساس بھی مسکرادیں۔

ماموں بھی خوش تھے کہ وہ دونوں جان چکی ہیں کہ آسیب پر قابو پانے کے لئے ڈر وخوف پر قابو پانا ہوگا۔

دو ہفتے ان کے امتحان کے تھے۔ آسیب نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ کئی بار دونوں ساس بہو کو ڈرانے کی ناکام کوشش کی اور پھر خود ہی ہار گیا۔ اور انہیں ڈراتا اور خوف زدہ کرنا چھوڑ دیا۔ وہ بھی خوش تھیں کہ ان کے ذرا ہمت دکھانے سے آسیب کو شکست ہوگئی ہے۔

عمران کے وطن لوٹ آنے تک وہ خوب مزے سے اس گھر میں رہیں، محلے والے بھی ان پر حیرت کرتے تھے کہ وہ دونوں عورتیں ہوکر بھی اس آسیب زدہ گھر میں رہ رہی ہیں۔ لیکن یہ راز وہ دونوں ہی جانتی تھیں کہ آسیب کو کس طرح انہوں نے شکست دی ہے۔

عمران بیرون ملک رہ کر اتنا کما کر لوٹا تھا کہ اس نے پہلی فرصت میں رہنے کے لئے ایک اچھا سا بنگلہ خرید لیا تھا اس گھر سے رخصت ہوتے وقت ساس نے پڑوسیوں کو وہ راز بتا ہی دیا تھا کہ اس گھر میں جب بھی کوئی رہنے کے لئے آئے وہ آسیب کے ڈر سے بھاگنے کے بجائے اسے شکست دے کر شان سے گھر میں رہے۔

ناگ منکا

عابد علی جعفری۔ کندیاں

ایک دهشت ناک اور خوفناک ناگ کی دیدہ دلیری کہ وہ ایک طویل عرصہ تک اپنے دشمن سپیرا کی تلاش میں سرگرداں رہا، پل پل کے لئے ناگ کا سکون برباد ہوچکا تھا اور پھر اس نے اپنا انتقام......

عقل کو حیران اور دل کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی عجیب وغریب ناقابل فراموش کہانی

جب میری آنکھ کھلی تو ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ میرا سرابھی تک درد کررہا تھا، رات کا وقت ہونے کی وجہ سے ہر چیز اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ معلوم نہیں یہ کون سی جگہ تھی اور تو اور مجھے کوئی بات یاد نہیں آرہی تھی۔ میں کہاں ہوں یہ کون سی جگہ ہے؟ بہرحال میں جس ماحول میں تھا ایک موم بتی روشن تھی جو ایک انسانی کھوپڑی کے اوپر رکھی ہوئی تھی، کھوپڑی کو دیکھ کر میرا دل لرزاٹھا اور میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ موم بتی سارے ماحول کو روشن کرنے میں ناکام ہورہی تھی۔

کہ اچانک آسمان پر بجلی چمکی تو مجھے معلوم ہوا کہ میں ایک غار میں ہوں اور میرے ہاتھ پیچھے پیٹھ پر باندھ دیئے گئے ہیں۔ بجلی چمکنے سے غار کا دہانہ روشن ہوا جہاں سے ایک شخص اندر داخل ہورہا تھا۔ اس نے اپنے آپ

کو کالے لباس میں چھپایا ہوا تھا۔ چہرے پر نقاب تھا اور تو اور اس کی آنکھیں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔

وہ میرے قریب نہ آیا بلکہ غار کے ایک کونے میں کچھ اور موم بتیاں کھوپڑیوں پر رکھ کر جلا رہا تھا۔ اب بارش شروع ہو چکی تھی۔ بجلی بھی بار بار آسمان اور اردگرد کے ماحول کو روشن کر رہی تھی۔

کالے لبادے میں چھپا وہ شخص مسلسل کسی انجان زبان میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ اور پھر مجھے پتا چلا کہ اس غار میں، میں اکیلا نہیں ہوں بلکہ ایک اور بدنصیب شخص بھی الٹے منہ پڑا ہے۔

کچھ دیر بعد پھر ماحول پر خاموشی چھا گئی بارش بھی تھم گئی۔ وہ کالے لبادے والا اپنی پڑھائی جاری رکھے ہوئے تھا۔

پھر وہ کچھ دیر بعد اٹھا اور اس بدنصیب شخص کو اٹھا کر اسی کونے میں لے گیا، اس نے تمام موم بتیاں گل کر دیں سوائے ایک کے، کچھ دیر خاموشی ماحول پر چھائی رہی۔

پھر اس خاموشی میں کسی کی ہلکی ہلکی آوازیں آنے لگی جیسے کسی کو ذبح کر دیا گیا ہو۔ پھر ایسی آوازیں سنائی دیں کہ جیسے کوئی غٹاغٹ کچھ پی رہا ہو۔

میں حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مجھے بہت مضبوطی کے ساتھ باندھا گیا تھا پھر ہوا میں کوئی چیز اڑتی ہوئی آئی اور مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر گری وہ ایک انسانی کھوپڑی تھی جو کچھ دیر پہلے اس بدنصیب شخص کے بدن پر موجود تھی۔

اب بات مجھے کچھ کچھ سمجھ آ رہی تھی۔ ''اس کالے لبادے والا شخص کوئی عمل کرنے کے بعد انسانی خون پی رہا تھا۔ اور میں بھی اسی سلسلے میں یہاں موجود ہوں اور اب میری باری ہے۔'' یہ خیال آتے ہی میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میری سانس گلے میں رک کر رہ گئی میرا سر چکرا گیا اور تمام بدن پسینے سے شرابور ہو گیا۔

اس وقت میری زبان پر جو کچھ آ رہا تھا میں اس کا ورد کر رہا تھا۔ اور خدا سے اپنی جان کی آزادی کے لئے دعا بھی کر رہا تھا۔ شاید کہ کوئی راستہ نکل آئے اور میری جان بچ جائے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ میں بہت نیک انسان ہوں اور میں نے زندگی میں کوئی غلط کام نہیں کیا جدید دور کا انسان ہونے کی وجہ سے کچھ میری عادتیں بری بھی ہیں لیکن میں نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی وجہ سے میرے والدین کو شرمندگی اٹھانی پڑی ہو۔

آج کل کے فیشن کے مطابق میں نے بڑے بڑے بال اپنے سر پر سجائے ہوئے ہیں جو دھوپ میں خوب چمکتے ہیں۔ چہرے پر ہلکی ڈاڑھی بھی ہے جو آج کل کے فیشن کے مطابق ہے۔

ان سب چیزوں کے باوجود میں نماز روزے کا پابند ہوں اور اکثر کلام الٰہی کی تلاوت بھی کرتا رہتا ہوں، اس وقت میں خدا سے اپنے گناہوں کی معافی اور اپنی زندگی کی دعا بھی کر رہا تھا۔

ماحول میں خاموشی کا ایک بار پھر راج تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا۔ بس پورے غار میں اس پراسرار کھوپڑی پر ایک ہی موم بتی روشن تھی جو اب اپنی آخری سانس گن رہی تھی جلد ہی اس کا کام بھی تمام ہونے والا تھا۔

پھر اس خاموشی میں مجھے اپنے قریب کوئی آہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ کالے لبادے والا شخص میرے سر پر کھڑا تھا۔

پھر میری کرب ناک چیخوں سے غار گونج اٹھا، وہ شخص میری لمبی زلفوں سے مجھے پکڑ کر غار کے اس کونے کی طرف لے گیا، پتھریلی زمین ہونے کی وجہ سے میرا بدن زخموں سے چور ہو رہا تھا۔ اس بے رحم شخص کو کوئی ترس نہیں آ رہا تھا۔

میری زبان پر مسلسل آیات کا ورد جاری تھا اور اپنی جان کے لئے خدا کے حضور دعا کر رہا تھا۔

اس نے کونے میں جس جگہ باقی کھوپڑیاں پڑی تھیں اس کالے لبادے والے نے مجھے چھوڑ دیا اور موم

بتیاں روشن کرنے لگا۔ روشنی ہوتے ہی میری نظر اس طرف پڑے بے سر کے جسم پر پڑی جو یقینی طور پر اس بدنصیب لڑکے کا تھا جو کچھ دیر پہلے میرے قریب ہی پڑا تھا۔

میں نے اپنی تمام قوت جمع کی اور اس کالے لبادے والے سے طیش میں بولا۔

''بے رحم، سنگدل قاتل تم میں کچھ انسانیت نام کی چیز نہیں ہے۔ تم کیوں میرے دشمن بنے ہو اور میری جان کیوں لینا چاہتے ہو؟ میرا قصور کیا ہے اور میری تمہارے ساتھ کیا دشمنی ہے؟ کیا تمہاری کوئی اولاد نہیں ہے جو مجھے میرے والدین سے جدا کرکے یہاں ویرانے میں لے آئے ہو؟ بولو! کیوں انسانوں کا خون پی رہے ہو ایک انسان کی اولاد ہو کر ایک انسان کے روپ میں درندوں والا کام کیوں کر رہے ہو؟''

میری ہمت بس یہاں تک تھی اس سے آگے مجھ سے کوئی بات نہ ہو سکی۔ میرے خاموش ہوتے ہی اس کالے لبادے والے شخص نے طویل قہقہہ لگایا۔

جس کی گونج غار کے کونے کونے سے سنائی دے رہی تھی۔ وہ قہقہہ بہت خوف ناک تھا جو غیر انسانی معلوم ہوتا تھا۔

پھر اس شخص کی بھیانک آواز کانوں کے پردے ہلانے لگی۔

''انسان اور انسانیت کہاں ہے اس دنیا میں، میری دشمنی تم سے ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں سے ہے اور تم بھی ایک انسان کی اولاد ہو۔''

''کیا تم انسان نہیں ہو کیا تم کوئی جانور ہو؟'' میں بولا۔

''ہاں میں انسان نہیں ہوں تمہارا خون تو میں نے پی ہی جانا ہے، چلو مرتے ہوئے یہ بات تمہارے ذہن میں نہ رہ جائے کہ میرا قاتل کون تھا؟ تو سنو! کیا نام ہے تمہارا چلو جو بھی ہے۔''

''الیاس میرا نام ہے۔ اور میں اصل میں مٹھی شہر کا ہوں لیکن پڑھائی کے سلسلے یہاں آیا ہوں۔''

''اچھا تو الیاس تم یقین نہیں کرو گے کہ میں انسانی روپ میں ایک ناگ ہوں جس پر انسان نے بہت بڑا ظلم کیا ہے۔

''اس ظلم کا بدلہ میں پوری انسان برادری سے لے رہا ہوں۔'' وہ بولا۔

''کیا ظلم ہوا ہے تم پر اور ہم کہاں ہیں اور جہاں تک مجھے کچھ یاد پڑتا ہے تو میں شام کی کلاس اٹینڈ کر کے واپس فلیٹ پر آ رہا تھا جو کہ میرے ماموں کا ہے وہ اس شہر میں کام کرتے ہیں۔''

''ہاں نوجوان ہم شہر سے بہت دور ایک پہاڑی علاقے میں ہیں، یہاں لوگوں کو آنے سے روکا جاتا ہے تم نے ایک شخص سے لفٹ لی تھی اور اس نے تم کو کچھ کھانے کو دیا تھا۔ بس اس چیز کی اثر کی وجہ سے ہی تم یہاں پر موجود ہو۔

''میرا نام راتاش ہے اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں ایک ناگ ہوں۔ میری عمر سو سال سے اوپر ہے اور اس وجہ سے میں اپنا روپ تبدیل کر سکتا ہوں۔''

میں نے ہمت کر کے پوچھا۔'' لیکن تم پر ایسا کون سا ظلم ہو گیا جو تم انسان کے دشمن بن بیٹھے ہو اور انسانوں کا خون پی رہے ہو۔''

انمول موتی

☆ ساری دنیا کے لوگ تجھے اپنے فائدے کے لئے چاہتے ہیں، صرف ایک تیرا رب ہی ہے جو تجھے تیرے فائدے کے لئے چاہتا ہے۔

☆ جب رب راضی ہونے لگتا ہے تو بندہ کو اپنے عیبوں کا پتہ چلنے لگتا ہے اور یہ اس کی رحمت کی پہلی نشانی ہے۔

☆ کائنات میں کوئی کسی کا اتنا انتظار نہیں کرتا جتنا رب کریم اپنے بندہ کی توبہ کا انتظار کرتا ہے۔

(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈو الہ یار)

''پچھلے کئی سال میں نے بہت تکلیف میں گزارے ہیں جس طرح سے تم جانتے ہو کہ کوئی بھی انسان مرد ہو یا عورت سانپ کو دیکھ لے تو وہ ڈر جاتا ہے اور جب تک اس سانپ کو ختم نہ کر دے آرام سے نہیں بیٹھتا، یا پھر کسی جوگی یا سپیرا کو بلوا کر سانپ کو ختم کرا دیتا ہے۔

مجھ پر بھی یہ اذیت کئی بار گزری۔ اس لئے میں آبادیوں سے دور ویرانوں اور جنگلوں میں زندگی گزارتا رہا۔

ایک مرتبہ ایک بہت ہی پرانی عمارت میں چھپ کر رہتا تھا اس وقت میری عمر پچاس سال سے کچھ اوپر تھی۔ اس وقت میری ملاقات ایک بزرگ سانپ سے ہوئی جس کے جسم پر بہت گہرے زخم تھے۔ زخم بہت پرانے معلوم ہوتے تھے۔

اس نے بتایا کہ ''میری زندگی ایک سپیرا کے ساتھ گزری ہے۔ جس نے میرے زہریلے دانت نکال پھینکا تھا وہ لوگوں کو مجھے دکھا کر پیسے کماتا تھا۔

وہ بہت لالچی تھا اور ہمیشہ وہ کسی ناگ کی تلاش میں رہتا تھا۔ کیونکہ وہ ناگ کی طاقت یعنی اس کی زندگی بھر کی جمع پونجی جو وہ دنیا سے اپنے آپ کو بچا بچا کر حاصل کرتا ہے وہ منکا جس پر اس کو ناز ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ سانپوں پر حکومت کرتا ہے اور وہ اس کی مدد سے کوئی بھی روپ اختیار کر سکتا ہے۔ ایک بار اس سپیرے کو اس ناگ کا پتا چل جاتا ہے جس کے منہ میں منکا ہوتا ہے، ناگ چاند کی چاندنی میں بہت مست ہو جاتا ہے۔ اور بار بار اپنے منہ سے منکا باہر پھینکتا ہے اور منہ سے پھر پکڑتا ہے۔

وہ بھی چاند کی چاندنی رات تھی۔ سپیرا اس جگہ پہنچا یہاں اس کو پتا چلا تھا کہ ناگ اس جگہ رات میں کھیلتا ہے۔

کچھ دیر خاموشی سے وہ بیٹھا رہا پھر مجھے باہر نکالا اور اس ناگ پر پھینک دیا ناگ منکا بھول گیا اور میرے ساتھ لڑائی کرنے لگا۔ مجھے خود یہ اندازہ نہیں تھا کہ سپیرا میرے ساتھ یہ کرنے والا ہے۔ بہرحال اس ناگ نے مجھے خوب زخمی کیا اس دوران سپیرا ریت میں منکا تلاش کرتا رہا کیونکہ ناگ سے وہ منکا رریتلی زمین پر گر گیا تھا۔

سپیرا بے فکر ہو کر کام کر رہا تھا۔ اس دوران ناگ کو موقع مل گیا اس نے سپیرے کو ڈس لیا، زہر اتنا تیز تھا کہ سپیرا منٹوں میں نیلا پڑ گیا اور تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

خیر میں بہت زخمی تھا اس لئے بڑی مشکل کے بعد یہاں تک آیا ہوں معلوم نہیں کتنے سال گزر چکے ہیں یاد نہیں لیکن یہ واقعہ میرے دماغ سے اترتا ہی نہیں۔

زندگی کا کوئی پتا نہیں ہے رات اش بس میری یہ نصیحت یاد رکھنا، انسانوں پر اعتبار نہیں کرنا اگر بھگوان نے چاہا تو تم بھی ایک دن ناگ بن جاؤ گے، اپنے زہر کی حفاظت کرنا اور جب منکا مل جائے تو اس کو انسانوں سے بچانا، فرض کرو اگر تم نے کوئی انسانی روپ اختیار کر لیا تو اس وقت منکا کو اور حفاظت کی ضرورت ہوگی۔

اگر تم سے اس وقت منکا کھو گیا تو تم انسانی روپ میں رہو گے لیکن تمہارا جسم کسی ناگ کے جسم کی طرح کالے موٹے چمڑے کا بن جائے گا جس کی وجہ سے تم دور سے ہی پہچان لئے جاؤ گے اس لئے بھگوان کے لئے میری بات پر عمل کرنا اور منکا حفاظت کے ساتھ محفوظ جگہ یعنی منہ میں ہی رکھنا۔

اسی طرح سال پر سال گزرتے گئے، میں اس پرانی عمارت میں ہی رہا، وہ بوڑھا سانپ چند دن بعد مر گیا لیکن اس کی کام کی باتیں ہمیشہ میرے ذہن میں رہتی ہیں۔

اس وقت میں نوے سال کا تھا جب میں نے وہ عمارت چھوڑی کیونکہ وہاں انسان آ گئے تھے اور اس عمارت کی مرمت کا کام شروع ہو گیا تھا۔

اس کے بعد میں ایک بند پڑی فیکٹری میں رہنے لگا جو شہر سے تھوڑے فاصلے پر تھی اور کئی سالوں سے بند پڑی تھی اس کا مالک ایک ٹریفک حادثے میں مر گیا تھا۔

اور اس کے بیٹوں کو اس فیکٹری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

میرے دن اچھے گزر رہے تھے۔ اس فیکٹری میں میری ملاقات ایک ناگن سے ہوئی جو تقریباً میری ہم عمر تھی اور وہ بھی چند سالوں کے بعد منکا حاصل کرنے کی خواہش مند تھی! یوں ہم مل جل کر رہنے لگے، سالوں کا کوئی پتا نہ چلا اور ہم سو سال کی عمر کو پہنچ گئے۔ ان سو سالوں میں، میں نے اپنے زہر کا استعمال نہیں کیا تھا۔

کیونکہ زہر استعمال کرنے سے ہماری طاقت اور عمر کم ہو جاتی ہے اور ہر ناگ کا خواب ہوتا ہے کہ وہ منکا حاصل کرلے اور سانپوں کی دنیا پر راج کرے۔

جس جوڑے کے پاس منکا ہوتا ہے اسے بہت بڑا درجہ اور عزت حاصل ہوتی ہے۔ سب ہی سانپ ان سے ڈرتے ہیں اور ان کے حکم کی پیروی کرتے ہیں۔

میں اس وقت سو سال کا ہو چکا تھا، وہ چاند کی چودھویں رات تھی میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا اتنا درد ہو رہا تھا کہ مجھے آنکھوں سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

ناگن بھی میرے ساتھ نہیں تھی وہ پیٹ پوجا کے لئے شکار کرنے گئی تھی۔

درد تھا کہ زیادہ سے زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر میرے سر سے خون کی ایک لکیر نکل کر میری آنکھوں میں پڑنے لگی، درد تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا میں درد کی وجہ سے زمین پر گول گول گھوم رہا تھا۔

کہ اچانک ایک جھٹکا لگا اور میرے منہ سے ایک سرخ رنگ کا منکا نکل کر زمین پر گر پڑا۔

جب مجھے کچھ ہوش آیا تو میں بہت خوش ہوا ، میں نے منکا فوراً اپنے منہ میں ڈال لیا مجھے بوڑھے سانپ کی بات یاد تھی۔

منکا ملنے کی خوشی میں، میں اپنے سر کا درد بھول گیا اور خوشی سے ناچنے لگا۔

ناگن آئی تو میں نے اس کو منکا کے متعلق بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی اور مجھے مبارک باد دی اور بولی ”اب ہمیں جلد از جلد ناگ دیوتا کے پاس جانا چاہئے تاکہ وہ تم کو کوئی کام دے جس کی وجہ سے سانپوں میں

فرمائش......!

شاعر ابودلامہ، مہدی کے پاس آئے اور اسے اپنا قصیدہ سنایا۔

مہدی نے کہا۔ ”اپنی کوئی حاجت بتاؤ۔“

ابودلامہ نے کہا۔ ”امیر المومنین! مجھے آپ ایک کتا عنایت فرمادیں۔“ مہدی کو غصہ آ گیا، اس نے کہا۔ ”یہ کیا بکواس ہے، میں کہتا ہوں، اپنی حاجت بتاؤ اور تم کہتے ہو کہ مجھے کتا دے دو؟“

ابودلامہ بولے۔ ”امیر المومنین! حاجت میری ہے، یا آپ کی؟“

مہدی نے کہا۔ ”تمہاری۔“

ابودلامہ نے کہا۔ ”تو میں نے آپ سے یہ کہا ہے کہ مجھے ایک شکاری کتا عنایت فرمادیں۔“

مہدی نے غلام سے کتا لانے کے لئے کہا۔

ابودلامہ نے کہا۔ ”امیر المومنین! مجھے پیدل شکار کے لئے نکلنا ہوگا، کوئی سواری دیجئے۔“

مہدی نے سواری لانے کا حکم دیا۔

ابودلامہ نے کہا۔ ”اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟“ مہدی نے غلام حاضر کرنے کا حکم دیا۔

اس نے کہا۔ ”کوئی چیز شکار کر کے، جب میں گھر لاؤں تو اُسے پکائے گا کون؟“

مہدی نے ایک لونڈی کا حکم دیا۔

اُس نے کہا۔ ”امیر المومنین! یہ سب رہیں گے کہاں؟“

مہدی نے گھر کا حکم دے دیا۔

اُس نے کہا۔ ”آپ نے میرے گلے میں اہل و عیال کا بوجھ ڈال دیا۔ میں کہاں سے انہیں کھلاؤں گا؟“

مہدی نے اپنے خدام سے کہا۔ ”اسے کھجور کا ایک باغ دے دو۔“ پھر ابودلامہ سے کہا۔ ”کیا اب بھی کوئی حاجت باقی ہے؟“

اُس نے کہا۔ ”ہاں، مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کے ہاتھ کا بوسہ لوں۔“

(انتخاب: ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

تمہاری عزت بن سکے۔"

"ٹھیک ہے لیکن ہمیں انتظار کرنا چاہئے جب تم کو بھی منکا مل جائے تو پھر اکٹھے جائیں گے۔"

دوسری رات بھی چاند خوب چمک رہا تھا۔ اور میرا دل بار بار باہر نکل کر منکے کے ساتھ کھیلنے کا کر رہا تھا۔

میری طبیعت بے چین ہو رہی تھی اور پھر میں خود بخود دل کی تسکین کے لئے ریت پر آ گیا اور منکے کے ساتھ کھیلنے لگا میں منکے کو ہوا میں پھینکتا اور منہ سے پکڑتا، یہ عمل میں کافی دیر تک کرتا رہا یہ رات کا آخری پہر تھا۔ میں تھک کر واپس فیکٹری میں داخل ہو رہا تھا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی انسان مجھے دیکھ رہا تھا، اب وہ بھی جا رہا تھا مجھے کچھ سمجھ نہ آیا اور میں نے یہ بات ذہن سے نکال دی۔

پھر مجھے بوڑھے سانپ کی وہ بات دل کو بے چین کر رہی تھی کہ انسانوں پر کبھی بھروسہ نہ کرنا، ہمیشہ سانپوں کے دشمن ہی رہتے ہیں، چاہے وہ سانپوں کو اپنے ہاتھ سے دودھ ہی پلاتے رہے ہوں۔ میرا حال دیکھ لو میں نے سپیرے کی کتنی خدمت کی تھی، اس کے ہر اشارے پر ناچتا رہا لیکن آخر میں اس نے مجھے کیا صلہ دیا ایک ناگ پر اچانک ڈال دیا جو اپنی مستی میں مست تھا۔

میں نے یہ بات ناگن کو نہیں بتائی کیونکہ وہ بھی اپنے سو سال پورے ہونے کی خوشی میں خوش تھی۔ مجھے معلوم نہیں اس نے ان سو سالوں میں کتنی بار زہر استعمال کیا کیونکہ منکا اتنی ہی دیر بعد ملے گا جتنا زہر اس نے استعمال کیا ہوگا۔

کیونکہ منکا بہت قیمتی چیز ہوتا ہے اور یہ سالوں اپنی اور اپنے زہر کی حفاظت کے بعد ملتا ہے اور اس منکے کو حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے سپیرے صحراؤں اور جنگلوں کی خاک چھانتے ہیں اور کئی کئی سالوں تک ناگوں کا پیچھا کرتے ہیں۔

رات اب گزر چکی تھی ناگن کا کوئی پتا نہیں تھا۔ کیونکہ فیکٹری میلوں تک پھیلی ہوئی تھی اس لئے وہ ایک جگہ آرام سے نہیں بیٹھتی تھی وہ فیکٹری میں چکر کاٹتی رہتی تھی آج چاند تھوڑی دیر بعد نکلا، رات کافی گہری ہو چکی تھی۔

میری طبیعت بہت بے چین تھی اور میرا دل بار بار باہر جانے کو کر رہا تھا تاکہ میں منکے کے ساتھ کھیل سکوں۔

چاند اپنی چاندنی نچھاور کر رہا تھا میں فیکٹری سے باہر نکل آیا ہر طرف ریت ہی ریت تھی۔ لیکن ایک جگہ ریت زیادہ ہی نرم تھی اور ریت کا رنگ کالا کالا سا تھا یہ ریت مجھے بہت اچھی لگی مجھے یہ اس وقت احساس نہیں تھا کہ یہ ایک جال ہے اور یہ ریت نہیں راکھ ہے جس سے سانپوں کو بہت نفرت ہوتی ہے۔

کیونکہ آگ میں جل جانا سانپ کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے اس لئے وہ آگ اور راکھ سے نفرت کرتا ہے۔

لیکن میں زیادہ تر ویرانوں صحراؤں اور جنگلوں میں رہا تھا اور میرا واسطہ راکھ سے نہیں پڑا تھا۔

اس لئے اس وقت میں بہت خوش ہو کر راکھ پر کھیل رہا تھا تین چار بار میں نے منکا ہوا میں اچھالا اور ہر بار منہ سے پکڑ لیا۔

اس وقت مجھے کسی کی موجودگی کا احساس نہیں تھا۔

اس بار جب میں نے منکا ہوا میں اچھالا تو ایک طرف شور ہوا تو میرا دھیان منکے سے ہٹ گیا اور منکا راکھ میں دب گیا۔

جس طرف شور ہوا تھا میں نے وہاں دیکھا تو میری دنیا ہی مجھ سے چھن گئی تھی اس بڑے بالوں والے انسان نے میری ناگن کو مار دیا تھا جو شاید میری حفاظت کے لئے وہاں آئی تھی۔

میں اس کی طرف بھاگا تو وہ سپیرا وہاں سے بھاگ نکلا اور میں تڑپنے لگا کیونکہ آج کی رات اس نے میرا بہت نقصان کیا تھا ایک میرا منکا گم ہو گیا تھا اور دوسرا میری تنہائی کی ساتھی میری ناگن مجھے چھوڑ کر دنیا سے چلی گئی تھی۔

میں نے منکا بہت تلاش کیا لیکن مجھے راکھ میں کچھ نہ ملا تو اس وقت میں نے اس سپیرے کی بو کا پیچھا کرنا شروع کردیا۔

اس کی بو مجھے اس کچی آبادی میں لے گئی جہاں سپیروں کے ڈیرے تھے۔ اور جگہ جگہ سپیرے بیٹھے بین بجا رہے تھے اور سانپ ان کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ مجھے اس وقت انسانوں سے سخت نفرت ہوگئی تھی خیر میں اپنی ناگن کو دفن کرنے کے لئے دوبارہ فیکٹری کی طرف چل دیا کیونکہ مجھے امید تھی کہ منکا مجھے مل جائے گا۔

جب میں راکھ والی جگہ پر پہنچا تو وہاں کوئی راکھ نہیں تھی وہ سپیرا ساری راکھ اٹھا کر لے گیا تھا، راکھ نہیں بلکہ میرا خزانہ بھی لے گیا تھا۔

میری دنیا تاریک ہوچکی تھی پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے ایک انسان کا روپ دھار لیا اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

میری آنکھوں میں بہت طاقت آچکی تھی میں بہت دور تک دیکھ سکتا تھا میں اس رات سپیروں کی بستی میں گیا اور بہت سے سپیروں کو ابدی نیند سلا دیا لیکن میرا دشمن مجھے نہ ملا مجھے اس کی بو نہ ملی۔

کافی سانپوں کو آزادی ملی ان سانپوں میں سے ایک ناگ بھی تھا جس کا منکا کھوگیا تھا اس نے بتایا ''اب اگر وہ سپیرا ایک خاص عمل تمہارے منکے پر کرتا ہے تو تم اس کے غلام بن جاؤ گے اور وہ تم سے ہر کام کروائے گا۔''

لیکن ابھی تم نے انسانی روپ اختیار کرلیا ہے اس لئے اس کا عمل بے کار ہے پر تم کو اب یہ نقصان ہے کہ تم انسانی روپ میں ہی رہو گے لیکن تمہاری جلد سانپوں کی طرح کی بن جائے گی جس کی وجہ سے انسان تم کو پہچان جائیں گے۔

''تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے کہ دوبارہ ناگ کا روپ اختیار کرلوں۔''

''نہیں اب تم ایسا بھی نہیں کرسکتے کیونکہ ناگ منکا اب تمہارے پاس نہیں ہے۔

ہاں ایک راستہ ہے اگر تم اپنے آپ کو لبادے میں چھپا کر رکھو اور اکیس انسانوں کا خون پیو تو تم ناگ کا روپ اختیار کرسکتے ہو اور وہ منکا بھی بے اثر ہوجائے گا۔ پھر میں نے یہ کالا لبادہ پہن لیا اور انسانوں کا خون پی کر پھر سے ناگ کا روپ حاصل کرلیا۔

میں مسلسل سپیرے کی تلاش میں تھا آخر میری تلاش ختم ہوگئی اور میں نے اس سپیرے کو ختم کردیا اور اپنا ناگ منکا حاصل کرلیا۔

''اب جب تم کو ناگ منکا مل گیا ہے تو پھر یہ خون کیوں پی رہے ہو؟''

''الیاس اب یہ میری ضرورت ہے کیونکہ اب میں چوہے نہیں کھاسکتا۔ اس لئے میں اپنی خوراک اور انسانوں سے دشمنی دونوں ساتھ ساتھ پوری کررہا ہوں۔ میرا منکا اب میرے پاس ہے۔''

اس کی باتیں میں سن رہا تھا لیکن میری زبان پر کلام الٰہی کا ورد جاری تھا پھر میں نے اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونک مار کر اپنے دونوں ہاتھ اپنے سر منہ اور بدن پر پھیر لیا۔

اتنے میں وہ میری جانب بڑھا اور طیش میں اس نے میرے بال اپنی مٹھی میں جکڑے۔ بال کا پکڑنا تھا کہ اس کے سر پر ایک زبردست شعلہ بھڑکا اور بدحواس ہوکر اس نے میرے بال چھوڑ دیئے۔

اور پھر کسی ان دیکھی طاقت نے مجھے غار سے باہر کی طرف آناً فاناً دھکیلا اور میں جھٹ سے غار سے باہر تھا۔ جب میں غار سے باہر نکلا تو اچانک زبردست گڑگڑاہٹ ہوئی اور پلک جھپکتے ہی پورے کا پورا غار زمین بوس ہوگیا، مجھ پر گھبراہٹ اور سکتہ طاری تھا۔ چند منٹ بعد جب میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے اس واقعات کو غیبی مدد سمجھا اور یقیناً وہ غیبی مدد ہی تھی کہ میں بحفاظت غار سے باہر نکلا تھا اور غار زمین بوس ہوگیا تھا اور پھر میں نے کلام الٰہی کا ورد کرتے ہوئے اپنے گھر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

☠

زندہ صدیاں

قسط نمبر:08

ایم اے راحت

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر جھلمل کرتی، قوس قزح کے دھنک رنگ بکھیرتی، حقیقت سے روشناس کراتی، دل و دماغ میں ہلچل مچاتی ناقابل یقین ناقابل فراموش انمٹ اور شاہکار کہانی

سوچ کے نئے دریچے کھولتی اپنی نوعیت کی بے مثال، لاجواب اور دلفریب کہانی

حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میں گھر کے دروازے پر پہنچا اور دروازہ کھول کر دیکھا، مجھے دوبارہ چونکنا پڑا تھا اول تو میرے گھر رات کے دو بجے آنے والا کوئی تھا ہی نہیں، پھر بھی میں نے سوچا کہ ہوسکتا ہے کوئی پڑوسی ہو، کسی مشکل کا شکار ہو اور مدد مانگنے کے لئے میرے پاس آیا ہو، لیکن جس شخص کو میں نے اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے دیکھا وہ گوتم بھنسالی تھا۔ مکروہ شکل کا پورا، وہ سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا، پھر اس کی مکروہ سی آواز ابھری۔

”مجھے اندر آنے دو۔“

میں نے اسے اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا، خود دروازہ بند کرنے کے لئے رکا لیکن وہ سیدھا آگے بڑھتا چلا گیا، پھر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا، اس نے خود ہی ڈرائنگ روم کی لائٹ آن کی، اس دوران میں اس کی آمد کے بارے میں سوچتا رہا تھا، اس شخص سے مجھے بدستور خطرہ تھا، لیکن اب میں اتنا بزدل بھی نہیں تھا خاص طور پر مہابھارت کے دور میں اور اس کے بعد یونان میں یولیسیس کی حیثیت سے میں نے جو عمل سرانجام دیا تھا اس نے تھوڑا سا نڈر کردیا تھا۔ میں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوکر تیکھی نگاہوں سے گوتم بھنسالی کو دیکھا اور کسی قدر ترش لہجے میں بولا۔

”آگئے ہو تو میں نے تمہیں بلالیا ہے، جس دور سے تم گزر رہے ہو اس کی تہذیب ذرا مختلف ہے اول تو رات کے دو بجے ایسے کوئی کسی کے گھر میں نہیں آتا اور اگر آتا بھی ہے تو میزبان کی اجازت کا انتظار کرتا ہے، تم نے اب تک جو کچھ کیا ہے مجھے پسند نہیں بیٹھو۔“

وہ ایک صوفے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا، پھر اس کی آواز ابھری۔ ”میں بیٹھنے کے لئے نہیں آیا، تمہارا مہمان نہیں ہوں بلکہ تمہیں خبردار کرنے آیا ہوں۔“

”کرو کرو کرو......“ میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا اور خود اس صوفے کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا جس سے وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا، گوتم کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

”تم اس کا پیچھا چھوڑ دو ورنہ میں تمہیں مصیبت میں پھنسادوں گا، کیا سمجھے؟“

”ٹھیک، کب تک پھنساؤ گے، کیا آج ابھی اور اسی وقت؟“ میں نے کہا اور اس کا چہرہ مزید بگڑ گیا۔

”تم شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو اس وقت بھی اگر میں چاہوں تو تمہیں کوئلے میں تبدیل کردوں تمہارے پورے بدن سے آگ ابل پڑے

گی، اس طرح......'' اس نے ایک ڈیکوریشن پیس کی جانب انگلی اٹھائی اس کی انگلی سے نیلے رنگ کی ایک شعاع خارج ہوئی اور میرا انتہائی قیمتی ڈیکوریشن پیس سلگنے لگا، ایک لمحے کے لئے میرا منہ غصے سے کھلا لیکن پھر میں نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ ڈیکوریشن پیس بہت خوبصورت تھا اور کسی نے گفٹ کیا تھا، اس کے جل کر راکھ ہوجانے سے مجھے دلی افسوس ہوا، میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''زمانہ قدیم کے شعبدہ گر میرے دور کے لوگ بھی ایسے شعبدے دکھا سکتے ہیں، پستول کی ایک گولی تیرے سینے میں سوراخ کرسکتی ہے۔ بے شک تو نے آب حیات پیا ہوا ہے اور وہ گولی تجھے موت نہیں دے سکتی، لیکن تیرے بدن کے زخم ضرور تجھے تکلیف دیں گے اور ان کے بھرنے میں وقت لگے گا۔''

''تم یہ بھی نہ کرسکو گے میرے نوجوان ادیب، میرے پاس اس کا حل بھی موجود ہے، لیکن نیلے رنگ کی یہ شعاع تمہیں اسی طرح خاکستر کردے گی، جیسے یہ......'' اس نے ڈیکوریشن پیس کی طرف اشارہ کیا۔

''ہوں تو پھر تو اس سے گریز کیوں کررہا ہے جبکہ بقول تیرے مجھ سے دشمنی ہے۔''

''کوروتی کے لئے، کوروتی کے لئے، اگر میں نے تجھے ہلاک کردیا تو وہ پیشگوئی غلط ہوجائے گی جس کے لئے مجھے نجانے کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔''

''پیشگوئی۔''

''ہاں، محبت کبھی نہ کبھی رنگ لے ہی آتی ہے، میں اسے بہت چاہتا ہوں، میں اسے کسی کرب کا شکار نہیں دیکھنا چاہتا، میں نے اگر تجھے ہلاک کردیا تو وہ مجھ سے بہت متنفر ہوجائے گی۔''

''پیشگوئی کرنے والے نے مجھے یہی بتایا تھا کہ اسے اس حد تک نہ پہنچانا کہ اس کے سینے میں نفرت کا درخت اگ آئے اور وہ جب بھی تم پر نگاہ ڈالے نفرت کی نگاہ ڈالے، ایک وقت ایسا آئے گا، جب اس کے دل میں تمہارے لئے محبت بیدار ہوگی اور وہ تمہیں اپنالے گی، بس میں کوئی ایسا عمل نہیں کرتا جس سے نفرت کا وہ درخت اگ آئے اور میرے راستے ختم ہوجائیں لیکن تو دیکھ ادیب کہ میں کتنا صبر والا ہوں کتنا انتظار کررہا ہوں اور کب تک مجھے انتظار کرنا پڑے گا۔''

''تو پھر تو نے مجھے کون سی مصیبت میں پھنسا دے گا گوتم بھنسالی۔''

''یہ راز تو مجھ تک ہی رہنے دے، بس اتنا سمجھ لے کہ اگر میں صرف تیرے خلاف کچھ کرنے پر آجاؤں تو تو اپنی زندگی سے تنگ آجائے گا تجھے صرف موت کی آغوش میں پناہ ملے گی اور وہ موت میں خود نہیں دوں گا تجھے، وہ تیری طلب ہوگی اور میرا انتقام۔''

''تو ٹھیک ہے گوتم بھنسالی، میں بھی زندگی کے انوکھے تجربے کررہا ہوں، وہ تجربے میں جاری رکھوں گا۔''

وہ مجھے گھورنے لگا پھر بولا۔ ''تیری مرضی ہے تیار رہنا مجھے تیری موت درکار ہے لیکن وہ موت جو خود تجھے تیرے اپنے ہاتھوں آئے، میں کوروتی کے سامنے سرخرو رہنا چاہتا ہوں۔ چلتا ہوں۔'' وہ واپسی کے لئے مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا، پھر بڑے دروازے سے بھی باہر نکل گیا۔

میں اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور میرے دل میں ایک عجیب سا احساس جاگ اٹھا تھا کوروتی سے میرا جو رابطہ ہوگیا تھا اور جو رشتہ میرے اور اس کے درمیان قائم ہوگیا تھا وہ اتنا ہلکا نہیں تھا کہ اسے موت کے خوف سے فراموش کردیا جاتا اور ویسے بھی میں ایک نڈر انسان ہوں، میرے بہت سے افکار و خیالات ہیں، موت کے بارے میں بھی بہر حال میں نے سوچا کوئی بچ سکا ہے آج تک، لیکن یہ آب حیات پتہ نہیں اس کا اختتام کیا ہوتا، میں نے بہت سی کہانیوں میں آب حیات کا ذکر کیا ہے، لیکن صرف خیالی حد تک حتمی طور پر میں نے کبھی نہیں کہا کہ آب حیات کا وجود ہے یا اگر وجود ہے بھی تو کیا کوئی عام انسان چشمہ حیوان سے آب حیات حاصل کرسکتا ہے، خیر میں اس پر کوئی اپنی رائے نہیں دے سکتا، لیکن عام لوگوں کی وہی

بات ہوجاتی ہے کہ وہ صرف کہانی کی حد تک ہیں یا پھر کہانی سے آگے بھی کچھ ہے۔

کوروتی اور گوتم بھنسالی اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ آب حیات کا وجود ہے اور وہ بقول ان کے یہ امرت جل پی چکے ہیں، کوروتی سے اپنی اس عمارت میں نہ رہا گیا، وہ دوسری صبح ہی میرے پاس پہنچ گئی اور اس نے میرے بازو سے رخسار لگاتے ہوئے کہا۔

''نہیں رہ سکتی اب میں تمہارے بنا ذیشان عالی، نہیں رہ سکتی میں اب تمہارے بنا، پتا نہیں کیا ہوگا کبھی کبھی تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے، میں جانتی ہوں تم بوڑھے ہوجاؤ گے مرجاؤ گے اور میں پھر ویران ہوجاؤں گی، پھر میرے دل میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ اگر میں امرت جل نہ پی چکی ہوتی تو اپنے پریمی کے ساتھ سے بتا کر میں بھی راکھ بن چکی ہوتی یا دھرتی کی گہرائی میں جا چکی ہوتی، پتہ نہیں یہ سب کچھ کیا ہے، منش کیا کیا سوچتا ہے، کبھی صحیح کبھی غلط۔'' ناشتے کے دوران میں نے اس سے کہا۔

''رات کو گوتم بھنسالی میرے پاس آیا تھا۔''

''ایں۔'' وہ اچھل پڑی۔

''ہاں وہ مجھے دھمکیاں دے کر گیا ہے، تم نے وہ ڈیکوریشن پیس نہیں دیکھا جو بڑا خوب صورت تھا لیکن راکھ بن گیا ہے۔'' میں نے اسے اس ڈیکوریشن پیس کی درگت دکھائی اور اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات پھیل گئے، تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر بولی۔

''وہ کمینہ اس سے زیادہ اور کیا کرسکتا ہے، جہاں تک بات رہی تمہاری تو اس کی مجال نہیں کہ تمہیں نقصان پہنچا سکے۔ پھر بھی میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں ایسے جاپ بتاؤں گی کہ تم اس سے ہی نہیں بلکہ اپنے ہر دشمن سے محفوظ رہو گے۔''

''مجھے ایک بات بتاؤ کوروتی؟''

''ہاں پوچھو۔''

''وہ تم تک کبھی نہیں پہنچ سکا، میرا مطلب ہے تمہاری قربت نہیں حاصل ہوئی اسے؟''

''کبھی نہیں مجھے اس کی شکل سے نفرت ہے۔''

''لیکن لیوسکی کی حیثیت سے تو اس نے تم پر قابو پالیا تھا، میں وہاں یولیسس کی حیثیت سے موجود تھا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اس نے تمہارے بدن پر خراشیں ڈال دی تھیں۔''

وہ ہنس پڑی پھر بولی۔ ''اچھا ایک بات بتاؤ۔''

''پوچھو۔''

''تم یولیسس کی حیثیت سے وہاں موجود تھے نا؟''

''ہاں۔''

''تو کیا تم یولیسس تھے؟''

''نہیں۔''

''تو میں بھی وہ نہیں تھی جو تمہیں نظر آرہی تھی، یہ تاریخ کے دو کردار تھے، میں شاید پہلے بھی تمہیں بتا چکی ہوں کہ ماضی جو گزر چکا ہوتا ہے اور اس کی ترتیب جس طرح ہوتی ہے اس میں نئے کرداروں کی گنجائش نہیں ہوتی، زیادہ سے زیادہ اگر کوئی دیدہ ور کی حیثیت سے تاریخ میں داخل بھی ہوجائے تو وہ صرف دیدہ ور ہوتا ہے اور وہ نہیں سمجھ پاتا جو تاریخ کا اصل ہوتا ہے، ہم جب تاریخ میں داخل ہوتے ہیں تو اپنی جگہ تلاش کرتے ہیں کہ ہم کہاں سماسکیں گے لیکن ہم پر جو اس دوران بیتتی ہے وہ ہم پر نہیں بیتتی، بلکہ تاریخ کے وہ کردار ہماری شکل میں اپنی کہانی بیان کرتے ہیں، لکھنا اپنی کتاب زندہ صدیاں میں یہ بات کہ جیون کا ایسا موڑ بھی ہوتا ہے جب ہم خود اپنی ذات کو نہیں سمجھ پاتے۔''

میں واقعی اس کی فلسفیانہ گفتگو سے الجھ رہا تھا، میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تو وہ تم نہیں تھیں۔''

''نہیں وہ اشتاریہ ہی تھی، میں نے صرف اس کا روپ دھارا تھا، اس کا میرے جیون سے کوئی تعلق نہیں تھا۔''

''ٹھیک اور میں......''

''تم نے بھی یولیسس کا روپ دھارا تھا۔''

''میں نے تو کچھ نہیں کیا تھا اس سلسلے میں جبکہ تم

نے روپ دھارا ہوگا۔"

"میری یہ کتاب جب تم اس کے حروف پڑ جاتے اور تاریخ کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہو تو پھر تمہارا ایک کردار منتخب ہو جاتا ہے، یہ میرا عمل ہے یہ میرا گیان ہے۔ ایک بار میرے ساتھ بڑا دلچسپ مسئلہ ہوا، تمہیں یونان سے دلچسپی ہے نا، میں یونان کے ایک بڑے ہی اہم کردار کے ساتھ جس حیثیت سے رہ چکی ہوں سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔"

مجھے بڑی دلچسپی محسوس ہوئی تھی میں نے کہا۔

"میں سننا چاہتا ہوں اور دنگ رہ جانا چاہتا ہوں۔"

وہ ہنس پڑی اور پھر بولی۔"تو کیوں نہ اس دور میں اور اس کے آخر تک کا سفر کیا جائے، خیر تو میں تمہیں بتا رہی تھی کہ ایک بار میرے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جو طویل واقعہ تھا، مجھے پتہ چلا کہ ایک پر خار علاقے میں ایک ایسا استاد اعظم موجود ہے جو بڑے انوکھے گیان جانتا ہے جس کا نام ایلی گوس تھا، ایلی گوس سے میں نے ایک علم سیکھا، بڑا انوکھا علم تھا اور بڑی مشکل سے میں نے ایلی گوس کو اس بات کے لئے تیار کیا تھا کہ وہ مجھے علم کی اس منزل تک لے جائے اس کے لئے مجھے اس انوکھے کردار میں اس حد تک پہنچنا پڑا تھا، اس کا وہ گیان اور علم اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اصل میں، میں کون ہوں، وہ مجھے بڑے پیار سے اپنا وہ علم سکھاتا رہا اور جب میں نے اس کا مکمل علم سیکھ لیا تو پھر میں نے اس سے جدا ہو جانا مناسب سمجھا اور مجھے معاف کرنا ذیشان عالی ایک کام میں نے کیا ہے کہ اگر کوئی ایسا علم میرے ہاتھ آ گیا جس میں میں نے سوچا کہ میرے علاوہ کوئی دوسرا اس سے واقف نہ ہو تو میں نے علم سکھانے والے کو یا تو ختم کر دیا یا اسے اس طرح ساکت کر دیا کہ پھر وہ جنبش تک نہ کر سکے، تو یہی ہوا میں نے ایلی گوس کی وہ قوت سلب کر لی اور ایلی گوس کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ غضب ناک ہو گیا، وہ میرا بدترین دشمن بن گیا۔

میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرے اندر ابھی بہت سی خامیاں ہیں، میں زخمی ہو سکتی ہوں، دکھ درد اٹھا سکتی ہوں، بس یہ کہ مر نہیں سکتی، اگر میرے بدن پر کوڑھ پھوٹ آئے، اگر میرے اعضاء مفلوج ہو جائیں تب بھی میں زندہ رہوں گی اور وہ زندگی کتنی تکلیف دہ ہو سکتی ہے تمہیں اس کا علم ہے، میں بتا رہی تھی کہ وہ میرا دشمن بن گیا، پھر میرے گیان ہی نے مجھے بتایا کہ وہ میری تاک میں ہے۔

یہاں مجھ سے ایک چھوٹی سی غلطی ہوئی میں اپنی طاقت کے زعم میں اس کے سامنے آ گئی اور اس سے کہا کہ "وہ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔"

وہ سخت غضبناک تھا اس نے کہا کہ "وہ میرا اتنا کچھ بگاڑ سکتا ہے کہ میں صدیوں اسے نہیں بھول سکوں گی۔" اور اس نے اس کا عملی مظاہرہ کر کے دکھایا۔

ایک انتہائی طاقتور ہاتھی نما گینڈا تھا جس کا قد و قامت دیکھنے کے قابل تھا، اس نے نمونے کے طور پر اس گینڈے پر اپنا وہ علم آزما کر مجھے دکھایا گینڈا اپنی جگہ ساکت ہو گیا وہ سانس لیتا تھا بول سکتا تھا لیکن اس کے بدن میں جنبش نہیں ہوتی تھی، ایلی گوس نے کہا کہ "وہ مجھے بھی ایک زندہ مجسمہ بنا سکتا ہے۔" کسی بھی جگہ میں ساکت ہو سکتی ہوں اور پھر میرے جیون کا باقی سے اسی پتھرائے ہوئے بدن کے ساتھ گزرے گا اور میں کسی طور اپنے آپ کو ٹھیک نہیں کر پاؤں گی۔

میں خوفزدہ ہو گئی اگر وہ یہ کر لیتا تو میرے لئے اس سے بھیانک سزا اور کوئی نہ ہوتی، میرے پاس گیان ہوتے طاقت ہوتی سب کچھ ہوتا لیکن مجھے پتھر کے ایک مجسمے کی طرح ایک جگہ ساکت رہنا پڑتا، سو میں نے وہاں سے فرار مناسب سمجھا اور جو بھی پہلا زاویہ مجھے نظر آیا میں اس زاویے میں گم ہو گئی، کوئی جانا پہچانا راستہ نہیں اختیار کیا تھا میں نے، بس مجھے ایلی گوس کے سامنے سے غائب ہونا تھا، وہ زاویوں کا علم نہیں جانتا تھا، لیکن اپنے گیان سے اس نے یہ پتہ لگا لیا کہ میں کس سمت گئی ہوں اور اس نے اسی سمت کا سفر شروع کر دیا۔

میں سچ مچ اس سے ڈر گئی تھی، میں نے ہواؤں میں اور فضاؤں میں اپنا ٹھکانہ نہ بنایا بلکہ ایک

اندھیرے غار کا رخ کیا اور غار میں جا چھپی۔ جس وقت میں اس غار میں داخل ہوئی دن کی روشنی تھی لیکن غار میں اندر سے بھیانک تاریکی تھی، ایلی گوس میرا پیچھا کررہا تھا اور میری خوشبو سونگھتا پھر رہا تھا، میں درحقیقت ڈر گئی تھی کیونکہ جو منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس نے مجھے دیوانہ کردیا تھا، میری ساری کوششیں ساری قوتیں اس جگہ ختم ہوجاتی تھیں جہاں میں ایک زندہ وجود کی حیثیت سے مجسمے کی شکل اختیار کرلیتی۔

ذرا سوچو ذیشان عالی مجھے موت نہیں ہے اور میں صدا جیتی رہوں گی، لیکن کس انداز میں...... ایلی گوس مجھ سے انتقام لینے میں حق بجانب تھا کیونکہ میں نے اس سے اس کی قوتیں چھین لی تھیں۔

غار میں کافی سے گزارلیا، پھر رات ہوگئی اور میں ایک پتھریلی زمین پر بیٹھ کر ایک جگہ لیٹ کر سوچنے لگی کہ ایلی گوس سے پیچھا کیسے چھڑایا جاسکتا ہے۔ پھر نجانے رات کا کون سا سمے تھا مجھے نیند آگئی تھی اور میں گہری نیند سورہی تھی کہ دفعتاً ہی میری آنکھ کھل گئی، کچھ ایسی آہٹیں ابھری تھیں، میں دہشت سے سکڑ گئی، میرا خیال تھا کہ ایلی گوس آخر کار میرا پتہ پانے میں کامیاب ہوگیا، میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا جو غار دن کی روشنی میں تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اب وہاں مدھم مدھم روشنی ہوتی جارہی تھی اور اس روشنی میں میں نے کچھ بوڑھے آدمیوں کو دیکھا وہ گردن سے لے کر پیروں تک لبادوں میں لپٹے ہوئے تھے اور ان کے چہرے روشنی میں نمایاں تھے، آہ میں نے جو کچھ دیکھا وہ میرے لئے بڑا سنسنی خیز تھا جانتے ہو ان میں سے کچھ شناسا چہرے کون سے تھے۔

میں چونکہ یونان میں کافی سے بتا چکی تھی اور یونان کی تاریخ سے مجھے پوری طرح شناسائی حاصل تھی اس لئے میں نے انہیں پہچان لیا، ان میں سے ایک افلاطون تھا، دوسرا بطلیموس، تیسرا ابقراط، چوتھا سقراط اور اس کے علاوہ کچھ ایسے اجنبی جنہیں میں نہیں جانتی تھی لیکن ان کے انداز سے پتہ چل رہا تھا کہ یونان کی قدیم تاریخ کے کچھ اہم کردار ہوں گے وہ سب میری ہی جانب نگراں تھے اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر وہ میرے قریب پہنچ گئے غالباً وہ بطلیموس تھا جس نے مجھ سے اٹھنے کے لئے کہا۔ سب کے چہروں پر فکرمندی کے آثار تھے بطلیموس بولا۔

''سنو! ہم تمہیں جانتے ہیں، تم کوروتی ہو کیا، ہم نے غلط کہا؟''

میں نے خود کو سنبھالا اور آہستہ سے بولی۔

''نہیں......''

تب سقراط آگے بڑھا اور اس نے کہا۔

''کوروتی تم کوئی نوجوان لڑکی نہیں ہو، اپنا اچھا برا سب سمجھتی ہو ایلی گوس یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے، وہ چیخ چیخ کر تمہیں پکارتا پھر رہا ہے، وہ ہواؤں سے مدد مانگ رہا ہے، وہ فضاؤں سے باتیں کررہا ہے اور کہتا ہے کہ وہ تمہاری نشاندہی کریں، وہ اس غار میں آسکتا ہے وہ تمہیں پاسکتا ہے لیکن میں تمہیں ایلی گوس سے بچنے کی دعوت دیتا ہوں، تمہیں ہمارا کام کرنا ہوگا اور تم اس سے بچ سکتی ہو۔''

میں جانتی تھی کہ یہ قدیم روحیں ہیں جو یہاں میرے گرد جمع ہوگئی ہیں، میں نے خود کو سنبھال اور ان سے سوال کیا کہ وہ کون سا ایسا عمل ہے جس کے تحت ایلی گوس سے اپنا جیون بچاسکتی ہوں تب سقراط کہنے لگا۔

''میرا شاگرد سکندر اس وقت ایک عجیب مشکل میں گرفتار ہے، اس کی محبوب ہستی اصناکیہ جو اس کی بیوی ہے گم ہوگئی ہے، سکندر کہیں مصروف ہے لیکن اس تک یہ اطلاع پہنچ چکی ہے کہ اصناکیہ لاپتہ ہے اس نے اپنے خاص آدمیوں کا ایک دستہ اصناکیہ کی تلاش پر مامور کیا ہے اور وہ اسے جگہ جگہ تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ سکندر کو جو کچھ کرنا ہے وہ تاریخ کا بہت بڑا حصہ بننے والا ہے، لیکن اگر اصناکیہ اسے نہ ملی تو خیال ہے کہ وہ دلبرداشتہ ہوجائے گا اور اس کے بعد تاریخ نجانے کون

سارخ اختیار کرلے۔

لیکن کوروتی اصناکیہ زندہ نہیں ہے، وہ ایک حادثے کا شکار ہوکر مرچکی ہے اور اس کی لاش اسی غار میں ہمارے پاس محفوظ ہے، ہم غور کررہے تھے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے، بہت سی باتوں کے بارے میں ہمیں علم ہے کہ وہ کس حیثیت کی حامل ہوتی ہیں کیونکہ ہم اس دنیا سے دور نکل چکے ہیں اور ایک نئی دنیا کے مسافر ہیں، ہمیں معلوم ہے کوروتی کہ تیرے پاس پوشیدہ علوم ہیں اور تو آب حیات پی چکی ہے، یعنی تو زندہ رہنے والوں میں سے ہے، جو علم تیرے پاس ہیں ان میں سے ایک علم یہ بھی ہے کہ تو مردہ اجسام میں داخل ہوکر ان کی حیثیت اختیار کرسکتی ہے۔تو بالکل اتفاقیہ طور پر ادھر نکل آئی ہے۔

لیکن یہ گیلاس پیش گوئی کررہا ہے کہ بہت جلد اصناکیہ کی زندگی کے لئے ایک حل نکلنے والا ہے، یہ ستارہ شناس ہے اور یونان کی تاریخ میں گیلاس کا نام ایک ستارے کی حیثیت ہی رکھتا ہے۔یونانیوں کا کہنا ہے کہ گیلاس کی راتیں کہکشاں میں ستاروں کے ساتھ گزرتی ہیں اور وہ ان سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے، تو گیلاس ستارہ شناس نے یہ بتایا کہ ایک عورت آنے والی ہے جو ان مشکلات کا حل بنے گی اگر تو ایلی گوس سے نجات چاہتی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ ایلی گوس تیرا پتہ نہ پاسکے اور تجھ سے اپنا انتقام نہ لے سکے تو تو اصناکیہ کے قالب میں چلی جا اور اس کی حیثیت سے دو فائدے حاصل کر، پہلا یہ کہ تو ایلی گوس سے محفوظ رہ جائے گی، دوسرا یہ کہ سکندر کی زندگی کا ایک اہم باب شروع ہوجائے گا اور وہ پورے اطمینان سے وہ سب کچھ کرسکے گا جو تاریخ کا منصب ہے۔''

ذیشان عالی! زندہ انسان کے ذہن میں خوف کا عنصر بالکل اسی طرح ہوتا ہے جیسے سانس لینے کا، درحقیقت جسم کے مختلف حصے ہوتے ہیں، جن میں سے ہر ایک حصے کا الگ الگ کام ہوتا ہے اور اس کے بغیر اجسام مکمل نہیں ہوتے، تو خوف بھی ایک وجود ہے جس کی مثال یہ ہے کہ ایک نوزائیدہ بچے کو جسے دنیا کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوتا سوائے ان دو چیزوں کے، یعنی ایک بھوک جس میں وہ روتا ہے یہ اس کی طلب ہے، جو آنسو اور آواز کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ دوسرا خوف، تم ایک چھوٹے سے بچے کے قریب ایک زور کی آواز پیدا کردو تو وہ اچھل پڑتا ہے یعنی اس کے خمیر میں خوف کا جو عنصر ہے وہ نومولودیت کے ساتھ بھی ہوتا ہے تو میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ ایلی گوس کے تاثر سے مجھے بھی خوف کا احساس ہوتا تھا اور میں ایک پتھریلا زندہ مجسمہ نہیں بننا چاہتی تھی۔

سو میں نے ان دنیا سے چلے جانے والے مفکروں کی وہ تجویز قبول کرلی اور انہوں نے مجھے اصناکیہ کا وہ جسم دکھایا جو وہیں اس غار میں موجود تھا اور ابدی نیند سو رہا تھا۔

کیا ہی حسین عورت تھی ایسے دلکش یونانی نقوش کہ آنکھیں ان پر جم کررہ جائیں اور پھر جواں مرد سکندر جس کی کہانیاں میرے کانوں تک پہنچ چکی تھیں، مجھے یہ سب کچھ بہت دلچسپ لگا اور میں نے اپنے گیان سے کام لے کر اصناکیہ کے قالب میں داخل ہونے کا عمل شروع کردیا اور کچھ لمحوں کے بعد اس کے روپ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

پراسرار بوڑھے مجھے اس طرح اٹھتے دیکھ کر خوش ہوگئے اور ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے کہ انہوں نے اس فاتح اعظم سکندر کو نئی زندگی دے دی۔

اس وقت میری سب سے پہلی طلب بھوک تھی جس کا میں نے ان لوگوں سے اظہار کردیا اور آخرکار تمام امور سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ مجھے ایک ایسی جگہ لے آئے جہاں سے سکندر کے لوگوں نے مجھے دیکھ لیا اور خوشیوں میں ڈوب کر مجھے اپنے ساتھ لے کر چل پڑے۔

میں ایک دلکش حیرت سے دوچار تھی اور سوچ رہی تھی کہ آنے والا وقت میرے لئے کتنی دلچسپی کا حامل ہوگا، میں نے اپنے اندر اصناکیہ کی فطرت اور اس کے

ماضی کا جائزہ لیا اور چونکہ اب میں اصناکیہ تھی اس لئے اس کے بارے میں اب میں سب کچھ جانتی تھی۔

اصناکیہ کو فارس کے تاریک ایام میں اپنے وطن کی مدد کرنے کے لئے پیدا کیا گیا تھا اور وہ یعنی بعد کی میں باختر کے گورنر کی پہلی اولاد تھی، میرا یعنی اصناکیہ کا باپ شاہ فارس کی سلطنت میں سگودیہ کا حکمران تھا، ان دنوں فارس کی حکومت ایشیاء کے ایک تہائی حصے میں پھیلی ہوئی تھی، میری ماں سینی رامس ایک اعلیٰ خاندان کی بیٹی تھی، جس کی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا تھا اور وہ میرے باپ کی پہلی بیوی تھی۔

واہ کس دلچسپ کہانی کا آغاز ہوا ہے اور ایک بات میں تمہیں بتاؤں ذیشان عالی کہ صدیوں کے اس سفر میں ایک قدیم روح کا سفر بہت ہی دلکش اور دلچسپ تھا اور چونکہ میں خود بھی تاریخ کی دیوانی تھی اس لئے مجھے اپنے اس نئے روپ سے بہت دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔

فارس کا قدیم اور تاریخی شہر ثمرقند چاروں طرف سے سرسبز و شاداب پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا اور اس کے حسن پر جنت ارضی کا گمان ہوتا تھا۔ اسی خوبصورت شہر کے ایک پرشکوہ محل میں میرے والدین کی رہائش تھی محل کی دیواریں چکنی اور رنگین اینٹوں سے تعمیر کی گئی تھیں، ان کے سرخ اور نیلے رنگ کے درمیان بنے ہوئے سنہری ستون اور چھت کے رنگ برنگے نقش و نگار صناعی کے نادر نمونہ تھے، شاہ داریوش سوئم کے دور حکومت کے آٹھویں سال میں چوتھے ماہ کی چھٹی تاریخ کو میں نے اصناکیہ کی حیثیت سے اس دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں، زندگی کے ابتدائی ایام میں نے محل کے اس اندرونی حصے میں بسر کئے جو حرم کہلاتا تھا، ویسے مجھے اپنے باپ کو بہت کم دیکھنے کا موقع ملتا تھا، میں جب پانچ برس کی تھی تو ایک دن وہ بڑے غصے میں اندر آیا اور اس نے میری ماں سے کہا کہ اس نے معبد سے اجازت لے کر مجھے اپنا جانشین بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے تب میری ماں نے حیرت زدہ ہوکر کہا کہ لڑکی کس طرح جانشین ہوسکتی ہے، لیکن میرے باپ نے ماں کی بات رد کردی اور جواب دیا کہ وقت یہی کہتا ہے کہ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ چار بیویوں اور کنیزوں سے میرے باپ کی چوبیس اولادیں ہوئیں لیکن سب کی سب لڑکیاں تھیں وہ مزید انتظار نہیں کرسکتے تھے اور پھر بڑے معبد نے جو اس دور کے مذہبی رہنما تھے اس کی اجازت دے دی تھی اس لئے میرے باپ نے اپنے فیصلے کا اعلان کرکے کہا خدائے ہرمز کو یہی منظور ہے تو اصناکیہ ہی میری جانشین بنے گی انہوں نے کہا کہ اگر یہ لڑکا ہوتی تو پانچ برس کی عمر میں معبد کے پاس تربیت کے لئے جاچکی ہوتی، اب یہ میری جانشین بن چکی ہے، اس لئے آئندہ زندگی اسے لڑکے کی طرح بسر کرنا ہوگی، ذیشان عالی اس نے یعنی میرے باپ نے یعنی اصناکیہ کے باپ نے مجھے اٹھا کر اپنے گھٹنے پر بٹھالیا اور پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”اصناکیہ! آج سے تو میری جانشیں ہے، میری ساری دولت ملکیت محل اور خزانے آج سے تیرے ہیں، لیکن تجھے ان کی حفاظت کے لئے بہت کچھ سیکھنا ہے، میں چاہتا ہوں کہ تو بیٹے کی طرح میرا نام روشن کرے۔“

آہ ذیشان عالی ذرا سوچو کیا ہی دلکش اور دلچسپ منظر تھا جب میں اپنا بچپن دیکھ رہی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ اس کے زانو پر بیٹھی ہوئی تھی اور وہ مجھے مستقبل کے لئے نصیحتیں کررہا تھا۔

میرا باپ بہت خوش تھا کہ اس نے مجھے اپنا جانشین مقرر کیا، لیکن ماں میری جدائی پر آنسو بہا رہی تھی، ایک طرح سے میں اس سے دور ہی ہورہی تھی، مجھے محل میں بنی ہوئی عبادت گاہ میں بڑے معبد کی رہائش گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں میری رہائش کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں میرا بستر ایک چھوٹی سی میز کپڑے رکھنے کی چوب ضرورت کے سامان اور کنیز کے سونے کے لئے لکڑی کا ایک تختہ تھا، میری کنیز اصنارہ بڑی بدصورت تھی، عبادت گاہ میں خوبصورت کنیزیں نہیں رکھی جاتی تھیں تاکہ پجاریوں کے جذبات قابو

میں رہیں اور میرے استاد کا نام ہاروس تھا۔

میری تعلیم زرتشت مذہب کے بنیادی اصولوں سے ہوئی جن کے مطابق حضرت زرتشت خدا کے پیغمبر تھے ان کا ظہور ایک ہزار سال قبل ہوا تھا۔ زرتشت دین کی مقدس کتاب آوستا تھی جس کی اکیس جلدیں سونے سے لکھی ہوئی تھیں، یہ مقدس کتابیں شہر کی پولیس کے شاہی خزانے میں محفوظ تھیں، میرے استاد نے اپنے درس میں مذہب کے جو اصول بتائے ان کی بنیاد نیک گفتار نیک کردار اور نیکیوں کے تمام اصولوں پر رکھی گئی تھی۔ مذہبی رہنماؤں کا ایک علیحدہ قبیلہ تھا جسے مغ کہتے تھے، میرے معبد بھی مغ کے درجے پر فائز تھے، پھر یوں ہوا کہ میری تعلیم کے ابتداء کے کچھ ہی عرصے کے بعد میرے باپ کو اپنا جانشین مل گیا یعنی وہ بیٹا جو میری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا اور جس کا نام راوش رکھا گیا۔ میں اپنے بھائی سے حسد کرنے لگی، لیکن میرے استاد نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ والدین کی محبت کا سمندر بہت گہرا ہوتا ہے تو فکر نہ کر خدائے بزرگ و برتر نے تجھے پہلے منتخب کیا ہے، اپنے باپ کی جانشین تو ہی رہے گی، میں نے مقدس آتش کدے کے سامنے سورج طلوع ہونے کا منظر پہلی بار دیکھا، کیونکہ زرتشت مذہب کی عبادت اسی وقت کی جاتی تھی اور عبادت کے موقع پر مذہبی کلمات پڑھے جاتے تھے۔ پھر سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی تیز دھار خنجر قربانی کے بیل کی شہ رگ کاٹ دیتا تھا، پہلی مرتبہ میں اس ہولناک منظر سے خوفزدہ ہو کر رونے لگی، لیکن آہستہ آہستہ اس خونی نظارے کی عادی ہوگئی۔

ذیشان عالی میں پوری دلچسپی سے اپنے فرائض انجام دے رہی تھی، البتہ مجھے چودھویں سالگرہ کے بعد ایک اور استاد کے سپرد کر دیا گیا، پھر اس دن میں نے اپنی ماں کو آتے ہوئے دیکھا، ماں نے مجھے بتایا کہ میری عمر چودہ برس ہو چکی ہے چنانچہ مجھے نسوانی تعلیم کے لئے حرم میں واپس طلب کیا گیا ہے، میں نے سخت احتجاج کیا لیکن ہدایت تھی کہ مجھے حرم میں واپس جانا ہے، اتنے عرصے تک لڑکے کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے بعد مجھے حرم کا ماحول بے حد ناگوار محسوس ہوا۔ عود و عنبر کی تیز خوشبو خواجہ سراؤں کی بے سری آوازیں اور بچوں کی مسلسل چیخ و پکار سے میرے نا آشنا کان ناواقف ہو چکے تھے لیکن اب یہ سب کچھ مجھے سنائی دے رہا تھا اور مجھے بے حد ناگوار تھا، میری ماں کی محل سرا میں شاہانہ سجاوٹ تھی، دیواروں اور دروں پر سنہرے تاروں سے بنے پردے، چھتوں پر خوب صورت جھاڑ فانوس، مخملیں نرم و گداز گدے کھانے کے لئے اعلیٰ ترین غذائیں اور کنیزوں اور خواجہ سراؤں کی خوشامدانہ خدمت گزاریاں یہ سب میرے سامنے لایا جا رہا تھا، حال میں انہیں دیکھنا میرے لئے ایک ناپسندیدہ عمل تھا جبکہ ماضی میں نجانے میں کن کن لمحات سے گزر چکی تھی۔

پھر ایک دن میری ماں نے مجھ سے کہا۔

''اصناکیہ! ایک بہت بڑی خوشخبری ہے تیرے لئے۔''

''کیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''تو نے سکندر کا نام سنا ہے؟''

میں نے اپنی ماں کا چہرہ دیکھا نجانے وہ کیا کہنا چاہتی ہے تاہم میں نے اس سے کہا۔ ''ہاں ماں، مجھے یہ نام بتایا گیا ہے، وہ مقدونیہ کے شاہ فلپ کا بیٹا ہے، یونان کو فتح کرنے کے بعد اس نے ایشیا کا رخ کیا ہے اور اس نے ہمارے شاہ فارس کی فوجوں کو بھی جنگ میں حیرت انگیز طور پر شکست دے دی ہے، لیکن آپ کس خوشخبری کا ذکر کر رہی ہیں۔''

''شاہ فارس نے اعلان کیا ہے کہ اب وہ سکندر کو شکست دینے کے لئے خود فوج لے کر جائیں گے اور اس کے لئے پورے ملک سے افواج کو جمع کیا جا رہا ہے۔ آج تمہارے بابا کو بھی وہ فرمان لا کر دیا ہے۔ جس کے مطابق شاہ نے بابل میں تمام سرداروں کو طلب کیا ہے تاکہ سکندر کی شکست کے لئے جنگی تیاریوں کو آخری شکل دی جا سکے، اس لئے ہم سب بابل جا رہے ہیں؟''

میں نے پوچھا۔

نجانے کیوں میرے دل کو ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا تھا۔ ''بابل! ہم واقعی بابل جارہے ہیں۔''

''ہاں میری بیٹی، کیا تو نے واقعی بابل کے بارے میں تفصیل سنی ہے۔''

''ہاں میں جانتی ہوں بابل دنیا کے حسین ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے اور فارس کی آخری سرحدوں پر واقع ہے، مگر ماں ہم کب تک وہاں چلیں گے؟''

میرے سوال پر میری ماں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''پگلی نام سن کر ہی اتنی خوش ہورہی ہے، لیکن بابل شہر میں تجھے دربار شاہی میں بھی حاضری دینا ہوگی، جہاں سارے ملک کے امراء، سردار اور خاندان شاہی کے افراد موجود ہوں گے، تیرے باپ کی خواہش ہے کہ اصنا کیہ اس انداز میں وہاں داخل ہو کہ اس کے حسن و جمال کی روشنی سب کو سحر زدہ کردے، خدا نے تجھے ایسا حسن دیا ہے جو مرد کی نگاہوں کو خیرہ کردے، تیرے بدن کو اس انداز میں تراشا ہے کہ بینس کا جیتا جاگتا وجود سامنے محسوس ہوتا ہے، تیرے حسن میں وہ کروفر ہے کہ مجھے فخر محسوس ہوتا ہے کہ تو میرے جسم کا ایک حصہ ہے، لیکن خیال رکھنا میری بیٹی حسن کو ہمیشہ آرائش کی ضرورت ہوتی ہے، تجھے ابھی لباس پہننے کا سلیقہ سیکھنا ہے اور دربار شاہی میں نشست و برخاست پر گفتگو کے آداب کی تربیت بھی حاصل کرنی ہے، اس کے لئے میں نے بندوبست کردیا ہے۔''

جو بندوبست میری ماں نے وہاں کیا تھا وہ یہ تھا کہ مجھے خواجہ سرا موسال اور مشاطہ کے حوالے کردیا گیا، انہوں نے میرے حسن کو بے حجاب کیا تو میں خود مسحور ہوگئی، درحقیقت ذیشان عالی میں اپنی زندگی کے اس دور کو کبھی نہیں بھول سکتی جب میں نے خود اپنا اجنبی بدن دیکھا جو میرا نہیں درحقیقت ادھار کا بدن تھا تو میں اس کی دیوانی ہوگئی، میرا یہ جسم سنگ مرمر کی طرح شفاف اور بلورین تھا، ایک ایک انگ قدرت کی صناعی کا نمونہ تھا، پھر مجھے وہ سب کچھ سکھایا گیا جو ایک عورت کے لئے ضروری ہوتا ہے اور جس کے بغیر اس کی زندگی حقیقی مسرتوں سے محروم رہتی ہے۔ یہاں تک کہ سفر کی تیاریاں شروع ہوگئیں اور آخر کار روانگی کی صبح آگئی۔

ذیشان عالی میں صدیوں پرانی روح بلکہ ایک زندہ وجود ایک اجنبی بدن کے ساتھ سفر کررہی تھی اور یہ سفر اس قدر دلکش تھا کہ میرا دل چاہتا تھا کہ ختم نہ ہو، لیکن ستائیس دن تک ہمارا یہ قافلہ بلند پہاڑی راستوں، تنگ دروں، خطرناک گھاٹیوں اور جھلستے ہوئے ریگستانوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا رہا، جب سفر کے دوران دھوپ کی تمازت ناقابل برداشت ہوجاتی تو دن کو قیام کیا جاتا اور رات کو سفر، تاریکی کی بناء پر مشعل بردار سوار ساتھ ساتھ چلتے تھے، رہنمائی کرتے۔ ہم اس قدیم راستے پر سفر کررہے تھے جو سائرس اعظم نے اختیار کیا تھا، باختر کی کارواں سرائے میں قیام کرکے ہم نے پھر آریہ جا کر دم لیا، سوساپری پولیس اور بابل سے آنے والے قافلے ہمیں ان کارواں سرائے میں ملتے رہے ان کے ذریعے ہمیں خبریں ملتی رہیں کہ موسم سرما میں آرام کرنے کے بعد اب سکندر نے پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ حملے کرکے ایشیا میں پیش قدمی شروع کردی ہے اور اب پورا فارس اس بات کا منتظر تھا کہ کب شاہ دارا اپنی فوجوں کے ساتھ آگے بڑھ کر سکندر کی سرکوبی کرتا ہے۔

اب تک ہم آرام سے سفر کرتے چلے جارہے تھے، پھر ایک رات جب تاریکی اتنی گہری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجائی دے، ہمارے کتوں نے اچانک زور زور سے بھونکنا شروع کردیا اور اسی کے ساتھ بہت سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں قریب آتی سنائی دیں، پتہ چلا کہ ڈاکوؤں نے اچانک حملہ کردیا ہے، فوراً ہی ہمارے مسلح سواروں نے عورتوں، سونے اور قیمتی سامان سے لدے ہوئے خچروں کے گرد حفاظتی ڈیرہ ڈال دیا، ڈاکوؤں کا حملہ بہت شدید تھا، اس وقت میں اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، میری چھوٹی بہن مجھ سے لپٹی ہوئی تھی کہ ہم نے بھیڑیوں کی طرح خوفناک ڈاکوؤں کو

آگے بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ان کے چہرے بالوں میں ڈھکے ہوئے تھے اور وہ ہمارے محافظوں پر بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ پھر اچانک ہی میں نے ڈاکوؤں کے سردار کو حصار توڑ کر آگے بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ڈاکوؤں نے خوب صورت کنیزوں کو گاڑیوں سے گھسیٹ گھسیٹ کر اپنے گھوڑوں پر بٹھانا شروع کر دیا تھا، لیکن سردار کا رخ ہماری گاڑی کی طرف تھا۔ میں نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا لیکن ایسا کوئی عمل ذہن میں نہ آیا جس سے سردار سے رہائی حاصل کر سکتی، خونخوار شکل والا سردار تیر کی طرح ہماری گاڑی پر جھپٹا اور دوسرے ہی لمحے میری کلائی اس کی آہنی گرفت میں تھی، میری بہن اور میری ماں نے اپنے بالوں کی نوکیلی پن اس کے بازو میں چبھوئیں لیکن اس جنگلی پر جیسے اثر ہی نہ ہوا، وہ ایک زوردار قہقہہ مار کر چلایا۔

''ارے واہ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی مجھے مل گئی۔'' اس نے مجھے کھینچنے کی کوشش کی لیکن میری ماں اور میری بہن میرے جسم سے لپٹ گئیں اس وحشی نے ایک جھٹکے کے ساتھ مجھے گھسیٹ کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا، لیکن اس جدوجہد میں میرے باپ کو نہ دیکھ سکا جو جھپٹ کر اس کے سر پر پہنچ چکا تھا اس کے تیز دھار تیغے نے ایک ہی وار میں ڈاکوؤں کے سردار کی گردن تن سے جدا کر دی، اپنے سردار کو گرتے دیکھ کر ڈاکوؤں نے راہ فرار اختیار کی اور تھوڑی ہی دیر میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس کے بعد ہمارا سفر پھر سے آگے جاری ہو گیا۔

حقیقت یہ تھی کہ ڈاکوؤں کے اس حملے میں میں نے محسوس کیا تھا ذیشان عالی کہ مجھے کوئی نقصان بھی پہنچایا جا سکتا ہے، جس منزل کی جانب میں آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور جدھر سفر میرے لئے ضروری تھا اس میں رکاوٹ پیش آ جاتی، مجھے تو جس منصب کے لئے تیار کیا گیا تھا، میں اس کی تکمیل کر کے ایلی گوس سے بچنا چاہتی تھی اور اس سے چھینے ہوئے علم کو اپنے لئے مستحکم کرنے کی خواہش مند تھی، راستے میں سکندر کی مسلسل پیش قدمی کی خبریں ملتی رہیں، البتہ میں نے کسی سے پوچھا کہ آخر سکندر کی ان فتوحات کا سبب کیا ہے، تو مجھے بتایا گیا کہ سکندر پر دیوتاؤں کا سایہ ہے، یونانیوں میں ایک روایت یہ بھی ہے ذیشان عالی کہ دیوتا زیورس کو سکندر کی ماں اولمپئن سے عشق ہو گیا تھا پھر ایک دن زیورس سانپ بن کر اس کے بستر پر سو گیا اور سکندر کی پیدائش اسی کا نتیجہ ہے، اس بات کو سننے کے بعد اس نے اعتراض کیا کہ سانپ کو زیورس دیوتا تو نہیں کہا جا سکتا، میرے اتالیق نے ہنس کر مجھے جواب دیا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو بیٹی، یہ سب محض روایتیں ہیں اصل بات یہ ہے کہ یونانی فوج بڑی دلیر اور فن حرب سے واقف ہے، سکندر کی تربیت یونان کے مشہور فلسفی ارسطو جیسے عالم نے کی ہے۔''

''مجھے ایک بات بتایئے، اتالیق اعظم، کیا شاہ دارا اس کی فوجوں کو عبرت ناک شکست دے سکیں گے۔'' میں نے سوال کیا۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو، حالانکہ شاہ دارا کی فوجوں کی تعداد سکندر کی افواج سے بہت زیادہ ہے، لیکن بدقسمتی سے ہماری فوجیں کرائے کی ہیں۔'' اتالیق کے لہجے کی فکرمندی نے مجھ پر ایک عجیب سا تاثر قائم کیا اور میں سکندر کے بارے میں سوچتی رہی، میں تمہیں ایک بات بتاؤں ذیشان عالی عورت بھی عجیب چیز ہوتی ہے، حالانکہ میں جس ملک اور جس وطن سے تعلق رکھتی تھی، وہ سکندر کے دشمنوں کا دیس تھا، لیکن سکندر اعظم کی بہادری اور اس کے متعلق بیان کی جانے والی داستانوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا اور میں احمقانہ کی حیثیت سے جاگتی آنکھوں اس کے خواب دیکھنے لگی تھی، وہ کیسا ہوگا، یونان کے حسن و جمال کے بارے میں، میں نے سن رکھا تھا کہ وہاں کھڑے کھڑے نقوش کے لوگ ہوا کرتے تھے، دلکش شخصیتوں کے مالک، تو اپنے دشمن کے خواب مجھے نظر آنے لگے تھے، لیکن تم ہنسو گے کہ میں اس کی دشمن بھی نہیں تھی، میں تو اپنی زندگی بچانے کے لئے اس روپ

میں سفر کر رہی تھی۔

''ارے یہ تمہارے چہرے کے تاثرات کیا بتا رہے ہیں۔'' اچانک ہی کوروتی نے کہا اور میں چونک پڑا، مجھے بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے میں دارا کی فوجوں کے ساتھ سفر کر رہا ہوں' راستے کا ہر منظر میری نگاہوں کے سامنے ہے اور میں خود اس لشکر کا لشکری ہوں' بس یہ بھی شاید کوروتی کے طرز گفتگو کی خوبی تھی کہ انسان اس ماحول میں کھو جائے، تبھی میں نے چونک کر کہا۔

''کیا ہوا کوروتی، تم نے کیا محسوس کیا میرے چہرے سے۔''

کوروتی ہنسنے لگی پھر بولی۔ ''میں صدیوں سے جی رہی ہوں ذیشان عالی، صدیوں کا تجربہ میرے وجود میں پیوست ہے، لیکن میں تمہیں ایک بات بتاؤں انسانی فطرت شاید جب سے انسان وجود میں آیا ہے یکساں رہی ہے، اس کے اندر حسن پرستی، خود پسندی اور کسی بھی چیز سے متاثر ہونے کے جذبے اتم حیثیت رکھتے ہیں، جب میں سکندر اعظم کا تذکرہ کر رہی تھی تو میں نے تمہارے چہرے پر رقابت کا تاثر محسوس کیا، تم سکندر اعظم کی تعریف سے خوش نہیں ہوئے تھے۔''

میں نے اسے دیکھا اور پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آ گئی، واقعی میں تھوڑی سی جلن محسوس کرنے لگا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کوروتی اب میری محبوبہ تھی، چاہے فرد فراموشی ہی کی بات کہہ لی جائے، یعنی کہاں میں اور کہاں وہ لاکھوں سال پرانی شخصیت جو بے شک انسانی جسم رکھتی تھی لیکن اگر اس کی زندگی کی تاریخ پر غور کر لیا جائے تو انسان کو اپنے آپ پر ہنسی آنے لگے، لاکھوں سال کی یہ عورت موجودہ زندگی میں میری محبوبہ تھی اور میں اس سے بہت متاثر تھا، میری ہنسی پر وہ بھی ہنسنے لگی پھر بولی۔

''میں نے کہا نا تم آج کی بات کر رہے ہو، میں لاکھوں صدیوں سے ان تمام کیفیات سے دوچار ہوتی ہوئی آئی ہوں، یہاں انسان اپنے آپ کو تبدیل نہیں کر سکتا۔''

''آہ میں بیچارے گوتم بھنسالی پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس کا دکھ اپنے دل میں محسوس ہوتا ہے، وہ بھی تمہارے ساتھ لاکھوں صدیوں سے سفر کر رہا ہے، صرف تمہاری محبت میں، ورنہ جیسا کہ تم نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس بھی بے شمار علوم ہیں اور ان علوم کے ذریعے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا، لیکن دیکھو اس کائنات میں جب عشق کی کہانیاں جنم لیتی ہیں تو پھر ایسے ہی انوکھے واقعات وجود میں آتے ہیں، محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو جسمانی اور ذہنی طور پر بالکل مفلوج کر دیتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں اور محبوب کا تصور اس کے لئے اس کی زندگی کی بنیاد بن جاتا ہے۔ اگر راستے میں آنے والے کسی بھی شخص سے وہ نفرت کرتا ہے تو اس میں وہ غلط نہیں ہے چونکہ یہ بھی اس کی فطرت کا حصہ ہے۔''

''میں تم سے اتفاق کرتی ہوں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔''

''چلو آگے بڑھو میں سکندر کی فوجوں کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ سکندر اور دارا کی جنگ کس طرح سے وجود میں آئی اور اس میں کیا ہوا؟''

کوروتی میری اس دلچسپی سے بہت خوش ہوئی اس نے کہا۔ ''یوں کرو کہ جب میں اپنی داستان دوبارہ شروع کروں تو تم میری آنکھوں میں دیکھتے رہو، ذرہ برابر یہ احساس نہیں ہوگا کہ تم اس دور کا کوئی کردار نہیں ہو، اس بار جب ہم صدیوں میں داخل ہوں گے تو میں تمہیں کوئی وجود نہیں دے سکوں گی کیونکہ میں خود وہاں ایک ایسے وجود میں سفر کر رہی ہوں جو کوروتی کا وجود نہیں ہے بلکہ ادھار کا بدن ہے جسے جینا ہے۔''

''تمہاری باتیں بے شک الجھی ہوئی ہیں جب زندہ صدیاں کتابی شکل میں آئے گی اور لوگ اسے پڑھیں گے تو اس کے بعض واقعات میں اس طرح الجھ جائیں گے کہ ان کا ذہن ان واقعات کو کوئی حل نہیں نکال پائے گا، لیکن میں اپنی اس کتاب میں تمہارے ساتھ گزرے ہوئے ایک ایک لمحے کا تذکرہ کروں گا اپنے

احساس کی ہی نہیں تمہارے احساس کی بھی صحیح ترجمانی کروں گا۔"

"آہ تمہاری ہر خواہش تمہاری زندگی میں پوری ہوجائے، میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہے اور کبھی کبھی ذیشان عالی کیسا عجیب سا لگتا ہے کہ ہم جس کو چاہتے ہیں اسے اپنے ساتھ دور تک نہیں لے جاسکتے کیوں کہ وہ فنا کا مقام رکھتا ہے اور وہ میرے ساتھ جی نہیں سکتا، خیر چلو چھوڑو، آؤ میری آنکھوں کے راستے سکندر کے دور کا سفر کرو۔" اس نے کہا اور میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے ملیں، درحقیقت مجھے یوں لگا جیسے میرے اطراف میں نارنجی رنگ بکھرتا جارہا ہو، یہ بھی شاید گزرے لمحات کا کوئی تاثر تھا، نارنجی رنگ فضا میں پھیلتا چلا گیا اور اس کے بعد جب فضا صاف ہوئی تو میں نے دیکھا کہ دارا کی فوجیں آگے کا سفر کررہی ہیں بابل کی طرف۔

بابل اس دور میں عالمگیر شہرت کا شہر تھا، یہ بہت بڑا تجارتی مرکز تھا جہاں دنیا کے گوشے گوشے کے تاجر خرید وفروخت کے لئے آتے تھے۔ سرسبز اور خوبصورت باغات نے شہر کے حسن کو دوبالا کردیا تھا، شہر کے گرد ایک گہری خندق تھی اور عین درمیان سے دریائے فرات خراماں خراماں بہتا تھا جس میں بجرے جہاز اور کشتیاں رواں دواں تھیں۔

یہ عظیم الشان کارواں دروازے سے بابل میں داخل ہوا، میری آنکھیں اس طرح کوروتی کی آنکھوں میں گم ہوگئی تھیں اور یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی سحر میں گرفتار ہوگیا ہوں، میری نگاہوں کے سامنے شہر بابل تھا۔

بابل کے حسن نے مجھے اس طرح اپنے جال میں جکڑ لیا تھا کہ میں یہ بھول گیا تھا کہ میں ایک جدید ملک کے جدید ترین شہر کے خوب صورت سے گھر میں بیٹھا ہوا ہوں جو ایک تحریر نگار ذیشان عالی کا گھر ہے، بلکہ میں اس وقت بابل کے حسین مناظر میں گم تھا اور یہ سارے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، پھر یہ قافلہ شہر کے بڑے بازار میں پہنچا، یہاں کی رونق اور چہل پہل دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا۔ مختلف ممالک کے لوگ زرق برق پوشاکوں میں گھوم رہے تھے، ان کے خوبصورت چہروں کی دمک سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہورہی تھیں۔ یہاں تک کہ ہماری منزل آگئی، پھر کوروتی کی آواز ابھری۔

"ہمیں قیام کے لئے جو محل دیا گیا تھا وہ شاہی محل کے بالکل قریب تھا، اس کی خوب صورت عمارت چکنے فرش، رنگین نقشین ریشمی پردے سب بے حد شاندار تھے۔ عورتوں کے لئے ایک حصہ درمیان میں پردے ڈال کر مخصوص کردیا گیا تھا، ہر سمت خوشبو سے فضا معطر تھی، آئینے میزیں اور مسہریاں انتہائی سجی ہوئی تھیں، لیکن میں بہت تھک گئی تھی، میں نے اپنی ماں سے اپنی تھکن کا تذکرہ کیا تو اس نے کسی اور سے کہا اور اس نے فوراً ہی میرے لئے غسل کا انتظام کردیا۔ کنیزوں نے خوشبودار پانی سے میرے جسم پر غسل دیا۔ بابل کی کنیزیں بھی اپنے فن کی ماہر تھیں، انہوں نے چند ہی لمحوں میں مجھے تازہ دم کردیا، جسم کو مساج کرکے ساری تھکن دور کردی، پھر مشاطہ نے تیل لگا کر میرے بال سنوار دیئے اور مجھے ایسے نرم ریشمیں کپڑوں میں ملبوس کیا گیا جو میں نے واقعی پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے، نہ کوروتی کی حیثیت سے اور نہ ہی اصنا کیہ کی حیثیت سے سنگھار سے فارغ ہوکر جب میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو خود مسحور ہوکر رہ گئی۔

آہ کم بخت گوتم بھنسالی تیرا ستیاناس جائے، اپنی شکل دیکھ بدنصیب اور پھر مجھے دیکھ، بہرحال میری ماں بھی غسل سے فارغ ہوگئی، میرے زرق برق لباس اور نکھرے ہوئے حسن کو دیکھ کر وہ خوشی سے مسکرادی پھر بولی۔

"تمہارے باپ کو شاہ کے دربار میں حاضری دینا ہے اصنا کیہ اس لئے آج رات خوب آرام کرکے سفر کی تھکن دور کرلو، کل ہم بابل کی سیر کو چلیں گے۔"

لیکن ذیشان عالی مجھ میں انتظار کی تاب نہیں تھی، میں یہ رات آرام کرکے ضائع کرنے کو تیار نہیں

تھی، اب تک جو کچھ دیکھا تھا اور جو کچھ تم نے میری آنکھوں سے دیکھا مجھے بتاؤ کیا وہ نظر انداز کرنے کے قابل تھا، اپنی بات تو میں یوں کہوں گی کہ مجھے بابل حسن نے دیوانہ کردیا تھا اور میں یہ رات بابل کی رونقیں دیکھنے کا فیصلہ کرچکی تھی، میرا اتالیق پہلے ہی بابل کے کاہنوں سے ملنے جاچکا تھا اور میں جانتی تھی کہ میری ماں رات کو کسی اور کے ساتھ مجھے سیر کی اجازت نہیں دے گی، اس لئے میں نے ان سے بحث کرنا فضول سمجھا، میری بے تابی اس درجے تھی کہ اس وقت کوئی قوت میرا راستہ نہیں روک سکتی تھی۔ لیکن میرے لئے بابل کی سیر کا صرف ایک راستہ تھا، مجھے رازداری کے ساتھ بابل کی کسی کنیز کا سہارا لینا ہوگا، میں نے اپنے آپ سے سرگوشی کی اور پھر میری نگاہ انتخاب اس کنیز پر پڑی جس نے بڑی خوبصورتی سے میرے بدن کی مالش کی تھی اگر میں اسے دوست بنالوں تو ہوسکتا ہے وہ کسی تدبیر سے مجھے خفیہ طور پر محل سے باہر لے جاسکے اور میں اس شہر عجائب کی رنگارنگ رونقوں کا نظارہ کرسکوں، یہ کنیز بہت خوب صورت تھی اور اس کا سڈول جسم شباب کی فتنہ سامانیوں سے پھٹا پڑتا تھا، میں نے اس پر حربہ آزمایا اور بڑے محبت بھرے انداز میں بولی۔

''لڑکی! تیرے ہاتھ میں جادو ہے تو نے جس طرح میرے بدن کا مساج کیا ہے میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے اس سے کتنا سکون ہوا، کیا نام ہے تیرا؟''

''مجھے صبا کہتے ہیں شہزادی۔'' کنیز نے خوش ہو کر کہا۔

''صبا تو بھی کسی شہزادی کی طرح حسین ہے، تجھے دیکھ کر تو مرد دیوانے ہوجاتے ہوں گے، لیکن ایک بات مجھے بتا؟''

''کیا عالیہ؟'' وہ میرے ایک لفظ سے خوشی سے پھولی جارہی تھی۔

''کیا تو غلام پیدا ہوئی تھی؟'' میں نے سوال کیا تو اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی اداسی کی لہر پیدا ہوگئی، اس نے کہا۔

''نہیں شہزادی، میں تو آزاد ہوئی تو لیکن میرا باپ بہت غریب آدمی تھا، ہم بارہ بہنیں تھیں اس لئے اس نے دو لڑکیوں کو فروخت کردیا، مجھے جس شخص کے ہاتھوں فروخت کیا گیا تھا وہ ایک بدصورت اور عمر رسیدہ آدمی تھا۔ بدبخت جب تک زندہ رہا میرے حسین جسم کو کتے کی طرح نوچتا رہا، لیکن شکر ہے جلدی مرگیا اس کے بعد مجھے غلام بنالیا گیا اور میں تمہیں بتاؤں گی کہ جس شخص نے مجھے غلام بنایا وہ اسی حرم میں رئیس خواجہ سرا ہان ہے، لیکن میرے لئے وہ بے حد مہربان آقا ہے، اس نے مجھے کبھی عام کنیزوں کی طرح نہیں سمجھا پچھلے پانچ برس سے میں بڑے عیش و آرام سے ہوں میرا مالک مجھ پر بڑا بھروسہ کرتا ہے، خفیہ کاموں کے لئے وہ ہمیشہ مجھے ہی شہر میں بھیجتا ہے اور آج رات بھی مجھے اس کے ایک کام سے جانا ہے۔'' ذیشان عالی اسے کہتے ہیں تقدیر کا کھیل، جس بات کے لئے میں نے اسے اتنا قریب بلایا تھا وہ خود بخود ہوگئی، تب میں رازداری سے اس سے کہا۔

''میرا دل بھی بابل کا حسن دیکھنے کے لئے بے قرار ہے صبا، کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے چلوگی؟''

''آپ کو شہزادی؟'' صبا کے دل میں خوف بیدار ہوگیا، پھر اس نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ''میں جس جگہ جارہی ہوں وہ باب نینوا کے باہر واقع ہے، آپ کو اس جگہ لے جانا بہت خطرناک ہوگا کیونکہ رات کو بابل میں چور اور رہزن گھومتے رہتے ہیں۔''

''مگر میں اس لباس میں نہیں جاؤں گی، نہ ہی زیور اور جواہرات پہنوں گی، تم مجھے بھی کسی کنیز کا لباس لاکر دے دو، بھلا کنیزوں کو کیا خطرہ ہوسکتا ہے اور سنو انکار نہ کرنا، میں تمہیں اس کام کا بھاری انعام دوں گی۔''

''ٹھیک ہے تمہیں یہ ساری تیاریاں کرنی ہیں۔'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''باہر تو خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا لیکن ہم محل سے باہر نکل پائیں گے؟''

''ہاں میرے پاس خصوصی اجازت نامہ موجود ہے، محل کے دربان اور سنتری مجھے نہیں روکیں گے اور

چونکہ آپ میرے ساتھ ہوں گی اس لئے آپ سے بھی کچھ نہیں پوچھا جائے گا بشرطیکہ آپ نقاب میں ہوں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"جیسے ہی سب سو جائیں تو لباس لے کر آجانا۔" اور ذیشان عالی محل کے پھاٹک پر دربانوں نے ہمیں روکا، لیکن وہ اجازت نامہ جو اس خصوصی پتھر کی لوح کی شکل میں تھا، ان کے لئے کافی تھا، وہ لوح دیکھتے ہی انہوں نے ہمیں باہر جانے کی اجازت دے دی، میں بے حد خوش تھی، میرے پورے بدن میں ہلکی ہلکی لرزش تھی، اصناکیہ کی حیثیت سے میری زندگی میں اس طرح باہر نکلنے کا پہلا اتفاق تھا اور چونکہ میں نے اصناکیہ کو اپنے پورے ذہن اور پورے وجود میں ضم کرلیا تھا اور کچھ وقت کے لئے بھول گئی تھی کہ صدیوں سے جینے والی کوروتی اصناکیہ کے جسم میں ہے اور یہی وجہ تھی کہ میں اصناکیہ کے جسم میں عمر کی منازل طے کرکے بچپن سے جوانی تک آئی تھی، بس یہ تجربہ تھا اور یہ تجربہ میرے لئے اتنا دلکش تھا، دل چاہتا تھا کہ اصناکیہ کا انجام دیکھوں۔

ہاں ذیشان عالی یہ بات بڑے دکھ کی ہے بے شک میں جانتی ہوں کہ کچھ لوگ میرے اتنے قریب آئے اور انہوں نے میرے ساتھ بڑا وقت گزارا اور بڑا اچھا وقت گزارا، لیکن میں یہ سوچ کر ہی دکھی ہو جاتی تھی کہ آخرکار وہ بوڑھے ہو جائیں گے چلے جائیں گے میرا ساتھ چھوڑ دیں گے اور میں زندہ رہوں گی، ان کی یادوں کو ساتھ لے کر، میں تمہیں سچ بتاؤں ذیشان عالی، میں نے اس کے لئے بڑا ایک خصوصی عمل کیا ہے، میں نے بہت سے جاپ کئے ہیں ایسے فنکاروں کی مدد سے جو یہ فن جانتے تھے کہ انسانی ذہن کو کس طرح تبدیل کیا جاسکتا ہے، یعنی وہ جو یادوں کی شکل میں انسانی ذہن میں باقی رہ جاتے ہیں انہیں کس طرح اپنے ذہن کے خلیوں سے مٹایا جاسکتا ہے، مجھے معاف کرنا تم خود بھی اس بارے میں سوچو گے کہ اتنا اچھا وقت گزارنے کے بعد میں تمہیں بھول جاؤں گی، لیکن تم مجھے خود بتاؤ حقیقت یہی ہے۔"

"تو میں بتارہی تھی کہ اس وقت اصناکیہ کی حیثیت سے محل سے پہلی بار باہر نکلی تھی۔ زندگی میں اس طرح باہر نکلنے کا یہ ایک انوکھا اتفاق تھا چنانچہ ہم دونوں آگے چلتی ہوئی ایک کشادہ شاہراہ پر آگئیں جس کے دونوں جانب کھجوروں کے درخت لگے ہوئے تھے، آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی روشنی میں بابل کا شہر عجائب میرے سامنے پھیلا ہوا تھا، کوروتی نے خوشی سے صبا کا بازو دباتے ہوئے کہا کہ بابل کی ساری رنگینیاں مجھے دکھادے۔" وہ شوخ سے ہنسی کے ساتھ بولی۔

"شہزادی کیا آپ واقعی شہر کی رنگینیاں دیکھیں گی، حالاں کہ اس میں خطرہ بہت ہے، ایسی جگہوں پر قتل وعصمت دری چوری اور رہزنی عام ہوتی ہے۔"

میرا دل تو چاہا کہ میں ہنسوں اور اس کو بتاؤں کہ ایسے خطرات کی مجھے پرواہ نہیں ہے اور میں نے اس سے یہی کہا لیکن مفہوم دوسرا تھا، میں نے اس سے کہا۔

"صبا تو اطمینان رکھ، مجھے کسی خطرے کی پرواہ نہیں ہے۔"

"تو پھر آیئے میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

بابل دیکھنے کے شوق نے اصناکیہ کو یعنی مجھے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ ہم سب سے پہلے بڑے مندر میں گئے صبا نے مجھے بتایا کہ مذہبی روایت کے مطابق ہر عورت پر یہ لازم ہے کہ وہ زندگی میں ایک مرتبہ کسی اجنبی کے ساتھ سوئے۔ مندر کے پائیں باغ میں بیٹھی ہوئی عورتیں اسی لئے منتظر ہیں، یہ باغ آپ جیسی شہزادیوں کے گھومنے کے لئے نہیں ہے۔"

اس کے بعد ہم ایک اور بہت بڑے باغ میں پہنچے وہاں جگہ جگہ درختوں میں ٹنگی ہوئی قندیلیں روشن تھیں اور لوگوں کا ایک ہجوم میلے کا سماں پیش کر رہا تھا۔ جگہ جگہ تماشے اور رقص وسرور کی محفلیں جمی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ بڑا سا اسٹیج بنا ہوا تھا جس کے گرد ساز بجانے والے بڑی مہارت کا ثبوت دے رہے تھے، ایک شخص چیخ چیخ کر لوگوں کو دعوت دے رہا تھا کہ اہل بابل آؤ،

مصر کی نامور رقاصہ کے فن کا تماشہ دیکھو، ذرا دیر کے بعد ایک لڑکی اسٹیج پر آئی، اس کے رقص میں جادو تھا، ہجوم تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا، لڑکی کا قیامت خیز شباب اور ہیجان خیز رقص لوگوں کو بدمست کیے دے رہا تھا، ان کی بے باک دست درازیوں پر قہقہوں کا شور بلند ہوتا، صبا نے میرے کندھے پر تھپکی دی اور بولی۔

''جلدی چلو شہزادی یہاں سے جلدی آگے بڑھو۔''

تھوڑے ہی مناظر دیکھے تھے کہ مجھے اندازہ ہوگیا کہ بابل واقعی شہر طرب ہے، ہر جگہ بے حجابی تھی، عیش وطرب تھا، خوبصورت جوڑے بے باکی کے ساتھ داد عیش دینے میں مصروف، بازاروں کی چہل پہل روشنیوں اور تاریکیوں میں بکھرتے ہوئے بدمست قہقہے ان سب کے درمیان سے گزرتے ہوئے میری نظر ایک کاہنہ کے خیمے پر پڑی، میں نے محض تفریح کی خاطر اسے ہاتھ دکھانے کا ارادہ کیا، خیمے میں صرف ایک شمع روشن تھی، بوڑھی کاہنہ ایک پرانے غالیچے پر بیٹھی ہوئی تھی، میں نے اسے چاندی کا ایک سکہ دیا تو اس کے جھریوں دار چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، میں نے شرارتاً پہلے صبا کو آگے دھکا دیا، کاہنہ نے اس کا ہاتھ دیکھنا شروع کردیا۔

''لڑکی تو کنیز ہے، لیکن تو جلدی سے بابل سے دور بہت دور دراز کا سفر کرے گی اور تو ہمیشہ ملازم نہیں رہے گی، کوئی عورت تجھے آزاد کردے گی، بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' صبا کا چہرہ فرط مسرت سے دمک اٹھا، اس نے فوراً ہی مجھے آگے بڑھا دیا میں نے ہچکچا کر اپنا ہاتھ سامنے کیا تو کاہنہ چونک اٹھی، چند لمحے وہ آنکھیں بند کیے زیر لب بڑبڑاتی رہی، پھر سرگوشی میں بولی۔

''کون ہے تو، تو کون ہے، تیری لکیریں تیری اپنی نہیں ہیں، ان لکیروں میں فرق ہے اور شاید تو ان کو نہ دیکھ سکے، لیکن یہ دہری لکیریں ہیں، پہلے کچھ لکیریں ابھر آتی ہیں پھر وہ گم ہو جاتی ہیں اور نئی لکیریں ابھر آتی ہیں۔ ارے میں نے ایسا حیرت انگیز ہاتھ پہلے کبھی نہیں

یا اللہ پناہ دے

اس نیند سے۔ جس سے فجر کی نماز قضا ہو۔
ایسی مصروفیات سے۔ جس سے ظہر کی نماز قضا ہو۔
ایسے قیلولے سے۔ جس سے عصر کی نماز قضا ہو۔
ایسی محفل سے۔ جس کے لطف سے مغرب کی نماز قضا ہو۔
ایسی تھکاوٹ سے۔ جس سے عشاء کی نماز قضا ہو۔
(محسن عزیز حلیم ...... کوٹھا کلاں)

دیکھا یہ سب کیا ہے۔''

میرا دل تو چاہا کہ میں اپنا ہاتھ پیچھے کرلوں لیکن بوڑھی کاہنہ پر جو بیت رہی تھی اس میں بھی مجھے مزہ آرہا تھا، میں نے اس سے کہا۔

''تو میرا ہاتھ دیکھ۔''

''میں کیا کہوں، کیا کہوں تجھ سے دنیا کے بہت بڑے بڑے لوگ محبت کریں گے کیا سمجھی اور اور نہیں ہرگز نہیں، کوئی غلام لڑکی اتنا بڑا درجہ حاصل نہیں کرسکتی، لیکن لکیریں جھوٹ نہیں بولتیں، دنیا کا عظیم ترین مردانی تلوار کے ذریعے تجھ تک رسائی حاصل کرے گا۔ وہ تجھے اپنی ملکہ بنائے گا تو نے سونے کی قسمت پائی ہے، بس بس اب چلی جا ورنہ میرا ذہنی توازن خراب ہو جائے گا۔ میں تیرے بارے میں کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہہ سکتی، تو تو تو..... پتہ نہیں تو کیا ہے۔ تیرے ہاتھ کی لکیروں میں کائنات کے بہت سے راز چھپے ہوئے ہیں آہ میں ان رازوں سے واقف نہیں ہوسکتی، لیکن ہر لکیر مجھے آواز دے رہی ہے کہ مجھے پڑھ مجھے سن مجھے دیکھ، آہ میرا دماغ پھٹ جائے گا، لڑکی تو چلی جا چلی جا۔''

مجھے ہنسی آگئی، میں نے مسکراتے ہوئے صبا کو دیکھا تو صبا عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی، میں اس کے ساتھ باہر نکل آئی تو صبا نے سرد لہجے میں کہا۔

''یقین کرو شہزادی، تم نے مجھے جو عزت اور اہمیت دی ہے، میں سمجھتی ہوں یہ میری بلند قسمتی کا ایک عمل ہے اور میں تمہیں دیکھ کر خود بھی اندازہ لگاتی ہوں کہ تم واقعی ایک عجیب وغریب شخصیت ہو۔ کہیں سے سمجھ میں نہ آنے والی۔''

''چل چل آگے چل بیکار باتیں مت کر'' میں نے اس سے کہا اور ہم فرات کا پل پار کر کے ایک نسبتاً ویران علاقے میں داخل ہو گئے، صبا بولی۔

''سڑک کے درمیان چلو تاریک دراڑوں میں چور اور رہزن اچانک دبوچ لیتے ہیں۔''

میں مسکرا کر خاموش ہو گئی، تیز تیز قدم رکھتے ہوئے ہم آگے بڑھتے رہے، میں نے اس سے پوچھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے جہاں ہمیں جانا ہے۔''

''اڑوبہ...... اڑوبہ ہے اس جگہ کا نام، لیکن وہ جگہ بہت خطرناک ہے، میں اپنے ساتھ عموماً کسی محافظ کو لے کر وہاں جاتی تھی۔ یہ سامان مجھے جہاں پہنچانا ہے وہ بہت ہی عجیب جگہ ہے۔'' اس نے بازو میں لٹکی ہوئی چھوٹی سی ٹوکری کو سنبھالتے ہوئے کہا، میں شروع ہی سے حیران تھی کہ نجانے اس میں کیا رکھا ہے جو وہ اتنی احتیاط سے اسے سنبھالے ہوئے ہے، وہ کہنے لگی۔

''اس سرائے میں طرح طرح کے لوگ جمع رہتے تھے، فنکار پہلوان سپاہی، شمشیر اور خطرناک قسم کے چور اور ڈاکو یہ سب کا اڈہ ہے، اڑوبہ میں اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں وہاں کی ایک خاص عورت بڑی اہمیت کی حامل ہے اور صحیح معنوں میں اسی کا نام اڑوبہ ہے، آپ جانتی ہیں کہ حرم کی خواتین کے لئے اپنی پردہ داری میں بہت مشکل کام ہوتا ہے لیکن ضروری ہے، اور اڑوبہ آفت کی پرکالہ ہے، وہ خطرناک زہروں اور تیر بہدف دواؤں کی بھی ماہر ہے اور آج بھی اسی سلسلے میں جا رہی ہوں۔''

ہم لوگ اڑوبہ پہنچ گئے اور میں نے اس عورت کو دیکھا جو ایک بدروح ہی معلوم ہوتی تھی جسے دیکھ کر مجھے خطرے کا احساس ہوا اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ میں نے یہاں آ کر غلطی کی ہے، اسی سرائے میں بابل کا مشہور شراب خانہ بھی تھا۔ پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہی قہقہوں کا شور وغل سنائی دینے لگا، صبا مجھے مختلف کمروں سے ایک درمیانے کمرے میں لے آئی جو کافی کشادہ تھا دیواروں میں تیل سے جلنے والے لیمپ لگے ہوئے تھے، ہر سمت بچھی ہوئی میزوں کے گرد رکھے ہوئے عجیب وغریب کوردانوں پر مختلف قسم کے مرد اور عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں، شراب کا دور چل رہا تھا، کہیں شطرنج اور چوسر کا کھیل جاری تھا، کہیں پچیسی کا، صبا ان تمام باتوں سے بے پرواہ کمرے کے آخر میں رکھی ہوئی میز کے گرد بیٹھی اس عورت کے پاس جا بیٹھی جس کا نام اڑوبہ تھا۔

''بڑے سردار نے تمہیں سلام بھیجا ہے۔ اڑوبہ۔'' صبا نے جھک کر اسے تعظیم دی اور میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

''بڑے سردار کو میرا بھی سلام کہنا اور یہ تو اپنے ساتھ آج کسے لے آئی ہے۔'' اڑوبہ کی نگاہیں پوری طرح میرے جسم پر گڑ گئی تھیں۔

''یہ نئی کنیز ہے، بڑے سردار نے کہا ہے کہ اسے یہاں کا راستہ دکھا دوں۔''

صبا نے بڑی احتیاط سے بند ٹوکری میری سمت بڑھائی اور سرگوشی میں بولی۔ ''ڈھکن نہ کھولنا۔'' اور پھر میں آگے بڑھی اور اڑوبہ کو وہ لوح دکھائی۔

''ہاں میں سب کچھ پہچانتی ہوں۔'' اڑوبہ مکار مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''چل یہ جگہ دیکھ اور اس پر اپنا نام لکھ دے اور یہ بٹوہ لے جا۔'' اس نے ایک موٹی تختی بڑھائی جس پر صبا نے بمشکل اپنا نام لکھا اور وہ چمڑے کی تھیلی اڑوبہ کے ہاتھ سے لے لی جسے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اونچا اٹھایا ہوا تھا۔

''اب کچھ دیر بیٹھ کر آرام کر لے اور شراب سے اپنی تھکن دور کر۔'' اڑوبہ بولی۔

''نہیں...... تمہاری مہربانی ہے ہمیں جلد واپس پہنچنا ہے ہمیں یہی ہدایت کی گئی ہے۔'' صبا نے وہ

چمڑے کی تھیلی اپنے لباس میں چھپاتے ہوئے کہا، نجانے کیوں مجھے کچھ عجیب سا لگا تھا چنانچہ میں نے اپنی باطن کی نگاہیں اس تھیلی پر جمادیں اور مجھے پتہ چل گیا کہ اس کے اندر ایک شیشی ہے جس میں ایک بہت ہی خوفناک قسم کا زہر موجود ہے۔ بہرطور اثوبہ اٹھ کر چلی گئی اور صبا واپسی کے لئے مڑی تو میں نے صبا کا بازو پکڑ کر اسے روکا اور کہا۔

''ذرا کچھ وقت اور رک صبا، میں اس پراسرار جگہ کو ابھی اور دیکھنا چاہتی ہوں، اس نے میری صورت دیکھی بہر طور میں اس وقت ایک شہزادی کا رتبہ رکھتی تھی یہ اور بات ہے کہ میں نے کنیزوں کا حلیہ اختیار کر رکھا تھا۔ وہ انکار نہ کرسکی اور ہم ایک کونے میں رکھی ہوئی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ایک خوب صورت سے نوعمر لڑکے نے لکڑی کے پیالوں میں شراب لا کر ہمارے سامنے رکھ دی، لیکن وہ اتنی تلخ تھی کہ میں بمشکل دو گھونٹ حلق سے اتار سکی، میں نے خود کو لبادے میں اچھی طرح چھپا رکھا تھا، ہمارے قریب ہی تین سپاہی ایک عورت کو لئے بیٹھے تھے، شراب پینے کے ساتھ وہ جنگ کے متعلق باتیں کر رہے تھے اور میں ان کی گفتگو سننا چاہتی تھی ان میں سے ایک نے کہا۔

''میں نے گیرانی کی جنگ میں خود حصہ لیا تھا اور میں پورے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ سکندر کے سپاہی سپہ گری میں ہم سے بہت بہتر ہیں، ان کے نیزے زیتون کی مضبوط لکڑی کے بنے ہوئے ہیں اور ان کے سارے ہتھیار ہم سے بہتر ہیں، وہ شاندار ہتھیاروں کے ساتھ جنگ کرتے ہیں، تم چاہو تو اس سے تصدیق کرلو یہ بھی میرے ساتھ تھا۔'' اس نے دوسرے سپاہی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، یہ ٹھیک کہتا ہے۔'' اس کے ساتھی نے تصدیق کی۔ ''مقدونیوں کے نیزوں نے ہمارے بے شمار سپاہیوں کا صفایا کردیا تھا۔''

''کیا تم فضول باتیں کئے جا رہے ہو جب سے واپس آئے ہو صرف جنگ کی باتیں کرتے ہو۔'' ان کے درمیان بیٹھی ہوئی عورت نے غصے سے چیخ کر کہا۔

''چپ رہ حرام زادی۔'' تیسرے سپاہی نے عورت کو ڈانٹا ''میں بڑی دور سے آ کر شاہی فوج میں بھرتی ہوا ہوں، مجھے بھی سکندر کی فوجوں سے جنگ کرنا ہے اس لئے ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری ہیں، تو خاموشی سے بیٹھ اور شراب کے گھونٹ پی کہ تیری یہی اوقات ہے۔''

وہ لوگ دوبارہ جنگ کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ دونوں سپاہی جنگ میں سکندر اور اس کے سپاہ کی دلیری کے کارنامے بڑھ چڑھ کر بیان کر رہے تھے اور ان کے درمیان بیٹھی ہوئی عورت جس کا کچھ اور ہی مقصد تھا بری طرح پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ آخر میں اس سے خاموش نہ رہا گیا اور اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''بہادرو! اگر تم سکندر کے اتنے ہی پرستار ہو تو اس کی فوج میں کیوں نہیں بھرتی ہو جاتے۔'' اس نے اتنی زور سے یہ جملے کہے تھے کہ سب بے ساختہ اس کی بات پر ہنس پڑے۔

''بازاری عورت!'' سپاہی نے غصے میں کہا۔ ''دیوتا جانتے ہیں کہ میں سکندر کو اپنے ہاتھوں دو ٹکڑے کرنے کی آرزو رکھتا ہوں لیکن جو سچ ہے اسے بیان کرنے میں کوئی عار نہیں ہوتا، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ سچ ہے۔''

''گھبراؤ نہیں۔'' ایک کونے سے ایک سپاہی کی آواز آئی۔ ''شاہ دارا اپنی عظیم فوج لے کر اس کی سرکوبی کے لئے خود جا رہا ہے، سکندر کو اب اس کے اپنے گھر میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔''

سپاہی نے اپنا مقصد بیان کیا تھا جو اس کی وطن پرستی کی غمازی کرتا تھا، لیکن میرے کان برابر والی میز کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے، دو نوجوان مذہب پر بحث کر رہے تھے۔

''تمہارے منہ سے ابھی دودھ کی بو آتی ہے، ہم بابل والوں کا مذہب سب سے پرانا ہے، ہمارے

عظیم دیوتاؤں کا ثانی نہیں ہے۔''

یہ الفاظ جس شخص نے کہے تھے وہ درمیانی عمر کا ایک بھاری بھرکم اور مضبوط شخص تھا اس کے سامنے بیٹھا ہوا یہودی نوجوان کافی خوب صورت اور خوش مزاج تھا۔ اس کی حسین آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی، پتہ نہیں کیوں مجھے یہ نوجوان بڑا دل کو بھایا اور میں پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ دوسرے آدمی نے کہا۔

''تمہاری باتیں بڑی دلکش ہیں اشورا، کیا سمجھے؟''

یہ لوگ جس زبان میں بات کررہے تھے وہ ان دنوں فارس میں عام تھی، اس کے لہجے میں بڑی مٹھاس تھی، پھر اس نے کہا۔

''لیکن ہم یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے انسان کو مٹی سے تخلیق کیا اور خدا صرف ایک ہے اور توریت اس کی تخلیق ہے وہی سب سے بزرگ و برتر ہے۔''

''کیا بکواس کررہے ہو تم؟'' سپاہی نے غصے سے کہا۔ ''ہم اہل بابل عظیم دیوتاؤں کے ماننے والے ہیں جن کے سامنے تمہارا خدا کوئی حیثیت نہیں رکھتا، یہ نہ بھولو کہ تم یہودیوں نے بھی پہلے مردوق اور عشتر کے مندروں میں پناہ پائی تھی اور خود تمہارے پیغمبر ابراہیم کا تعلق بھی بابل سے ہی تھا۔''

سپاہی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا جبکہ دوسرے شخص کے چہرے پر سکون تھا۔

''میرے دوست تم بھی یہ بھول گئے کہ تمہارے عظیم دیوتا دانیال کا تعلق بھی اہل یہود سے تھا اور تم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ انہیں شیر کے پنجرے میں ڈال کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔

''گندے کیڑے تیری یہ مجال.....'' نوجوان غیض وغضب میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور غراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اگر سائرس اعظم تیری قوم کو آزاد نہ کرتا تو تو بھی ہمارا نوکر ہوتا ذلیل کتے۔'' اس شخص نے اچانک خنجر نکال کر دوسرے شخص پر حملہ کردیا لیکن وہ دوسرا نوجوان پھرتی سے سامنے سے ہٹ گیا اور حملہ کرنے والا سپاہی توازن کھو کر ہماری میز پر گرا، لوگ قہقہے لگارہے تھے اسی وقت صبا اور میں اپنی جگہ سے اٹھیں اور ہم نے میز پر گرے ہوئے سپاہی کو سہارا دے کر کھڑا کیا ایسا کرتے ہوئے میری پوشش سر سے سرک گئی اور ایک لمحے کے لئے میری نظریں نوجوان کی نیلی نگاہوں سے ٹکرائیں میں جیسے سکتے میں رہ گئی، اچانک ہی میں نے اس کی آنکھوں کو حیرت اور مسرت سے پھیلتے ہوئے دیکھا اور تب مجھے ہوش آیا کہ میرا چہرہ بے نقاب ہوگیا ہے۔ میں نے گھبرا کر اپنی پوشش کو نیچے کیا لیکن دیر ہوچکی تھی۔

''دیوتاؤں کی قسم! یہ کنیز تو حسن کی دیوی ہے۔''

ایک بھاری بھرکم شخص جس نے پہلوانوں کا سا لباس زیب تن کیا ہوا تھا بدمست ہوکر چیخا اور اس سے پہلے کہ میں سنبھلتی اس نے آگے بڑھ کر میرے سر کی پوشش بھی کھینچ لی، اب دوسرے لوگ بھی میری سمت بڑھنے لگے تھے لیکن ایک سپاہی اچھل کر آگے بڑھا۔

''دیوتا بالی کی قسم کنیز تو ہماری ملکہ سے زیادہ حسین ہے۔'' اس نے آگے بڑھ کر میری کلائی پکڑنا چاہی لیکن پہلوان نے اسے دھکا دے دیا۔

''دور ہٹو پہلے میں نے اسے دیکھا ہے اس لئے پہلا حق میرا ہے، بول لڑکی تیرا آقا کون ہے، میں تجھے اس سے منہ مانگے داموں پر خرید لوں گا۔''

''ہمارا آقا بڑا سردار ہے، شاہ فارس کا رئیس خواجہ سرایاں۔'' صبا نے حقارت سے کہا پھر بولی۔ ''اور اس کی کنیزیں فروخت کے لئے نہیں ہوتیں۔''

''آہ لیکن میں تجھے یوں نہیں جانے دوں گا۔''

پہلوان نے جھپٹ کر میری کلائی پکڑلی اور پھر حیرت زدہ ہوکر بولا۔ ''حیرت ہے اس کنیز کی کلائی پر کسی کا داغ نہیں ہے، بہت خوب یہ تو کوئی خاص کنیز معلوم ہوتی ہے۔'' اس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

''بول لڑکی سچ سچ بتا تو کون ہے اور یہاں کیوں آئی ہے، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ تو صرف میرے لئے

آئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

"سور ذلیل کمینے......" میں نے دونوں ہاتھوں سے اسے مارنا شروع کر دیا، لیکن اس کی آہنی گرفت نے مجھے بے بس کر دیا، اس نے میری آواز کو اپنے ہونٹوں سے بند کر دیا، میں اس وقت واقعی اپنے آپ کو بڑا بے بس محسوس کر رہی تھی، ذیشان عالی! میرے بدن میں کسی ہاتھی سے زیادہ قوت ہے، لیکن اس وقت میں اپنی قوت کو استعمال نہیں کر سکتی تھی کیونکہ میں کوروتی نہیں اصناکیہ تھی۔ ایک اور آواز بولی۔

"اے جلدی کر تیرے بعد میری باری ہے۔" سپاہی خوشی سے چیخا۔

"اور ہماری بھی۔" دوسری آوازیں ابھریں اور میرے لئے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ میں اصناکیہ کے روپ سے نکل آؤں اور کوروتی کی طاقت استعمال کروں، تاہم میں ایسا نہیں کر سکتی تھی اگر ایسا کرتی تو اب تک اس کی تمام کوششیں بیکار جاتیں، مجھے آج بھی ایلی گوس کا خوف تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوگا کیونکہ وہ علم والا تھا اور پراسرار علوم رکھتا تھا، بے شک میں نے اس سے بہت کچھ چھین لیا تھا، لیکن میں جانتی تھی کہ وہ خاموش نہ ہوگا، جہاں تک عمروں کا تعلق ہے تو کم از کم میری تو وہی عمر تھی جو اس نے دیکھی تھی اب یہ الگ بات ہے کہ اس وقت میں ادھار کے بدن میں تھی۔

اچانک ہی میرے اندر ایک عجیب سی کیفیت ابھری اور میں نے پوری قوت سے اس وحشی کے بال دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا، اسی وقت صبا غضبناک شیرنی کی طرح گرجی۔

"کمینے کتے تم نے اپنی موت کو دعوت دے دی ہے، تو نے موت کو دعوت دی ہے اے شخص۔" یہ کہہ کر اس نے برق رفتاری کے ساتھ ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹوکری سے دو مرتبہ اس وحشی پہلوان پر بھرپور وار کئے اور جیسے کوئی جادو ہو گیا اس کی گرفت تیزی سے ڈھیلی پڑنے لگی پھر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا، اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ پسینے سے تر ہو گیا، اس کی آنکھیں باہر کو نکلی پڑ رہی تھیں، وہ پھٹی پھٹی خوفزدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا، میں گھبرا کر پیچھے ہٹی، اب اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا تھا، پھر اچانک وہ وحشت زدہ لہجے میں بولا۔

"جادوگرنی، جادوگرنی ساحرہ" یہ کہہ کر کٹے ہوئے درخت کی طرح وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ سرائے میں ایک لمحے کے لئے سناٹا چھا گیا۔ اسی وقت اژدبہ جو کسی وقت واپس اپنی نشست پر آ کر بیٹھ گئی تھی اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھی اور اس نے پہلوان کی نبض دیکھی پھر اس کی سرد آواز ابھری۔

"یہ تو مر گیا؟"

چاروں طرف بھنبھناہٹیں گونج اٹھی تھیں، اژدبہ نے کہا۔ "تم لوگ اسے دریا میں اٹھا کر پھینک دو، اگر شاہی دستہ گشت پر آ گیا تو مصیبت آ جائے گی چلو جلدی کرو۔"

"آؤ......" صبا نے میرا بازو پکڑ کر مجھے گھسیٹتے ہوئے کہا اور ہم دونوں تیر کی طرح باہر نکل آئے، لیکن ابھی سیڑھیاں بھی نہ اترے تھے کہ اندر سے لوگ چلائے۔

"یہ جادوگرنی ہے، دونوں ساحرہ ہیں پکڑو انہیں قتل کر دو۔" مجمع تیر کی طرح ہماری طرف لپکا لیکن وہی نوجوان اچھل کر درمیان میں آ گیا، اس نے ایک ہاتھ صبا کی طرف بڑھایا اور بولا۔

"جلدی کرو وہ سانپ والی ٹوکری مجھے دے دو۔"

صبا نے فوراً ہی ٹوکری اس کی سمت بڑھا دی اور پھر اس سے پہلے کہ قتل پر آمادہ مشتعل ہجوم آگے بڑھتا نوجوان نے ٹوکری میں ہاتھ ڈال کر زہریلا سانپ باہر نکال لیا اور مجمع کو خوفزدہ کرنے کے لئے آگے بڑھ آیا، اس دوران صبا مجھے گھسیٹتی ہوئی باہر لے آئی اور ہم نے جان بچانے کے لئے بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔

"وہ سانپ، وہ سانپ کہاں سے آ گیا صبا، اس

نے میری جان اور آبرو بچالی، میں تجھے انعام سے مالا مال کردوں گی۔'' میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''میں ٹوکری میں سانپ لئے بغیر بابل سے کبھی باہر نہیں نکلتی، صبا نے کہا اور پھر بولی۔ ''جلدی تیز بھاگئے شہزادی بھاگئے اور تیز۔''

اسی لمحے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور ہم فوراً تاریکی میں چھپ گئے، چندہی لمحے کے بعد ایک گھوڑا برق رفتاری کے ساتھ ہمارے پاس سے گزرا، چاندنی میں مجھے اس نوجوان کا چہرہ صاف نظر آ گیا تھا وہ گھوڑے کی گردن سے چمٹا ہوا تھا، اس کے سنہرے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

''آہ کتنا حسین ہے وہ کس قدر خوب صورت، صبا اب تو تو میری دوست بن چکی ہے، ہر قیمت پر اس یہودی نوجوان کو تلاش کرنا، میں اس کی دلیری کا انعام دوں گی۔'' میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

مجھے معاف کرنا ذیشان عالی، مجھے معاف کرنا وہ کوروتی نہیں بلکہ امناکیہ جو سب کچھ ہونے کے باوجود ایک عام سی لڑکی تھی اور اس یہودی نوجوان کو جو بے حد خوب صورت تھا اپنا دل دے بیٹھی تھی، صبا تو بالکل نہیں جانتی تھی کہ میں اسے کیا انعام دینا چاہتی ہوں۔

دوسرے دن میں نے اپنی چھوٹی بہن کو اپنا راز دار بناتے ہوئے رات کے تمام واقعات کی تفصیل سنائی، پھر صبا کو حکم دیا کہ وہ سرائے جا کر اس یہودی نوجوان کی خبر لے کر آئے، اس نے آکر بتایا کہ نوجوان کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہیں ہے اور اسے پہلی بار ہی اس سرائے میں دیکھا گیا تھا، مجھے بے حد مایوسی ہوئی میں نے صبا سے کہا کہ شاید اس شخص کے متعلق کچھ پتہ چل سکے جس سے اس نوجوان کی لڑائی ہوئی تھی لیکن سب نے جواب دیا کہ اس وقت وہ سرائے میں موجود تھا، تمام لوگوں سے پوچھ گچھ کے باوجود کچھ پتہ نہیں چل سکا، حیرت کی بات ہے کہ کوئی بھی شخص اس یہودی جوان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

میں بے قرار ہوگئی۔ صبا کو میں نے تاکید کی کہ دوبارہ سرائے جا کر ہر قیمت پر اس کا پتہ چلائے کیونکہ مجھے اس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک کہ میں اس کا شکریہ ادا نہ کرلوں۔

ذیشان عالی! ہر دور میں انسان کی فطرت الگ الگ ہوتی ہے، تم اسے بالکل محسوس نہ کرنا، میں تو اس وقت صحیح معنوں میں کوروتی تھی ہی نہیں، بلکہ امناکیہ کے روپ میں تھی اور اس کی سوچیں اپنائے ہوئے تھی، کیا تمہیں میری بات بری لگ رہی ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ظاہر ہے تم میری ملکیت تو نہیں ہو میری دوست ہو۔''

کوروتی جواب نہیں دے پائی تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ''آخر کار دس دن گزر گئے اور اس نوجوان کا کوئی سراغ نہیں ملا وہ اس رات کے بعد اس سرائے میں واپس نہیں آیا۔ میں اندر سے سلگ رہی تھی اس کی کنول جیسی آنکھیں اس کا خوب صورت چہرہ ہر لمحے میری نظروں میں رقص کرتا رہتا تھا۔ ایک انجانی سی بے قراری اور خلش مجھے ہر لمحے بے چین کئے دیتی تھی، میرا اتالیق مجھے اور میری چھوٹی بہن کو روزانہ بابل کی سیر کرانے لے جاتا اور میری نگاہیں ہر سمت اسی نوجوان کو تلاش کرتی رہتیں، لیکن افسوس وہ کہیں نظر نہ آیا۔ تمام ملک سے آئے ہوئے سرداروں سے صلاح و مشورے کے لئے ہونے والی جنگی مجلس اختتام کو پہنچی تو شاہ فارس نے ایک بہت اعلیٰ پائے کی دعوت کا اہتمام کیا۔ اس شاہی دعوت میں شرکت کے لئے زور و شور سے تیاریاں ہونے لگیں۔ صبا نے مجھے خوشبودار پانی سے غسل دیا۔ یہ افواہیں گردش کررہی تھی کہ شاہ کو پھر کسی ملکہ کی تلاش ہے۔ ادھر صبا اور دوسری مشاطائیں میرا سنگھار کررہی تھیں تو میں نے کسی قدر الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے علم ہے کہ شاہ کے حرم میں پہلے ہی تین سو ساٹھ بیبیاں موجود ہیں پھر وہ کسی اور ملکہ کی تلاش میں کیوں دیوانہ ہو رہا ہے؟''

میرے اس سوال کے جواب میں صبا نے ہنس

کر کہا۔ ''شہزادی! مردوں کی حرص عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے، بس سمجھ لو یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔''

خیر صبا اور دوسری کنیزوں نے مجھے دلہن کی طرح سجادیا، بابلی انداز میں میری چوٹیاں گوندھی گئیں، پلکوں اور آنکھوں پر کاجل لگانے کے بعد رخساروں پر غازہ اور ہونٹوں پر سرخی لگائی گئی۔ مجھے زرد اور نیلے رنگ کی چولی پہنائی جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے، زرق برق رنگ کے باریک ریشمی لباس میں میرا حسن دمک رہا تھا۔ گلے میں نیلم اور زمرد کا بہت ہی خوب صورت ہار تھا، یہاں تک کہ میری جوتیوں میں بھی قیمتی نگینے جڑے ہوئے تھے۔ صبا نے بتایا کہ دستور کے مطابق شاہ جس کو پسند کرے اس کو دربارِ خاص میں رقص کرنا لازم ہوتا ہے، اس لئے مجھے تیار ہو کر جانا چاہیے اور جب میں نے آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا تو خود مسحور ہو کر رہ گئی۔

ہمیں دیوان خاص میں پہنچایا گیا جہاں تخت شاہی تھا اور ہم سب شاہ فارس کی خدمت میں باریابی کے منتظر کھڑے ہوگئے، امراء رؤسا سردر شاہی مہمان باری باری تعظیم کے لئے آگے بڑھ رہے تھے، ہر سمت خوبرو مردوں اور حسین عورتوں کا ہجوم تھا، میری چھوٹی بہن نے جواب خوب جوان ہو چکی تھی مجھے ٹہوکہ مار کر شوخی کے ساتھ سرگوشی میں کہا۔

''دیکھ رہی ہو تم اصنا کیہ ساری نگاہیں تم پر ہی مرکوز ہیں۔''

میں چونک پڑی، اس میں شک نہیں کہ مرد رشک بھری نگاہوں سے مجھے گھور رہے تھے، لیکن عورتوں کی نگاہوں کا حسد صاف نمایاں تھا، جب میرے باپ کی باری آئی تو پہلے دو شہزادوں نے آگے بڑھ کر انہیں بوسہ دیا، یہ اعزاز صرف ان لوگوں کو حاصل ہوتا تھا، جنہیں برابری کا درجہ مل جائے ورنہ باقی امراء اور سرداروں کو یہ شرف حاصل نہیں تھا، آخر کار شاہ فارس کی خدمت میں باریابی کا موقع آیا ہم دونوں بہنیں اپنے باپ سے دو قدم پیچھے کھڑی تھیں اور ہمارے درمیان ہماری ماں تھی، شاہ کا شاہی لباس ہیرے اور جواہرات سے جگمگا رہا تھا، وہ دراز قد چھریرے بدن کا خوب صورت شخص تھا، اس کے بال سیاہ تھے، داڑھی گھنگھریالی تھی اور رنگ کانسی کی طرح تھا، ناک خمیدہ اور آنکھیں سیاہ اور بڑی بڑی تھیں اس کا تخت سونے کا تھا جس کے دونوں جانب مقدس بیل کے سر بنے ہوئے تھے، اس کی عبا پر دو سنہرے عقاب کڑھے ہوئے تھے اور شانے پر ایک بہت بڑا ہیرا دمک رہا تھا، میرے باپ نے شاہ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے تعظیم دی اور کہا۔

''شاہ شاہان آپ کا غلام قدم بوسی کی اجازت چاہتا ہے۔''

شاہ سوئم مسکرایا اور بولا۔ ''ہم نے تمہارا سلام قبول کرلیا اب ہماری خدمت میں وہ سب کچھ پیش کرد جس کے لئے تم یہاں تک آئے ہو۔''

میرا باپ ادب اور عقیدت کے ساتھ کھڑا ہوا اور اس نے ہم لوگوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''عالی جاہ یہ میری بیوی ہے اور یہ میری بڑی بیٹی اصنا کیہ جو میری جانشین بھی ہے اور یہ میری چھوٹی بیٹی ہے۔''

میں نے دیکھا کہ شاہ کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں، میں ان کی تاب نہ لاسکی اور جلدی سے نظریں جھکالیں، شاہ نے کہا۔

''ہم تمہاری خواتین کی باریابی سے بہت خوش ہوئے، ایسے حسین چہروں کو ہمارے دربار میں جگہ ملنی چاہئے۔ یہ ہمارے دربار میں ہمارے داہنے جانب جگہ پائیں گی۔''

''خدائے برتر و عالی، عالی جان کو ہمیشہ سلامت رکھے۔'' میرے باپ نے تعظیم پیش کی۔

ضیافت کے دوران ہمیں شاہ کے داہنی جانب جگہ ملی، اس کی کرسی ہم سب سے بلند تھی، شاہی خدام انواع واقسام کے کھانے پیش کررہے تھے۔ سونے کے ساغروں میں شراب کا دور چل رہا تھا۔ میرے برابر ایک

نوجوان ایرانی سردار بیٹھا ہوا تھا اس نے مجھے بتایا کہ شاہ کے بازو میں ملکہ سیطرہ بیٹھی ہوئی ہے۔ لیکن شاہ کی نظریں بار بار میری جانب اٹھ رہی تھیں اور میرا دل خوف سے کانپ رہا تھا کہ کہیں وہ مجھے اپنے حرم کی زینت نہ بنالے۔ میں نے دل میں یہ عہد کرلیا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو میں شاہ کی داشتہ بننے پر موت کو ترجیح دوں گی۔

کھانا ختم ہوا تو خادموں نے میز صاف کرکے اس پر مختلف قسم کی شراب اور مٹھائیاں لاکر چن دیں اور اس کے بعد محفل طرب کا آغاز ہوا۔ موسیقاروں کی ایک ٹولی نے سامنے آکر شاہ کو تعظیم دے کر اجازت لی اور طربیہ موسیقی کا آغاز کیا، ساز بڑے دلکش اور نغمہ بے حد دل پذیر تھا۔ اس کے بعد فضا میں بانسری کی سریلی آواز ابھری اور اسی کے ساتھ ایک گلوکار نے محبت کا ایک دلگداز گیت شروع کردیا جو یوں تھا۔

’’اے حسینہ تجھے کیا خبر کہ میں تیرے عشق کی آگ میں جل رہا ہوں۔‘‘

آواز میں اتنا درد تھا کہ میں تڑپ اٹھی اور میں نے گردن اٹھا کر گلوکار کی سمت دیکھا۔ تبھی میرا دل خوشی سے اچھل پڑا، کچھ فاصلے پر کھڑا گلوکار میری ہی سمت دیکھ رہا تھا اور وہ کوئی اور نہیں وہی یہودی نوجوان تھا جس نے میری جان بچائی تھی اور جس کی تلاش میں میری آنکھیں اتنے دنوں سے سرگرداں تھیں، وہ گاتا رہا اور میں گردوپیش سے بے خبر اسے گھورتی رہی۔ زندگی میں ایسی مسرت کا احساس ہوا جو کبھی نہ ہوا تھا، میرا دل بے ساختہ اس کی سمت کھنچا چلا جارہا تھا۔ اس کے سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے، کنول جیسی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں، مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے گیت میں مجھ سے مخاطب ہے، اس کی آواز میرے ہوش وحوش پر چھاتی چلی جارہی تھی اور میں سحرزدہ ہوکر اس آواز کے جادو سے موہوش ہورہی تھی۔

نغمہ ختم ہوا تو تمام حاضرین نے زبردست داد دی اور شاہ نے خوش ہوکر اشرفیوں کی تھیلی نوجوان کو دی، اس نے جھک کر تعظیم دی۔

اچانک ہماری نگاہیں چار ہوئیں، مجھے یوں لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو اصنا کیہ میں نے تیری محبت کا نذرانہ قبول کرلیا ہے، وہ چلا گیا، لیکن میں محویت کے عالم میں گم صم بیٹھی رہی، تب ایرانی نوجوان نے بتایا کہ سردار نے اس گلوکار کو اپنے دربار کے شاہی فنکاروں میں شامل کرلیا ہے، میرے لئے یہ خبر ایک ناقابل بیان مسرت کا باعث تھی۔ اس کے بعد شراب کا دور اور رقص و سرور کی محفل اپنے شباب پر پہنچ گئی۔ بیشتر لوگ نشے میں مدہوش ہوکر قہقہے لگانے لگے۔ خود شاہ کی آنکھیں خمار آلود ہوچکی تھیں۔

اچانک ہی اس نے پرسی پولیس کے ایک میر کی بیوی کو اشارہ کیا، دستور کے مطابق اب اسے بے حجابی کا رقص پیش کرنا تھا، میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اس رقص کے لئے مجھے منتخب نہیں کیا اور اس کے ساتھ ہی جیسے ساری محفل کو بے حجابی کی دعوت عام مل گئی، بدمست مردوعورت تمام آداب سے بے نیاز ہوکر ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے، میرے قریب بیٹھے ہوئے ایرانی نوجوان نے بے تابی کے عالم میں مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔

’’آہ روئے زمین کی ملکہ حسن، میں کتنا خوش قسمت ہوں۔‘‘ اس نے حد سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

’’تم دیوانے تو نہیں ہوگئے ہو؟‘‘ میں نے اسے دھکا دے کر غصے سے کہا۔

’’پاگل نہ بنو اصنا کیہ بابل میں تو اسی کو زندگی کہتے ہیں اور اس میں برائی بھی کیا ہے؟‘‘

میں اسے دھکا دے کر دور ہٹ گئی، دوسری طرف میری بہن خود کو ایک دوسرے نوجوان کی دست درازیوں سے بچانے کی جدوجہد کررہی تھی، میری ماں نے پریشانی اور بے بسی کے عالم میں میرے باپ کی سمت دیکھا اور بولی۔

’’ہماری آبرو خطرے میں ہے، کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم یہاں سے فوراً نکل چلیں؟‘‘

لیکن میرے باپ نے مایوسی سے جواب دیا۔

''نہیں جب تک بادشاہ رخصت نہ ہوجائے کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی، ایسا کرنا شاہ کی توہین ہوتی ہے، کاش میں تم لوگوں کو بابل نہ لایا ہوتا۔ البتہ اسی لمحے بادشاہ اٹھ کھڑا ہوا، اس کے قدم بھی لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ واپسی کے لئے مڑا تو ہماری آبرو بھی بال بال بچ گئی اور ہم واپس چلے آئے۔ غرضیکہ کچھ اور وقت گزرا یہ معلوم ہوجانے کے بعد کہ یہودی نوجوان جس کا نام بعد میں اولاش پتہ چلا تھا شاہی طائفے میں شامل ہے۔

صبا کو اپنا راز دار بنانا بہت ضروری تھا، ویسے بھی میں نے اس کنیز کو وفادار اور قابل اعتماد پایا تھا، اس لئے میں نے اس کو ہدایت کی کہ وہ یہودی نوجوان سے ملنے کی کوئی سبیل نکالے تو میں اسے مالا مال کردوں گی۔ وفادار صبا شاید میرے دل کا راز جان گئی۔

دوسرے دن وہ خوشی خوشی واپس آئی اور مجھے بتایا کہ ملاقات کا سامان ہوگیا ہے، میرا باپ شاہی دربار میں جنگی مجلس میں حاضری دینے گیا ہوا ہے اور ماں رات کی تھکن دور کررہی ہے، چنانچہ میں نے بازار جاکر بابل کے پارچہ جات خریدنے کا بہانہ کرکے اجازت لے لی اور ساتھ ہی اپنی چھوٹی بہن کو لے لیا، صبا جب ہمیں لے کر بازار پہنچی تو اولاش ایک دکان کے سامنے ہمارا منتظر تھا، میرے چہرے پر چونکہ نقاب پڑی ہوئی تھی اس لئے مجھے نہ پہچان سکا، تب میں اس کے قریب پہنچی اور میں نے کہا۔

''میرا سلام قبول کرو اولاش۔''

وہ اچھل پڑا، خوشی سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اس نے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''میرا بھی سلام قبول کرو اصنا کیہ۔'' اس کی آواز میں بے پناہ مسرت تھی، اس نے پھر کہا۔ ''اور اس عزت افزائی کا میں بے حد شکر گزار ہوں۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس نے میری جان بچائی تھی، اس کی آنکھوں میں جو تشکر تھا وہ مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکا، البتہ اس نے بازار میں گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا اور بولا۔

''قریب ہی ایک باغ ہے اس میں بیٹھ کر اطمینان سے بات کریں گے۔'' میں نے مڑ کر دیکھا میری چھوٹی بہن اور صبا کچھ فاصلے سے ہمارے تعاقب میں آرہی تھیں۔ آخر کار ہم ایک کنج میں جاکر بیٹھ گئے جو گھنی جھاڑیوں کی آڑ میں تھا، میں نے اپنی نقاب الٹ دی۔

''تم سے مل کر مجھے جو خوشی ہوئی ہے اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکو گی۔'' اولاش نے میرے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ''اصنا کیہ جب میں نے سرائے میں پہلی بار تمہارا بے نقاب چہرہ دیکھا تو ہوش وحواس کھو بیٹھا، یقین جانو، تم نے بے مثال حسن پایا ہے جو ہر کسی کو دیوانہ بنا سکتا ہے لیکن میں حیران ہوں کہ تم جیسی اعلیٰ نسب خاتون بدنام جگہ پر کیا کررہی تھی۔''

جواب میں، میں نے اسے تفصیل بتائی تو اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''تم واقعی بے حد دلیر اور مہم جو خاتون ہو۔ جب صبا نے یہ بتایا کہ تم کنیز ہو تو میں نے یہ تہیہ کرلیا تھا کہ ہر قیمت پر تم کو آزاد کرالوں گا، اس کے بعد سے ہر لحظہ تمہاری شکل آنکھوں میں گھومتی رہی، ایک لمحے کو قرار نہیں تھا، بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح تم کو ہمیشہ کے لئے اپنالوں۔''

''لیکن اولاش......'' میں نے بے چینی سے کہا۔

''ہاں، بس کیا بتاؤں کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہے، کہاں ایک اتنے بڑے سردار کی بیٹی اور کہاں ایک عام گویا۔''

''نہیں اولاش، میں نے صبا کو بھیج کر تم سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا ہے تم بے تکلف ہوکر بات کرو۔''

اولاش نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ''ہاں یہ میری خوش قسمتی ہے۔'' پھر اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں تمہیں حاصل کرنے کا تصور کیسے کرسکتا ہوں۔''

میں تڑپ اٹھی اور اس کی نگاہوں میں محبت کا سمندر موجزن تھا، لیکن اس کی گہرائیوں میں بے کسی اور بے بسی چھائی ہوئی تھی۔

''تم مایوس کیوں ہوتے ہو اولاش، محبت چھوٹے بڑے کے امتیاز سے بے نیاز ہوتی ہے اور مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی حجاب نہیں محسوس ہوتا کہ میں تم سے بے پناہ محبت کرنے لگی ہوں۔''

''اوہ احنا کیہ، میری زندگی میری آرزو......''

اس نے بے تاب ہوکر مجھے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور بار بار یہی الفاظ دہراتا رہا کہ ''میں کتنا خوش نصیب ہوں، میں کتنا خوش نصیب ہوں۔''

ہم دونوں گرد و پیش سے بے خبر اپنی محبت کا اظہار کرتے رہے، اولاش کا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا، میں صبر و قرار کے بندھن توڑ چکی تھی اور جب مجھے ہوش آیا تو سورج ڈھل چکا تھا۔

''بہت دیر ہوگئی اولاش اب مجھے جانا چاہیے۔''

''ابھی نہیں میری زندگی، ابھی تو میں نے جی بھر کے تمہیں دیکھا بھی نہیں ہے، کچھ دیر اور ٹھہرو، لیکن یہ ممکن نہیں تھا میں نے اسے بتایا کہ ''یہاں سے کچھ فاصلے پر صبا اور میری بہن بیٹھی انتظار کررہی ہیں اور محل میں میرا انتظار ہورہا ہوگا، بس بہت ہوچکا ہے۔'' میں نے بمشکل خود کو اس کے بازوؤں سے علیحدہ کیا۔

''ہم پھر ملیں گے اولاش اور تم یقین کرو میں اس ملاقات کے لئے ہر لمحہ بے قرار رہوں گی۔'' میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے، پھر میں نے دکھ بھری آواز میں کہا۔

''لیکن تم ملو گے کہاں؟''

''میں دریا کے کنارے یہودیوں کی بستی میں رہوں گا، مجھے کسی ایسے قابل بھروسہ آدمی کی تلاش ہے جو بادشاہ کی عنایت کی ہوئی اشرفیاں یروشلم میں میرے والدین کو پہنچادے۔''

''تم یروشلم کے رہنے والے ہو؟''

''ہاں آج سے اکیس برس پہلے میں وہیں پیدا ہوا تھا، تین سال پہلے موسیقاروں کے ایک طائفے کے ساتھ مصر گیا اور وہاں سے شاہ فارس کے ایک درباری نے میرا گانا اور اتنا پسند کیا کہ مجھے یہاں لے آیا اور میں شاہی طائفے میں ملازم ہوگیا۔''

''میں اس درباری کی احسان مند ہوں اگر وہ ایسا نہ کرتا تو میری زندگی ہمیشہ نامکمل رہتی۔''

''آہ ایسا نہ کہو یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تم اتنا فاصلہ طے کرکے یہاں تک آئی ہو۔ ورنہ میں محبت کے اس درس سے محفوظ رہتا جو میری زندگی کی انمول دولت ہے، لیکن افسوس کہ نو دن کے بعد ہم کو جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہوگا، کیونکہ شاہ اس دن سکندر کی سرکوبی کے لئے روانہ ہورہا ہے اور شاہی طائفہ فوج کے ساتھ جائے گا۔''

''صرف نو دن۔ نہیں ایسا نہ کہو تمہارے بغیر بابل میرے لئے ویران ہوجائے گا اولاش'' ہم جدائی کے اذیت ناک تصور دل میں چھپائے ہوئے جدا ہوئے، میرا دل چاہ رہا تھا کہ نو دنوں کا ایک ایک لمحہ اولاش کے بازوؤں میں گزاروں اور شاید میری یہ دعا سن لی گئی، کیونکہ دوسرے دن سے جنگی تیاریوں کے سلسلے میں میرے بابا اس قدر مصروف ہوگئے کہ رات گئے تک دربار شاہی میں رہتے اور اس طرح میرا بیشتر وقت اولاش کے ساتھ گزرنے لگا، ماں سے بابل کی سیر کا بہانہ کرکے میں، میری چھوٹی بہن اور صبا صبح صبح نکل جاتے اور شام تک باغ کے ویران کونے میں ہم دونوں محبت کے عہد و پیمان کرتے، کبھی کبھی وہ ہم سب کو ساتھ لے کر بابل کی سیر کرانے نکل جاتا، اس دوران میں نے اپنی بہن کا تعارف بھی اس سے کرادیا تھا ایسے موقع پر صبا بھی ساتھ ہوتی تھی۔ اولاش نے ہمیں بابل کے مندر کی عالیشان عمارت دکھائی، مینار بابل کی سیر کروائی اور پھر ایک دن جب ہم تنہائی میں محبت کی لذتوں سے ہمکنار ہوکر باتیں کررہے تھے وہ مجھے اپنے مذہب کے بارے میں بتانے لگا اس نے بتایا کہ موسوی عقیدے کے ماننے والے کسی غیر مذہب کے لوگوں میں شادی نہیں کرسکتے، ان کے عقیدے کے مطابق یہ گناہ ہے، میں اس انکشاف پر چند لمحے کے لئے اداس ہوگئی۔

(جاری ہے)

عشق کے اسرار

سیدہ عطیہ زاہرہ-لاہور

اچانک نوجوان نے کنوئیں میں چھلانگ لگادی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں نے کنویں میں پتھر برسانے شروع کردیئے مگر اس کے باوجود نوجوان نعرہ عشق بلند کرتا رہا، وہ لہولہان ہوگیا تھا مگر پھر بھی......

عشق کیا نہیں جاتا بلکہ عشق ہوجاتا ہے......اس کے مصداق سبق آموز کہانی

وارث شاہ کے نام سے کون واقف نہیں ہے۔ایک معتبر شخصیت جس نے تصوف کی بلندیوں کو چھوا، یہ کہانی ان ہی کے ایک مرید جاں نثار عبدالکریم کی ہے۔عبدالکریم ایک خوش جمال، خوش خصال، خوش رو، خوش خو، سترہ سال کے نوجوان تھے۔ وہ لکھنو کے ایک دینی مدرسے کے طالب علم اور حافظ قرآن بھی تھے۔ جب وہ پہلی بار وارث شاہ کے پاس آئے، تو آپ نے معمول کے خلاف کھڑے ہوکر اُس نوجوان کی پذیرائی کی اور ذوق وشوق کے ساتھ اس سے بغل گیر ہوئے۔ حافظ کی پیشانی پر بوسہ دے کر آپ نے کہا۔

''کیوں نہ ہو میاں! عاشق ہو!'' ان الفاظ میں عجیب تاثیر تھی۔ کریم کے دل کی دنیا زیروزبر ہوگئی۔ وہ عشق و عاشقی سے یکسر ناآشنا تھا، لیکن اس نے سوچا۔ ''حضرت کہہ رہے ہیں تو کوئی اچھی بات ہی ہوگی۔''

وارث شاہ نے پہلی ہی درخواست پر اسے بیعت کرلیا۔

ایک سال بعد دیوہ میں وارث شاہ کے والد کا عرس منعقد ہوا۔ لکھنو سے کریم دیوہ پہنچا۔ اس دوران اس نے اپنے ایک رشتے کے چچا کے ہاں قیام کیا۔ دیوہ میں وہ وارث شاہ سے ملا، تو انہوں نے کریم کو دیکھتے ہی بڑے جوش سے کہا۔ ''عاشق آیا۔ عاشق آیا!'' اسی دوران انہوں نے عبدالکریم کو ایک کتاب دی اس کتاب میں حیرت انگیز قصہ درج تھا۔ قصے کا خلاصہ یہ ہے۔

''ایک امیر کسی رئیس کی بیٹی پر عاشق ہوگیا۔ وہ دن رات روتا اور لڑکی کے مکان کے چکر کاٹتا، کھانا پینا، سونا جاگنا، سب کچھ بھول گیا تھا اس نے بے انتہا مصائب برداشت کئے۔ یہ کیفیت برسوں رہی۔ آخر ایک درویش سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ شخص درویش کے حکم پر ایک جگہ سکون سے بیٹھ گیا۔ اس نے فقیرانہ زندگی اختیار کرلی، اس کی محبوبہ کو معلوم ہوا تو وہ مضطرب ہوکے گھر سے نکلی اور اپنے چاہنے والے کے پاس پہنچ کر بولی۔ ''تم نے مجھے فراموش کیوں کردیا ہے؟''

اس شخص نے لڑکی کے کان میں کچھ کہا۔ نہ جانے اس نے کیا کہا، کہ لڑکی بھی پاؤں توڑ کر اس کے ساتھ وہاں بیٹھ گئی اور پھر وہ اپنے گھر کبھی واپس نہیں گئی۔

وارث شاہ نے عبدالکریم کو کتاب دیتے ہوئے کہا۔ ''میاں اسے روزانہ دو مرتبہ پڑھ لیا کرو۔''

کریم بہت خوش ہوا۔ گھر پہنچ کے اس نے اپنی چچی سے ذکر کیا۔

''چچی جان آج تو مرشد نے کرم کی انتہا کردی۔ انہوں نے مجھے یہ کتاب مرحمت فرمائی ہے اور کہا ہے کہ ''اسے روزانہ دو مرتبہ پڑھ لیا کرو۔''

گھر کی تمام عورتوں کو کتاب کا قصہ سننے کا اشتیاق ہوا۔ ان کی فرمائش پر عبدالکریم نے نہایت ذوق وشوق سے داستان پڑھ کر انہیں سنائی۔ داستان سب کو بڑی دلچسپ معلوم ہوئی۔ عبدالکریم روزانہ گھر میں کتاب سنانے لگا۔ چچی کی لڑکیاں ان دنوں قرآن ناظرہ پڑھتی تھیں۔

ایک روز چچی نے اس سے کہا۔ ''بیٹا میری بچیاں اب بڑی ہوگئی ہیں۔ باہر کے کسی غیر آدمی سے پڑھوانا مناسب معلوم نہیں ہوتا ہے۔ تم گھر کے لڑکے ہو، بچیوں کو قرآن شریف پڑھا دیا کرو۔''

عبدالکریم راضی ہوگیا۔ وہ اس روز سے لڑکیوں کو قرآن پڑھانے لگا۔ ان لڑکیوں میں سے ایک کا نام پیاری تھا۔ وہ تیسرا پارہ پڑھتی تھی۔

عبدالکریم اسے پڑھاتا تو وہ عجیب انداز سے اس کی صورت تکتی، عبدالکریم کا چہرہ حیاء سے سرخ ہوجاتا۔

پیاری کی آواز شیریں تھی، اور لب ولہجہ نہایت دل فریب تھا۔ عبدالکریم اس کے لب ولہجے میں کھو جاتا!

عرس کی تقریبات ختم ہونے کے بعد عبدالکریم کلیجے پر پتھر رکھ کے دیوہ سے اپنے گاؤں آگیا، لیکن وہ اپنا دل دیوہ ہی میں پیاری کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ اسے کسی لمحے قرار نہیں تھا، پیاری کی موہنی صورت ہر وقت اس کی نظروں میں پھرتی! وہ کونوں کھدروں میں چھپ چھپ کر اس کے لئے روتا! اس کا کوئی مونس نہ تھا، کوئی غم گسار نہ تھا، دل کا راز کس سے کہتا؟

چند روز بعد اس کی بہن کی شادی تھی۔ شادی میں دور اور نزدیک کے تمام رشتہ دار جمع ہوئے، عبدالکریم کے چچا بھی اپنے تمام خاندان کے ساتھ آئے، پیاری بھی آئی تھی۔ وہ اور عبدالکریم یوں ٹوٹ کر ملے جیسے صدیوں سے بچھڑے ہوئے ہوں، تقریب ختم ہوئی، تو مہمانوں نے جانے کا قصد کیا، عبدالکریم کے والدین نے چچی اور ان کی لڑکیوں کو کچھ دنوں کے لئے روکنا چاہا۔

چچی نے کہا۔ ''میرا ٹھہرنا تو مشکل ہے۔ البتہ لڑکیوں کو چھوڑ سکتی ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ کریم انہیں قرآن پڑھا دیا کرے۔''

عبدالکریم کی والدہ نے جواب دیا۔ ''بہن کریم تمہارا ہی بیٹا ہے۔ بسر وچشم پڑھائے گا۔''

پیاری کی والدہ لڑکیوں کو عبدالکریم کے گھر چھوڑ کر چلی گئیں۔ عبدالکریم نے انہیں نہایت جاں فشانی

سے پڑھایا اور بہت جلد پورا قرآن ختم کروادیا مگر اس کے دل میں محبت کی آگ روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ پیاری کا خوب صورت چہرہ ہر وقت اس کے سامنے رہے اور وہ اسے پڑھاتا رہے۔

رفتہ رفتہ پڑوس میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ عبدالکریم اور پیاری کے عشق کا چرچا شروع ہوگیا۔ کسی نے پیاری کے والدین کو بھی خبر کردی۔ چنانچہ ایک روز یکا یک کہار سواری لے کر دروازے پر آگئے۔ پیاری اور اس کی بہنوں کو رخصت کرنے کے لئے ڈولیوں میں بیٹھادیا گیا۔

عبدالکریم کی حالت نہایت ہی خراب تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور چہرہ فرقت کے جوش سے تپ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پیاری کی حالت بھی خراب ہونے لگی۔ اندیشہ ہوا کہ لڑکی کا دم نہ نکل جائے، چنانچہ چند لمحوں کے لئے عبدالکریم اور پیاری کو از سرنو بات کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ پیاری نے عبدالکریم سے صرف اتنا پوچھا۔ ''آپ دیوہ کب آئیں گے؟''

عبدالکریم نے بے قراری سے جواب دیا۔ ''تم پہنچو، میں پیچھے پیچھے آتا ہوں۔''

عبدالکریم کا اپنے گھر میں وقت گزارنا عذاب ہوگیا، پھر علی الصباح اندھیرے ہی اس نے ہاتھ منہ دھوئے اور ناشتہ کئے بغیر بڑا گاؤں سے پیدل دیوہ روانہ ہوگیا۔ وہ گھنٹوں بھوکا پیاسا چلتا رہا۔ اس نے کہیں دم نہ لیا، آخر دوپہر کے وقت وہ اپنی چچی کے گھر پہنچ گیا۔

عبدالکریم نے پیاری کو رخصت کرتے وقت سمجھادیا تھا کہ ''قرآن ختم ہونے کا ذکر اپنی والدہ سے نہ کرنا بلکہ کہنا'' ابھی کچھ سپارے باقی ہیں۔'' لہٰذا پیاری نے اپنی ماں سے کہا۔ ''اماں! حافظ بھائی سے کہیے کہ جتنا قرآن باقی رہ گیا ہے، وہ ختم کرادیں۔''

پیاری کی والدہ بولیں۔ ''بیٹی یہ کیسے ممکن ہے۔ عبدالکریم کا ہمارے ہاں رہنا دشوار ہے، اور روزانہ بڑا گاؤں سے دیوہ آنا اس سے بھی زیادہ دشوار!''

عبدالکریم وہیں موجود تھا اس نے کہا۔ ''چچی جان! آپ فکر نہ کیجئے۔ میں بڑا گاؤں سے روز آ کے پڑھادیا کروں گا۔''

چچی کہنے لگیں۔ ''بیٹا! یہ تو ٹھیک ہے، لیکن لوگوں کی زبانیں کون پکڑے گا؟''

عبدالکریم نے چچی کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ ''ہمیں لوگوں سے کیا مطلب ہے چچی جان! ہمارے دل اور ہماری نیتیں تو صاف ہیں۔''

عبدالکریم روزانہ عصر کے بعد بڑے گاؤں سے چلتا اور آٹھ نو بجے رات تک چچا کے گھر پہنچ جاتا۔ دو گھنٹے تک وہ پیاری کو قرآن پڑھاتا اور گیارہ بجے رات کو دیوہ سے چلتا اور صبح کی نماز بڑا گاؤں میں ادا کرتا۔ یہ سلسلہ دو ڈھائی برس تک جاری رہا۔

رفتہ رفتہ دیوہ میں بھی اس کی آمد و رفت کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ آس پاس کی عورتوں نے پیاری کی والدہ سے کہا ''عبدالکریم روزانہ بلا ناغہ رات کے وقت تمہارے گھر آتا ہے، کیا تم لوگوں کی عقلوں پر پتھر پڑ گئے ہیں؟''

پیاری کے والد جہاں گیر آباد میں ملازم تھے۔ مخبروں نے ان کے کان بھردیئے۔ وہ سخت طیش میں وہاں سے دیوہ آئے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو نہایت برا بھلا کہا اور پھر کہا کہ ''خبردار عبدالکریم اب اس گھر میں ہرگز نہ آئے۔ اگر وہ یہاں آیا تو سمجھ لینا، مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

عبدالکریم رات کے نو بجے وہاں پہنچا اس نے دستک دی، چچی دروازے پر آئیں، انہوں نے کریم سے صاف کہہ دیا ''میاں! تمہیں گھر میں آنے کی اجازت نہیں۔ فوراً چلے جاؤ اور آئندہ ادھر کا رخ نہ کرنا!''

عبدالکریم سکتے میں رہ گیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُسی وقت پیاری ایک کتاب دینے کے بہانے دروازے پر آگئی۔ چچی نے اسے ڈانٹا، لیکن وہ رو کر کہنے لگی۔ ''حافظ بھائی سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔'' اس کی والدہ مکان میں چلی گئیں۔

پیاری نے جہاں گیر آباد سے والد کی آمد کا ذکر

کیا اور بتایا۔ ’’انہوں نے حکم دیا ہے کہ آئندہ تمہیں گھر میں نہ آنے دیا جائے۔‘‘

چند لمحوں تک وہ حسرت سے اس کا منہ تکتی رہی۔ پھر بولی۔ ’’دیکھو میں تمہیں ایک تدبیر بتاتی ہوں۔ تم جانتے ہو۔ گھر کے سب لوگوں کا خیال ہے کہ اس بالا خانے پر جن رہتے ہیں۔ اگر تم آئندہ مجھے دیکھنا چاہو تو رات کے وقت جن بن کے آجایا کرو، مگر اس کام میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر کسی کو شک ہو گیا تو میرے منہ میں خاک، تمہاری جان کی خیر نہیں ہے۔‘‘

عبدالکریم نے کہا۔ ’’پیاری! اب جان کی پروا کسے ہے؟ جان تو ہم ہتھیلی پر لئے ہوئے ہیں۔‘‘ مکان کے اندر سے چچی نے ڈانٹ کر پیاری کو بلایا۔

عبدالکریم نے اسے تسلی دی۔ اور کہا کہ ’’تم غم نہ کرنا، میں سب انتظام کر کے دو تین روز میں آؤں گا۔‘‘

محبوب کے کوچے سے وہ بھیگی ہوئی آنکھوں اور جلتے ہوئے سینے کے ساتھ لوٹا، پیاری نے ملاقات کی بے مثال تدبیر بتائی تھی۔ اب کریم نے ٹھان لی تھی کہ جن ضرور بنوں گا۔ خواہ سچ مچ کے جنات مار ڈالیں، اور خواہ پیاری کے گھر والے ذلیل وخوار کریں۔

عبدالکریم وہاں سے چلا تو دل کی عجیب کیفیت تھی۔ پیاری کی صورت مستقل نگاہ کے سامنے رہتی۔ اس پر کبھی حافظ کی جان صدقے ہوتی، کبھی دل نثار ہوتا۔ قلب کی گہرائی سے بار بار آواز آئی کہ حسن کی بارگاہ سے جو بھی فرمان صادر ہو، اس کی تعمیل عین فرض ہے۔ دیوہ سے نکل کر کریم بڑا گاؤں گیا، اس نے ضد یا حیلے کر کے اپنی والدہ سے کچھ روپے لئے اور لکھنو پہنچا۔ لکھنو میں اس نے جن بننے کے لئے تمام ضروری سامان خریدا۔ مختلف قسم کے عطر، اگر بتیاں، شیرینی، کوئلے، دیا سلائی، لوہے کی سات آٹھ سلاخیں، دو دو ہاتھ لمبی اور موٹی، ایک پورا تھان خرید کے اس نے یہ چیزیں باندھ لیں۔ اور ایک لمحے بھی آرام نہیں کیا۔ لکھنو سے وہ سیدھا دیوہ پہنچا۔

آدھی رات ہو چکی تھی۔ قصبے کے در و دیوار پر سناٹا تھا۔ پیاری کے مکان کی عقبی دیوار میں کریم نے سلاخیں گاڑ دیں اور ان کے ذریعے بالا خانے پر پہنچ گیا۔ اوپر جا کر اس نے کسی جگہ اگر بتی جلائی اور کسی جگہ لوبان سلگایا، کہیں چراغ روشن کیا، کہیں عطر اور گلاب کا عرق چھڑکا، بالا خانہ خوشبو سے مہک گیا۔ عشق نے اسے ایک اور تدبیر بجھائی اگر وہ زینے سے مکان میں اترا تو کوئی اسے جن نہیں سمجھے گا، وہ کوٹھے سے دھم سے صحن میں کود گیا۔ کودنے کی بھیانک آواز سے سب کی آنکھ کھل گئی۔ عورتیں حواس باختہ ہو گئیں اور سمجھیں کہ آج حقیقت میں جن نازل ہو گیا۔ انہوں نے گھبرا گھبرا کر کہنا شروع کیا۔

’’یا حاجی وارث! یا خواجہ معین الدین، یا شاہ منعم! یا شاہ رزاق ہماری مدد کیجئے۔‘‘ پیاری کی والدہ کا دہشت سے برا حال تھا۔ انہوں نے جلدی سے پھونک مار کر چراغ گل کر دیا تاکہ جن کی صورت دیکھ کے لڑکیاں نہ ڈر جائیں۔ عبدالکریم نے والان کے ایک گوشے میں جا کر ڈراؤنی آواز سے کہا۔

’’بڑی بی! چراغ جلاؤ اور ہماری صورت دیکھو۔ تم روز کہتی تھی کہ ہم نے کبھی جن کی صورت نہیں دیکھی۔ لو آج ہم تمہاری آرزو پوری کئے دیتے ہیں۔‘‘

پیاری کی والدہ کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ ہاتھ جوڑ کے بولیں۔ ’’حضور ہماری خطا معاف کر دیجئے۔ ہم اس لائق کہاں کہ آپ کی صورت دیکھیں ہم غریبوں پر رحم کریں۔ ایسا نہ ہو کہ بچے دہل کر مر جائیں۔‘‘

جن نے زبردست قہقہہ لگایا۔ ’’بڑی بی! یہ نہ سمجھنا کہ ہم تمہیں آسانی سے چھوڑ دیں گے۔ ہمارے آنے کی وجہ سنو۔ ’’عبدالکریم یہاں آتا تھا۔ تمہاری لڑکی اس سے قرآن پڑھتی تھی۔ ہم بھی اس کی تلاوت شوق سے سنتے تھے۔ اب کیا وجہ ہے کہ تین دن ہو گئے، تلاوت کی آواز نہیں آئی؟‘‘

پیاری کی والدہ نے جواب دیا۔ ’’حضور! ہم نے عبدالکریم کو خود یہاں آنے سے روک دیا۔ اس کی آمد و رفت سے ہماری بچی رسوا ہو رہی تھی۔ اگر آپ

تلاوت سننا چاہتے ہیں تو جس وقت کے لئے حکم دیجئے گا، بچی اسی وقت تلاوت کرے گی۔ ہم ہرطرح حاضر ہیں۔''

جن نے کہا۔''بڑی بی! ہمیں قرآن سننے سے مطلب ہے۔ عبدالکریم سے نہیں! ہم روزانہ رات کو آئیں گے اور پیاری ہمیں قرآن سنائے گی۔ ہم مدت سے تمہارے بالاخانے پر رہتے ہیں۔'' پیاری کی والدہ نے یہ بات منظور کرلی۔

''عبدالکریم روزانہ اسی طریقے سے اگر بتیاں اور لوبان چھت پر سلگاتا۔ چراغ روشن کرتا اور دھم سے صحن میں کود پڑتا۔ لیکن چھت پر واپس جاتے۔ وقت وہ زینہ استعمال کرتا۔

ہوتے ہوتے بستی میں اس حیرت انگیز واقعے کی شہرت ہوگئی۔ بعض لوگوں نے وارث علی شاہ کو بھی یہ بتایا۔ انہوں نے مسکرا کہا۔''ہاں ہاں، پڑھا جن ہے۔ پڑھا جن ہے۔'' ان الفاظ کا مطلب کوئی نہیں سمجھا۔ سب یہ ہی سمجھتے رہے کہ کوئی عالم و فاضل، تلاوت کا عاشق زبردست جن ہے۔

عبدالکریم کئی مہینوں تک جن بن کر پیاری کے گھر جاتا رہا۔ کبھی کبھی دن کے وقت وہ حافظ عبدالکریم کی صورت میں بھی جاتا۔ وہ جن بن کے پہلے سے کہہ دیتا تھا کہ فلاح مقام پر عرس ہے۔ ہم وہاں جارہے ہیں۔ چندروز نہیں آسکیں گے۔

پیاری کی والدہ جانتی تھیں کہ عبدالکریم اور پیاری میں پاک وصاف محبت ہے۔ ہرطرح اطمینان کے قابل پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ وارث شاہ ان کے مکان پر آئیں اور عبدالکریم کے بارے میں اپنی زبان سے کوئی اشارہ کریں تاکہ رہا سہا خدشہ بھی دور ہوجائے۔

ایک دن عبدالکریم اپنی چچی کے گھر پہنچا۔ انہوں نے کہا۔''بیٹا! حاجی صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کرو کہ اگر مکان پر تشریف لائیں تو بڑا کرم ہوگا، سب دیدار کرلیں گے۔''

عبدالکریم نے وعدہ کرلیا کہ وہ وارث شاہ سے یہ درخواست کرے گا، لیکن وہ اپنی محبت کے باعث شرمندہ تھا۔ اس لئے مدت سے اس نے وارث شاہ کا سامنا نہیں کیا تھا۔ البتہ راہ چلتے جب بھی انہیں دیکھتا۔ نگاہ نیچی کرکے ادب سے سلام کرلیتا اور قدم بوس ہوجاتا۔ وارث شاہ، عبدالکریم پر ایک نگاہ ڈالتے اور متبسم ہوکے کہتے!''عبدالکریم تم کہاں ٹھہرے ہو! خون، جگر کا معاملہ ہے۔''

بہرحال وہ چچی کے اصرار پر وارث شاہ کے پاس گیا۔ اس نے چچی کا پیغام انہیں سنادیا۔ وارث شاہ بولے۔''اچھا سہ پہر کو چلیں گے۔''

عبدالکریم نے لوٹ کر اطلاع دی کہ وارث شاہ سہ پہر کو آئیں گے۔ گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ عورتوں نے مل جل کے مکان کی صفائی شروع کردی۔ اور وارث شاہ کی نشست گاہ آراستہ وپیراستہ کی۔ سہ پہر کو عبدالکریم دوبارہ ان کے پاس گیا، وارث شاہ اس کے ساتھ پیاری کے گھر پہنچے اور استراحت کے لئے بستر پر لیٹ گئے۔

عبدالکریم کی چچی اور لڑکیاں وارث شاہ کے ہاتھ پاؤں دبانے لگیں۔ عبدالکریم کچھ فاصلے پر دیوار سے پیٹھ لگائے گردن جھکائے دم بخود بیٹھا تھا۔ اس کے دل کی حالت ناقابل بیان تھی۔

یکایک اس پر رقت طاری ہوئی، اس نے اونچی آواز سے رونا چاہا، مگر کمال ضبط کیا اور چپکے چپکے آنسو بہاتا رہا، وارث شاہ نے کئی مرتبہ دریافت کیا۔ ''عبدالکریم کہاں گیا؟ عبدالکریم کہاں گیا؟''

پیاری کی والدہ نے اشارے سے بتایا کہ وہ سامنے بیٹھا ہے۔ پیاری نے عبدالکریم کے پاس جاکے کہا۔''جاؤ، تم بھی حضرت کے پاؤں دباؤنا!''

یہ سنتے ہی عبدالکریم کی حالت خراب ہوگئی، اس کا جسم لرزنے لگا، ہاتھ پاؤں قابو میں نہیں رہے، لیکن اسے پیاری کا حکم ٹالنے کی مجال نہ تھی، وہ آہستہ آہستہ وارث شاہ کے قریب پہنچا۔ وارث شاہ عبدالکریم کی یہ

حالت دیکھ کر مسکرائے۔ انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ پیاری بھی دوبارہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ جلد ہی یہ کیفیت ہوئی کہ کریم ان کے پاؤں دبانے لگا۔ پیاری بھی وارث شاہ کے پاؤں دبا رہی تھی۔ وارث شاہ یہ تماشا دیکھ کر مسکراتے رہے، پھر یکا یک پیاری کی والدہ سے مخاطب ہوئے۔ ''پیاری کی ماں!'' ہم نے بہت سیر کی ہے، اور تمام ملکوں میں پھرے ہیں۔ ہم ایک مقام پر پہنچے تو ہمیں ایک بات معلوم ہوئی۔ ایک شخص کسی لڑکی پر عاشق تھا اور اس کا عزیز تھا۔ لوگوں نے اس کی حالت دیکھ کر بدنامی کا خیال کیا۔ اور اسے آنے جانے کی مخالفت کرنے کے لئے مشورے ہونے لگے، طے پایا کہ وہ کسی کے کہنے سننے سے نہیں رکے گا۔ البتہ لڑکی اگر خود کہہ دے کہ میرے پاس نہ آیا کرو، تو مان جائے گا۔

لڑکی کے عزیزوں نے لڑکی کو سمجھایا بجھایا اور مجبور کیا کہ اسے آنے جانے سے منع کردے، چنانچہ وہ آیا تو لڑکی نے دل پر جبر کرکے کہا۔ ''اب یہاں نہ آیا کرو۔''

عاشق نے کہا۔ ''کیا سچ کہتی ہو؟ میں نہ آیا کروں؟'' اس نے تین مرتبہ اس سوال کی تکرار کی۔

لڑکی نے کہا۔ ''ہاں نہ آیا کرو، نہ آیا کرو، نہ آیا کرو۔''

جیسے ہی تیسری مرتبہ لڑکی نے نہ آنے کے لئے کہا۔ عاشق کی روح اس کے قالب سے پرواز کرگئی۔ اور ادھر اس کی جان نکلی، ادھر لڑکی بھی جاں بحق تسلیم ہوگئی۔''

یہ قصہ سنانے کے بعد انہوں نے ایک لمحے توقف کیا۔ پھر کہا۔ ''سنو پاک عشق میں خدا مدد کرتا ہے۔''

یہ کہہ کے وہ اٹھ بیٹھے، انہوں نے پہلے پیاری کی پیٹھ پر پھر کریم کی پیٹھ پر ایک گھونسا رسید کیا۔ اس واقعے کے بعد چچی کی بدگمانی جاتی رہی۔ وہ کریم کی خاطر مدارت کرنے لگیں۔ کریم کی آمد و رفت دوبارہ کثرت سے شروع ہوگئی۔

لیکن جیسا کہ دنیا کا قاعدہ ہے، لوگوں نے پھر طرح طرح کی افواہیں گرم کرنی شروع کردیں، کریم نے احتیاطاً آنا جانا کم کردیا، مگر وہ رات کو جن بن کر روزانہ وہاں جاتا تھا۔ ایک رات جن کے بہروپ میں پیاری سے باتیں کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ''میں لکھنو جارہا ہوں تمہیں کچھ منگوانا ہو تو بتادو، لیتا آؤں گا۔''

پیاری نے کہا۔ ''میرے لئے عقیق پتھر کی ایک تسبیح لیتے آنا۔'' کریم کا خیال تھا۔ گھر والے سو رہے ہیں، لیکن اس کی چچی جاگ رہی تھی۔ انہوں نے جن کی باتیں سن لیں اور یہ سمجھیں کہ کریم نے عمل وغیرہ پڑھ کے بالاخانے کے جن اپنے قبضے میں کرلئے ہیں اور ان کی مدد سے خود جن بن کر یہاں آتا ہے۔ انہیں یقین ہوگیا کہ یہ ضرور کریم ہی ہے، مگر انہوں نے کریم سے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔

کریم کو جن بن کر آتے تین چار مہینے گزر گئے تھے۔ ایک دن دوپہر کو عبدالکریم آیا۔ چچی نے اس سے پیاری کا پردہ کرایا اور اسے کسی طرح کریم کے سامنے نہیں آنے دیا۔ کریم نے گھر کے اندر سے پیاری کے رونے کی آواز سنی وہ مضطرب ہوگیا، یکا یک پیاری روتی ہوئی آئی اور کریم کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس کی بڑی بہن نے کہا۔ ''پیاری! اماں جان نے تمہیں باہر آنے سے منع کیا تھا۔ پھر تم کیوں آئیں؟''

پیاری نے جواب دیا۔ ''اماں جان کی یہ بات عقل کے خلاف ہے۔ کریم رشتے میں میرے بھائی ہیں اور انہوں نے مجھے قرآن شریف بھی پڑھایا ہے۔ تمام بستی جانتی ہے کہ ان سے میرا پردہ کبھی نہیں تھا۔ اب اگر میں نے پردہ کیا تو لوگ کیا کہیں گے، اس میں میری بدنامی ہے یا نہیں، میں پوچھتی ہوں آخر پردے کی وجہ کیا ہے؟''

لڑکیاں دم بخود رہ گئیں۔ کریم کو نہ جانے کیا خیال آیا وہ فوراً اٹھ گیا۔ اور جانے لگا۔ چچی نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں رکا۔ وہ بہت بدحواس تھا۔ قدم رکھتا کہیں تھا، قدم پڑتا کہیں تھا، وہ بڑا گاؤں کی طرف روانہ ہوا، مگر آدھے راستے سے پلٹ کر پھر دیوہ آگیا، اور پیاری کے گھر پہنچا۔ اندر سناٹا تھا۔ پیاری ایک طرف بیٹھی رو رہی تھی۔ کریم نے اس کی بہنوں سے

دریافت کیا۔ ''یہ کیوں رو رہی ہے؟''

انہوں نے بتایا ''آپ کے جانے کے بعد اماں نے اسے پردے سے باہر آنے کی وجہ سے خوب مارا۔ مگر وہ برابر یہی کہتی رہی کہ ''میں کریم بھائی سے پردہ نہیں کروں گی۔''

اس واقعے نے کریم کی طبیعت پر ایک اور تازیانے کا کام کیا۔ رات ہوئی تو وہ حسب معمول جن بن کر بالا خانے پر گیا اور صحن میں کود پڑا، پیاری کی والدہ کو سخت تعجب ہوا، کہ کل تو یہ کہہ گیا تھا کہ ہم خواجہ کے عرس میں اجمیر شریف جا رہے ہیں، آج کیسے آ گئے؟'' انہوں نے آواز دے کر کہا۔ ''حضور! کیا عرس میں تشریف نہیں لے گئے؟''

جن نے ڈپٹ کر کہا۔ ''بی بی! پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے کریم سے پیاری کا پردہ کیوں کرایا؟ اور پیاری کو مارا کیوں؟ ہمیں خبر ہوگئی ہے۔ اسی لئے ہم واپس آگئے ہیں۔ ہمیں تمہاری گستاخی سے بہت دکھ ہوا ہے۔ کریم ہم سے جو بھی خدمت لے گا، ہم اس کی بجا آوری کے لئے تیار ہیں۔''

پیاری کی والدہ متوحش سی ہوگئیں، وہ خطا معاف کروانے کے لئے جن کی منتیں کرنے لگیں، مگر جن نے ان کی ایک نہ سنی، اس نے کہا۔ ''ہم اس وقت تو جا رہے ہیں مگر بہت جلد تمہیں اس حرکت کا مزا ضرور چکھائیں گے۔''

دوسرے دن کریم دن کے وقت دیوہ آیا اور رشتے کے ایک ماموں کے ہاں ٹھہر گیا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ پیاری کی والدہ کو خبر ہوئی، تو جنات کی ناراضی کے خیال سے وحشت ہونے لگی کہ کوئی مصیبت نازل نہ ہوجائے، ویسے بھی جن دھمکی دے کر گیا تھا، چنانچہ انہوں نے اپنے گھر کی ملازمہ کو کئی بار بھیجا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، وہ عبدالکریم کو لے آئے، لیکن کریم ٹس سے مس نہ ہوا۔

روزہ کھولنے کے لئے ممانی نے بھی کریم کے لئے افطاری تیار کی اور پیاری کی والدہ نے بھی بھیجی۔

کریم نے خیال کیا کہ چچی کی افطاری میں پیاری کے ہاتھ لگے ہوں گے، اس نے وہی افطاری کھائی اور چچی کو پریشان کرنے کے لئے ممانی والی افطاری میں سے کچھ چیزیں اٹھا کر ان کی بھیجی ہوئی افطاری میں شامل کردیں۔

چچی کے گھر کی ملازمہ برتن لینے آئی تو ساری چیزیں اسی طرح موجود تھیں۔ چچی یہ دیکھ کر اور حواس باختہ ہوئیں کہ کریم نے افطاری واپس کردی۔

رات کو پھر چچی نے ملازمہ کو روانہ کیا، کہ کریم کو لے کر آؤ، مگر کریم نہیں گیا، آخر چچی خود آئیں اور زبردستی اسے ساتھ لے گئیں، انہوں نے پیاری کو بلانے کے کریم کے قریب بیٹھایا اور کہا۔ ''پیاری! کریم بھائی کو کھانا کھلاؤ۔'' پیاری ایک خوب صورت سینی میں کھانا لے آئی، کریم کھانے لگا، دفعتاً چچی کے حواس بگڑنے لگے۔ نہ جانے کیوں ان کی حالت پاگلوں جیسی ہوگئی، لکڑی، جوتا، ڈنڈا جو کچھ بھی ہاتھ میں آیا، اٹھا اٹھا کر وہ سب کو مارنے لگیں، لیکن کریم اور پیاری کو انہوں نے کچھ نہ کہا، پھر اسی وحشت کے عالم میں کنویں میں گرنے کے لئے وہ دوڑیں، سب نے مل کر انہیں پکڑلیا، یہ کیفیت لحظہ بہ لحظہ بڑھتی رہی اور بارہ بجے رات تک قائم رہی۔

ماں کی یہ مجنونانہ حالت دیکھ کر پیاری کا برا حال تھا۔ وہ کریم کے پاؤں پکڑ کے کہنے لگی۔

''اماں پر تم نے تو کچھ نہیں کردیا؟''

کریم نے جواب دیا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ شاید ان کے قلب کی حرارت سے ایسا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر کریم مردانے میں آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد پیاری کی بڑی بہن نے کریم کو بلا کے کہا۔ ''کریم بھائی ایک خط لکھ دو۔ ملازم کے ہاتھ خط بھیج کر جہاں گیر آباد سے ابو کو بلانا ہے۔''

کریم نے مردانے میں جا کر چچا کے نام خط تو لکھ دیا، مگر اسے خیال آیا کہ اگر ملازم یہ خط لے گیا تو چچا

فوراً آ جائیں گے، پھر نہ معلوم کیا واقعات پیش آئیں۔
کریم نے گھر کے ملازم عظمت کو بلایا اور الگ لے جا کر اس سے کہا۔

''عظمت! تم بھی کچھ جانتے ہو کہ یہ کیا قصہ ہے، اور ایسا کیوں ہوا؟''

عظمت نے جواب دیا۔ ''کریم میاں! مجھے سب معلوم ہے آپ اپنی چچی سے ناراض ہو گئے ہیں۔ اس سبب سے ان کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ اب جب تک وہ آپ کو منا نہیں لیں گی اسی آفت میں پھنسی رہیں گی۔ آپ کے قبضے میں جن ہیں وہ جن انہیں پریشان کئے ہوئے ہیں۔''

یہ سن کر کریم کو خوشی ہوئی، ''یہ آدمی بھی جنات کا قائل تو نکلا۔'' کریم نے عظمت سے کہا۔ ''میں جنات کو شام سے سمجھا رہا ہوں، مگر وہ میری ایک نہیں سنتے، اب مجھے تمہاری فکر لگی ہوئی ہے اور خوف ستا رہا ہے کہ ادھر تم خط لے کر جاؤ گے ادھر جنات تمہیں گھیر لیں گے۔''

عظمت کا چہرہ دہشت سے پیلا پڑ گیا۔ وہ گھبرا کر بولا۔ ''نا میاں! نا! اب تو یہ لوگ لاکھوں کا لالچ بھی دیں تو میں خط لے کر نہ جاؤں۔''

کریم نے کہا۔ ''اگر انکار کرو گے تو نوکری سے انکار مل جائے گا۔''

اس نے جواب دیا۔ ''مجھے نوکری کی پروا نہیں ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔''

کریم کہنے لگا۔ ''میں تمہیں ایک تدبیر بتاتا ہوں۔ اگر اس پر عمل کرو گے تو نوکری بھی سلامت رہے گی اور تم جہاں گیر آباد جانے سے بھی بچ جاؤ گے۔''

عظمت نے کہا۔ ''میاں جلدی سے بتائیں، میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا۔''

کریم نے کہا۔ ''تم ڈیوڑھی پر جا کے خط مانگ لو اور پھر مکان کے پچھواڑے زمین پر گر کے چیخنے چلانے اور قلابازیاں کھانے لگنا، سب یہ سمجھ لیں گے کہ خط لے کر جا رہے تھے، جنات نے ہلکان پریشان کر دیا۔ اس طرح میری تدبیر پر عمل کرو۔''

عظمت نے کہا۔ ''میں ابھی آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔ وہ فوراً ڈیوڑھی پر پہنچا۔ اس نے پیاری کی بڑی بہن سے خط لیا، اور روانہ ہو گیا، تھوڑی دور جا کر اس نے اپنی پگڑی، لاٹھی اور جوتے سب کچھ پھینک دیا، اور زمین پر گر کے مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ بارہ بجے رات کا وقت ہو گا۔ ایک میراثی پڑوس میں رہتا تھا۔ اس نے عظمت کا غل غپاڑہ سنا، تو اٹھ کے باہر نکلا۔ عظمت بہت برے حال میں زمین پر لوٹ رہا تھا۔ میراثی نے پوچھا۔

''ارے! عظمت! تمہیں کیا ہوا؟''

عظمت نے اٹھ کر اس کے گال پر زور سے ایک طمانچہ رسید کیا۔ میراثی کا منہ چرخی کی طرح گھوم گیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر بھاگا، اور مکان پر پہنچ کر چیخنے چلانے لگا۔

کریم چادر اوڑھے ہوئے بستر پر لیٹا تھا، چچی کی طبیعت سنبھالنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کر رہے تھے۔ میراثی کا شور سن کے وہ باہر نکلے۔ انہوں نے پوچھا۔ ''کیا معاملہ ہے؟'' میراثی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میاں! جلدی سے جا کر دیکھیے۔ عظمت کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔''

وہ عظمت کے قریب پہنچے۔ دہشت سے ان کے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے۔ ''افسوس۔ گھر میں صرف ایک مرد نوکر تھا، اس کی بھی یہ حالت ہو گئی۔ اندر عورتوں کی حالت الگ خراب ہے۔ یہ کریم کا بچہ ابھی نہ جانے اور کیا کیا گل کھلائے گا، اسی نے گھر بھر کو پریشان کر رکھا ہے۔'' وہ کریم کے پلنگ کے پاس گئے اور اسے اٹھا کر بولے۔

''بھائی! ہماری خطائیں معاف کر دو! کیا تم کوئی خون کروا کے جاؤ گے؟ عورتیں کیا بے پردہ ہو جائیں؟ جب خوش ہو گے؟''

کریم نے کہا۔ ''جناب آپ مجھے کیوں ملامت کر رہے ہیں؟ میں نے کیا کیا ہے؟''

وہ کہنے لگے۔ ''یہ سب آفتیں تمہاری وجہ سے آئی ہیں۔'' اتنے میں عظمت نے ڈیوڑھی میں آ کر آواز

دی۔ ''دیکھو میاں! اگر تم نے کریم کے خلاف کوئی بات کی تو اچھا نہ ہوگا۔''

''پیاری کی والدہ کے حواس کچھ کچھ بحال ہوچکے تھے۔ عظمت کی آواز سن کر وہ لجاجت سے بولیں۔ ''کریم کی مرضی کے خلاف اب کوئی بات نہیں ہوگی۔ وہ جیسا کہیں گے کروں گی۔''

صبح کریم بڑا گاؤں جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ رشتے کے ایک عزیز بھی اس کے ساتھ نکلے، راستے میں انہوں نے مشورہ دیا کہ ''کریم میاں! میں جہاں گیر آباد جارہا ہوں۔ تم بھی میرے ہمراہ چلو، میں رات کے واقعے کا ذکر پیاری کے والد سے کروں گا، اور ان پر زور ڈالوں گا، کہ وہ پیاری کی شادی تمہارے ساتھ کردیں، ورنہ ان کی رسوائی تو ہوگی ہی، کسی کا خون بھی ہوجائے گا۔''

کریم بے چارہ شامت کا مارا ان کے ساتھ جہاں گیر آباد پہنچا۔ انہوں نے ساری داستان خوب نمک مرچ لگا کر پیاری کے والد کو سنائی اور آخر میں کہا۔ ''کریم کے قبضے میں دو جن ہیں۔ سوچ لیجئے۔ اگر آپ نے پیاری کا نکاح کریم سے نہ کیا تو وہ جن پورا گھر برباد کرکے رکھ دیں گے۔''

پیاری کے والد غیظ و غضب سے چلائے۔ ''خواہ کچھ ہوجائے گھر سلامت رہے یا اجڑے۔ میں پیاری کی شادی کریم سے ہرگز نہ کروں گا۔'' وہ طیش سے کریم کے قریب آگئے۔ ''میاں! دو جن تم نے اپنے قبضے میں کیا کرلئے ہیں، خدائی پر قبضہ کرلیا ہے۔ سارے گھر کو رات سے پریشان کر رکھا ہے۔ میں اسی وقت دیوہ جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں، کہ تمہارے جن میرا کیا بگاڑ لیں گے۔''

کریم نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''جناب! آپ وہاں جانے کی زحمت کیوں کرتے ہیں؟ جن تو ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں۔ جی چاہے تو ابھی تماشا دیکھ لیں۔''

ان عزیز کا رنگ فق ہوگیا۔ وہ جلدی سے کہنے لگے۔ ''کریم میاں! کیا یہاں بھی آبرو کے خواہاں ہو؟ کچھ تو ہوش سے کام لو۔''

کریم نے کہا۔ ''میری اس میں کیا خطا ہے؟ چچا جان خود جنوں کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ جن اس وقت بھی میرے ساتھ ہیں۔ اور اپنی موجودگی ثابت کرنے کے لئے بے چین ہو رہے ہیں۔ میں نے انہیں بہت مشکل سے روک رکھا ہے۔

ان عزیز نے کریم کے چچا سے کہا۔ ''بھائی جان آپ بھی غصہ تھوک دیجئے۔ کریم آپ کا بھتیجا ہے، کوئی غیر نہیں ہے۔ یہ جو کچھ عرض کرے، اطمینان سے سن لیجئے۔''

چچا تھوڑی دیر خاموش رہے، پھر کریم سے کہنے لگے۔ ''اس وقت مجھے معاف رکھو۔ غور و خوض کے لئے کچھ وقت دو۔ تین دن بعد مجھ سے ملنا۔''

کریم نے سلام کیا اور جہاں گیر آباد سے بڑا گاؤں آیا۔ تیسرے روز وہ وہاں پہنچا۔ چچا کا مکان رشتے داروں سے بھرا ہوا تھا۔ سب نے کریم کو دیکھا۔ مگر کسی نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ کریم نے مایوس واپسی کا قصد کیا۔ اتفاق سے پیاری کے پھوپھا بھی بڑے گاؤں جارہے تھے۔ وہ کریم کے ہمراہ ہولئے۔ جہاں گیر آباد سے نکل کر انہوں نے کہا۔ ''کریم میاں! بڑے افسوس اور دکھ کی بات ہے، کہ تمہاری وجہ سے ایک خون ہوجائے گا۔''

کریم نے وحشت سے پوچھا۔ ''یہ آپ کیا فرما رہے ہیں پھوپھا جان! کیسا خون؟''

انہوں نے کہا۔ ''پیاری کے والد اور چچا کو معلوم ہوگیا ہے کہ تم دونوں طالب و مطلوب ہو۔ خود سوچو، شرفاء میں اس سے زیادہ قابل شرافت کون سی ہوگی؟ اسی وجہ سے پیاری کے والد نے عزیزوں کو جمع کیا تھا۔ سب نے انہیں مشورہ دیا ہے کہ عزت بچانی ہے، تو پیاری کی جان لے لیں، اگر انہوں نے اسے مار ڈالا میاں! تو تمہیں بھی جان دے دینی چاہئے۔ تم اس کے بغیر زندہ رہ کر کیا کروگے۔''

کریم کے ہاتھ پیروں سے جیسے جان نکل گئی۔

کلیجہ امڈ امڈ کر حلق میں آنے لگا۔ وہ بے حد بدحواسی میں وہیں سے دیوہ کی طرف بھاگا۔ راستے بھر اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہے۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر پیاری نہ رہی، تو زندگی بے کار ہے اسے بھی جان دے دینی چاہئے۔ اس نے سوچا کہ پیاری کے مکان میں ایک کنواں ہے۔ اس میں گر کر جان دینا بہتر ہوگا۔ یہ طے کرکے وہ دیوہ پہنچا۔

پیاری کے مکان پر سناٹا تھا۔ کوئی آواز نہیں آرہی تھی، مکان کا دروازہ بند تھا۔ اس ہیبت ناک سناٹے نے کریم کو یقین دلا دیا کہ پیاری کے والد اور چچا پہنچ چکے ہیں اور انہوں نے پیاری کو مار ڈالا ہے۔

کریم مجنونانہ انداز میں مکان کا طواف کرنے لگا۔ پھر اس نے زور زور سے آوازیں دیں، لیکن نہ دروازہ کھلا نہ کھڑکی سے کوئی جھانکا۔ کریم پریشانی میں شاہ منعم کے سجادہ نشین کے پاس گیا اور فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ انہوں نے خدام کو حکم دیا کہ ''کریم کو اٹھا کر حمام میں لے جاؤ، اور اس کے جسم پر اچھی طرح پانی ڈالو۔''

خدام نے حکم کی تعمیل کی۔ کریم کو دیر تک نہلایا گیا۔ پھر کپڑے پہنائے گئے اور عطر لگا کے سجادہ نشین کے سامنے لے جایا گیا۔ کریم کو کسی پل چین نہ تھا۔ یک بارگی وہ مچل کے پھر پیاری کے مکان کی جانب روانہ ہوگیا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ کریم روزے سے تھا۔ افطار میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ کریم پیاری کے مکان پر پہنچا۔ اب دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کریم نے ایک مستانہ نعرہ مارا اور مکان کے اندر چلا گیا۔ جاتے ہی اس نے سر کے بل کنویں میں چھلانگ لگادی۔ اتفاق دیکھئے وہ کنویں میں کودا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے اسے سنبھال لیا ہے۔ مگر اس کے دونوں ہاتھوں میں سخت چوٹیں آئیں ایک ہاتھ کی ہڈی باہر نکلی ہوئی تھی اور دوسرے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

پیاری کی والدہ نے کریم کو کنویں میں کودتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ پاس پڑوس کے لوگ جمع ہوگئے۔ گھر والوں نے پیاری کو ایک کوٹھری میں بند کر کے قفل لگا دیا اور کنویں میں اینٹیں وغیرہ برسانی شروع کردیں۔ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ کسی نے سید معروف شاہ وارثی کو خبر پہنچا دی کہ کریم نے کنویں میں چھلانگ لگا دی ہے اور گھر والے کنویں میں ہی پتھر برسا کے اسے ہلاک کردینے کے درپے ہیں۔ معروف شاہ چند معززین کے ساتھ اسی وقت وہاں پہنچے۔ انہوں نے کنویں پر آکر آواز دی۔ ''کریم! زندہ ہو۔ تو بولو۔'' کنویں میں گھٹنے گھٹنے پانی تھا۔ اتنے میں پیاری کی چیخ کریم کے کان میں پہنچی۔ پیاری اپنے گھر والوں سے رو رو کے کہہ رہی تھی ''آخر تم لوگوں نے کریم بھائی کی جان لے لی۔ اب تو دروازہ کھول دو۔''

کریم نے پیاری کی آواز سنی، تو اس کے قلب میں تقویت پیدا ہوئی اور جان میں جان آئی، اسے یقین ہوگیا کہ پیاری ابھی زندہ ہے، اس نے کنویں سے پکار کر کہا ''میں زندہ ہوں میں زندہ ہوں، جلدی سے مجھے باہر نکالو۔''

معروف شاہ کے حکم پر ایک کھٹولا رسی سے باندھ کر کنویں میں لٹکایا گیا اس طرح کریم باہر نکلا، نکلتے ہی اس نے قلب و جگر کی تمام تر گہرائی سے نعرہ لگایا۔ ''مزا ہے پیاری کا۔'' یہ ہی نعرہ لگاتے ہوئے وہ معروف شاہ کے ساتھ ان کے مکان پر آیا۔

خدام نے اسے پھٹکری ڈال کے دودھ پلایا۔ اس کے حواس کچھ بحال تو ہوئے لیکن یہ نعرہ اس نے بار بار جاری رکھا۔ ''مزا ہے پیاری کا۔''

شاہ معروف نے کہا۔ ''کریم! میں کہاروں کو بلواتا ہوں۔ وہ تمہیں پالکی میں بیٹھا کے بڑا گاؤں لے جائیں گے۔''

کریم بچوں کی طرح مچل کر بولا۔ ''حضرت میں اب قیامت تک اپنے مکان پر نہیں جاؤں گا۔''

شاہ معروف نے کہا۔ ''نہیں، نہیں تجھے جانا ہوگا۔ کیا تو جانتا نہیں کہ پیاری کے والد اور دوسرے عزیز تیری جان کے درپے ہیں۔ نجانے تیرے ساتھ کیا سانحہ پیش آجائے، لڑکی کی آبرو کا معاملہ ہے۔ ساری

بستی انہی کے ساتھ ہوگی۔''

کریم نے شاہ معروف کے پاؤں پکڑ کے کہا۔

''حضرت میں نے تو جان دے دی تھی۔ بے حیا ہوں کہ اب تک زندہ ہوں۔ کیا کروں، مرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ ورنہ میں جان دینے سے نہیں ڈرتا۔''

اس اثنا میں کریم کے ایک رشتے دار میاں نوروز علی بھی وہاں آگئے، اور اسے سمجھا بجھا کے اپنے گھر لے گئے، اسی رات پیاری کے والد بھی جہاں گیر آباد سے دیوہ پہنچے۔ گھر والوں نے ساری داستان سنائی، کریم سے یہ بات غلط کہی گئی تھی کہ پیاری کے والد پیاری کو ہلاک کرنے کے لئے دیوہ جارہے ہیں۔ کریم نے ساری رات یہ نعرہ لگا کے کاٹی کہ ''مزا ہے پیاری کا۔'' اسے نہ ہڈی ٹوٹنے کا احساس تھا، نہ کسی اور تکلیف کا۔

صبح معلوم ہوا کہ وارث شاہ دیوہ آرہے ہیں۔ کریم کا عجیب حال ہوا جو لوگ وارث شاہ کے پاس جانے والے تھے، کریم ان کی طرح طرح سے خوشامد کرنے لگا کہ ''ممکن ہے، حضرت دیوہ آکر میرے خلاف باتیں سن کر مجھے یہاں سے نکل جانے کا حکم دے دیں، مجھے دیوہ سے نکلنے نہ دینا!'' لیکن جو سنتا کانوں کو ہاتھ لگاتا کہ ہماری کیا مجال کہ حضرت کی بات ٹالیں۔

کریم کو ان دنوں حضرت وارث پر صرف اتنا اعتقاد تھا کہ وہ ایک بزرگ ہیں اور سب ان کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔ اگر انہوں نے حکم دے دیا کہ کریم کو دیوہ سے نکال دیا جائے، تو پھر کوئی اسے یہاں نکنے نہیں دے گا۔

آٹھ بجے صبح سید معروف شاہ چند معززین کے ہمراہ وارث شاہ کے استقبال کے لئے گئے۔ وارث شاہ نے ان کی طرف مبتسم دیکھ کر کہا۔ ''کیوں کریم کنویں میں کود پڑا، کیوں ایسا کیا جو وہ کود پڑا؟'' پھر معروف شاہ کی طرف دیکھ کر بولے۔

''سنا محبت ایسی تو ہو جیسی کریم کو ہے۔''

معروف شاہ نے سارا واقعہ سنا کر کریم اور پیاری کی کیفیت بیان کی۔

وارث شاہ نے کہا۔ ''ہاں دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ پاک محبت ہے، پاک محبت ہے، مگر دنیا کے لوگ نہیں مانیں گے، اور ان کی بدنامی ہوگی، کریم عاشق ہے، وہ عاشق ہے۔''

کریم کے بارے میں وارث شاہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر لوگوں نے اس کی حمایت شروع کردی، اور کہا کہ ''جی حضور کریم تو بہت اچھے آدمی ہیں۔''

وارث شاہ کے الفاظ کریم کے کانوں میں بھی پڑے۔ اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ رات کو وہ ان سے ملنے کے لئے پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ کریم نے دستک دی۔ وارث شاہ کو اطلاع دی گئی کہ کریم آیا ہے۔ انہوں نے کہا۔ ''کریم مستان کریم مستان!''

کریم وہی کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ جو کنویں میں چوٹ لگنے سے خون آلود ہوگئے تھے۔ وارث شاہ نے دروازہ کھولا، کریم نے ان کے قدم چومے۔

وارث شاہ بولے۔ ''کریم تم سے ضبط نہیں ہوا، کنویں میں پھاند پڑے، کون سا ہاتھ ٹوٹا؟'' انہوں نے دفعتاً کریم کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی اسی وقت جڑ گئی۔ وارث شاہ نے کہا۔ ''کریم! وہ لوگ تمہارے دشمن ہوگئے ہیں۔ آئندہ ان کے گھر نہ جانا!''

کریم نے دل میں کہا۔ وہاں تو ضرور جاؤں گا، کیوں نہیں جاؤں گا، ضرور جاؤں گا۔

یہ خیال اس کے دل میں آیا ہی تھا کہ وارث شاہ نے پھر تنبیہ کی۔ ''دیکھو ہرگز نہ جانا، وہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے۔''

کریم ان سے رخصت ہوکر گھر سے باہر آیا۔ عشق کا جن اس کے سر پر سوار تھا۔ کوئی بات ذہن میں نہ آتی تھی۔ بس اسی وقت بے تاب ہوکر وہ پیاری کے مکان تک آگیا اور اندر گھس گیا۔ عورتوں اور مردوں نے پکڑ کر اسے خوب مارا پیٹا اور بری طرح لہولہان کرکے باہر نکال دیا۔

کریم پاگلوں کی طرح بستی کے گلی کوچوں میں صدا لگاتا پھرا۔ ''مزا ہے پیاری کا، مزا ہے پیاری کا!''

خستہ حال، بھوکا پیاسا اور داڑھی مونچھیں بڑھی ہوئی، اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ پیاری کے والدین نے اپنے دروازے پر پہرا لگوادیا تاکہ کریم دوبارہ نہ آسکے۔ پیاری کی حفاظت کے لئے بھی عورتیں مقرر کردی گئیں۔

ایک روز کریم جذب میں یہ ہی صدا لگاتا ہوا مکان کے گرد پھر رہا تھا۔ پیاری کوٹھے پر چڑھ آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے چند عورتیں بھی تھیں۔ انہوں نے پیاری کو پکڑا اور گھسیٹتی ہوئی نیچے لے گئیں۔ اسی وقت مکان کا وہ زینہ گرادیا گیا۔

کریم کی زبان پر دن رات پیاری کے نام کی رٹ تھی۔ لڑکے بالے اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے، کوئی پتھر اور کوئی چپت رسید کرکے بھاگ جاتا، کسی کا جی چاہتا تو دور ہی سے پتھر پھینک مارتا، نوبت یہاں تک آگئی کہ کریم گلی گلی پٹنے لگا، ایک روز پیاری کے مکان کے گرد طواف کرتے ہوئے وہ یہ ہی صدا لگا رہا تھا۔ ''مزا ہے پیاری کا!'' کہ پیاری کی والدہ اور دوسری عورتیں حضرت وارث شاہ کے پاس گئیں اور بولیں۔

''حضور کریم ہمیں بدنام کرتا ہوا پھرتا ہے اور ہماری بچی کا نام علی الاعلان لیتا ہے۔''

وارث شاہ نے کہا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو ہم اسے دیوہ سے نکال دیں گے۔'' انہوں نے اپنے خادم نورمحمد شاہ سے کہا۔ ''جاؤ اور اسی وقت کریم کو پکڑ کر لاؤ۔''

نورمحمد شاہ نے کریم سے مل کر سارا واقعہ بیان کیا۔ کریم ایک لمبا چھرا ہاتھ میں لے کر وارث کے دروازے پر جا بیٹھا، اس نے طے کرلیا تھا کہ اگر وہ اسے دیوہ سے نکل جانے کا حکم دیں گے، تو وہ ان کے سامنے اپنے سینے پر چھرا گھونپ لے گا۔

وارث شاہ نے کریم کی یہ حالت دیکھ کر خاموشی اختیار کیا اور کوئی ایسی بات نہ کہی جس سے کریم مایوس ہوتا۔

ایک روز کسی نے کریم سے مذاق میں کہہ دیا کہ ''میاں! پتنگ اڑا کر پیاری کے مکان کی چھت پر گرادیا کرو۔ پھر پتنگ لینے کے بہانے مکان میں گھس جایا کرو، شاید اسی بہانے تمہیں پیاری کا دیدار نصیب ہوجایا کرے۔''

کریم نے یہی کیا۔ وہ پتنگ اڑا کر مکان میں گرادیتا۔ پھر خود دوڑ کے اندر چلا جاتا کہ ''ہماری پتنگ گری ہے، ہماری پتنگ گری ہے۔ واپس دو۔'' لیکن وہاں سے وہ پٹ پٹا کر نکلتا، اسے دن میں کئی کئی مرتبہ اس طرح زدوکوب کیا جاتا۔

ایک دن وارث شاہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے کریم کو بلا کر کہا۔ ''تم اپنی پتنگ ہمارے کوٹھے پر گرایا کرو۔''

کریم نے پتنگ اڑانی ہی چھوڑ دی، مگر پیاری کا پیار روز بہ روز بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ اسے دنیاو مافیہا کی خبر نہ رہی، تین برس اسی کیفیت میں گزر گئے، کبھی کبھی وارث شاہ اسے بلا کر اس کا حال دیکھ لیتے، اور مسکرا دیتے!

ایک دن انہوں نے کہا۔ ''کریم تم ہماری صورت دیکھا کرو۔''

کریم نے کہا۔ ''حضور! دنیا میں پیاری سے زیادہ حسین کوئی ہے ہی نہیں، دیکھوں کسے؟ آپ اس سے زیادہ خوب صورت ہوتے تو آپ کو دیکھتا!''

وارث شاہ ہنس پڑے۔ انہوں نے کریم کو گلے لگا کر کہا۔ ''عاشق کے سوا کسی کو یہ جرأت نہیں ہوسکتی!''

ایک بار وارث شاہ فتح پور میں مستقیم شاہ کے مکان میں بیٹھے تھے۔ کریم بھی ان کے ساتھ تھا۔ فتح پور کے ایک بزرگ شاہ نذیر علی وارث شاہ سے ملنے کے لئے آئے۔ وہ بہت دیر تک ٹکٹکی باندھ کے کریم کی صورت دیکھتے رہے۔

وارث شاہ نے کریم سے کہا۔ '''' کریم! آج دیوہ میں عجیب واقعہ ہوا! ماں بیٹی میں خوب تکرار ہوئی وہ لڑکی تمام گھر کو پریشان کئے ہوئے ہے۔''

کریم بے قرار ہوگیا۔ وارث شاہ دیوہ لوٹے، تو معلوم ہوا کہ پیاری کے سوا تمام گھر والے بیمار ہیں۔ ان کی واپسی کا علم ہوا، تو تمام گھر والوں نے ان سے مل کر انہیں بپتا سنائی کہ بہت بری حالت ہے۔ وارث شاہ نے کریم کو بلا کر کہا۔ ''کریم! تم ان کے گھر جا کر صدا

مت لگایا کرو۔ ہاں بزرگوں کے درباروں پر جاؤ۔ تو خوب صدا لگاؤ۔ دیوہ میں مت لگایا کرو۔ ان لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے۔''

کریم خاموشی سے چلا آیا۔ اس نے ایک مدت تک صدا نہیں لگائی۔ اب وہ چپ چاپ اور بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا۔ ایک روز وارث شاہ نے کہا۔ ''کریم! میری دعا ہے کہ خدا اور رسول تم کو ملیں، وہ لڑکی ملے یا نہ ملے۔''

☆......☆......☆

ایک روز مغرب کے بعد کریم کو خبر ہوئی کہ پیاری اور اس کی والدہ وارث شاہ کی طرف گئی ہیں، کریم بھی وہیں پہنچ گیا اور زنانے حصے کے قریب پہنچ کر صدا لگانے لگا۔ ''مزا ہے پیاری کا، مزا ہے پیاری کا!'' وارث شاہ نے جیسے ہی یہ صدا سنی! پیاری اور اس کی ماں کو فوراً رخصت کر دیا۔

کریم دروازے پر مستانہ وار جھوم جھوم کر یہ ہی صدا لگا رہا تھا۔ پیاری کی والدہ یہ دیکھ کر رک گئیں۔ انہوں نے وارث شاہ کے ایک خادم سے کہا۔ ''کریم دروازے پر کھڑا ہے، اسے دروازے سے ہٹا دو۔''

خادم نے کریم سے کہا۔ ''یہ زنانہ دروازہ ہے۔ یہاں کیوں کھڑے ہو؟ جاؤ جا کر مردانہ دروازے پر صدا لگاؤ۔ ادھر سے عورتیں حضرت کی قدم بوسی کے لئے آتی ہیں۔''

کریم نے جواب دیا۔ ''میں زنانہ مردانہ کچھ نہیں جانتا۔ جہاں جی چاہتا ہے صدا لگاتا ہوں۔ تم کون ہو مجھے روکنے والے؟''

خادم نے کریم کو بہت برا بھلا کہا۔ اور یہ دھمکی بھی دی کہ ''میں ابھی حضرت کو اطلاع کر کے تمہیں دیوہ سے نکلواتا ہوں۔''

لیکن کریم نہ مانا، پھر پیاری خود باہر نکل آئی اور ساتھ اس کی ماں بھی، دونوں اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔

کریم کی شکایت حضرت وارث شاہ سے کر دی گئی، انہوں نے کریم کو طلب کیا اور لطف و کرم کی نظر اس پر ڈال کر بولے۔ ''نور محمد شاہ! جاؤ پیاری کی ماں سے کہہ دو کہ اپنی لڑکی کو لے کر ہمارے ہاں نہ آیا کریں، کریم عاشق ہیں، کسی روز انہوں نے پکڑ لیا تو قیامت تک اس کا چھوٹنا مشکل ہے۔''

کریم پر وجد طاری ہو گیا۔ اس نے اپنا سر زمین پر دے مارا اور بری طرح تڑپنے لگا۔ پھر وارث شاہ کی توجہ سے اس کی حالت درست ہوئی۔

ایک دن بستی کے ایک صاحب کریم کے پاس آئے اور بولے۔ ''اگر تم ہمیں پانچ سو روپے دو، تو ہم تمہیں پیاری سے ملوا دیں گے۔''

کریم بے چارے کے پاس پانچ سو روپے کہاں سے آئے؟ یہ اس زمانے میں ایک خطیر رقم تھی۔ کریم خاموش ہو گیا۔ ان صاحب نے کہا۔ ''ان دنوں تیورہ رئیس عبدالحمید صاحب حضرت کی زیارت کے لئے آئے ہوئے ہیں ان کی جیب میں سونے کی ایک بیش قیمت گھڑی ہے۔ اگر تم کسی تدبیر سے وہ گھڑی ہمیں لا دو تو ہم تم سے پیاری کی ملاقات کروا دیں گے۔''

کوئی گیارہ بجے دن کا وقت تھا۔ کریم اس مکان میں پہنچا۔ جس میں تیورہ کے رئیس عبدالحمید کا قیام تھا۔ وہ سیدھا کوٹھے پر جا کر ان کے کمرے میں گھس گیا۔ اس نے ان کی موجودگی میں اچکن سے گھڑی نکال لی، اور کوٹھے ہی سے کود پڑا، وہ چلائے کہ ''کریم گھڑی کہاں لے جاتے ہو۔'' مگر دیوانہ کس کی سنتا ہے۔ عبدالحمید کا چلانا سن کر لوگوں نے کریم کو پکڑ لیا اور گھڑی سمیت وارث شاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ پورا واقعہ سن کر وارث شاہ بولے۔ ''کریم کو نکال دو، آئندہ یہ یہاں نہ آنے پائے۔ نور علی سے بھی کہہ دو کہ انہیں اپنے مکان میں نہ رہنے دیں، یہ ہم کو بدنام کرتے ہیں، لوگ کہیں گے کہ چوری ہم کرواتے ہوں گے، ہماری بھی شرکت ہو گی۔''

کریم کو وہاں سے نکال دیا گیا۔ صبح اس کو پتہ چلا وارث شاہ قصبہ سہالی چلے گئے ہیں۔ کریم وہاں جا پہنچا۔ دروازے پر جا کر اس نے صدا لگائی۔ ''مزا ہے پیاری کا!'' وارث شاہ نے اس کی آواز سنتے ہی اسے

اندر بلالیا۔ اور کہا کہ ’’دیکھو کریم! اب تم دیوہ نہیں جاسکتے! ہماری بدنامی ہوتی ہے۔‘‘

کریم نے دل میں کہا۔ حضرت کچھ بھی ہوجائے، جاؤں گا ضرور، وہ اسی وقت دیوہ کی جانب چل دیا، دیوہ میں وہ ادھر ادھر پھرتا رہتا، رات ہوتی تو پیاری کے گھر کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے پڑا رہتا۔

ایک دن وہ سر دھنتا ہوا باغ میں گھوم رہا تھا۔ اتفاق سے مشہور انگریز بیرسٹر کالون وہاں سیر کے لئے آیا، اس کی نظر کریم پر پڑی اس کا دل اس دیوانے کی طرف کھنچا، وہ اس کے قریب جا کر اس سے باتیں کرنے لگا، کریم نے اس کے سامنے اپنا حال بیان کردیا، کالون نے دانتوں میں انگلی دبا کر اور بہت ہمدردی ظاہر کی۔ یہاں تک کہ وہ ٹم ٹم پر اسے بیٹھا کر اپنی کوٹھی لے آیا۔ اسے دو تین روز اپنا مہمان رکھا اور پھر کریم سے کہا۔ ’’تم بارات لے کر پیاری کے دروازے پر پہنچ جانا اور وہاں باجا بجادینا۔‘‘

بارات میں دو تین لوگ ہی شامل ہوں بھلا پھر میں مقدمہ لڑوں گا اور یہ مقدمہ میں جیت کر تمہاری پیاری تمہیں دلاؤں گا۔‘‘ اس کے علاوہ پانچ سو روپے نقد اسے دیئے۔

کریم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پانچ سو روپے لے کر دیوہ آ گیا۔ معلوم ہوا کہ وارث شاہ آج کل رودلی میں قاضی مظہر الحق کے ہاں مقیم ہیں۔ اور پیاری کے گھر والوں نے منت مان رکھی ہے کہ اگر کریم کو دیوہ سے نکال دیا جائے، تو وہ وارث شاہ ان کی دعوت کریں گے۔

کریم کی جان پر بن گئی، اسے خیال آیا کہ باجے بجانے سے پہلے ادولی جاؤں، اور حضرت کی قدم بوسی کرکے انہیں دعوت دوں، ممکن ہے، قسمت یاوری کرے، اور حضرت میری دعوت قبول کرلیں، وہ جب ادولی پہنچا تو آپ نے ملنے سے انکار کردیا، پر دوسری دفعہ جب درخواست پہنچائی گئی تو آپ نے کہا۔ ’’اچھا کریم کو بلاؤ۔‘‘

خدام کریم کو ان کے سامنے لے گئے۔ وارث شاہ نے اس سے تمام حال پوچھا۔ اور کہا کہ ’’کریم! اگر کوئی تم سے یہ کہتا کہ وارث علی کی گردن ماردو۔ ہم تمہیں پیاری سے ملوادیں گے۔ تو تم کیا کرتے؟‘‘

کریم نے بے ساختہ کہا۔ ’’حضور! میرا بس چلتا تو اس کام میں بھی ذرا تامل نہ کرتا!‘‘

وارث شاہ ہنس دیئے۔ انہوں نے اٹھ کر کریم کو گلے لگالیا۔ ’’جاؤ، ہم دیوہ میں تمہاری دعوت ضرور کھائیں گے۔‘‘

کریم نے ان کے قدم چوم لئے، اور چلا آیا، قمری مہینے کی بائیس تاریخ تھی، وارث شاہ دیوہ لوٹے، پیاری کے گھر والوں کی طرف سے دعوت کا اہتمام ہوا، اور احترام کا جلوس اٹھا۔ کریم بھی اسی وقت وہاں پہنچ گیا۔ اس نے صدا لگائی۔ ’’مزا ہے پیاری کا!‘‘ شیرینی وارث شاہ کو پیش ہوئی، کریم یہ سوچ کر جھومنے لگا کہ اس شیرینی میں پیاری کے ہاتھ ضرور لگے ہوں گے، کاش مجھے بھی ملے مگر عجیب بات ہوئی، خادم نے شیرینی سب کو دی، مگر کریم کو نہ دی۔

یکا یک وارث شاہ نے کریم کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ’’کریم! تم کو حصہ نہیں ملا؟‘‘

کریم زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ وارث شاہ نے اسے اپنے ہاتھ سے مٹھائی دی۔ تھوڑی دیر بعد پیاری کے گھر سے کھانا آیا۔ اس میں سے بھی کریم کو اس کا حصہ دیا گیا۔

چند روز بعد کریم نے دعوت کا اہتمام کیا اور پیاری کے مکان کا طواف کرنے لگا، وہ جو کھانا لے کر آیا۔ اس میں سے کچھ پیاری کے گھر بھجوادیا۔ کچھ مدت بعد لوگوں نے وارث شاہ سے پھر کریم کی شکایتیں کیں۔ وارث شاہ نے اسے دیوہ سے نکل جانے کا حکم دیا۔ وہ چالیس دن تک بستی سے باہر سر پھوڑتا رہا۔ شب باشی قبرستان میں کرتا تھا۔

ایک روز مجبور ہوکر وہ دیوہ آ گیا۔ اس نے حلوائی کی دکان سے حلوہ لیا، اور وارث شاہ کے دروازے پر پہنچ کے خدام سے اطلاع کرنے کے لئے کہا۔ انہوں نے انکار کردیا۔ کریم بے اختیار چوکھٹ

سے سر پھوڑنے لگا۔ آخر ایک نو وارد کو اس پر ترس آ گیا۔ اس نے اندر جا کے اطلاع دی کہ کوئی عاشق آیا ہے۔ وارث شاہ نے کہا۔ ”عاشق کو کون روک سکتا ہے؟ آنے دو۔“

کریم کو دیکھ کر وہ مسکرائے۔ اس نے حلوہ پیش کیا۔ وارث شاہ بولے۔ ”یہ سارا حلوہ پیاری کے مکان پر بھیج دو۔“

اتفاق سے ان دنوں پیاری کے رشتے کے ایک چچا وہاں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کریم کو بلوایا۔ کریم خوش خوش ان کے پاس پہنچ گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گھر میں چولہا گرم ہو رہا تھا، انہوں نے کریم کو سمجھایا کہ پیاری کا نام لینا چھوڑ دو، اور دیوہ سے ہمیشہ کے لئے چلے جاؤ۔ کریم نے جوش میں آ کر نعرہ لگایا۔ ”مزہ ہے پیاری کا!“ نعرہ سن کر وہ بہت تلملائے۔ انہوں نے کریم کو پکڑ لیا اور گھر کی عورتوں سے کہا کہ دست پناہ گرم کر کے لاؤ، تھوڑی دیر بعد وہ دست پناہ سرخ کر کے لایا گیا، انہوں نے کریم کو اس سے داغنا شروع کر دیا۔

ایک شخص نے کریم کو مکان میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اندر سے اس نے چیخیں سنیں تو دوڑ کر وارث شاہ کو اطلاع کی کہ ”حضرت! لیجیے، فیصلہ ہو گیا۔ آج کریم ان کے گھر میں بند ہے، مار ڈالا ہوگا، اسے!“

وارث شاہ نے ایک جذب سے کہا۔ ”عاشق کو مار ڈالنا دل لگی نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دروازے پر گئے۔ انہوں نے خدام کو حکم دیا کہ ”ابھی وہاں جاؤ اور کریم کو ساتھ لے کر آؤ۔“

اس وقت کریم پیاری کے ہاتھ کا سلا ہوا کرتا پہنے ہوئے تھا۔ داغنے اور پٹنے سے کرتا پھٹ گیا تھا۔ کرتا پھٹنے کا اسے سخت رنج تھا۔ داغنے اور پٹنے سے کرتا پھٹ گیا تھا۔ وہ وارث شاہ کے سامنے پہنچا۔ تو انہوں نے کہا۔ ”بھلا اس کو مارنے سے کیا فائدہ؟ ظلم کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا!“

بات آئی گئی ہو گئی۔ کریم اسی حالت میں مستانہ وار نعرہ لگاتا ہوا زندگی کے دن کاٹنے لگا، برسات کے موسم میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ وارث شاہ فتح پور سہورہ میں تھے۔ کریم کو وہیں طلب کر کے انہوں نے حکم دیا کہ ”تم بہرائچ جاؤ، اور کل آ کے ہم سے پتھیے پور میں ملنا۔“ کریم اسی وقت پاپیادہ لہرائچ پہنچا، اور سید سالار کے مزار پر جا کے بیٹھ گیا۔ اس پر غفلت طاری ہونے لگی۔ اسی حالت میں اس نے دیکھا کہ وہ بڑا گاؤں اپنے گھر میں بیٹھا ہے۔ وارث شاہ آئے اور بولے۔

”کریم! اگر تم ہماری دعوت کرو، تو تمہیں پیاری مل جائے گی، دن پیر اور تاریخ گیارہ ہوگی۔ اب ہم دیوہ جا رہے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔“

خواب ہی میں وہ دیوہ پہنچا۔ وہاں شاہ منعم کی درگاہ میں گیا، مزار کا تعویذ غائب تھا۔ اور شاہ منعم اپنے مزار کے باہر بیٹھے ہوئے تلاوت کر رہے تھے۔ جیسے ہی کریم پر ان کی نظر پڑی انہوں نے قرآن بند کر کے کریم کی طرف توجہ کی۔ کریم نے ان کا ہاتھ تھام کے اشتیاق سے پوچھا۔ ”حضور! یہ فرمایئے کہ مجھے پیاری کب ملے گی؟“

شاہ منعم نے کہا۔ ”جب ہمارے مزار پر چادر چڑھاؤ گے۔“ یہ کہہ کے انہوں نے کریم کو رخصت ہونے کا اشارہ کیا۔ اور قرآن کھول کے دوبارہ تلاوت میں مصروف ہو گئے۔ کریم کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے خود کو سید سالار کے مزار پر پایا۔

وہ اٹھ کر باہر آیا۔ ایک اجنبی شخص آگے بڑھا اس نے کریم کے ہاتھ میں ایک تھیلی دی اور یہ کہہ کے چلا گیا کہ ”اس میں تین سو روپے ہیں۔“

بعد میں کریم نے اس اجنبی کو بہت تلاش کیا۔ مگر اسے دوبارہ نہ دیکھ سکا۔ وہاں سے کریم پیدل روانہ ہو گیا۔ دوسرے روز پتھیے پور پہنچا، چاند رات تھی۔ اس نے حساب لگایا تو پیر کے دن گیارہویں تاریخ پڑ رہی تھی۔ وہ وارث شاہ کے پاس پہنچ گیا اور بولا۔ ”حضرت! گیارہ تاریخ کو پیر کے دن آپ کی دعوت ہے۔“

وارث شاہ بولے۔ ”جمعہ کو کر دینا!“

کریم نے کہا۔ ”حضور نے خود پیر کا دن مقرر

فرمایا تھا۔"

"اچھا، پیر ہی سہی!"

ان سے دن تاریخ طے کر کے وہ دیوہ پہنچا اور شاہ منعم کے سجادہ نشین سے اپنے خواب کا ذکر کرنے لگا، اس نے شاہ منعم کی شبیہہ کی تفصیل سنائی تو سجادہ نشین نے اٹھ کر اسے سینے سے چمٹا لیا، اور رونے لگے۔ "کریم! بے شک شاہ صاحب بالکل ایسے ہی تھے۔"

گیارہ تاریخ آئی۔ وارث شاہ بھی دیوہ آ گئے۔ کریم نے ان کے پاس پہنچ کر انہیں سلام کیا۔ وارث شاہ بولے۔ "کریم! بے شک شاہ صاحب بالکل ایسے ہی تھے۔"

وارث شاہ بولے۔ "کریم! شاہ منعم کے مزار پر چادر کب چڑھاؤ گے؟"

کریم نے جواب دیا۔ "حضرت! ابھی جا کر چڑھاتا ہوں۔" وہ اسی وقت چادر لے کر شاہ منعم کے مزار پر گیا۔ اس نے چادر چڑھائی اور مزار سے باہر آیا۔

یکا یک اس کا دل مچلنے لگا کہ آج گھر میں گھس کر پیاری کو پکڑ لائے گا جو ہوگا دیکھا جائے گا، اسی مستانہ حالت میں وہ کریم شیرازی کا مطلع گنگناتا ہوا دریا کی طرف چلا آیا۔

راستے میں وارث شاہ کی قیام گاہ تھی۔ اس کے قدم وہیں رک گئے۔ اس نے سوچا کہ پہلے حضرت کی قدم بوسی کر لوں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بے جھجک اندر چلا گیا۔ وہاں اسے وارث شاہ دکھائی نہیں دیئے البتہ ایک اور ہوش ربا جلوہ نظر آیا۔ کریم کے قدم سو سو من کے ہو گئے۔ روح کھنچ کر دل میں آ گئی۔ وہ آئینے کے مانند حیرت زدہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہی نقشہ ہے، وہی رنگ ہے، وہی روئے زیبا ہے۔ جس پر ہزار جان سے قربان ہونے کو جی چاہتا ہے وہی پیاری ہے۔ گلے میں چندن ہار اور سر پر گلابی دوپٹہ اوڑھے ہوئے بصد ناز و ادا مسکرا رہی تھی۔

کریم بے اختیار سر بسجود ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جلوہ جہان آرا پھر دیکھنے کے لئے اس نے سر اٹھایا مگر نہ وہ پیاری تھی نہ وہ موہنی صورت بلکہ وارث شاہ بیٹھے ہوئے تھے۔ پیاری کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کریم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ آگے بڑھ کر مرشد کے قدموں پہ چہرہ رگڑنے لگا۔ "حضور! یہ کیا تماشا تھا؟"

مرشد نے کہا۔ "کریم! یہی صورت ہے، اسی کے ساتھ تمہارا حشر ہے۔ جہاں کہیں دیکھو گے یہی صورت دیکھو گے۔"

ان الفاظ سے کریم کے دل کی دنیا پلٹ گئی۔ گزشتہ خیالات اور تصورات اس طرح فنا ہو گئے۔ جیسے کبھی تھے ہی نہیں اس کے قلب پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ جو کچھ ہیں۔ یہی ہیں اور یہ ہی صورت ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کریم نے دل کی مراد پائی، اور وارث شاہ کی شکل میں وہی صورت دیکھی، جس نے دونوں عالم سے بے گانہ اور اپنا دیوانہ کر رکھا تھا۔ ماسوا کا ہر نقش اس کے دل سے مٹ گیا۔ اب وہی عالم افروز حسن اس کے پیش نظر تھا۔

کریم کو لوگ کریم پیاری کہنے لگے تھے۔ کریم نے یہ آخری منظر دیکھنے کے بعد پھر کبھی پیاری کے گھر کا رخ نہیں کیا۔ مرتے وقت تک نہ کبھی اس کا ذکر کیا نہ اس کی فکر کی، ہاں زبان پر یہ صدا ہمیشہ رہی "مزا ہے پیاری کا!"

وارث شاہ کے انتقال کے بعد کریم پیاری برسوں زندہ رہے، وہ سال میں دو مرتبہ ان کے مزار پر نہایت اہتمام سے چادر چڑھاتے۔

اس موقع پر کریم کی حالت دل سوز منظر پیش کرتی تھی۔ سر پر چادر کی سینی رکھی ہوتی، قوالی ہوتی جاتی۔ آنکھیں حیرت زدہ کھلی ہوئی ہوتیں۔ تمام جسم غیر متحرک رہتا، دو دو آدمی سنبھالتے تھے، بالکل سناٹے اور ہیبت کا عالم ہوتا تھا۔ اسی کیفیت میں وہ مرشد کے مزار پر پہنچتے اور چادر وغیرہ چڑھا کر اسی حالت میں واپس مڑتے، مردے کی سی شکل ہو جاتی تھی، لوگ انہیں ہوا دیتے اور عرق گلاب چھڑکتے، انہوں نے عشق کی پر اسرار منزلیں طے کر لی تھیں!

آدم خور پودے

ساجدہ راجہ۔ ہنڈواں سرگودھا

حواس باختہ بوڑھا دندناتے ہوئے کمرے سے نکلا اور باہر کی جانب بھاگا، طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ جو کہ بوڑھے کے لئے جان لیوا ہو سکتی تھیں مگر وہ بوڑھا اس سے بھی لاپرواہ کہ پھر اچانک.........

خوشی میں اکثر حواس کھودینے والے......ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہوتے ہیں

اتنی شدت سے طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں گویا ہر چیز کو تہس نہس کردیں گی۔ ان کی شائیں شائیں کی آواز جیسے کسی اور ہی دنیا کی آوازیں لگ رہی تھیں، جب یہی آواز چھتوں سے ٹکراتیں تو یوں محسوس ہوتا جیسے چھت کو ہوا اپنے ساتھ ہی اڑا کر لے جارہی ہو۔ شدید سردی کا موسم نہیں آیا تھا لیکن اس طوفان کی وجہ سے یا کچھ خوف کی بدولت جسم کی کپکپی رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

بادل اتنی زور سے گرجا تو یوں لگا کہ آسمان ٹوٹ کر گر پڑا ہو۔

بجلی کی چمک آنکھوں کی بینائی اچک لے جائے گی اور کڑک گویا سب کے دل بند کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ خود کو طاقتور سمجھنے والے اس رات کے خوف کے زیر اثر آ گئے تھے۔

رضائی میں دبکے ہونے کے باوجود بھی کپکپی نے وجود کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا اور ٹھنڈ گویا ہڈیوں میں اترتی جارہی تھی۔ ٹھنڈ اور خوف جب مل جائیں تو یہی صورتحال پیدا ہوجاتی ہے۔

اور پھر بادل شدت سے گرجا اور زوردار دھماکے سے بارش شروع ہوگئی۔ بارش کی شدت اتنی تھی کہ اس نے چند ہی لمحوں میں ہر چیز کو جل تھل کردیا تھا اور ساتھ ہی ہوا کے شور میں اضافہ ہوگیا۔

بجلی کی کڑک بادلوں کی گرج اور چمک مل کر ماحول کو اتنا خوفناک اور پراسرار بنا رہے تھے کہ دل لرز لرز جاتا۔ بارش اور ہوا کا شور اتنا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

بوڑھا میک بھی اپنے فارم ہاؤس میں رضائی میں دبکا پڑا تھا۔ آتش دان میں آگ ابھی روشن تھی، کمرہ معمول سے زیادہ گرم تھا اس کے باوجود بوڑھے میک کو شدت سے سردی محسوس ہورہی تھی۔ وہ بوڑھا تھا اور بوڑھے لوگ ذرا سی بھی ٹھنڈ برداشت نہیں کرپاتے، وہ تو پھر خوف سے معمور ٹھنڈ تھی، جس نے میک جیسے بہادر کو بھی رضائی میں دبکنے پر مجبور کردیا تھا۔ آتش دان میں آگ دھیمی پڑتی جارہی تھی۔ بوڑھے میک نے ذرا سی رضائی اوپر کرکے آتش دان کو دھیما ہوتے دیکھا اور پھر رضائی تان لی۔ اس میں اٹھ کر آتش دان میں دوبارہ لکڑی ڈالنے کی ہمت نہیں تھی لیکن کب تک.....؟

ٹھنڈ کی شدت نے اسے رضائی کے اندر کانپنے پر مجبور کردیا تھا۔ مجبوراً اسے بستر سے نکلنا پڑا، اس کے جسم میں پھریری دوڑ گئی وہ کانپتا ہوا آتش دان تک آیا اور کچھ لکڑیاں آگ میں ڈال دیں۔ دھیمی پڑتی آگ نے پھر سے شدت پکڑلی۔ آگ کی حدت نے سردی کی شدت کو کچھ کم کیا۔ میک نے کچھ دیر آگ تاپی پھر اٹھ کر بستر کی طرف آگیا۔

بارش کی شدت بڑھتی جارہی تھی۔ رات آدھی ڈھل چکی تھی۔ میک بوڑھا آدمی تھا اس کے باوجود اسے نیند ٹوٹ کر آتی، روز صبح اسے یہی شکایت ہوتی کہ رات اتنی جلدی کیوں گزر جاتی ہے کیونکہ وہ سارا دن کھیتوں میں کام کرتا تھا اور جب بوڑھا آدمی تھک ہار کر بستر پر گرتا تو پھر صبح کی خبر لاتا، لیکن آج کی رات بات کچھ اور تھی......!

طوفان نے رات کو اتنا خوفناک بنادیا تھا کہ وہ دعا کررہا تھا کہ رات جلد گزر جائے لیکن اسے لگ رہا تھا جس طرح بارش کی شدت میں اضافہ ہورہا ہے اسی طرح رات کی طوالت میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔ لیکن ایسا بالکل نہیں تھا وقت کا کام ہے گزرنا سو وہ گزر رہا تھا لیکن رات اسے اپنی خوفناکی کی وجہ سے ٹھہری ہوئی لگ رہی تھی کیونکہ جب ایک ایک سیکنڈ گن کر گزرے تو یونہی لمحات بہت طویل دکھائی دیتے ہیں۔

اور میک کو اپنی نئی فصل کی بھی بہت فکر تھی جو ابھی ابھی زمین سے سر نکال رہی تھی۔ ”اتنی طوفانی بارش میں تو فصل تباہ ہوجائے گی۔“ میک نے سوچا۔

”خداوند رحم کر۔“ اس نے دعا کی اور اپنی کپکپاہٹ کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہوا جو کچھ دیر تھمی تھی پھر شدت سے چلنے لگی۔ بجلی کی کڑک اتنی دل دہلا دینے والی تھی کہ میک کو اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا۔ ہوا اس کے فارم ہاؤس سے یوں ٹکرا رہی تھی کہ میک نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں اسے لگا چھت اب گری کہ تب......! دور کہیں زوردار دھماکے سے بجلی گری اور ادھر بوڑھے میک کا دل سہما......!

”یقیناً کل کا سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوگا......“ میک خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ ”اٹھ کر کھڑکی کھولتا ہوں پتہ نہیں فصل کا کیا حال ہوا ہوگا۔ اٹھ کر کھڑکی سے دیکھ لوں تاکہ کچھ دل کو تسلی ہو۔“ فصل کھڑکی کھولنے پر واضح نظر آتی تھی۔ میک دل پر پتھر رکھ کر بستر سے اترا حالانکہ اترنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

کھڑکی کے قریب آیا اور ڈرتے ڈرتے کھڑکی کھولی۔ بجلی اتنی زور سے چمکی کہ میک کو لگا کہ وہ شاید اندھا ہوچکا ہے اس نے جلدی سے کھڑکی بند کردی۔ فصل دیکھنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد میک کی بینائی ٹھیک ہوئی تو اس نے شکر ادا کیا اور جلدی سے بستر میں دبک گیا۔

”خداوند رحم......“ اس نے لرزتے دل سے کہا اور رضائی میں مزید سمٹ گیا۔

دو تین گھنٹے یہی صورتحال رہی پھر آہستہ آہستہ صورتحال نارمل ہوتی گئی۔ بارش رک گئی۔ ہوائیں گویا تھک کر اپنے ٹھکانوں پر لوٹ گئیں۔ بجلی نے تھکے تھکے قدموں سے واپس پلٹنا شروع کردیا بادل بلبلا کر تھک گئے تو یوں چپ سادھ لی گویا اب ہمیشہ کے لئے بات چیت بند۔ بادل سمٹنا شروع ہوگئے تھے اور تاروں نے زمین کو اپنی پیاری شکل دکھانی شروع کردی۔ سب مخلوق نے اس عذاب کے ٹل جانے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

میک کے لرزتے دل کو بھی خاصی حد تک قرار آیا تو نیند جو کب سے روٹھی ہوئی لگ رہی تھی، اس نے آن واحد میں اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا......!!!

دن چڑھے تک سوتا رہا پھر اٹھ کر ناشتہ کرنے کے بعد اپنی فصل دیکھنے چلا آیا اور پھر اک خوشی اس کی منتظر تھی کہ اس کی فصل تباہ ہونے سے بچ گئی تھی کچھ پودے گر پڑے تھے لیکن میک کو امید تھی کہ دو تین دن تک میں یہ جڑ پکڑ لیں گے، اور ایک نئے پودے کو اس نے اپنی فصل میں دیکھا، بہت خوب صورت لیکن عجیب ساخت کا...... حالانکہ پہلے اس نے اپنی فصل میں اس پودے کو نہیں دیکھا تھا۔ ”ہوسکتا ہے دیکھا ہو لیکن غور نہ کیا ہو۔“ میک بڑبڑایا۔ لیکن اس کی بڑبڑاہٹ اسی تک محدود رہی......!!!

پھر وہ اس پودے کے قریب گیا ابھی وہ کچھ دور ہی تھا کہ پودا ہلنے لگا جیسے ہوا سے ہلا ہو۔ میک نے کوئی توجہ نہ دی وہ پودے کے قریب بیٹھ گیا اور اسے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر رک گیا۔

"میرے خیال میں تو ان پودوں کو تلف کر دینا چاہئے.....؟"

لیکن جب اس نے پورے کھیت میں نگاہ دوڑائی تو جابجا کچھ پودے نظر آئے، "یہ تو مقدار میں زیادہ ہیں انہیں تلف کرنے کا مطلب فصل تباہ کرنا ہے۔" اور پھر وہ اٹھا اور پورے کھیت کے گرد چکر لگایا جب وہ کسی ایسے پودے کے قریب سے گزرتا تو پودا یوں لہرانے لگتا جیسے ہوا کے زور پر لہراتا ہے، میک نے کوئی توجہ نہ دی۔

وہ کافی دیر کھیت میں گھومتا رہا اور پھر واپس فارم ہاؤس لوٹ آیا دوپہر کو تھوڑا بہت کھا پی کے وہ نئے کھیت کو تیار کرنے کے کام میں مصروف ہو گیا۔

دوسرے دن وہ کھیتوں میں آیا تو حیران رہ گیا۔ وہ پودے جو فصل کے علاوہ اگے تھے ان کی لمبائی میں حیرت انگیز اضافہ ہو چکا تھا ان کے پتے کمان کی مانند ہوتے جارہے تھے، عجب مٹیالی رنگت کے، میک حیران سا ان کے قریب پہنچا۔ پودے پھر لہرانے لگے۔ میک نے آس پاس نگاہ دوڑائی ہوا ساکن تھی اور باقی سب پودے بھی لیکن جس پودے کے پاس وہ موجود تھا صرف وہی ہل رہا تھا اس نے پھر بھی خاص توجہ نہ دی۔

کچھ دن گزرے لیکن اس کی فصل کی وہی حالت تھی جو بارش والی رات کے بعد ہوئی تھی۔ جو پودے گرے ہوئے تھے وہ یونہی گرے پڑے تھے اور جو سیدھے کھڑے تھے ان کی لمبائی عام تھی ہاں..... وہ نئی ساخت کے پودے خوب بڑھ رہے تھے، دن بدن ان کی لمبائی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میک حیران اور اپنی عقل کی حالت پر بہت پریشان تھا اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اس کے قریب پہنچنے پر پودے اس کی طرف کیوں لپکتے تھے۔ نہ جانے کیوں اس نے ابھی تک ان پودوں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا وہ پودوں کی اتنی بڑھوتری پر حیران تھا۔

وہ پودے اور دو فٹ لمبے ہو چکے تھے لیکن اس کی فصل ابھی تک وہیں کی وہیں تھی۔ حالانکہ وہ پودے تعداد میں چھ یا سات ہی تھے لیکن وہ اس کی فصل کو تباہ کئے دے رہے تھے۔ میک سوچ سوچ کر پریشان تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے.....؟

وہ پورے کھیت میں گھوم پھر کر جائزہ لینے لگا...... اور پریشان ہوتا رہا وہ جس پودے کے پاس سے گزرتا اسے پودا اپنی طرف بڑھتا محسوس ہوتا...... وہ کچھ خوف زدہ ہوا اور پھر ہنس پڑا۔ "میں بھی کتنا سٹھیا گیا ہوں.....؟ اب تو لگتا ہے میں واقعی بوڑھا ہو رہا ہوں۔"

دوسرے دن ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔ وہ اپنے کھیت کی طرف آیا، پودے ہوا سے جھوم رہے تھے اور صرف وہی جو کافی بڑے اور خوب صورت ہو چکے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی کافی عجیب ساخت کے تھے۔ کئی بار میک نے انہیں جڑ سے اکھاڑنے کا سوچا لیکن پھر نہ جانے کیوں اس نے اپنا ارادہ ٹال دیا۔

اس کا دل اتنے خوب صورت پودوں کو تلف کرنے کو نہیں چاہتا تھا یا پھر نہ جانے کیوں وہ رک جاتا۔ وہ پودے دن بدن بڑھنے کے ساتھ ساتھ بہت خوب صورت ہوتے جارہے تھے اور میک جب بھی انہیں دیکھتا اس کا دل خوش ہو جاتا۔ اس کا دل ان پودوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوا کہ اسے اپنی فصل کی تباہی پر بھی کوئی دکھ نہ ہوا۔

فصل کے پودے اسی جگہ پہ تھے نہ سوکھ رہے تھے نہ بڑھ رہے تھے لیکن اب میک کو ان کی پرواہ نہ رہی وہ ان پودوں کو دیکھ کر ہی خوش ہوتا رہتا اس نے کبھی بھی کہیں بھی اس ساخت کے پودے نہ دیکھے تھے سبز تنے اور مٹیالے رنگ کے پتوں نے اس پودے کو بہت خوب صورت بنا دیا تھا اور پھر اس کے کمان نما پتے اتنے دلکش کہ میک انہیں چھونے سے گریز کرتا کہ کہیں وہ خراب نہ ہو جائیں۔

نہ جانے کیا بات تھی کہ میک انہیں آج تک چھو نہ پایا تھا وہ نہ جانے کیوں ان پودوں کے بارے میں جنونی سا ہوتا جارہا تھا۔ صبح کے وقت جب وہ ان پودوں کے پاس آیا تو حیران کن طور پر بہت سے کیڑے مکوڑے اور پتنگے مرے پڑے تھے۔

میک نے پہلے کبھی اتنا غور نہیں کیا تھا ہو سکتا ہے پہلے سے یہ سلسلہ جاری ہو۔ بہر حال میک کی طبیعت کو وہ

کافی ناگوار گزرا وہ صفائی پسند تھا لیکن ان پودوں کے معاملے کو تو بہت زیادہ ہو گیا...... اسے ان کے قریب ذرا بھی گندگی گوارہ نہیں تھی، اب جو اتنی تعداد میں کیڑے مکوڑوں کا ڈھیر دیکھا تو بہت بدمزہ ہوا۔ ”میں ابھی یہاں کی صفائی کرتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ کام میں جت گیا لیکن وہ پودوں سے او... رہ کر صفائی کرتا رہا۔ جیسے ہی وہ قریب ہونے لگتا پودے لہراتے ہوئے اس کی طرف بڑھنے لگتے اور میک پیچھے ہونے پر مجبور ہو جاتا۔

اگر وہ ان پودوں کی سفاکیت کے بارے میں جان جاتا تو کبھی ان کے قریب نہ جاتا۔

پھر دن بدن اس کی حالت جنونی ہوتی گئی وہ ان پودوں کے معاملے میں اتنا حساس تھا کہ ہر وقت وہیں بیٹھا انہیں دیکھتا رہتا۔ ہوائیں لہراتے جھومتے جھامتے وہ پودے گویا اس کی تسکین کا سامان تھے، نہ جانے کیوں لیکن میک کو کبھی کبھار احساس ہوتا جیسے وہ پودے اس کے قریب آنے کے منتظر ہیں ان کے لہرانے کا انداز یوں ہوتا جیسے وہ کسی چیز کے لئے بے تاب ہوں لیکن وہ چیز ان کے سامنے ہوتے ہوئے بھی دور ہو۔

میک فارم ہاؤس میں جا کر بھی کھڑکی کھولے رکھتا اور ان پودوں کو دیکھتا رہتا اور جیسے ہی فارم ہاؤس سے کام ختم ہوتا وہ فوراً کھیتوں کی جانب دوڑتا۔

اس نے کبھی ان پودوں کو پانی لگانے کی زحمت نہیں کی تھی اس کے باوجود وہ پودے کبھی مرجھائے نہیں بلکہ دن بدن ان کی لمبائی چوڑائی اور خوبصورتی میں اضافہ ہوتا رہا۔ کوئی بھی دیکھتا تو بس دیکھتا ہی رہتا اور قدرت کی دلکشی پر حیران ہوتا اگر میک ان پودوں پر فدا تھا تو یہ انہونی بات نہیں تھی۔ انہونی صرف یہ تھی کہ وہ ان پودوں کے لئے جنونی تھا۔ ذرا سی تیز ہوا چلتی تو وہ فکرمند ہو جاتا کہ کہیں وہ پودے ٹوٹ نہ جائیں، روز مرے ہوئے کیڑے مکوڑے کو اٹھا کر پھینکتا اور پودوں سے باتیں کرتا رہتا کوئی بھی اسے دیکھ کر پاگل سمجھنے میں بالکل حق بجانب ہوتا......!

اور پھر انہونی ہو گئی اس رات بادل بہت گہرے آئے۔ شام کے وقت بھی گھپ اندھیرا آدھی رات کا سماں پیدا کر رہا تھا بارش برسنے کو بے تاب تھی اور ہوا کے تیز جھونکے کسی طوفان کی آمد کا پیش خیمہ تھے۔ میک بہت پریشان تھا خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ پودوں کے لئے، بقول اس کے آندھی ان پودوں کو جڑ سے اکھاڑ سکتی تھی اور وہ یہ بالکل برداشت نہ کرتا۔

بادل گرجا، بجلی چمکی اور تیز ہوا نے آندھی کی شکل اختیار کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی ہلکی ہلکی بوندا باندی نے تیز بارش کا روپ دھار لیا۔ میک کھڑکی کھولے پودوں کو ہی دیکھ رہا تھا جو تیز ہوا سے ادھر ادھر جھوم رہے، گویا کسی چیز کو پکڑنے کو بے تاب۔

ادھر میک ان کے لئے بے تاب۔ جب تیز آندھی آئی اور میک کو لگا کہ پودے اب ٹوٹے کہ تب...... وہ بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج، تیز بارش اور آندھی کی پرواہ کئے بغیر اندھا دھند باہر دوڑا۔ ساتھ میں وہ زور زور سے بڑبڑاتا جا رہا تھا۔

وہ کھیت کے قریب پہنچا تو ہوا کا زور بڑھا اور اس سے پہلے کہ پودا جڑ سے اکھڑتا وہ پودے سے لپٹ گیا، پودے نے اسے یوں سمیٹا گویا اسی کا منتظر ہو اس کی کمان نما پتے میک کے جسم میں پیوست ہو گئے۔

میک کی آنکھیں پھیل گئیں، اس نے چیخنے کے لئے منہ کھولا لیکن پودے کی شاخ نے اس کے منہ میں داخل ہو کر اس کی چیخ کا گلا گھونٹ دیا۔

”آدم خور پودے......“

آخری خیال میک کے دل میں آیا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا اور پھر ہوا کی شدت میں کمی آتی گئی، بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک کم پڑتی گئی۔

بارش کی شدت کم ہو گئی اور میک کی خوفناک لاش پودے سے الگ ہوئی اور بارش کے پانی میں گر گئی اور پودے کے پتوں کا رنگ مٹیالے سے سرخ رنگ میں تبدیل ہو گیا۔

مہنگی پیاس

ایس حبیب خان۔ کراچی

خوبرو حسینہ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلیں اور سامنے موجود نوجوان بے سدھ ہوگیا تو حسینہ نے اس کا سینہ چاک کیا اور اندر سے نوجوان کا دل نکال کر بڑی رغبت سے کھانے لگی کہ اتنے میں ایک دلخرش منظر رونما ہوا۔

لفظ لفظ سے خوف ٹپکتا اور جسم وجاں کے رونگٹے کھڑے کرتی حقیقی سبق آموز اور شاہکار کہانی

"نرملا! اری او نرملا!" گائتری دیوی نے آواز دی تو نرملا چونک کر خیالوں سے باہر آگئی، وہ چنری ہاتھ میں لئے رادھا کو یاد کررہی تھی، اس کی آنکھوں میں پچھلا منظر گھومنے لگا۔

نرملا نے آئینہ کے آگے کھڑے ہوکر ماتھے پر بندیا لگائی، مانگ میں سندور بھرا اور پھر لہنگے کی ایک طرف کمر میں چنری ٹانگی اور اس کو لپیٹتی ہوئی پلو شانے پر ڈالا اور ساس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ "رنگولی بنالی تھی بہو؟" اس کی ساس گائتری نے پوچھا۔

"جی ماں جی! وہ تو اسی سے بنالی تھی۔" نرملا نے سر جھکا کر کہا۔

"اچھا ایسا کر میری تھالی پروس دے۔" اور پھر گائتری چلتی ہوئی رسوئی گھر کے ساتھ تخت پر جا کر بیٹھ گئی۔ نرملا نے رسوئی گھر میں جا کر جلدی سے تھالی نکالی

اور اس میں کٹوریاں رکھیں، دال، بھاجی، چپاتی اور اُبلے چاول پروس دیئے، گائتری دیوی نے نوالہ منہ میں رکھا اور مسکراتے ہوئے نرملا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہو، تیرے ہاتھ میں بھگوان نے بہت سواد رکھا ہے۔ بھوجن بہت ہی سوادش ہے۔'' اور دوسرا نوالہ منہ میں رکھ لیا۔

نرملا دھیرے سے مسکرائی اور اٹھ کر گائے کو چارہ ڈالنے چلی گئی۔

گائتری کے پتی مانک چند کا لکڑیوں کا کاروبار تھا مانک چند اور گائتری کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا موہت اور چھوٹا بیٹا موہن، بڑا بیٹا موہت شادی شدہ تھا اس کی پتنی نرملا تھی۔ نرملا بہت ہی سگھڑ تھی۔ اپنی ساس کو تو وہ ہلنے بھی نہیں دیتی تھی۔ ساس، سسر کی سیوا کرنا پتی اور دیور کی ضرورتوں کا خیال سب اس نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ بھگوان کی کرپا سے ان کا پریوار سکھی جیون بسر کر رہا تھا۔

رات کو بھوجن کر کے سب صحن میں جمع تھے ایک پلنگ پر گائتری اور نرملا بیٹھے تھے اور دوسرے پلنگ پر مانک چند کے بیٹے تھے ایک پیر دبا رہا تھا، دوسرا کندھے دبا رہا تھا۔ ''سنتے ہو جی!'' گائتری نے پتی مانک چند کو مخاطب کیا۔ ''ہوں!'' مانک چند نے آنکھیں بند کر کے جواب دیا۔

''میرے وچار میں اب خیر سے موہن اس قابل ہو گیا ہے کہ میں اپنی دوسری بہو لے آؤں۔'' گائتری کی بات پر سب خوش ہو گئے۔

اگلے ہی روز گائتری دیوی نے کجری مائی رشتے کرانے والی کو بلوا کر موہن کے لئے اچھی سی لڑکی دکھانے کا کہا۔ چند روز ہی گزرے تھے کہ کجری مائی گائتری کے درشن کرنے آ پہنچی۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ''گائتری! سب سے پہلے میرا منہ میٹھا کرا تیرے لئے خوشخبری لے کر آئی ہوں۔'' اس نے کہا تو گائتری نے نرملا کو جل پان کا بندوبست کرنے کا کہا۔

''برابر والے گاؤں میں، میرے ایک جاننے والے کشور داش رہتے ہیں، بہت ہی بھلے منش ہیں ان کی پتنی کا دیہانت ابھی تھوڑے سے پہلے ہی ہوا ہے، خود وہ بھی بیمار رہتے ہیں۔ وہ اپنی اکلوتی پتری رادھا کو اپنے جیون میں ہی اپنے گھر کا کرنا چاہتے ہیں۔ رشتہ بہت اچھا ہے لڑکی اکلوتی اور سندر ہونے کے ساتھ ساری جائیداد کی اکلوتی وارث بھی ہے۔''

''کجری مائی! لڑکی سندر اور سوشیل ہونی چاہئے باقی کی ہمیں کوئی اِچھا نہیں بھگوان کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس، ہم چل کر لڑکی دیکھ آئیں گے۔'' گائتری بولی۔

پھر ان کی ملاقات ہوئی تو کشور داس اور مانک چند دونوں کو ایک دوسرے کے پریوار بھا گئے۔ کشور داس کو ایسے ہی لوگوں کی تلاش تھی جو شریف ہوں۔ اس طرح موہن اور رادھا کا رشتہ طے ہو گیا۔ بیاہ میں سمے تھا اس لئے گائتری کی اچھا پر سگائی کی رسم کر لی گئی۔

خوشیوں نے تو جیسے گائتری دیوی کی چوکھٹ کو تھام لیا تھا۔ موہت اور نرملا کی شادی کو پانچ سال ہو چکے تھے مگر ان کی کوئی سنتان نہ تھی مگر رادھا اور موہن کی سگائی کے اگلے ہی روز نرملا کو یہ خوشخبری ملی کہ پانچ برس بعد نرملا کے آنگن میں پھول کھلنے والا ہے۔ پھر نرملا کے گھر ایک گول مٹول بالک نے جنم لیا۔

گائتری کے تو خوشی سے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹی گئی۔ مٹھائی صرف پوتے کی خوشی کی نہیں تھی بلکہ اگلے ماہ موہن کا بیاہ تھا۔ موہن کے دوستوں نے اس کا پیچھا گھیر لیا کہ کہیں گھومنے کا پروگرام بنائے کیونکہ بقول ان سب کے شادی کے بعد موہن مشکل سے ہی ہاتھ لگے گا اور پھر موہن نے ان کے آگے ہار مان لی اور وہ سب دوست یار مل کر سیر کے لئے نکل گئے۔ مختلف جگہوں سے ہوتے ہوئے وہ لوگ موہن کے دوست جوگیندر کی موسی کے گھر پہنچ کر ٹھہر گئے۔ سب دوست گھومتے گھومتے تھک گئے تھے۔

گرمیوں کا جاتا موسم تھا ان لوگوں نے چھت پر سونے کا کہا اور وہاں لیٹ گئے۔ ''یار تھکن تو اپنی جگہ مگر مزہ بہت آ رہا ہے۔'' دوستوں میں سے شیکھر بولا۔

''بس کل کا دن ہے یہاں گھوم پھر کر واپس چلتے ہیں۔'' جوگیندر بولا۔

"مگر جوگیندر بھیا! یہاں تو ایسی کوئی جگہ نہیں ہے گھومنے کی۔" جوگیندر کی موسی کا لڑکا ٹھنڈے شربت کے گلاس رکھتے ہوئے بولا۔

"راجو بیٹا وہ یہاں کسی محل کے کھنڈرات بھی ہیں ناں سنا تو بہت تھا مگر دیکھا نہیں اب تک، ہاں یاد آیا، مہاراجہ لکشمن کے قلعے کے کھنڈرات" جوگیندر بولا۔

"آپ لوگ وہاں نہ جائیں! سب کہتے ہیں اُن کھنڈرات میں اثر ہے۔" راجو نے خوفزدہ انداز سے کہا۔ اس کی بات سن کر وہ لوگ قہقہے لگانے لگے۔ پھر شیکھر بولا۔ "اب تو بیٹا ہم وہاں ضرور جائیں گے۔"

پھر وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے سو گئے۔

دو گھنٹے سونے کے بعد جب وہ اٹھے تو شام ہونے والی تھی۔ وہ لوگ نیچے آئے نہائے دھوئے تو موسی نے گرم گرم گوبھی کے پراٹھے، لسی اور کھیر ان لوگوں کے آگے رکھ دی۔ ان لوگوں نے خوب ڈٹ کر کھایا اور باہر کا چکر لگانے کا کہہ کر گھر سے نکل گئے۔ باہر کھڑے راجو سے انہوں نے چلنے کا کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ پھر موہن بولا۔ "اچھا یار راجو تو ساتھ چل نہیں رہا، کم از کم راستہ تو بتا دے۔"

راجو نے انہیں راستہ سمجھایا اور ساتھ ایک بار پھر خبردار کیا مگر وہ بعض نہ آئے اور آگے چل پڑے۔ تھوڑی دور چل کر انہیں ایک بیل گاڑی دکھائی دی۔ انہوں نے اس سے "مہاراجا لکشمن کے قلعہ" جانے کا کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ جوگیندر بولا۔ "تاؤ جی! ہم یہاں مہمان ہیں ہماری سہائتا کرو، اچھا قلعہ تک نہیں تو تھوڑی دور تک چھوڑ دو، ہاں پیسوں کی چنتا مت کرو۔"

اس کی بات سن کر وہ بولا۔ "باؤ جی ہمارے ہاں مہمان بھگوان سمان ہوتا ہے۔ مجھے آپ کو چھوڑنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے مگر جہاں جانے کا کہہ رہے ہو، وہاں نہ جاؤ! بڑے بوڑھے کہتے ہیں وہ جگہ جوان پرش اور ناری دونوں کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔"

مگر وہ لوگ نہ مانے اور پھر مجبوراً بیل گاڑی والے نے انہیں قلعہ سے دور اتار دیا اور گاڑی واپس موڑتے سے اک بار پھر بولا۔ "سوچ لو باؤ! میں واپس لئے چلتا ہوں۔"

مگر وہ لوگ نہ مانے اور پھر بیل گاڑی والا گردن ہلاتا ہوا واپس چلا گیا۔ قلعہ دور سے ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ لوگ چلتے ہوئے قلعہ کے نزدیک پہنچے تو اندھیرا ہونے لگا تھا۔ "یار غلطی ہو گئی ہمیں دن میں آنا چاہئے تھا، اندھیرے میں ہمیں کچھ دکھائی تھوڑی دے گا۔" موہن کا اتنا کہنا تھا کہ پورے قلعہ میں دیئے جل اٹھے، قلعہ بہت بلند تھا اس کی بلندی آسمان کو چھو رہی تھی، وقت نے اس کی خوبصورتی کو کم ضرور کر دیا تھا مگر ان کھنڈرات کو دیکھ کر یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اپنے دور میں یہ کتنا عالیشان رہا ہوگا۔ "ارے یہاں تو قلعہ کے رکھوالے بھی ہیں جب ہی تو دیئے روشن ہوئے ہیں۔" شیکھر بولا۔

"پھر تو کافی لوگ ہونگے یہاں کیونکہ اتنے سارے دیئے روشن ہوئے ہیں۔" جوگیندر بولا۔ پھر وہ لوگ قلعہ میں داخل ہو کر گھومنے لگے، پھر تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ "یار کچھ بتا تو سہی اس جگہ کے بارے میں۔" موہن بولا۔ تو جوگیندر نے بتانا شروع کیا۔

"یہ قلعہ مہاراجا لکشمن نے تعمیر کروایا تھا اس قلعہ میں وہ اپنی دھرم پتنی کے ساتھ رہتا تھا۔ مہارانی کے بارے میں سنا ہے کہ بہت ہی سندر اور کم سن تھی۔ پھر ایک روز وہ محل میں موجود نہ تھی مگر کسی کی جرأت نہ تھی کہ مہاراجا لکشمن سے کوئی اس بارے میں پرشن کرتا۔ اس کے بعد مہاراجا لکشمن کی مرتیو ایک یودھ میں ہو گئی، مہاراجا کی کوئی سنتان نہیں تھی جو اس کا ونش آگے بڑھتا اور یوں سے گزرنے کے ساتھ یہ قلعہ ویران ہوتا چلا گیا۔" جوگیندر خاموش ہو گیا۔

وہ آگے بڑھے تو قلعہ کی پچھلی طرف انہیں ایک بہت بڑا ویران کنواں نظر آیا۔ موہن نے کنویں کی منڈیر پر چڑھ کر رسی کو کھینچا تو پانی سے بھرا ڈول اوپر آ گیا۔ موہن نے چلو بھر کر پانی پیا اور بولا۔ "واہ کیسا ٹھنڈا پانی ہے۔ میری تو پیاس بجھ گئی، کاش میں اس سے مہاراجا ہوتا تو اس حسین اپسرا کا پتی ہوتا۔ وہ اور میں اس قلعہ

میں جیون بتاتے۔"

"ارے او! پریم دیوانے تیرا بیاہ ہونے جا رہا ہے اور تو ہے کہ یہاں اس گزری ہوئی مہارانی کے ساتھ اپنی خیالی پریم کتھا بنا رہا ہے۔" شیکھر نے جوگیندر کے ہاتھ پر تالی مارتے ہوئے کہا اور سب ہنستے ہوئے موہن کی جانب مڑے تو ایک دم ان کی ہنسی رک گئی۔ موہن کنویں کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چکرا کر گرتا۔ دونوں بھاگ کر اس کے پاس پہنچے۔ پھر شیکھر نے دوڑ کر اسے سنبھالا۔ موہن نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔ جوگیندر نے بوتل نکال کر اسے پانی پلایا۔ کچھ دیر بعد اس کی حالت بہتر ہو گئی۔ "ارے بھیا! یہ تو پریم روگی ہو گیا ہے۔ جبھی تو برداشت نہیں کر پایا اس سندری کی جدائی۔" شیکھر نے موہن کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

موہن پر کپکپی سی طاری ہو رہی تھی۔ شیکھر اور جوگیندر نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور پھر وہ لوگ قلعہ سے باہر آ گئے۔ سورج نکلنے ہی والا تھا۔ "یار یہاں تو کوئی بیل گاڑی نہیں ملے گی ہمت کر کے تھوڑا چل۔" جوگیندر بولا اور پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ اور پیچھے پلٹ کر دیکھنا بھول گئے کہ سورج کی پہلی کرن نکلتے ہی دیوں سے روشن پورا قلعہ اندھیرے میں گم ہو گیا اور نہ ہی ان لوگوں نے دھیان دیا کہ پورا قلعہ گھومنے کے باوجود انہیں کوئی رکھوالا نظر نہ آیا۔ آگے چل کر انہیں ایک بیل گاڑی مل گئی تو اس پر سوار ہو کر موسی کے گھر گئے اور کچھ دیر رک کر واپس گھر کے لئے چل پڑے۔

موہن پر نقاہت طاری تھی اس کو اس کے دوست بڑی مشکل سے گھر چھوڑ کر آئے اور موہن کے گھر والوں سے اصل بات چھپائی کر کے وہ قلعہ گئے تھے، تھکن کا بتایا اور چلے گئے۔

☆......☆......☆

گاں! گاں! گاں! صبح صبح گاؤ ماتا نے شور شروع کر دیا نرملا کی آنکھ آواز سے کھل گئی۔ سورج ابھی نکلا نہیں تھا۔ وہ بستر سے نکلی ساڑھی درست کی اور باہر نکل آئی۔ گاؤ ماتا زمین کی طرف سر کر کے گول گول چکر لگا رہی تھی اور ساتھ گاں! گاں! کی آواز نکال رہی تھی۔ اس کا انداز بے چینی ظاہر کر رہا تھا۔ اس سے پہلے نرملا نے گاؤ ماتا کو ایسا کرتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نرملا نے اس کے آگے چارہ ڈالا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ کچھ دیر شانت ہو گئی مگر اس نے چارے کو منہ تک نہیں لگایا نرملا نے اپنے کام کرنے شروع کر دیئے اور تھوڑی دیر بعد وہ بالٹی لے کر گاؤ ماتا کے پاس آئی اور دودھ دوہنے لگی۔ گاؤ ماتا کے انداز میں اب بھی بے چینی تھی۔ نرملا کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

نرملا نے پوجا کی اور گلاس میں دودھ نکال کر موہن کو دینے اس کے کمرے میں چلی آئی۔ "موہن بھیا! اٹھیے دودھ پی لیجیے۔" موہن نے آنکھیں کھولیں جو کہ سرخ ہو رہی تھیں۔ نرملا نے گلاس میز پر رکھا اور موہن کو سہارا دے کر اٹھایا، تکیہ کو سرہانے لگایا اور موہن کو ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ پھر اس نے دودھ کا گلاس اٹھا کر اس کو دیا۔ جب موہن نے دودھ کا گلاس لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

نرملا نے آگے بڑھ کر موہن کا ہاتھ تھام لیا اس کا ہاتھ برف کی مانند یخ ہو رہا تھا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ نرملا نے اسے دودھ پی کر آرام کرنے کا کہا اور چلی گئی۔

گاؤ ماتا زمین پر بیٹھی ہوئی تھی اور اپنا منہ پیٹ پر رکھا ہوا تھا اس نے نہ ہی چارے کو منہ لگایا تھا اور نہ ہی پانی کا ایک قطرہ منہ میں ڈالا تھا۔ سارے لوگ پریشان ہو گئے۔ بھولو کو بلایا گیا وہ گائے بھینسوں کا علاج کرتا تھا اس نے گاؤ ماتا کو دیکھا وہ بالکل ٹھیک تھی پھر بھی اس نے ہاضمہ درست کرنے کی دوا دی تا کہ اسے بھوک لگ جائے۔ چارے میں دوا ملا کر موہت نے زبردستی ہاتھوں سے گاؤ ماتا کو منہ میں کھلا دیا۔ "بھگوان کی کرپا سے شام تک یہ ٹھیک ہو جائے گی۔" موہت نے ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔ مگر گاؤ ماتا نے کسی چیز کو منہ تک نہ لگایا۔

اگلی صبح جب نرملا اٹھی تو سب سے پہلے گاؤ ماتا کو

دیکھنے گئی مگر وہاں جا کر اس کی چیخیں نکل پڑیں۔ وہاں گاؤ ماتا کی جگہ اس کی باقیات پڑی تھیں۔ ''کھر سے اوپر تک کا ایک پیر جس کی کھال غائب تھی، خون میں لت پت، گاؤ ماتا کا سر جس میں سے بھیجا غائب تھا اور اس کی اذیت میں ڈوبی پتھرائی آنکھیں، نرملا سے یہ سب دیکھا نہ گیا گھر والوں کے ساتھ پورا محلہ جمع ہوگیا۔ سب سمجھے کوئی خطرناک جانور علاقے میں آ گیا ہے اور اسی نے گاؤ ماتا کا شکار کیا ہے۔

نرملا کا رو رو کر برا حال تھا سب سے زیادہ خیال نرملا ہی رکھتی تھی اس کا۔ مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے یہ تو بس شروعات تھی جس سے بے خبر سب لوگ اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔

☆......☆......☆

ہلدی کی رسم میں جب موہن کو لا کر بیٹھا گیا گیا تو سب رشتے دار ملنے والے اسے دیکھ کر چونک گئے۔ موہن کا سرخ وسفید رنگ تھالی میں بچی ہلدی ابٹن جیسا ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور وہ خاموشی سے سر جھکائے پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ دو ایک نے تو گائتری سے کہہ بھی دیا کہ ''اگر موہن ٹھیک نہیں تھا تو ابھی بیاہ کیوں کر رہی ہے؟''

گائتری نے بتایا کہ ''رادھا کے پتا کی طبیعت اوچت نہیں ہے اور ان ہی کے اصرار پر بیاہ کی تاریخ آگے نہیں کی ہم نے ورنہ ہمارا ابھی یہ ہی ماننا تھا کہ تاریخ تھوڑی آگے کر دیں۔''

پھر رسمیں شروع ہوگئیں نرملا ایک پیر پر ناچ رہی تھی کبھی اپنے بچے کو لے کر بیٹھنا پڑتا، کبھی کسی کو کوئی چیز دینی ہوتی، وہ ہر آواز پر دوڑتی گھن چکر بن گئی تھی۔ رسمیں ختم ہوگئیں تو تمام کام سمیٹ کر وہ بستر پر تھکن سے چور لیٹی تو فوراً آنکھ لگ گئی۔ وہ کتنی دیر سوئی معلوم نہیں مگر اس کی آنکھ ننھے منیش کی رونے کی آواز سے کھل گئی۔ نرملا نیند میں دھت اٹھی اور منیش کو جھولے سے نکال کر پلنگ پر پالتی مار کر بیٹھ کر ہلانے لگی۔ منیش سو گیا۔ نرملا نے اسے لٹایا اور پانی پینے کے لئے گلاس اٹھایا تو وہ خالی تھا۔ اس نے ساڑھی کا پلو سر پر لیا اور کمرے سے باہر نکل آئی، گلاس اٹھائے وہ رسوئی گھر میں گئی اور مٹکے سے گلاس میں پانی انڈیلنے لگی۔

نرملا کافی بہادر تھی ورنہ گاؤ ماتا والی بات کے بعد رات کو اکیلے نکلنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ جیسے ہی اس نے گلاس ہونٹوں سے لگایا۔ اچانک کوئی چیز لہراتی ہوئی اس کے ہاتھ پر آ لگی، گلاس ایک دم اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ کوئی ''نرم چیز'' تھی۔ اس نے مڑ کر سوال کیا کون ہے؟ اور رسوئی گھر سے باہر آ گئی۔ مگر

اسلامی معلومات

س: قرآن پاک نے سب سے پہلا پیغمبر کس کو کہا ہے؟

ج: حضرت آدم علیہ السلام کو۔

س: نماز کے لئے سب سے پہلے اذان کی تجویز کس نے دی؟

ج: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے۔

س: وضو کا حکم کب اترا؟

ج: 5 ہجری میں۔

س: اسلام میں پہلی اذان کب ہوئی اور موذن کون تھے؟

ج: فتح مکہ 8 ہجری میں اور موذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فجر کی نماز کیلئے اذان دی۔

س: زمین پر پہلا درخت کون سا تھا؟

ج: کھجور کا۔

(محمد اسحاق انجم: کنگن پور)

جواب میں صرف ہوا زور سے گزری نرملا کے جسم میں خوف سے سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ تیز قدم اٹھاتی کمرے میں آ گئی اور دروازہ بند کرلیا اور بستر پر دبک کر لیٹ گئی۔

نرملا کو ابھی تک اپنے ہاتھ پر اس چیز کا لمس یاد تھا۔ وہ جو چیز بھی تھی زندگی کی حرارت سے بھرپور تھی۔

''آخر کیا چیز تھی وہ؟'' یہ سوچتے سوچتے نرملا نیند کی وادیوں میں گم ہوگئی۔

صبح کا اجالا پھیلا، سورج دیوتا کے ساتھ نرملا بھی باہر نکلی۔ اس کے ساس سسر بھی جاگے ہوئے تھے۔ نرملا نے اشنان کے بعد تلسی میا کی پوجا کی اور رسوئی گھر میں ناشتہ بنانے لگی۔ موہت، موہن کو سہارا دے کر لے آیا۔ منیش گائتری دیوی کی گود میں تھا۔ نرملا نے سب کی تھالیوں میں گرم گرم پوریاں پروس دیں۔ ناشتے کے بعد سب کاموں میں مصروف ہوگئے۔ کیونکہ شام کو بارات جانا تھی۔ مگر موہن کو دیکھ کر کسی کو یقین نہ آ رہا تھا کہ اس نوجوان کی آج شادی ہے۔ وہ بت بنا خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

دوسری طرف منڈپ سجا ہوا تھا اور لڑکے والوں کے سواگت کے لئے لڑکی والے منتظر تھے۔ بارات پہنچی تو سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ سب منڈپ کے گرد جمع ہوگئے۔ دولہا دلہن کے آتے ہی رسمیں شروع ہوگئیں۔ دولہا، دلہن کو پھیروں کے لئے کھڑا کیا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اگنی کے گرد پھیرے شروع کرتے۔ ''کوئی بوجھ موہن پر آ گرا، موہن لڑکھڑا کر گر پڑا۔ وہ بڑی مشکل سے سیدھا ہوا مگر اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔''

''شما چاہتا ہوں بھائی جی! میری ضد کی کارن بیاہ آگے نہ کیا گیا۔ آپ کی طبیعت تو مجھے ابھی تک صحیح نہیں لگتی۔'' کشورداس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں! نہیں! پتاجی وہ وہ بس میں اپنا سنتولن کھو گیا تھا، اب ٹھیک ہوں۔'' موہن نے شرمسار کشورداس کے جوڑے ہوئے ہاتھوں کو تھام کر کہا۔

پنڈت جی نے پھر منتر پڑھنا شروع کردیئے اور پھیرے شروع کردیئے۔ موہن کو ایک قدم اٹھانا بھی دشوار لگ رہا تھا اس کے اوپر بے انتہا بوجھ تھا۔ ساتویں اور آخری پھیرے کو پورا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ موہن کے قدموں سے جان نکلی جا رہی تھی۔ پھیرے ختم کرکے اس نے آشیرواد لینے کے بجائے ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔ سب موہن کے پاس دوڑ کر آ گئے۔ جب موہن کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو رادھا کی بدائی کردی گئی۔

نرملا اور موہت پہلے ہی چلے گئے تھے۔ تاکہ نرملا رادھا کے گھر پرویش کی تیاریاں کرلے۔ بارات دلہن لے کر گھر آ گئی۔ نرملا نے آرتی کی تھالی سجائی اور دروازے پر آ گئی، نرملا نے دولہا دلہن کی آرتی کی۔ پھر چاول سے بھرا کلش گھر کی دہلیز پر رکھ دیا۔ رادھا نے پیر سے کلش گرایا اور اندر رکھی تھالی میں پیر رکھے۔ اس کے رنگ میں ڈوبے پیر کے نشان زمین پر بچھی چادر پر چھپنے لگے۔ سب لوگ اندر چلے گئے۔ نرملا چادر اٹھانے کے لئے جھکی تو چونک کر رہ گئی۔ ''رادھا کے قدموں کے نشان کے اوپر ایک ہلکا سا نشان چھپا ہوا تھا۔ وہ پیر جیسا ہی نشان تھا مگر الٹا تھا۔'' اس سے پہلے کہ نرملا کچھ سوچتی۔ گائتری کی آواز آئی۔ تو اس نے جلدی سے چادر اٹھا کر الماری میں رکھ دی اور تیز تیز قدم اٹھاتی آواز کی سمت چلی گئی۔

موہن کمرے میں آیا، رادھا بستر پر گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہوئی تھی۔ موہن نے دروازہ بند کیا اور بات کرنا تو دور رادھا کی اور دیکھے بغیر بستر پر لیٹ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سو گیا۔ رادھا کافی دیر انتظار کرتی رہی، بیٹھے بیٹھے اس کی کمر دکھنے لگی تو اس نے جھجکتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے گھونگھٹ اٹھایا اور ترچھی نظروں سے موہن کو دیکھا۔ موہن آنکھوں پر ہاتھ رکھے ست لیٹا تھا۔ رادھا نے اپنے گہنے اتارے اور سیدھی ہو کر لیٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

''شادی کی پہلی رات ہے اور میرے پتی نے تو میری طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا! کہیں موہن جی کسی اور سے پریم تو نہیں کرتے اور پریوار والوں کے کہنے پر مجھ سے بیاہ کرلیا ہو؟'' وہ دل میں جانے کیا کیا وچار لئے سو گئی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا رادھا نے کروٹ بدلی تو چونک گئی اس نے ہاتھوں سے ٹٹولا تو ہاتھ ٹھنڈے فرش پر لگے تو وہ ننگے تار کو چھونے کی مانند اٹھی تو وہ اپنے بستر کے بجائے فرش پر پڑی تھی۔ ''موہن جی کو میرا ایک بستر پر سونا بھی برداشت نہیں!'' اس نے سوچا اور آنسو پونچھتی ہوئی اٹھی اور بستر کی جانب بڑھتی مگر بستر کی جانب دیکھ کر اس کے قدموں کو زمین نے جکڑ لیا۔

''موہن بائیں کروٹ لیٹے سو رہا تھا اور اس کی کمر سے چپکا ہوا ایک بے انتہا سیاہ وجود بستر پر پڑا تھا۔'' پھر تڑاخ کی زوردار آواز کے ساتھ ایک زوردار طمانچہ رادھا کے گال پر پڑا اور وہ چکرا کر زمین پر جا پڑی اس کی باچھوں سے خون جاری ہوگیا جس کا پتہ رادھا کو اپنے ہونٹوں پر محسوس ہونے والے ذائقے سے چلا۔ اس کی ساڑی بھی زمین پر بکھر گئی۔ وہ اٹھی اور ساڑی کو لپیٹا۔ اس نے موہن کے پاس جانے کے لئے پیر اٹھایا ہی تھا کہ کسی نے گدی کے پاس سے اس کی چوٹی کو کس کر جکڑ لیا۔ تکلیف سے رادھا کی چیخ نکل گئی۔ اور اس کی آنکھوں کے آگے ایک سیاہ چادر تن گئی اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ پھر پلک جھپکتے ہی اس کی نگاہوں کے آگے دو انگارے آگئے ساتھ ہی رادھا زور سے فضا میں اچھلی اور ہوا میں اڑتی ہوئی دور جا گری۔ اب کی بار رادھا نے جو سر اوپر اٹھایا تو ''اس کی نگاہوں کے سامنے دو بے حد سیاہ پیر تھے جن کے ناخن لمبے اور مڑے ہوئے تھے۔ پھر پیروں کے اوپر موجود سیاہ وجود نیچے ہوتا چلا گیا، رادھا کی آنکھیں خوف سے پھٹتی چلی گئیں پھر اس وجود کے سیاہ ہاتھ رادھا کے منہ کی طرف بڑھنے لگے۔''

☆......☆......☆

سورج دیوتا کے نکلتے ہی نرملا بستر سے نکل آئی۔ اشنان اور تلسی ماتا کی پوجا کرنے کے بعد وہ پلٹی تو سامنے گائتری دیوی کھڑی تھیں۔ نرملا نے ان کے چرن چھو کر آشیرواد لیا۔ ''نرملا! آج رادھا کا سسرال میں پہلا دن ہے۔ اس کو پوجا میں شامل ہونا چاہیے تھا آخر کو وہ گھر کی لکشمی ہے۔'' گائتری کو رادھا کا پوجا میں نہ آنا عجیب لگا۔ نرملا سر جھکائے وہاں سے چلی گئی اور جھجکتے ہوئے موہن کے کمرے پر دستک دی۔ مگر دروازہ نہ کھلا۔ اس نے رک کر دوبارہ دستک دی مگر دروازہ پھر بھی نہ کھلا۔ نرملا کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ نو بیاہتا جوڑا تھا شاید دیر تک سو رہے ہوں۔

دوسری طرف گائتری کا غصہ۔ اس نے دھیرے سے آواز دی۔ ''دیور جی!'' مگر جواب میں خاموشی تھی۔

نرملا رسوئی گھر میں جا کر ناشتہ بنانے لگی۔ جب وہ ناشتہ پروسنے لگی تو گائتری نے اس سے پوچھا۔ اس نے بتایا تو گائتری سر ہلا کر رہ گئی اور وہ چاروں ناشتہ کرنے لگے۔ دن کے بارہ بج گئے۔ اب تو گائتری دیوی خود گئیں اور دروازہ بجایا مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا کافی دیر آوازیں دینے پر بھی دروازہ نہ کھلا تو وہ لوگ پریشان ہوگئے۔

موہت نے زوردار دھکے مار مار کر دروازہ توڑ دیا۔ اندر موہن بستر پر دراز تھا جبکہ رادھا بستر کے بجائے کمرے کے کونے میں زمین پر بیٹھی ہوئی تھی اس نے دلہن والی ساڑی باندھی ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے گردن جھکائے ہوئے تھی۔ ''رادھا!'' نرملا نے آگے بڑھ کر رادھا کو ہلایا۔ مگر وہ پتھر کی مورت بنی رہی۔ نرملا نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تو ''رادھا کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔''

ادھر موہت نے موہن کو ہلایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا اس کی سانسیں چل رہی تھیں مگر دونوں سکتے میں تھے۔

پہلے وید جی پھر شہر سے بڑے ڈاکٹر کو بلایا گیا تو پتہ چلا دونوں کو سکتہ ہوگیا ہے۔ رات ان دونوں کے ساتھ کمرے میں کیا ہوا کسی کو نہ معلوم تھا، راودھا کے پتا یہ خبر برداشت نہ کر پائے اور پرلوک سدھار گئے۔

گائتری دیوی کے گھر میں تو مانو قیامت آگئی تھی۔ جوان بیٹا اور بہو سکتے میں تھے۔ کب یہ سکتا ٹوٹتا کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔ دونوں برابر بستر پر لیٹے رہے اور گائتری اور نرملا دونوں کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔

نرملا اپنے بستر پر سوئی ہوئی تھی، موہت دوسری

کروٹ لئے سو رہا تھا جبکہ منیش پالنے میں سو رہا تھا۔ نرملا کو نیند میں اپنے چہرے پر کسی گرم چیز کا احساس ہوا جیسے کوئی چیز رینگ رہی ہو۔ اس نے نیند میں ہی ہاتھ سے اسے پرے کر دیا۔ مگر پھر وہی احساس اسے اپنی گردن پر ہوا۔ نرملا نے پھر اسے ہاتھ سے ہٹایا۔ تو وہ چیز رینگتی ہوئی گردن سے سینے پر آگئی۔ سینے سے ہوتی ہوئی پیٹ سے رینگنے لگی نرملا کسمسائی، پھر پیٹ سے ہوتی ہوئی وہ چیز پیروں میں آگئی اور پنڈلیوں پر رینگنے لگی۔ نرملا نے نیند میں دونوں پیروں کو آپس میں رگڑا وہ احساس ختم ہوگیا تو وہ پھر گہری نیند میں چلی گئی۔

لمحہ نہ گزرا تھا کہ نرملا کے کے پیر کے تلوے میں کسی نے اس زور سے گدگدی کی کہ نرملا اچھل پڑی کہیں کوئی سانپ وغیرہ تو نہیں آگیا، کمرے میں! اس خیال سے وہ تیر کی طرح بستر سے نکلی اور منیش کے پالنے کے پاس آئی۔ منیش دائیں کروٹ لیٹا ہوا تھا۔ نرملا اسے سوتا دیکھ کر اطمینان سے پلٹ کر بستر کی جانب چل دی۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ چڑ، چڑ کی آواز آئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ آواز کہاں سے آرہی ہے مگر اسے سمجھ کچھ نہیں آیا۔ جب اس نے رک کر کان لگائے تو آواز منیش کے پالنے سے آرہی تھی۔ اس نے پھرتی سے جا کر منیش کی اوڑھنی ہٹائی تو ساکت رہ گئی۔

”پالنے میں لیٹے منیش کے منہ میں ایک لمبی، پتلی سیاہ چیز تھی، جسے وہ بے تابی سے چوس رہا تھا۔“ نرملا کو لگا کہ وہ سانپ کی دم ہے۔ وہ چیز پالنے سے بھی نیچے لٹک رہی تھی۔ نرملا نے اس کے تعاقب میں نگاہ دوڑائی تو وہ شے پالنے سے لٹکی نیچے زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ حلق میں آئے تھوک کو اس نے بڑی مشکل سے نگلا۔ ”وہ چیز جس کی دم تھی، وہ ایک آدمی کی قامت والا بے حد بڑا سیاہ لنگور تھا۔“ اس سے پہلے کہ نرملا کچھ کرتی۔ وہ سیاہ لنگور جھپٹ کر نرملا سے چمٹ گیا اور اپنے پنجے سے نرملا کا منہ بند کر دیا۔ نرملا نے زور لگا کر اس کا سیاہ لجلجا سا پنجہ اپنے منہ سے ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکی۔

لنگور اسے گھسیٹ کر صحن میں لگے درخت کے پاس لے آیا اور نرملا کو نوچنا شروع کر دیا۔ اس کے ناخنوں نے نرملا کے بدن پر خراشیں ڈال دی تھیں۔ کھینچا تانی میں نرملا کی چولی بھی پھٹ گئی تھی جس میں سے اس کا بدن جھلک رہا تھا۔ آخر اس لنگور کا کیا ارادہ، اس کی سمجھ نرملا کو نہ آرہی تھی۔ پھر اس لنگور نے نرملا کو نیچے زمین پر گرا دیا اور اس کی گردن، سینے اور پیٹ پر اپنے نوکیلے دانت گاڑ کر بھنبھوڑنے لگا، تکلیف نے نرملا کو جھنجھنا دیا۔ اس نے پورے شریر کی طاقت جمع کر کے سیاہ لنگور کو دھکا دیا اور اٹھ کر دوڑی۔ لنگور نے اس کا پلو پکڑا تو نرملا کی ساڑی کھل گئی مگر وہ رکی نہیں اور کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ وہ دروازے سے لگی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی اس کا سینہ انجن کی طرح اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ پھر نرملا نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اس کی آواز سے موہت کی آنکھ کھل گئی وہ اٹھ کر نرملا کے پاس آیا۔

نرملا اتنا حواس باختہ تھی کہ موہت کو لنگور سمجھی اور ہاتھ چلانے لگی اور چیخی۔ ”دور رہ مجھ سے دشٹ، پاپی، درندے!“ اس کو موہت نے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ”نرملا! میں ہوں موہت۔“ تو نرملا رک کر اس کو دیکھنے لگی اور ایک دم اس سے لپٹ گئی، وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔

موہت نے اسے چپکارا پھر نرملا نے موہت کو ساری بات بتائی۔ موہت نے اسے بستر پر بیٹھایا اور خود دروازہ کھول کر باہر آیا مگر سارا صحن خالی تھا۔ اس نے اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد نرملا کو آکر بتایا۔ مگر نرملا کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھی۔ موہت نے گائتری دیوی کو بلایا۔ انہوں نے جب نرملا کی حالت دیکھی تو وہ خوفزدہ ہوگئیں۔ نرملا کے سینے، گردن، پیٹ اور شریر کے اور حصوں پر کٹ کھنے لنگور کے دانتوں کے نشانات واضح تھے۔ اور نرملا کی ساڑی بھی صحن میں بکھری پڑی تھی۔ انہوں نے نرملا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولیں۔ ”چنتا نہ کر بہو! ایسے بے شرم لنگور ہوتے ہیں جو آوارہ پھرتے ہیں اور ناری کو دیکھ کر ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ میرے لڑکپن میں ایک بار جب میں اپنی موسی کے ساتھ جھرنے پر گئی تو میری موسی پر بھی ایک آوارہ لنگور نے

حملہ کر دیا تھا۔ پھر گاؤں کے لوگوں نے اسے مار کر بھگایا تھا۔'' انہوں نے نرملا کو شانت کیا اور اس کے زخموں پر مرہم لگا کر اسے سلا دیا۔

☆......☆......☆

مانک چند اپنے کمرے سے نکلے اور چھت پر بنے کمرے میں آ گئے۔ رات کا بھوجن کرنے کے بعد یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ انہوں نے پان کی گلوری منہ میں رکھی اور ریڈیو پر گانے لگا کر لیٹ گئے۔ ایک دم ریڈیو بجتے بجتے بند ہو گیا۔ مانک چند نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے سر گھما کر ریڈیو کی طرف دیکھا مگر ریڈیو اپنی جگہ سے غائب تھا۔ وہ حیران ہو کر اٹھ بیٹھے اور کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ مگر کمرے میں سناٹا تھا پھر ایک دم گانے کی آواز آئی مگر وہ آواز کمرے کے باہر سے آ رہی تھی۔ مانک چند نے بستر سے اتر کر پاؤں میں جوتیاں پہنیں اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ ریڈیو سامنے ہی چھت کی منڈیر پر رکھا ہوا تھا۔ مانک چند ہچکچاتے ہوئے آگے بڑھے اس سے پہلے کہ وہ ریڈیو اٹھاتے۔ کسی نے ان کا کرتا پیچھے سے پکڑ کر کھینچا۔ وہ پیچھے مڑے تو وہاں ایک سیاہ لنگور کھڑا تھا اور ساتھ منڈیر پر ایک عورت گھٹھرا بنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سرخ رنگ کی چنری کا گھونگھٹ نکالا ہوا وہ ٹانگیں آگے پیچھے ہلا رہی تھی۔

''کون ہے؟'' مانک چند نے پوچھا۔

''بڑی جوانی چڑھی ہے تجھے جو گانوں سے دل بہلا رہا ہے۔'' اس عورت نے بے ہودہ انداز سے کہا۔

''چلو نکلو یہاں سے تم ضرور رگھو کے گھر سے آئی ہو گی وہی ایسے بیہودہ لوگوں سے ملتا ہے۔'' مانک چند نے اپنے محلے کے ایک بے کار آدمی کا نام لیا۔

''تو ہٹائے گا ہمیں یہاں سے۔'' وہ عورت کود کر نیچے اتر آئی۔

''اور یہ اپنا پالتو بندر بھی لیتی جا!'' مانک چند سمجھا وہ عورت جا رہی ہے۔ اس عورت نے قریب آ کر جو اپنا گھونگھٹ اٹھایا تو مانک چند کا خون جمنے لگا۔ اتنی خوفناک شکل اس نے اپنے پورے جیون میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پھر اس عورت نے مانک چند کو دھکا دیا اور ان کے سینے پر پیر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ مانک چند کی آواز ان کے منہ سے باہر نہ نکل سکی ان کے ہونٹ آپس میں چپک گئے تھے۔ بوجھ بڑھتا گیا اور مانک چند ٹھنڈا ہو گئے۔ اس عورت نے مانک چند کا سینہ چیرا اور دل نکال کر چبانے لگی، پھر اس نے مانک چند کا کلیجہ نکالا اور اسے چبانے لگی۔

سیاہ لنگور بے چینی سے ادھر ادھر کود رہا تھا کہ کب اس کی باری آئے گی۔ پھر وہ عورت ہٹی اور اپنی مڑی ہوئی انگلیاں چاٹنے لگی۔ سیاہ لنگور اس کے ہٹتے ہی دھپ سے کودا اور لاش کو نوچ کر کھانا شروع کر دیا۔ پوری لاش چٹ کر کے لنگور بے تابی سے زمین پر لگے خون کو زبان سے چاٹنے لگا۔ اس نے ہڈیاں تک اپنے پیٹ میں اتار لی تھیں۔ ''بڑا ہی بھوکا ہے تو ایک پرش سے تیرا پیٹ نہیں بھرا؟ ہاں بھرے گا کیسے تیری بھوک تو ناری کے نرم ماس سے مٹتی ہے ناں۔'' اس عورت نے کہا تو لنگور اپنے دانت نکالنے لگا۔

☆......☆......☆

گائتری نے نرملا سے پوچھا۔ ''بہو! تمہارے سسر جی آ گئے نیچے؟''

''نہیں ماں جی! آج تو باؤ جی کو کافی سے لگ گیا ہے نیچے آنے میں۔'' اتنے میں موہت بھی آ گیا تو گائتری دیوی نے اسے مانک چند کو بلانے اوپر بھیجا۔ اوپر کمرہ خالی تھا اور ریڈیو بج رہا تھا۔ موہت نے اسے بند کیا اور نیچے آ کر ماں کو بتایا۔ گائتری اور نرملا حیران تھیں کیونکہ دروازے کا کنڈا اندر سے چڑھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب ہے مانک چند باہر نہیں گئے تو آخر کہاں غائب ہو گئے۔ پورا گھر چھان مارا پھر سارے پاس پڑوس، جاننے والوں، دوستوں، گاہکوں سے معلوم کیا مگر کسی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ مانک چند کہاں گئے؟ سب پریشان تھے مگر کچھ کر نہ پائے۔

موہت اکیلا سارے جھمیلے دیکھنے کے ساتھ گھر

والوں کو سنبھال رہا تھا۔ نرملا کے سونے کے بعد اسے نیند نہیں آ رہی۔ وہ باہر صحن میں کھٹولے پر آ کر لیٹ گیا وہ سارے واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا، ٹھنڈی ہوا چلی تو موہت کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ موہت کو اپنی کلائی پر کسی کی گرفت کا احساس ہوا اس نے نیند بھری آنکھ کھولی تو کوئی بیٹھا اس کی کلائی تھامے ہوئے تھا۔ موہت کو وہ نرملا لگی۔ موہت نے نیند میں کہا۔ ''سو جا بھاگوان! سب ٹھیک ہو جائے گا، پتاجی آ جائیں گے تو فکر مند نہ ہو؟''

''اب کیا چنتا سے واپس اٹھ کر آئے گا تیرا باپ!'' اس عورت نے گرج کر کہا تو موہت کی نیند اڑ گئی۔ موہت کو کرنٹ لگا اور ایک دم اٹھ کر بھاگا اور کمرے کے بجائے گھر میں بنے مندر کے اندر گھس گیا۔ سامنے سارا صحن خالی تھا موہت وہیں بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ سویرے گائتری اور نرملا نے آ کر اسے جگایا۔ موہت نے اٹھ کر بتایا۔ ''رات صحن میں کوئی عورت تھی! عورت؟''

''مگر بیٹا یہاں تو عورت کا نام و نشان تک نہ تھا، جب ہم آئے، تیرا وہم ہوگا تو ویسے بھی پریشان جو ہے۔'' گائتری دیوی کی بات پر موہت سر ہلا کر رہ گیا۔

گائتری دیوی گہری نیند میں تھیں جب انہیں کسی نے آواز دی۔ ''ماں جی!'' گائتری اٹھیں تو انہیں دروازے سے نکلتا ہوا کوئی دکھا اور پلو لہرایا۔ گائتری سمجھیں کہ نرملا کسی کام سے آئی تھی اور مجھے سوتا پا کر واپس چلی گئی۔ مگر جب گائتری نے وقت دیکھا تو رات کے سوا دو بج رہے تھے۔ ''نرملا اس وقت! کہیں کوئی چنتا کی بات تو نہیں ہے؟'' یہ سوچ کر گائتری تیر کی طرح بستر سے نکلیں اور کمرے سے صحن میں آئیں مگر وہاں نرملا کے بجائے رادھا سامنے چھت پر جاتی سیڑھیوں پر چڑھتی نظر آئی۔ ''ایں! رادھا تو سکتے میں تھی یہ ٹھیک ہو گئی؟ یہ تو خوشی کی بات ہے۔'' گائتری کو خوشی ہوئی۔ وہ تیزی سے رادھا کے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگیں اور رادھا تک پہنچ کر انہوں نے رادھا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف موڑا۔

رادھا کے مڑتے ہی گائتری کی خوشی ہوا ہو گئی۔

> **رشتے**
>
> مخلص رشتے اللہ کی نعمت ہوتے ہیں انہیں کبھی مت ضائع ہونے دینا چاہئے جیسی بھی مجبوری ہو کیونکہ مجبوری تو ختم ہو جائے گی لیکن رشتے دوبارہ نہیں ملتے۔
>
> (ثروت عزیز گوشی: کوٹھا کلاں)

رادھا کی آنکھیں بند تھیں۔ جو اس نے پٹ کر کھول دیں اس کے ڈیلے سفید تھے اور پتلی غائب، رادھا نے عجیب سی خوفناک آواز نکال کر رونا شروع کر دیا۔'' گائتری رادھا سے خوفزدہ ہو گئیں۔ پھر رادھا نے اپنے ہاتھ کو منہ کے قریب لے جا کر اشارہ کیا اور اپنا منہ کھول دیا۔ اب جو گائتری کی نظر رادھا کے منہ پر پڑی وہ لڑکھڑا گئی۔'' رادھا کے کھلے منہ میں خون بھرا ہوا تھا۔ جو باچھوں سے بہنے لگا تھا اور اندر سب خالی تھا رادھا کی زبان غائب تھی۔

ایک دم گائتری کی ساڑی کسی نے پیچھے سے کھینچی، گائتری کا سنتولن بگڑا اور وہ لڑھکتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے آ پڑیں، ان کا سر زمین سے ٹکرایا تو ان کی آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھ کر بیٹھ گئیں، ان کا سر ابھی تک گھوم رہا تھا۔

گائتری کو پیچھے سے کسی نے دبوچ لیا وہ کسی کے ہاتھ تھے جنہوں نے سینے پر دونوں طرف سے جکڑ رکھا تھا۔ گائتری نے گردن موڑی تو ''پیچھے ایک خوفناک سیاہ لنگور اپنے بڑے بڑے دانت نکالے کھیں، کھیں کر رہا تھا، گائتری کی جان نکل گئی اس لنگور نے گائتری کے سینے پر اپنے ناخن چھونے شروع کر دیئے اور پھر ایک دم اپنے نوکیلے دانت گائتری کے گال میں پیوست کر دیئے۔

گائتری کو لگا کسی نے گرم سلاخیں ان کے چہرے میں گھسا دی ہوں۔ اس لنگور نے گائتری کے گال کا گوشت دانتوں سے کاٹ کر الگ کر دیا۔

گائتری سر سے پیر تک جھن جھنا گئیں اور اپنے

ٹانگ پیچھے موڑ کر بھرپور طاقت سے لات لنگور کے پیٹ میں ماری، لنگور کی گرفت چھٹی تو گائتری نے دوڑ کر باہر جانے کا دروازہ کھولا اور گھر سے نکل آئیں، اس وقت انہیں کچھ نہیں سوجھ رہا تھا، لنگور بھی چھلانگیں مارتا ان کے پیچھے آرہا تھا، گائتری بھاگتے بھاگتے تھکنے لگیں، وہ شیطانی سیاہ لنگور تھا اس کا فاصلہ گائتری سے کم ہوگیا تھا اس سے پہلے کہ گائتری کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ لنگور انہیں دبوچ لیتا۔

سامنے مندر کی سیڑھیاں گائتری کو نظر آئیں۔

وہ بے تحاشا دوڑتی ہوئی مندر کی سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ اوپر مندر میں پہنچ کر انہوں نے نیچے دیکھا تو وہ شیطانی سیاہ لنگور غضبناک انداز سے اچھل رہا تھا وہ مندر کی سیڑھی کے پاس آتا اور ایک دم اچھل کر پیچھے ہٹ جاتا، کافی دیر ایسا ہوتا رہا پھر وہ وہاں سے پلٹ گیا۔ گائتری وہیں مندر میں ڈھیر ہوگئیں۔

گائتری کی آنکھ کھلی تو انہوں نے ادھر ادھر دیکھا وہ مندر ہی میں تھیں۔ سامنے ہی کچھ دور ایک بہت عمر رسیدہ منش بیٹھے ہوئے تھے۔ گائتری ایک دم اٹھیں اور نیچے سیڑھیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

''وہ! وہ!...... نیچے لنگ......'' مگر الفاظ ان کا ساتھ نہ دے سکے اور انہوں نے رونا شروع کردیا۔ ان بابا نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور بولے۔ ''شانت ہوجا! پتری، تو بھگوان کی شرن میں ہے، چنتا کاہے کرتی ہے؟ ادھر آ ہمارے پاس۔''

گائتری ان کے پاس جاکر بیٹھ گئیں، ان کے گال کا ماس غائب تھا، ان بابا نے اپنا داہنا ہاتھ گائتری کے گال پر پھیرا تو ان کا زخم فوراً بھر گیا۔ گائتری کو اپنے اندر ٹھنڈک سی اترتی محسوس ہونے لگی۔ گائتری نے روتے ہوئے رات کے اس سمے اپنے مندر میں ہونے کا کارن بتایا تو ان بابا نے آنکھیں بند کرلیں۔ پل بھر میں انہوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو ان کے ماتھے پر چنتا کی لکیریں صاف دکھ رہی تھیں۔ ''تیرے پریوار پر ایک بہت پرانی چڑیل کا سایہ پڑ گیا ہے، وہ تیرے پورے پریوار کو ختم کردے گی اور سب سے چنتا کی بات یہ ہے کہ اس نے تیرے پتر کے ساتھ پھیرے لے کر اسے اپنا پتی مان لیا ہے اور یہ نیوتا اسے تیرے پتر نے خود دیا تھا۔ تیرے پریوار کو ختم کرنے کے بعد وہ تیرے پتر کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔ ابھی اسے شکتی پراپت کرنی ہے اور اس کار میں اس کا چیلا شیطانی بدروح بھی شامل ہے جس نے ایک سیاہ لنگور کے شریر میں پراویش کیا ہوا ہے۔'' وہ بابا جی خاموش ہوگئے، اتنے میں مندر کے اندر سے ایک داسی انہیں بلانے آئی۔ ''تو یہیں ٹھہر ہم ابھی آتے ہیں اور داسی کو گائتری کے پاس ٹھہرنے کا آدیش دے کر اندر چلے گئے۔

''یہ کون ہیں؟'' گائتری نے داس سے پرشن پوچھا۔

''آدر سے نام لے مورکھ! جانتی ہے کس کے بارے میں بات کررہی ہے؟'' داسی نے ترش لہجے میں کہا۔

''شما چاہتی ہوں! مندر کے پجاری جی کو ہم جانتے ہیں مگر ان کو پہلی بار دیکھا ہے۔'' گائتری بولیں۔

''بھاگیہ شالی ہے! جو تجھے آج پنڈت گوسوامی وجے مہاراج کا دیدار کرنے کو ملا اور انہوں نے تجھے اتنا سمے دیا وہ بھی بنا کسی انتظار کے۔ ورنہ ان کی صرف ایک جھلک دیکھنے کو لاکھوں لوگ پیدل چل چل کر ان کے پاس جاتے ہیں اور کئی دنوں بعد ان کا دیدار کرپاتے ہیں۔ اتنی لمبی قطاریں ہوتی ہیں ان کے بھگتوں کی۔ آج اس مندر میں گوسوامی مہاراج چالیس ورشوں بعد پدھارے ہیں۔'' داسی نے بتایا۔

اتنے میں گوسوامی مہاراج آگئے تو داسی ہاتھ جوڑے نگاہیں نیچے کیے ایک طرف ہوگئی۔

گائتری گوسوامی مہاراج کے چرنوں میں گر گئیں اور بولیں۔ ''میری سہائتا کیجیے مہاراج۔''

انہوں نے گائتری کو شانوں سے تھام کر اوپر اٹھایا اور بولے۔ ''ہم اوشیہ تیری سہائتا کریں گے۔ سنکٹ میں کسی کی سہائتا کرنا تو ہر منش کا کرتویہ ہے اور پہننے کا کام بھی۔''

''سوامی مہاراج! وہ چڑیل میرے بیٹے کے

پیچھے کیسے لگ گئی؟'' گائتری نے سوال کیا۔

''اسے تیرے پتر نے خود نیوتا دیا تھا، وہ جس مہاراجا کے قلعہ گیا تھا، وہ چڑیل وہاں سے اس کے ساتھ آئی ہے۔ وہ بہت پرانی ہے۔ یہ اس سمے کی بات ہے جب مہاراجا لکشمن اس قلعہ میں اپنی ماں یعنی راج ماتا کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ جب راج ماتا بہت بیمار ہوگئیں اور بستر سے جا لگیں تو انہوں نے مرتیو سے پہلے اپنی انتم اچھا مہاراجا لکشمن کے سامنے رکھی کہ وہ مہاراجا لکشمن کے ونش کو آگے بڑھانے کے لئے، اپنے سامنے اس کا دواہ کرنا چاہتی ہیں۔ مہاراجا لکشمن کے لئے راج ماتا کا آدیش پتھر پر لکیر تھا۔ اس کے قریبی ساتھیوں اور وفاداریوں نے بہت سی راجکماریوں کے بارے میں مہاراجا لکشمن کو بتایا مگر مہاراجا لکشمن کے در بھاگیہ نے اس کو عجیب حالات سے دوچار کردیا۔

مہاراجا لکشمن اپنے متر شمشیر سنگھ کے بلاوے پر اس کی جاگیر گیا اور اس کی ملاقات راستے میں ایک کم سن، سندر، کنواری کنیا سے ہوگئی۔ مہاراجا لکشمن کو وہ فوراً بھاگئی اور بنا کسی جان کاری کے مہاراجا لکشمن نے اس سے دواہ کرلیا اور راج ماتا کے سامنے لاکر پیش کردیا۔

راج ماتا اتنی بیمار تھیں کہ بمشکل انہوں نے دونوں کو آشیرباد دیا اور اس دواہ کے دو روز بعد ہی راج ماتا پرلوک سدھار گئیں۔

مہارانی پدمنی کی سندرتا نے مہاراجا لکشمن کو بری طرح اپنے جال میں لپیٹ لیا تھا اور اسی سندرتا کے کارن اس نے پدمنی کو اپنی دھرم پتنی بنایا تھا۔ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ مہاراج لکشمن کو کچھ خبر نہ تھی۔ بس پدمنی نے اتنا بتایا تھا کہ اس کا اس سنسار میں کوئی نہیں ہے۔

پھر مہاراجا لکشمن کی جاگیر میں جوان پرش اور ناریوں کا غائب ہونا معمول بن گیا۔ ایسا کوئی دن نہ جاتا جب کوئی غائب نہ ہوتا ہو۔ مہاراجا لکشمن نے اپنے گپت کارندوں اور سیناپتی کو اس کی کھوج لگانے کا آدیش دیا مگر اس سے کوئی سپھلتا نہ ملی اور مرتیو ہونے کا سلسلہ نہ تھم سکا، پھر ظلم کا یہ سلسلہ بھگوان کی کرنی سے حل ہوا۔

ایک رات مہاراجا لکشمن کی آنکھ خود بخود کھلی اس نے اپنی برابر سوتی مہارانی پدمنی کو دیکھا تو اس کا بستر خالی تھا۔ کافی سے انتظار کرنے پر بھی جب وہ نہ آئی تو مہاراجا لکشمن اٹھ کر باہر جانے لگا پھر جانے اس کے من میں کیا آئی اس نے اپنی تلوار بھی اٹھالی اور باہر آگیا۔ باہر کھڑے پہرے داروں سے اس نے مہارانی کا پوچھا مگر انہوں نے کہا ''مہارانی تو کمرے سے نکلی ہی نہیں۔'' اس بات نے مہاراجا لکشمن کو حیرت کے سمندر میں ڈال دیا اس نے پہرے داروں سے تو کچھ نہ کہا اور آگے بڑھ گیا۔ چلتے ہوئے اسے کہیں بھی مہارانی پدمنی دکھائی نہ دی۔ پھر مہاراجا لکشمن قلعے کی دوسری طرف گیا اس جگہ کافی اندھیرا تھا۔

مہاراج نے قلعہ کی دیوار سے لگی ایک مشعل لی اور آگے بڑھ گیا۔ ایک دم اس کے پیر میں کچھ الجھا۔ مہاراجا نے اسے اٹھایا تو وہ کوئی کپڑا تھا جو کہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پھر مشعل کی روشنی میں دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ دراصل ساڑی تھی۔ مہاراجا لکشمن اسے پدمنی کی ساڑی سمجھا اور کسی خطرے کے پیش نظر تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ مگر آگے پہنچ کر جو منظر اس کی آنکھوں نے دیکھا، اس نے مہاراجا کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی۔

''سامنے مہارانی پدمنی زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی پیٹھ مہاراجا لکشمن کی طرف تھی، مہارانی سے تھوڑی دوری پر ایک چھوٹا، گنجا، سیاہ پرش موجود تھا جو کہ زمین پر پڑی ایک عورت کے گلے پر جھکا ہوا تھا۔ عورت کے گلے سے خرخر کی آواز آرہی تھی اور وہ بری طرح پھڑک رہی تھی۔ عورت کے جسم پر ساڑی موجود نہ تھی۔ مہارانی کچھ کر رہی تھی وہ دونوں اتنے مگن تھے کہ انہیں مہاراجا لکشمن کے آنے کی خبر ہی نہ ہوسکی۔

مہاراجا آگے بڑھا تو اس کو مہارانی کا چہرہ نظر آیا، اس کا منہ خون سے لتھڑا ہوا تھا اور اس کے ہاتھوں میں کلیجہ تھا، جسے وہ بے صبری سے چبا رہی تھی پھر وہ زمین پر چاروں ہاتھوں سے پیروں سے جانوروں کی طرح چلتی لاش کے پاس پہنچی اور دانتوں سے ادھیڑنے لگی۔

مہاراجا لکشمن نے سے ضائع کئے بغیر میان سے تلوار نکالی اور دونوں کے سران کے شریر سے الگ کر ڈالے۔ وہ اتنے مگن تھے کہ کچھ نہ کر پائے۔ مہاراجا نے اپنے وفاداروں سے دونوں کی لاشوں کو قلعہ میں موجود کنویں میں ڈلوادیا۔''

مہاراجا نے ان کے شریر تو نشٹ کردیئے مگر ان کی آتماؤں کو نہ مارا اور وہ اس کنویں میں بھٹکنے لگیں۔ وہ چڑیل جوان رہنے کے لئے جوان پرشوں کے کلیجے چباتی اور اس کا پاپی کارندہ جوان ناریوں کا شکار کر کے اپنی پیاس بجھاتا تھا۔

تیرے پتر کے بلاوے پر وہ چڑیل کی آتما اس پر آگئی اور اپنے ساتھ اپنے کارندے کو بھی لے آئی۔

تیری بہو رادھا اور اس نے ایک ہی سے پھیرے لئے تھے اس لئے وہ بھی اس چڑیل سے بندھ گئی تھی۔ اسی کارن اس چڑیل نے اسے اس سے نہیں مارا۔ مگر اس چڑیل نے رادھا کی زبان کھینچ کر باہر نکال لی اور کھا گئی۔ مگر آج اس نے اتنی شکتی پراپت کرلی ہے کہ اس نے اپنے آپ کو رادھا سے آزاد کرلیا اور اس کا کام تمام کردیا۔ تیرا پتی بھی اسی کا شکار بنا، اتنا ہی نہیں وہ تیرے بیٹے کے راستے نیا شریر حاصل کرے گی اور پوری شکتی پانے کے بعد تیرے پتر کا پران لے کر پھر سے خونی کھیل رچانے لگے گی۔'' ان کی بات سن کر گائتری لرزنے لگیں۔

پھر انہوں نے گائتری کو ایک پانی سے بھرا کلش دیا اور بولے۔ ''تیرا چھوٹا بیٹا جسے وہ اپنے ساتھ لے جا چکی ہے اور اسے اس سے روکنا ضروری ہے۔ تو یہ پانی لے اور اسے اپنے آگے چھڑکتی گھر جا اور اپنے دوسرے بیٹے اور بہو کو لے کر باہر آ اور پھر گھر کا دروازہ بند کر کے تالا ڈالنے کے بعد یہ پانی اس تالے پر ڈال دے۔ اس سے وہ چڑیل دوبارہ گھر میں داخل نہ ہو پائے گی اور اپنے بیٹے اور بہو کو لے کر مہاراجا لکشمن کے قلعہ میں پہنچ، ہم بھی وہیں آجائیں گے۔ ابھی وہ چڑیل اسے غائب کر کے نہیں لے جاسکتی اسی لئے ہم بھی سے پر پہنچ جائیں گے جا جلدی کر۔'' انہوں نے زور سے کہا تو گائتری بجلی کی سی رفتار سے بھاگنے لگیں۔

گائتری، موہت اور نرملا جب مہاراجا لکشمن کے قلعہ میں پہنچے تو سورج دیوتا سونے جارہے تھے۔ گائتری کے پاس وہ پانی کا کلش اب بھی موجود تھا مگر وہ کبھی سورج کی طرف دیکھتی تو کبھی آنے والے راستے کی طرف، انہیں گوسوامی مہاراج کا انتظار تھا۔ ایک دم کسی نے گائتری کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

گائتری سمجھی موہت ہے، مگر جب وہ مڑی تو اچھل پڑی وہ گوسوامی مہاراج تھے۔ ''مہاراج آپ!''

''میں تو کب سے راستے پر نگاہیں جمائے آپ کی راہ تک رہی تھی۔''

تو گوسوامی جی مسکرادیئے۔ گوسوامی جی نے اپنی مٹھی میں بند قلعہ کے بند دروازے پر کچھ دانے بکھیر دیئے۔ سورج ڈوبتے ہی وہ دانے انگاروں کی طرح سلگ اٹھے اور جل کر چٹخنے لگے اور قلعے کا دروازہ دھڑ دھڑانے لگا اور اس کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اب ٹوٹ کر گرا۔ گوسوامی مہاراج نے قلعے کے دروازے پر قدم رکھا تو دروازہ ایک دم رک کر شانت ہوگیا اور زمین پر بکھرے ہوئے دانے خود بخود ٹھنڈے ہوگئے۔ پھر ایک دم قلعے کا دروازہ کھل گیا، گوسوامی مہاراج اندر گئے اور گائتری، موہت اور نرملا ان کے پیچھے چل پڑے۔ پھر وہ سب قلعہ میں موجود کنویں کے پاس پہنچ گئے۔ مگر وہاں موہن کا کچھ پتہ نہ تھا۔ گوسوامی مہاراج نے آنکھیں بند کیں اور چونک گئے۔

''بہت چنٹ ہے! ہمارے آنے سے پہلے موہن کو کنویں میں لے گئی۔'' پھر انہوں نے آنکھیں دوبارہ بند کیں تو ان کے ہونٹ جلدی جلدی حرکت کرنے لگے اور پھر انہوں نے ایک بار پھر اپنی مٹھی ہوا میں اٹھائی اور پھر اس میں موجود دانوں کو کنویں میں پھینک دیا۔

کنویں کے اندر سے فوراً موہن کے چیخنے کی آواز آنے لگی۔ پھر وہ آوازیں غلیظ قسم کی گالیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ پھر گوسوامی مہاراج نے کنویں کی

طرف پھونک ماری تو کنویں کے اندر سے موہن باہر نکل کر ہوا میں معلق ہوگیا اور اس کے گرد گوسوامی مہاراج کے پھینکے ہوئے دانے ہوا میں معلق موہن کے گرد گھوم رہے تھے۔

پھر گوسوامی مہاراج نے آنکھیں کھول کر ان دانوں پر نگاہیں جمائیں۔ تو وہ سلگ اٹھے۔ موہن نے حلق پھاڑ کر چیخنا شروع کردیا۔ اس کی حالت بہت اذیت ناک ہورہی تھی۔

گائتری کا من مٹھی میں بھنچا جارہا تھا اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو اس حالت میں دیکھ کر وہ آگے بڑھنے لگیں مگر نرملا نے انہیں جکڑ کر روک لیا۔ پھر ان تینوں کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا اس سے وہ لوگ اپنی جگہ پر جم گئے۔ ان سلگتے ہوئے دانوں نے ایک بھنور کی شکل اختیار کرلی تھی۔ موہن کنویں کے اندر جاتا کبھی باہر آجاتا دونوں طرف سے کشش کا زور نظر آرہا تھا پھر وہ بھنور کنویں سے باہر آکر ہوا میں گھومنے لگا۔ اور پھر ایک دم موہن دھپ سے زمین پر گرگیا۔ اس سلگتے دانوں کے بھنور میں اب ایک خوفناک چیخ سنائی دے رہی تھی۔

وہ آواز ایک سیاہ بے حد سیاہ عورت کی تھی اس کی کھال انتہائی بوسیدہ تھی جس کی وجہ سے وہ جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھی اور ہاتھوں پیروں کی انگلیاں مڑی ہوئی تھیں جن پر اگے ہوئے ناخن بھی لمبے لمبے مڑے ہوئے تھے۔

پھر گوسوامی مہاراج پڑھتے پڑھتے چونک پڑے۔ انہوں نے دوبارہ اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

اچانک کنویں کے برابر لگے درخت میں سے لنگور کے چیخنے کی آواز آئی اور پھر گوسوامی مہاراج نے اسی درخت پر نگاہ جمائی اور پل بھر میں اس درخت میں آگ بھڑک اٹھی اور دھڑ دھڑ جلنے لگا۔ آگ کے لگتے ہی درخت سے ایک سیاہ لنگور دھپ سے زمین پر آن گرا اور ایک دم اٹھ کر بھاگنے لگا۔ مگر کسی نے اسے دم سے پکڑ کر ہوا میں لٹکا دیا، کس نے لٹکایا وہ نظر نہ آرہا تھا۔ سیاہ لنگور ہوا میں لٹکا چیخیں مار مار کر کچھ دیر میں لنگور دھپ سے زمین پر آگرا اور ہوا میں ایک سیاہ وجود معلق ہوگیا۔ سیاہ اور بے انتہا خوفناک لمبے لمبے دانت اور سرخ خون میں ڈوبی بڑی بڑی گول آنکھیں، سر گنجا پھر اس کے وجود میں آگ بھڑک اٹھی۔ دونوں جلتے ہوئے چیخیں مار رہے تھے اور فضا میں غلیظ بو رچ گئی تھی پھر ان بھیانک آتماؤں کی چیخیں مدھم ہوتی چلی گئیں اور پھر وہ دونوں جل کر ختم ہوگئے اور فضا میں بھڑکتی آگ ٹھنڈی پڑگئی۔

''اب تو سب ٹھیک ہے ناں گوسوامی مہاراج!''

گائتری نے بے تابی سے پوچھا۔

گوسوامی مہاراج دھیرے سے سر اٹھا کر بولے۔ ''دیکھ! گائتری! ہونی کو کوئی چاہ کر بھی نہیں روک سکتا۔ وہ پاپی تو اپنے انجام کو پہنچ گئے مگر جاتے ہوئے وہ چڑیل اپنا وار کرگئی۔ ہمارے آنے کی خبر اس چڑیل کو ہوگئی تھی، اس نے اپنی ہٹ دھرمی سے تیرے پتر کی پران لے لی۔''

گائتری دوڑ کر نیچے گرے ہوئے موہن کے پاس گئیں اور اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

موہت اور نرملا بھی آنکھوں میں آنسو لئے گائتری کو دلاسے دینے لگے۔ پھر وہ لوگ موہن کی لاش کو گھر لے آئے۔ پھر اس کا انتم سنسکار کردیا گیا۔ گائتری کو صبر نہیں آرہا تھا اس کے پریوار کے لوگ ایک ایک کرکے اسے چھوڑ گئے تھے۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کرسکتی تھیں۔

نرملا خیالوں سے نکل آئی کیونکہ اس کی ننھی پالنے میں رونے لگی تھی۔ اس نے چنری واپس الماری میں رکھی اور ننھی بملا کو اٹھایا۔ اتنے میں ننھا منیش بھی دوڑتا ہوا آگیا۔ نرملا دونوں کو لے کر بستر پر لیٹ گئی۔ ابھی وہ کچھ دیر سونا چاہتی تھی کیونکہ شام کو موہت اور گائتری واپس آنے والے تھے، وہ یاترا پر گئے ہوئے تھے اور ساتھ گوسوامی مہاراج سے ان کے آشرم میں ملنے بھی گئے تھے۔

قسط نمبر: 20

ایم الیاس

چاہت خلوص اور محبت سے سرشار دلوں کی انمٹ داستان جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی کہ دل کے ہاتھوں مجبور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے بے شمار جان لیوا اور ناقابل فراموش مراحل سے گزرتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ حقیقت کہانی میں پوشیدہ ہے۔

یہ دنیا رہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔ انہی الفاظ کو احاطہ کرتی دلگداز کہانی

شنکر ناتھ نے یہ بات غلط نہیں کہی تھی۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ اس نے نہ صرف آکاش کی پرچھائیں اپنے قبضے میں کرلی تھی اور دوسری طرف امرتا رانی کو بے بس کردیا تھا۔ امرتا رانی کو چوں کہ آکاش کی زندگی اور محبت عزیز تھی اس لئے شنکر ناتھ جیسے اس کی کمزوری اور بے بسی سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ وہ ایک نمبری کمینہ، فریبی، مکار ہی نہیں بلکہ شقی القلب، درندہ صفت بھی تھا۔ اس نے نہ جانے کتنی ہی کلیوں اور پھولوں کو ایک بھونرے کی طرح تباہ کیا تھا۔ اس نے بڑے بڑے حریفوں اور دشمنوں کو زیر کیا اور صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا۔ اس پر کوئی بھی قابو نہ پاسکا۔ اس کا بال تک بیکا نہ ہوسکا تھا۔ اس لئے اسے بڑا زعم اور گھمنڈ تھا کہ ایک امرتا رانی کیا دس بھی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں...... اس لئے اس کے بھدے اور بدنما ہونٹوں پر ایک مکروہ فاتحانہ مسکراہٹ رینگنے لگی اور آنکھوں میں وحشیانہ چمک کوندگئی۔

وہ خوش فہمی اور خود فریبی سے اکڑ رہا تھا۔ امرتا رانی بے بس ہوچکی تھی۔ لیکن اس کی ساری توقع خاک میں مل گئی۔ امرتا رانی نے اچانک اور غیر متوقع طور پر دہکتی ہوئی وہ سرخ سلاخ کسی چاقو اور نیزے کی مانند شنکر ناتھ کی پسلیوں کو نشانہ بنا کر اس سمت پھینکا جو بجلی کی سی سرعت سے کوندا بن کر لپکی...... شنکر ناتھ غافل اور بے پروا نہ تھا اس نے جھک کر سرخ سلاخ سے بچنے کی کوشش کی اور سرعت سے ایک طرف ہٹ گیا۔ لیکن اس سلاخ نے اچانک حیرت انگیز طور پر رخ بدل کر کسی نیزے کی طرح اس کے نیم برہنہ پیٹ میں جا گھسی تو اس نے ایک کریہہ چیخ ماری اور اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور پیچھے الٹ گیا۔

حالات کسی سنسنی خیز اور ڈراؤنی اور بھیانک انگریزی فلم کی طرح پے در پے مناظر بدل رہے تھے کہ آکاش بھونچکا سا ہوگیا اور وہ اپنی جگہ ساکت وصامت رہ گیا۔ شنکر ناتھ کے زمین پر گرتے ہی امرتا رانی نے آکاش سے کہا۔

”تم غار ہی میں ٹھہرے رہنا باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔“

پھر امرتا رانی نے فوراً ہی بغیر کسی تاخیر کے انگلی کے اشارے سے آتشیں سلاخ کو پراسرار طریقے سے شنکر ناتھ کے بدن میں اس طرح گھمانے لگی جیسے اس میں ڈرل کر رہی ہو اور اس لمحے امرتا رانی کے چہرے پر سفاکی کی سرخی ابھر آئی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خوب صورتی کے بجائے نفرت اور انتقام کی سرخی

بھر گئی تھی۔

آکاش اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہا اور اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی لرزہ خیز اور خونی منظر دیکھ رہا ہو۔

امرتا رانی اپنی نادیدہ اور پراسرار قوتوں سے شنکر ناتھ کو فٹ بال کی طرح ایک سمت لے گئی اور شنکر ناتھ کا جسم اس طرح لڑھک رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت اسے بڑی بے رحمی سے لات مار رہی ہو۔

آکاش ششدر و مبہوت آنکھیں پھاڑے اس طرح یہ خونی منظر دیکھتا رہا جیسے ہولناک خواب دیکھ رہا ہو اور اس کی نس نس میں لہو منجمد ہونے لگا تھا اور دل و دماغ سنسناتا جا رہا تھا۔ لمحہ لمحہ اس کی آنکھیں پھیلتی بھی جا رہی تھیں۔

شنکر ناتھ کی روح فرسا چیخیں اس میں کوئی ہیجان اور دہشت پیدا کرنے کے بجائے اس کی آتما کو طاقت بخش رہی تھیں...... اس کے کانوں میں شہد کی سی مٹھاس گھول رہی تھیں۔ اس کی مسرت کا اندازہ وہ خود ہی کر سکتا تھا یا پھر امرتا رانی...... اس کی بے پناہ مسرت اس کے وجود میں موجزن تھی کہ شنکر ناتھ اس کا بدترین جانی دشمن تھا۔ آخر وہ کیوں کر اور کیسے خوش نہ ہوتا......

پھر ذرا سی دیر میں وہ دونوں غار کی بھول بھلیوں کی آغوش میں اس کی نگاہوں سے روپوش ہو گئے۔

ادھر غار سے روشنی کا وہ ہلکا ہلکا سا مخرج روپوش ہو جانے کے باعث آکاش نے محسوس کیا وہ پھر سے ایک عجیب سی طمانیت محسوس کر رہا ہے۔ وہ جس تکلیف اور گھبراہٹ میں مبتلا تھا اب اس کا شائبہ تک نہ رہا تھا۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس کے سارے جسم پر ایک میٹھی سنسنی دوڑ گئی۔

آکاش کو توقع تھی کہ امرتا رانی جلد ہی شنکر ناتھ کا منحوس وجود موت کی آغوش میں بھینٹ کر کے چلی آئے گی تاکہ وہ راستے کا پتھر نہ بنا رہے۔ پھر بھی تنگ و پریشان اور جان لینے پر نہ تلا رہے۔ اس کا وجود خاک میں مل جانے سے ہی سکون ملے گا۔

وہ امرتا رانی کا لمحہ لمحہ بے تابی سے انتظار کرنے لگا۔ ہر لمحہ اس پر کسی صدی کی طرح بھاری ہونے لگا تھا۔ لیکن خاصی دیر گزرنے کے باوجود وہ واپس نہ آئی...... اس نے باہر کی جانب کان لگا دیئے۔ اسے کسی قسم کی آواز یا آہٹ سنائی نہ دے رہی تھی...... پھر اس کے دل کے کسی کونے میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اسے طلب کرے لیکن اس نے اپنے آپ کو اس خیال سے باز رکھا کہ وہ نجانے اس وقت اس خبیث اور بوڑھے اور کمینے شنکر ناتھ سے مقابلے کے کس مرحلے سے دوچار ہو۔ شاید ان کے درمیان زبردست مقابلہ ہو رہا ہو یا پھر شنکر ناتھ اپنی کسی پراسرار طاقت سے مقابلہ کر رہا ہو۔ اس لئے اس نے مزید انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ گوکہ یہ انتظار کی کیفیت بڑی اذیت ناک تھی۔ اس کا جو کرب تھا اس کے لئے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔

وہ ان خیالات میں گم تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم میں جان ہی نہیں رہی ہے۔ اس وقت وہ بڑی بے تابی اور اضطرابی کیفیت میں امرتا رانی کے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ نہ تو اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے اور نہ ہی ایک قدم چل بھی سکے گا۔ اگر وہ ایک دم سے غار کے فرش پر نہ بیٹھ جاتا تو شاید سنگلاخ فرش پر بے دم سا ہو کر گر جاتا۔ توازن قائم نہ ہونے کی صورت میں منہ کے بل گرتا تو پھر شاید تمام دانت ٹوٹ جاتے۔ چہرے کا جغرافیہ بگڑ جاتا یا پھر اس کی پیشانی پھٹ کر بھیجا باہر نکل آیا۔ فرش پر بیٹھتے ہی اس نے اس کیفیت میں محسوس کیا کہ اسے اذیت اور تکلیف سے نجات مل گئی لیکن سکون سا محسوس کر رہا ہے۔ چند ہی لمحوں کے بعد اس کے پورے وجود میں میٹھی میٹھی سی سن سناہٹ ہو رہی تھی جیسے کوئی غیر مرئی اور نادیدہ شے غیر محسوس انداز سے باہر آنے کے لئے بے تاب ہو رہی ہو۔ جس سے اس کے سکون میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔

آکاش کے لئے یہ تجربہ نہ صرف بے حد دلچسپ بلکہ سنسنی خیز بھی تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی اپنی

اس مجموعی کیفیت کے باعث اسے اطمینان تھا کہ یہ حالت اس کے لئے کسی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت نہیں ہوگی...... اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ امرتا رانی شنکر ناتھ پر قابو پا چکی ہے اور اب وہ اپنے سائے کے کرب ناک عذاب سے نجات پالے گا۔

وہ اس خوشی میں غار کی دیوار کے سہارے بیٹھا ہوا تھا کہ اسے نیند سی آنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد کسی چھوٹی سی ٹارچ کی روشنی غار کے گھپ اندھیرے میں مشعل بن کر پھیل سی گئی۔ کوئی غار میں گھسا تھا اور روشنی کا دائرہ بھٹکتا ہوا اس کے چہرے پر پڑا تو اس نے اپنی آنکھیں لمحے بھر کے لئے بند کرلیں۔ کیوں اس کی آنکھیں چندھا سی گئی تھیں۔ جب روشنی اس کے چہرے سے ہٹی تو اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ یہ امرتا رانی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے پاس ٹارچ کہاں سے آسکتی تھی۔ پھر اس نے دیکھا کہ ایک قدآور شخص اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ وہ ایک پرکشش اور باوقار شخصیت کا مالک لگ رہا تھا۔ جیسے اعلیٰ فوجی افسر ہو۔ وہ حیران تھا کہ یہ شخص اس غار میں کیوں، کس لئے اور کیسے آگیا......؟ کہیں یہ شخص کوئی مفرور مجرم نہ ہو جو پناہ لینے کی غرض سے یہاں گھس آیا ہو۔

''آپ کون ہیں......؟'' آکاش نے اس کی شخصیت سے مرعوب ہوکر پوچھا۔ ''اس غار میں کیسے آگئے؟''

''میں ایک پولیس افسر ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں مجرموں سے بچ کر پناہ لینے آیا ہوں۔ وہ دس عدد ہیں۔ لیکن آپ یہاں کیسے......؟ اس غار میں روپوش ہوکر کیا کررہے ہیں؟ کیا آپ نے قانون کے ہاتھوں سے بچنے کے لئے پناہ لی ہے؟''

''میں بڑا بدقسمت اور بدبخت شخص ہوں...... میری ایک لمبی اور دردناک کہانی ہے؟'' آکاش نے ایک سرد آہ بھری۔

''وہ شخص آکاش کے پاس آبیٹھا اور اس نے ٹارچ گل کردی۔'' روشنی دیکھ کر بدمعاش آسکتے ہیں...... صبح ہونے میں دو ایک گھنٹے باقی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کیوں نہ ایک دوسرے کو اپنی اپنی رام کہانی سنائیں۔ اس طرح نہ صرف وقت بھی کٹ جائے گا، دل کو سکون اور قرار مل جائے گا۔ کیا آپ پہلے اپنی بپتا سنانا پسند کریں گے؟''

اس اجنبی نے ٹارچ روشن کرکے اپنی جیب سے بسکٹ کا ایک پیکٹ نکالا اس میں کل بارہ عدد بسکٹ موجود تھے۔ یہ کریم بسکٹ تھے۔ اس میں سے چھ عدد اس نے آکاش کی طرف بڑھائے۔ اس میں سے خوشبو آرہی تھی۔

''میرے خیال میں آپ بھوکے ہوں گے۔ میرے پاس صرف اتنے ہی بسکٹ ہیں۔'' اس شخص نے کہا۔

''ہاں۔'' آکاش نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ''میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کرسکوں......'' وہ جذبات سے اس قدر مغلوب ہوا کہ اس کی آواز بھرا گئی۔ ''آپ میرے لئے اوتار بن کر آئے ہیں۔ میں سپنے اور خیال میں بھی سوچ نہیں سکتا تھا کہ آپ مجھ پر اتنی بڑی دیا کرنے آئیں گے...... میں زندگی کی آخری سانس تک آپ کے لئے پرارتھنا کرتا رہوں گا۔''

''انسان کا کسی انسان کے کام آئے اس کا فرض ہے۔'' وہ بولا۔ ''آپ اپنی دردناک کہانی تو سنائیں؟''

''میری کہانی صرف اتنی سی ہے کہ نامعلوم بردہ فروشوں نے میری پتنی کو اس لئے اغوا کرلیا کہ اس علاقے کا ایک ظالم شخص اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا اور ادھر بھٹکتا ادھر آنکلا۔ میں اس ڈر اور خوف سے اس غار میں روپوش ہوگیا کہ اس ظالم شخص کے آدمی مجھے قتل نہ کردیں۔ ایک عجیب سی بات اس شخص کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ عورت کی مرضی کے بغیر اس سے شادی نہیں کرتا ہے۔ وہ مجھے ختم کرکے اسے ودھوا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میں اپنی پتنی کو اس حویلی سے نکال لاؤں گا۔

جس میں اسے قید کیا ہوا ہے۔ اس کی ایک بہن جو اس علاقے میں رہتی ہے۔ میری ہر طرح کی مدد کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ اس کے مشورے پر میں یہاں روپوش ہوں۔"

آکاش نے اسے اصل کہانی نہیں سنائی۔ اس لئے کہ وہ یقین نہیں کرتا۔ یہ گھڑی ہوئی کہانی سنائی دی۔

"عورت بھی بڑی عجیب و غریب شے ہے۔ جتنی خطرناک ہے، حسین اور اتنی ہی بہادر بھی ہے۔ میں جو اپنی کہانی سنا رہا ہوں آپ نے شاید ہی ایسی کہانی سنی ہوگی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کے کہنے لگا۔ "عورت جتنی نرم و نازک ہے اتنی پتھر بھی ہے۔"

ہر شخص کی زندگی میں بڑے نشیب و فراز آتے ہیں...... اچھے برے دن بھی آتے رہتے ہیں جس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا ہے۔ اس کا تصور بھی ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن آج جو دن میری زندگی میں طلوع ہوا اور وہ کسی بہار کے جھونکے کی طرح تھا۔ میں نے بھولے سے بھی نہیں سوچا تھا کہ اتنی عزت اور پذیرائی اور شہرت مل سکتی ہے میں ایک مقام بھی پا سکتا ہوں۔

ملک کے دور دور کے گوشے سے اخباری نمائندے میرا انٹرویو لینے آرہے تھے۔ میڈیا میں، میں نے ہل چل مچادی تھی اور انہیں چونکا دیا تھا۔ سنسنی پھیلا دی تھی۔ اس کا پس منظر ایک ایسا کارنامہ تھا جو میں نے انجام دیا تھا جو گزشتہ برسوں سے پولیس کے لئے دردسر بنا ہوا تھا اور ان کی ناک کٹ گئی تھی۔ بڑا بدنام ہو گیا تھا۔ اس بات نے جو ناک میں دم کیا تھا اور پھر ان کے منہ پر کالک بھی مل دی تھی۔ اور پھر یہ ایک ایسی مصیبت تھی جو کسی بلا کی طرح ٹلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پولیس کی گردن کسی مجرم کی طرح ندامت سے جھکی ہوئی تھی۔ اب جو اس کارنامے سے تن گئی تھی۔ ذلت و رسوائی کی کالک چہرے اور اس محکمے سے دھو ڈالی تھی۔

دوسری طرف حکومت نے مجھے اس بہادری کے صلے میں لاکھوں کی رقم تحفے میں دان دینے والی تھی۔ اس لئے کہ میں نے جو قانون کی پاس داری کی...... پولیس کے محکمے کی جو لاج رکھی تھی اور اس کی ذلت کو عزت میں بدل دی تھی وہ کوئی آسان بات نہ تھی۔ یہ عزت، انعامی رقم کا اعلان، میڈیا میں میرے کارنامے کو بیان کیا جارہا تھا...... کیا میں واقعی اس سے خوش تھا۔

یوں تو میں دنیا والوں کو دکھانے کے لئے اس طرح اپنے آپ کو خوش ظاہر کر رہا تھا جیسے خوشی کے ساتوں در کھل گئے ہوں۔ آکاش کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ سچ پوچھئے تو میں اپنے وجود کے اندر گہرائی میں ایک عجیب سی کسک محسوس کر رہا تھا۔ میرے سینے میں خلش کا جو خنجر پیوست ہو گیا تھا میں اسے نکال نہ سکا۔ جب بھی میں آئینے میں اپنی صورت دیکھتا تو ایسا لگتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دوں گا۔ جب میں راتوں کو سونے کے لئے دراز ہوتا تو لگتا تھا کہ انگاروں پر لوٹ رہا ہوں جو دہک رہے ہوں۔ میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش اور جتن کرتا لیکن بے سود...... وہ چہرہ نہ میری آنکھوں سے دور ہوتا اور نہ مجھے سونے دیتا۔

پدمنی مری نہیں...... مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میرے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔ میں اپنی ساری توجہ اس عورت کے تصور سے ہٹانے کی کوشش کرتا، لیکن ہٹانے میں بھی کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ پھر بھی یکایک چشم تصور میں دیکھتا کہ جیسے میرے دائیں ہاتھ کی کہنی سے کچھ اوپر جلتا ہوا انگارہ رکھ دیا گیا ہو۔ میں کرب اور درد کی شدت سے چیخنا چاہتا تو ایسا لگتا کہ میرے سامنے وہ عورت ریوالور تانے کھڑی ہے اور میں چیخ نہ پاتا۔ جیسے میری آواز حلق میں پھنس گئی ہو۔ کوئی گولہ سا اٹک گیا ہو۔

"خبردار......! اپنی جگہ سے جو حرکت کی......؟ سانس جو نکالا...... ریوالور کی تمام گولیاں تمہارا جسم چھلنی کر دیں گی۔"

اس کی گرج دار آواز نے جیسے میرا گلا گھونٹ دیا...... میں تڑپتا رہا۔ پھر اس نے قہقہے مار کے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

"دیکھتے کیا ہو...... اس سادھو کے بچے کو...... کہیں بھی...... کسی گڑھے یا سمندر میں......"

اس واقعے کے تصور سے آج بھی میرے

رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ میں آج جب کبھی اپنی قمیص کے آستین چڑھا کے دیکھتا ہوں...... ایک سیاہ گھناؤنا سا داغ جو بہت غور سے دیکھنے پر ایک نام معلوم ہوتا تھا...... پدمنی...... ہاں پدمنی...... وہی عورت جس نے اپنے ہاتھوں سے لوہے کی لال انگارے جیسی سلاخ سے میرے بازو پر گودا تھا...... یہ نشان، یہ کام اب زندگی بھر میرے ساتھ رہے گا۔ میں سوچتا تھا کہ کل کے تمام اخباروں میں میری تصویریں چھپیں گی۔

لوگ میری بہادری کی کہانی پڑھیں گے۔ خوب داد دیں گے...... سراہیں گے کہ میں اکیلے کس طرح اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ڈاکوؤں کے ایک بڑے اور خطرناک گروہ کی سردار کو کیفر کردار تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ فرض کی ادائیگی کے لئے ان عزیز کی پروانہ کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ بہت سے پولیس والوں کو اپنی جان عزیز ہوتی ہے۔ انہیں مجرموں سے خوف آتا ہے کہ وہ ان کے لئے فرشتہ اجل بن سکتے ہیں۔

وقت جو کسی کا کبھی نہیں ہوتا ہے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ اس کی کہانی پر وقت کی دھول کی تہیں جمتی جائیں گی۔ پھر کوئی بھی سنسنی خیز اور چونکا دینے والی خبر جاننے کے لئے جس قدر جوش اور اشتیاق دکھاتے ہیں اسے اتنا ہی جلد بھول جاتے ہیں۔ کیوں کہ ایسے ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ وہ پرانی خبروں کو ماند کردیتے ہیں۔

لیکن آکاش دوست......! جب تک میرے بازو پر یہ نشان موجود ہے اور میری بائیں ٹانگ میں لنگ ہے میں وہ چہرہ کبھی بھول نہیں سکوں گا...... جس کے سر کی قیمت سرکار نے زندہ یا مردہ حالت میں پانچ لاکھ روپے رکھی تھی۔ یہ بہت بڑی رقم ہے۔ جس کے حصول کے لئے کوئی بھی اپنی سر دھڑ کی بازی لگا سکتا ہے۔ میں نے انعام کے لالچ میں نہیں بلکہ فرض کے جذبے سے یہ کارنامہ انجام دیا۔

یہ وہ عورت تھی دوست......! جس نے بڑے بڑے بہادر اور جیالے پولیس والوں کی ناک میں نکیل ڈال رکھی تھی۔ اس کا نام سن کے بڑے بڑے سورماؤں کے قدموں سے زمین نکل جاتی تھی۔ اس کی بڑی دھاک تھی اور اس نے ان کا چین وسکون اور نیندیں حرام کی ہوئی تھیں۔ رام گڑھ کے آس پاس کے علاقوں میں اس کی حکومت تھی۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ وہ علاقوں میں گھس سکے۔

رام گڑھ کی پولیس چوکی پر کوئی انسپکٹر دو مہینے سے زیادہ نہیں ٹکتا تھا۔ جس انسپکٹر نے بھی ہمت کر کے رام گڑھ کے مشرق کی جانب بڑھنے کی کوشش کی جہاں پہاڑیوں کا سلسلہ دراز تھا وہ پدمنی کے ریوالور کا شکار ہوا۔ وہ اس قدر سفاک، درندہ صفت اور شقی القلب تھی کہ اسے گولیوں سے چھلنی کردیتی اور اس کی لاش پولیس چوکی کے پاس ملتی تاکہ حکومت اور پولیس عبرت حاصل کرسکے۔

چوں کہ عوام میں خوف و دہشت اور ہیجان نہ پھیلے اس لئے حکومت نے مرنے والے افسران کی تعداد کبھی بھی صحیح نہیں بتائی۔ انہیں خفیہ ہی رکھا۔ پھر لوگوں کا اندازہ اور قیاس تھا کہ پدمنی سینکڑوں پولیس والوں کو رام گڑھ کی پہاڑیوں میں موت کی نیند سلا چکی ہے۔ ایسی باتیں بھلا کیسے اور کیوں کر چھپی رہ سکتی ہیں۔ پولیس کے اعلیٰ افسران کی پریشانی روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر کیسے اور کس طرح اس عورت اور اس کے گروہ پر قابو پایا جائے۔ کیا اسے لاقانونیت اور موت کے کھیل کے لئے کھلا چھوڑ دیا جائے۔

بالآخر کچھ ایسے پولیس انسپکٹروں کو رام گڑھ میں متعین کیا گیا جو اپنے ریکارڈ اور کارکردگی اور فرض شناسی کے مطابق بہت بہادر تھے مگر انہیں پدمنی کے آگے شکست کھانی پڑی۔ ان کی بہادری، تدبیریں اور ہر طرح کی منصوبہ بندی کسی کام نہ آسکی۔ وہ دھری رہ گئیں۔

ایک دن مجھے اچانک رام گڑھ پولیس چوکی کا چارج لینے کا حکم ملا۔ اس لئے کہ میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں جو کارکردگی دکھائی اور خطرناک مجرموں اور قاتلوں کی سرکوبی کی اور انہیں کیفر کردار تک پہنچا دیا تھا۔

پولیس کے ہیڈ کوارٹرز سے نہ صرف مجھے سند بلکہ ایک لاکھ کی اضافی رقم بھی مل چکی تھی۔ میری مہارت پر سبھی عش عش کرتے تھے۔ میں نے ایک طرح سے پانی صلاحیت کا لوہا منوایا ہوا تھا۔

لیکن اس کے باوجود رام گڑھ کا نام سنتے ہی سر سے پاؤں تک پسینہ آ گیا۔ بہت دیر تک میرے جسم پر لرزہ طاری رہا اور رگوں میں لہو خشک ہو گیا، جیسے میری نظروں کے سامنے فرشتہ اجل کھڑا میری بے بسی پر تمسخر کر رہا ہو اور استہزائیہ نظروں سے گھور رہا ہو۔ چوں کہ سرکاری نوکری کا معاملہ تھا اس لئے مرتا کیا نہ کرتا...... مجھ میں بھلا سرتابی کی جرات کہاں سے آتی......؟ فرض شناسی سے انکار کیسے کرتا؟

میں ایس پی اور آئی جی سے بھی ملا۔ انہیں مجھ پر بہت زیادہ اعتماد تھا۔ وہ میرے کارناموں کی وجہ سے مداح تھے۔ میری قابلیت پر انہیں بڑا ناز بھی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر میں پدمنی کا گروہ ختم نہ کر سکا تو امن ضرور قائم کروں گا۔ اعلیٰ افسران نے مجھے ہر ممکن مدد اور تعاون کا یقین دلایا۔

رام گڑھ جانے سے پہلے میں نے سوچا کہ چار دن کی چھٹی لے کر ایک عام آدمی کی طرح وہ علاقہ دیکھ آؤں۔ اس سے پہلے کبھی میں اس جانب نہیں گیا تھا۔ اور پھر وہاں انسپکٹر کی حیثیت سے جانے پر حالات دوسری نوعیت کے ہوں گے۔ اس سوچ بچار کے بعد میں نے چار دن کی چھٹی لی اور رام گڑھ کی جانب ایک عزم اور اعتماد کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اس طرح میں اس علاقے سے واقفیت معلوم کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ اجنبی نہ رہے۔

میں ایک سادھو کے بھیس میں رام گڑھ پہنچا تاکہ مجھے کوئی پہچان نہ سکے۔ رام گڑھ کے تھانے پر ویرانی چھائی ہوئی تھی اور ایک ہولناک سناٹا کسی آسیب کی طرح مسلط تھا۔ ماحول نہ صرف بڑا پراسرار اور دہشت ناک تھا بلکہ نحوست زدہ تھا۔ گشت پر مامور سپاہی بوجھل قدموں سے ادھر ادھر چکر کاٹ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اس سپاہی نے مجھے تیز لہجے میں وارننگ دی۔

''سادھو مہاراج......! جان کی خیر چاہتے ہو تو اسی وقت یہاں سے بھاگ جاؤ۔''

''وہ کس لئے......؟'' میں نے سوال کیا۔ ''میں ایک سادھو ہوں۔ چوری کی نیت سے تھوڑی آیا ہوں۔''

''اس لئے کہ پدمنی کے کسی آدمی نے دیکھ لیا تو وہ تمہیں جلا دینے میں پل بھر کی بھی تاخیر نہیں کریں گے۔ وہ بڑے ظالم اور سفاک ہیں۔''

میری بات سن کر اس نے خوف ظاہر کرتے ہوئے حیرت سے کہا تھا۔

''کیوں جلا دیں گے حوالدار جی......؟ ہم ٹھہرے سادھو سنیاسی......! نہ کسی کے لینے میں اور نہ ہی کسی کے دینے میں...... نہ ہی اس کے دشمنوں میں...... اور نہ ہی اہلکاروں میں...... ان سنسار میں سادھو سنیاسی سب سے بے ضرر ہوتے ہیں۔''

سپاہی خوف زدہ آوازیں دھیرے سے میرے کان کے پاس منہ لا کے بڑبڑایا۔

''سادھو ہو یا سنیاسی......! اگر اس نے دیکھ لیا تو پاؤں کے انگوٹھے سے ماتھے پر بنا ہوا چندن کا کلک پونچھ دے گی...... پدمنی کے ڈر اور خوف سے یہاں میلوں تک کوئی سادھو سنیاسی دکھائی نہیں دیتے...... اگر جان پیاری ہے تو الٹے قدموں لوٹ جاؤ...... ورنہ ایسی مٹی خراب ہوگی کہ سارا کرم دھرم دھرا رہ جائے گا۔''

میں آگے بڑھا۔ مجھے اتنا معلوم تھا کہ مشرق کی طرف پہاڑیوں میں کہیں پدمنی کا گروہ کہیں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ اگر پدمنی نے ڈیرا جمایا ہوا ہے تو اس کے اڈے کا کچھ سراغ مل سکے گا۔ میں کسی صورت میں ہمت ہارنا نہیں چاہتا تھا۔

ادھر کے آنے جانے والے لوگوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ ادھر نہ جائے۔ تم موت کے منہ میں جا رہے ہو......؟ میں نہ رکا تو لوگ سمجھے کہ کوئی پاگل سادھو ہے۔ جو جان بوجھ کے موت کے منہ میں جانا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

میں پہاڑیوں کے پاس ایک جنگلی پہاڑی کے

پیچھے دھرنا مار کر بیٹھ گیا۔

میں نے یہ سوچ کر فیصلہ کیا تھا کہ اگر مجھے پدمنی کے آدمی پکڑ کے لے گئے تو میں ان کا اڈا دیکھ سکوں گا۔

دیکھتے ہی دیکھتے شام جھک آئی اور پھر اندھیرے کی گہری چادر نے پہاڑوں کے ننگے پن کو چھپالیا۔

رات کی گہری خاموشی کے آغوش میں مجھے محسوس ہوا کہ میں لاکھ ہمت کا آدمی سہی اور جسم میں کافی طاقت اور بھرپور توانائی سہی...... میں بیک وقت چار بدمعاشوں سے مقابلہ کرسکتا ہوں۔ جیسا کہ ماضی میں چھ سات خطرناک مجرموں سے جو مسلح تھے ان سے نہتہ مقابلہ کر چکا تھا...... لیکن پھر بھی جیسے جیسے اندھیرا بڑھتا جاتا تھا میرے دل کے کسی کونے میں خوف کسی سانپ کی طرح کنڈلی مار کے بیٹھ جاتا تھا۔

میں نے ایک اچٹتی نظر چاروں طرف ڈالی تو میرے سارے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔

دور دور تک آدم نہ آدم زاد...... ٹن...... ٹن...... ٹن...... دور تھانے کے گھنٹے کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ آٹھ بج چکے تھے۔

ایک لمحے کے لئے میرے جی میں آیا کہ کیوں نہ میں بھاگ جاؤں...... لیکن دوسرے لمحے ہمت بندھی کہ...... نہیں...... ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا......؟ اچانک آس پاس کی گھنی جھاڑیاں موت کی گہری نیند سے جاگ اٹھیں۔

بہت سے قدموں کی آواز اور دھمک بڑی تیزی سے میری طرف بڑھتی آرہی تھی۔ میں نے خود کو اچھی طرح سے ایک جھاڑی کے عقب میں چھپالیا۔ وہ تقریباً بیس آدمیوں کا گروہ تھا۔ آگے والا آدمی اپنے آدمیوں سے پوچھ رہا تھا۔

”گھوڑے تیار ہیں نا......؟“

جواب دیا گیا...... ”ہاں...... دو فرلانگ باغ میں سب تیار کھڑے ہیں۔“

میں دم سادھے سب کچھ دیکھتا...... سنتا رہا...... جانتا تھا کہ اگر میں نے زور زور سے سانس لی تو مجھے کچا چبا جائے گا۔

مگر وہ کس سمت سے آیا تھا یہ میری سمجھ میں آگیا تھا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود میں نے اندازہ کرلیا تھا۔ ان کے قدموں کی آواز کافی دور ہوگئی۔ میں نے چند لمحوں کے بعد تب اس راستے پر بڑھا۔

ابھی میں دو ایک فرلانگ ہی چلا تھا کہ محسوس ہوا کہ آگے راستہ خاصا تنگ ہے۔ دائیں طرف گہری کھائیاں تھیں...... ذرا بھی قدم ڈگمگائے دھڑام سے نیچے جاتا...... بائیں طرف کی اگی ہوئی جنگلی گھاس پکڑ کے میں سیدھے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ ہاتھ پاؤں بری طرح لہولہان ہورہے تھے۔ میں نہ جانے کب تک آگے بڑھتا رہا، چاروں طرف گہری خاموشی طاری تھی...... جھینگروں کی چھن چھن کی آواز کے درمیان ایک دو بار مجھے ایسا لگا کہ اب میں گرا اب گرا، لیکن میں گرا نہیں...... میں جسم میں کافی طاقت محسوس کررہا تھا۔ اس لئے دو چار راتیں کچھ کھائے بغیر بھی یوں ہی چل سکتا تھا۔ مگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا شروع ہی میں عدم آباد چلا جاتا۔

ایک جگہ رک کر میں نے گہرا سانس لیا اور چاروں طرف دیکھا...... پہاڑیوں اور جنگلی درختوں کے سوا کہیں کچھ دکھائی نہیں دیا۔

سائیں سائیں اور جھن جھن کی آواز کے بیچ مجھے ایسا لگا کہ میں راستہ بھول گیا ہوں۔

مجھے نیچے والے راستے کی جانب جانا چاہیے تھا۔ اب واپس لوٹنے کے تصور سے ہی میرے پاؤں لرز گئے تھے لیکن آگے بڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ لہٰذا ہر صورت پیچھے ہٹنا تھا...... مجھے نیچے دائیں طرف پہلے کی نسبت راستہ کچھ صاف نظر آیا تو میں نے چین کا سانس لیا۔

آگے بائیں طرف پھر ایک راستہ مڑتا تھا اس بار میں سوچے بغیر مڑ گیا۔ جب بھٹکنا ہی ہے تو ہر موڑ پر کیوں نہ مڑ جاؤں۔

ایک میل سے زیادہ چلنے کے بعد کچھ دور مجھے روشنی دکھائی تو میری جان میں جان آئی کہ میری محنت اور جستجو اکارت نہیں گئی۔ میرا حوصلہ بڑھا کہ میری منزل سامنے ہے اور اب وہ دو گام پر موجود ہے۔ پھر بھی نے روشنی کی سمت قدم بڑھایا۔ دو قدم طے کئے تھے کہ ہی کہ کنپٹی پے پاس سے زن سے ایک گولی سنسناتی نکل گئی۔ جب تک میں کچھ سمجھ پاتا کہ گولی کس سمت سے آئی ہے۔ ایک ساتھ کئی آدمی مجھ پر ٹوٹ پڑے اور دبوچ لیا اور قابو میں کر کے بے بس کر دیا جس سے میں بظاہر کافی ٹپٹایا، ان کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑے، میں نے کوئی مزاحمت اس لئے نہیں کی تھی کہ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ لوگ مجھے اٹھا کے لے جائیں تاکہ میں ان کے سرغنہ کو دیکھ سکوں جو کسی رانی کی طرح اپنی ریاست قائم کئے ہوئے ہے۔

جب میری آنکھوں سے پٹی کھولی گئی تو سامنے ہی ایک بہت خوب صورت بڑی تمکنت، شان سے اور باوقار انداز سے کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے ایک لمحے میں ناقدانہ نظروں سے اس کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لے لیا۔ اس میں بڑا دبدبہ بھی تھا۔

میں نے سوچا کہ یہ عورت کتنی خوب صورت ہے۔ وہ اتنی خوب صورت ہوگی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا..... جانے کیوں یقین نہیں آیا اور یقین آنے والی بات بھی تھی کہ کیا اتنی حسین و جمیل..... پرشباب گداز بدن..... اور اس قدر بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھوں والی عورت اتنی سنگ دل بھی ہو سکتی ہے..... وہ جتنی نازک اندام لگ رہی ہے اس کے سینے میں بھی ایسا ہی نرم و نازک دل ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ اس کے برعکس تھا۔ وہ اس کی ضد تھی وہ ایک پتھر عورت تھی۔ اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس کے متاثر کن سراپا پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے نشیب و فراز ہیجان خیز تھے۔ بجلی بھرا بدن تھا کہ شعلہ بنا ہوا تھا۔ پھر میں گڑگڑایا۔

''یہ لوگ مجھے یہاں کیوں اور کس لئے لائے ہیں۔ میں سادھو سنت آدمی ہوں۔''

وہ گرج اٹھی۔ بجلی کی طرح کڑکی..... اس کے چہرے پر درندگی اور حقارت ابھر آئی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا اور بولی۔

''بکواس بند کرو..... کمینے آدمی.....'' پھر اس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ ''خشونت سنگھ.....! نیچا کرو اس کا سر..... دیکھو کس طرح اکڑ کے اور رعونت سے اس طرح بات کر رہا ہے۔ جیسے یہ علاقہ اس کے باپ کا ہو۔''

نفرت اور غصے سے اس کا چہرہ جتنا سرخ ہوا وہ اتنا ہی حسین نظر آیا۔ میں اس ایک پل میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ عورت اگر فلم نگری میں جاتی تو تہلکہ مچا دیتی..... اس کا حسن و شباب اور گداز بدن کی قیامتیں تماشائیوں کے دلوں پر بجلیاں گراتیں۔ وہ دلوں پر راج کرتی، ہندوستان اور بنگال میں اس کا طوطی بولتا..... یا پھر وہ کسی شخص کی جیون ساتھی بنتی تو وہ دنیا کا سب سے بہت خوش قسمت ترین شخص ہوتا اور اس کے نصیب جاگ جاتے..... لیکن نجانے کیوں وہ ایک ڈاکو عورت بن گئی.....؟ آج تک، اب تک کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے ڈاکو بننے کا پس منظر کیا ہے.....؟ اس کی زندگی اب تک ایک راز اور معمہ بنی ہوئی تھی۔

میں ان سوچوں میں غلطاں تھا کہ خشونت سنگھ نے مجھے کسی پہلوان کی طرح اٹھا کے زمین پر پٹخ دیا، جیسے میں کوئی پلاسٹک کا کھلونا ہوں..... پھر اس نے میری تلاشی لی۔ جب میں نے اس کے بعد اٹھنے کی کوشش کی تو پدمنی نے آگے بڑھ کر میرے سینے پر ایک لات رسید کی..... پھر جھپٹ کے اس نے اپنے دائیں پاؤں سے میرے ماتھے کا تلک مٹاتے ہوئے کہا۔

''خشونت سنگھ.....! اس کا ہاتھ داغ دو.....''

ایک موٹی سی لوہے کی گرم سلاخ میرے ہاتھ کے پاس لائی گئی۔

اس دہکتی ہوئی سرخ سلاخ کو دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ میں ایک انتہائی قوت برداشت کا مالک تھا لیکن پولیس کی ملازمت کے دوران میں نے کبھی ایسا

تشدد کسی مجرم کے ساتھ نہیں کیا تھا اور نہ ایذا دی تھی۔ کسی بھی ڈھیٹ اور خطرناک مجرم سے اعتراف جرم کروانے کے لئے اس کا جسم نہیں داغا تھا۔ کچھ تھانوں میں عقوبت خانے ہوتے تھے جہاں مجرموں اور بے گناہوں کے ساتھ ایذا اور بربریت کی جاتی تھی۔ میں اس کے خلاف تھا۔ اس لئے کہ انہیں انسان سمجھتا تھا۔ ایسا سلوک تو جانوروں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا تھا۔

جیسے جیسے انگارے کی طرح گرم او جلتی سلاک میرے قریب آ رہی تھی مجھے لگا کہ میں خوف و دہشت سے سب کچھ اگل دوں گا۔

میں سادھ والی نقاب زیادہ دیر قائم نہیں رکھ سکوں گا...... ایسی ایذا دی جانے والی تھی کہ میری آتما تھر تھر کانپ رہی تھی۔ گو کہ میرے جسم پر چاقو کے کئی مہلک وار ہو چکے تھے اور ریوالور کی گولیاں بازو میں پیوست ہوئی تھیں۔ میں وہ زخم اور درد سہہ چکا تھا لیکن جانتا تھا کہ آگ اور اس میں بڑا فرق ہے...... میری جگہ کوئی اور ہوتا وہ دہشت و خوف سے کب کا مر چکا ہوتا۔

پدمنی نے مجھ پر ریوالور تانا اور گرج دار آواز میں خشونت سنگھ سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''یہ ضرور پولیس کا آدمی ہے...... اسے جلدی داغ دو...... تاکہ جب تک جیے پدمنی کو یاد رکھے۔''

''بھگوان کے بھگت ہیں ہم بچہ......! جھوٹ کیا ہے سچ کیا ہے ہم کیا جانیں......؟ سادھو ہیں...... اپنے آپ کو پولیس والے کیسے کہیں......؟'' میں نے آنکھیں بند کر کے کہا۔ ''میری بات پر بسواس کرو۔''

''چر چر......'' کہنی کے اوپر کی کھال جلنے کی آواز آئی۔ میں ناقابل برداشت اور جلن سے تڑپ گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ''خبردار...... جو سانس نکالا...... پھینک آؤ...... اس سادھو کے بچے کو......'' پدمنی نے غرا کے دوسرا حکم دیا۔

اسی اثنا میں کسی طرف سے دس بارہ آدمی آ گئے، پدمنی نے میری طرف سے دھیان ہٹا کے ان لوگوں سے پوچھا۔

''بہادر سوامی......! سب تو ٹھیک ہے نا......؟ کوئی پریشانی تو نہیں......؟''

بہادر سوامی کی آواز رندھی ہوئی تھی اور اس نے گہرا سانس لیا اور رک رک کے جواب دیا۔

''رانی جی......! بڑی بری خبر ہے...... پونگی پولیس کے ہاتھ......!''

پدمنی گھائل سے گن کی طرح اور غضب ناک ہو کے دانت پیسنے لگی۔

''بدذات کہاں گئے ہوں گے......؟ اسے کیا شہر لے گئے یا ابھی تھانے......؟''

مجھے دو آدمیوں کے سپرد کر کے پدمنی اور باقی سب لوگ بگولوں کی طرح باہر نکل گئے۔ دو آدمیوں کو قابو کرنے کی مجھ میں طاقت تھی۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ میں ماضی میں چار چار آدمیوں کو قابو کر چکا تھا۔ انہیں بے بس کرنا میرے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پدمنی نے میری مشکل آسان کر دی تھی اور مجھے اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھانا تھا۔ جتنا جلد ممکن ہو سکے۔

کچھ دیر بعد میں نے چاروں طرف کا بغور جائزہ لیا کہ کہیں اور آدمی چھپے ہوئے تو نہیں ہیں......؟ میں ہر طرح سے اپنی تسلی اور اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ عجلت سے معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ صبر اور تحمل کی ضرورت تھی۔

ان دونوں آدمیوں نے جو میرے پہرے پر مامور تھے۔ لمبی جماہی لیتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

''بابا......! کچھ بھجن جانتے ہو تو سناؤ...... اس طرح بیٹھے رہنے سے جی اکتانے لگتا ہے اور نیند بھی آنے لگتی ہے۔ جب کہ سونا سخت منع ہے۔'' میں اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما کے جواب دیا۔

''بھجن گانا تو اپنا کام ہی ہے بچہ......! بھجن

گاتے ہوئے جیون بیت گیا۔۔۔۔۔ لیکن دوسرے کی نیند خراب کرنے سے کیا فائدہ۔۔۔۔۔ نیند سے پیاری چیز سنسار میں کوئی نہیں ہے۔۔۔۔۔ یہ ایک طرح کی دولت ہے جو جانے کتنے سارے لوگوں کو نصیب نہیں ہے۔ لوگ اسے لانے کے لئے جانے کیا کیا جتن کرتے اور دوائیاں تک کھاتے ہیں۔۔۔۔۔''

''ہاں۔۔۔۔۔ تم ٹھیک کہتے ہو سادھو مہاراج۔۔۔۔۔!'' ان میں سے دوسرا بولا۔ ''دوسرا یہاں کون ہے۔ ہم لوگوں کے سوا۔۔۔۔۔ بس اب تم شروع کردو۔۔۔۔۔ رانی جی۔۔۔۔۔ دو تین گھنٹے سے پہلے آنے کی نہیں۔۔۔۔۔ تم ان کی چنتا نہ کرو۔''

میرے دماغ میں برق رفتاری سے یہ بات آئی کہ پدمنی کے آنے پر یہ لوگ میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر باہر مجھے وہاں پہنچادیں گے جس جگہ میں موجود تھا۔ میں یہاں زندگی بھر نہیں پہنچ سکتا۔

وہاں سے اڈے تک پہنچنا آسان کام نہیں تھا۔۔۔۔۔ کیوں کہ انتہائی چکردار اور پیچیدہ راستے تھے۔ کسی خاص وقت کا انتظار کرنا میں نے کبھی نہیں سیکھا۔ میں جانتا تھا کہ خطرناک کام خود کو خطرے میں ڈالے بغیر پورا ہو ہی نہیں سکتا۔ میرا جسم درد اور تھکن سے چور چور تھا۔ جوڑ جوڑ بری طرح درد کر رہا تھا۔ ان ڈاکوؤں نے میری ٹھیک ٹھاک کاطر مدارت کردی تھی۔ زندگی میں پہلی بار میری ایسی خاطر ہوئی تھی۔

پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ میں ان دونوں پر آسانی سے قابو پالوں گا۔ میرے لئے ناممکن نہیں ہوگا۔ چند لمحے قبل بھی میں نے یہی سوچا تھا۔

میرے ذہن نے اس لمحے برق رفتاری سے ایک بے عیب منصوبہ تیار کرلیا تھا۔

میرے سامنے ایک تدبیر تو یہ تھی کہ ایک ڈاکو کو نرک پہنچادوں اور دوسرے کو گائیڈ بنا کر راستہ معلوم کیا جائے۔۔۔۔۔ زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ اس کے فرشتے بھی میری رہنمائی کرنے پر تیار اور مجبور ہوجائیں گے۔ اس منصوبے پر عمل کرنا چنداں مشکل نہ تھا۔

میں نے اپنے منصوبے کا جائزہ لینے کے بعد ان دونوں ڈاکوؤں کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا۔

ان میں ایک بہت زیادہ تگڑا تھا۔ کسی گینڈے کی طرح۔۔۔۔۔ میں نے اس تگڑے سے کہا۔

''میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ صبح سے بھوکا پیاسا ہوں۔۔۔۔۔ اگر تھوڑا پانی مل جائے تو حلق تر کرلوں۔۔۔۔۔ پانی میرے لئے کسی امرت بانی سے کم نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ میں پھر پانی کے بھجن شروع کردوں گا۔

مجھے امید نہیں تھی کہ ایک گھونٹ پانی بھی پینے کو مل جائے گا۔۔۔۔۔ کیوں کہ میرے سامنے ہی پدمنی یہ حکم صادر کرگئی تھی کہ اس قیدی کو ایک قطرہ بھی پانی کا پینے کے لئے نہ دیا جائے۔ اسے بھوکا پیاسا مارنا ہے۔۔۔۔۔ اس لئے کہ یہ ایک موذی سانپ ہے۔''

اس حکم کے برعکس ہی وہ فوراً ہی پانی لینے چلا گیا۔ میرے لئے راستہ صاف ہوگیا تھا اور ایک سنہرا موقع ہاتھ آگیا تھا۔ میں نے اس سے فائدہ اٹھانے سے پل بھر کی تاخیر نہیں کی۔

اس کے لوٹنے تک میں نے دوسرے ڈاکو پر آسانی سے قابو پالیا اور اسے نرک میں پہنچادیا۔ میں اس کا ٹینٹوا دبا چکا تھا اور اس کی لاش دیوار سے لگادی تھی۔ اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ کیوں کہ یہ میرے جانی دشمنوں میں سے تھا۔

جیسے ہی اس کا ساتھ پانی لے کر اندر آیا تو میں نے تڑختے لہجے میں کہا۔

''خبردار۔۔۔۔۔ جو تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا۔۔۔۔۔ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھوگے۔''

وہ ڈاکو بھونچکا ہو کے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر وہ کوندا بن کر اپنی بندوق کی طرف لپکا۔ میں نے اسے بندوق پر جھپٹنے نہیں دیا۔ کیوں کہ میں نے مقتول کی بندوق اٹھا رکھی تھی۔ جب میں نے بندوق کی نال اس کے سینے میں گاڑ دی تو وہ بہت کسمسایا۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ جیسے کوئی اور چیز مزاحمت کے لئے تلاش کر رہا ہو۔ لیکن میں نے اسے بہت مہلت اور موقع

نہیں دیا۔ باہر لے آیا۔
میں اسے بندوق کی زد پر لے کر رام گڑھ کی چوکی پر پہنچا۔ انسپکٹر مہاراج سنگھ کو مختصراً تمام بات بتا کے اس سے اس کی موٹر سائیکل لی اور ڈاکو کو اس کے حوالے کیا۔ پھر اس ڈاکو کے چار ہاتھ ایسے لگائے کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہوگا۔ کیوں کہ اس نے مجھے قابو میں کر کے میری خوب درگت بنائی تھی۔ میں نے اس کی حالت ناگفتہ بہ کر دی اور پھر میں نے کہا۔
''میرے دل کے ارمان نہیں نکلے...... وہ ادھار رہے۔ واپسی پر تمہاری خوب خاطر مدارت کروں گا۔''
شہر تقریباً چالیس میل دور تھا...... مگر سڑک بالکل سنسان، ویان اور خالی پڑی تھی۔ اس لئے میں جلدی شہر پہنچ گئی۔ اس سڑک پر صبح کا اجالا پھیلنے تک مال بردار ٹرک اور بیل گاڑیاں رسد اور آڑتیوں کا اناج لے کر گزرتی تھیں جس سے آمدورفت دشوار ہو جاتی تھی۔
مجھے خیال آیا کہ اس سے اچھا اور سنہرا موقع زندگی میں کبھی ہاتھ نہیں لگے گا۔ اگر پدمنی اپنے اڈے پر پہنچ گیا تو سب کچھ دھرا رہ جائے گا۔ کف افسوس ملنا تو دور کی بات ہوگی۔ جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ اس کے نزدیک میں کسی موذی سانپ سے کم نہیں ہوں۔ وہ سانپ کی طرح میرا سر کچل کر رکھ دے گی۔
میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد منصوبہ بنایا کہ پدمنی جیسے ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ رام گڑھ پولیس چوکی سے اپنے ساتھی پونگی کو چھڑا کے لے جائے گی پچاس آدمی اس جگہ سے اس پر ٹوٹ پڑیں گے جہاں سے راستہ اندر کی طرف مڑتا تھا۔ وہاں پدمنی آسانی سے قابو میں آ سکتی تھی۔
شہر پہنچتے ہی میں نے اپنا منصوبہ بنایا اور دستی گولوں اور مشین گنوں سے مسلح نوجوانوں کو ساتھ لے کر رام گڑھ لوٹ آیا۔
پھر میں نے بغیر کسی تاخیر کے منصوبے کے مطابق سب کو راستوں پر تعینات کر دیا تھا کہ کہیں سے ڈاکوؤں کا گروہ نکل نہ جائے۔ میں سانس روکے انتظار کر رہا تھا کہ کب پدمنی اور اس کے ساتھیوں کی آہٹ ہو اور وہ گولیاں برسائیں۔ انسپکٹر نے سرگوشی میں کہا۔
''شاید وہ لوگ خطرے کی بو پا کر واپس اپنے اڈے پر پہنچ گئے ہوں۔''
میں ایک لمحے کے لئے الجھن میں پڑ گیا...... اگر ایسا ہوا تو پدمنی کو گرفتار کرنا آسان نہ ہوگا۔ ایک بار تو میرا جی چاہا کہ اس کے اڈے تک جا کر دیکھوں کہ کہیں وہ پونگی کو چھڑا کے واپس تو نہیں پہنچ گئی......؟
اس وقت قریب سے ایک آواز آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے دھیمے سے سرگوشی میں کہا۔ ''ہوشیار......''
پونگی کو چھڑانے کے لئے چلتے وقت پدمنی نے شگون لیا تھا۔
اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے ایک چونی کافی اوپر اچھالی تھی اور دائیں ہاتھ سے چونی کا نشانہ لیا تھا۔
تب دلاور نے کہا تھا...... ''رانی جی......! شگون اچھا ہے...... ہم پونگی کو بخیریت چھڑا لائیں گے۔''
پدمنی نے فاتحانہ انداز اور تمکنت سے ریوالور کو چومتے ہوئے کہا تھا۔
''پدمنی کا شگون آج تک کبھی خراب نہیں ہوا۔ آج بھی نہیں ہوگا'' اس نے سینہ تان لیا تھا۔
اس وقت میرا دل چاہا تھا کہ بڑھ کے پدمنی کے خوب صورت، مرمریں، سڈول اور گداز ہاتھوں کو چوم لوں...... اس کا نشانہ بھی کم اچھا نہیں تھا۔
پھر بھی ایک ہاتھ سے سکہ فضا میں اچھل کے دوسرے ہاتھ سے نشانہ لینا دشوار ہی نہیں ناممکن تھا۔
شاید وہ لوگ ہم سے صرف دس قدم کی دوری پر تھے...... آگے پدمنی...... پھر دلاور......!
اس نے فائر کیا...... فوراً ہی دھائیں کی آواز کے ساتھ ایک گولی میری بائیں ران میں لگی۔
پدمنی فوراً ہذیانی انداز میں چیخی...... ایسا لگا جیسے بجلی کڑکی ہو۔
''کرمو......! نادر...... دیکھتے کیا ہو...... مشین گن چلاؤ...... بھون دو ان کتوں کو...... ایک بھی زندہ نہ

بچے۔“

مشین گن کا نام سنتے ہی میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ ان کے پاس بھی مشین گنیں ہیں اور وہ ساتھ لے کر آئے ہیں..... دلاور کے فائرنگ کرنے سے پہلے ہی تینوں طرف پولیس کی مشین گنوں نے آگ برسانی شروع کردی..... دشمن کو مہلت نہیں دینی تھی..... کہاں ایک اور کہاں تین..... یہ محاذ جنگ بن گیا تھا جیسے۔

دو تین آدمیوں کو چھوڑ کے پدمنی کے سبھی آدمی ڈھیر ہوگئے۔

میری نظر پدمنی پر تھی..... وہ میرے ریوالور کے زد پر تھی۔ پھر بھی میرا خیال تھا کہ وہ بھاگ نہیں سکتی.....؟

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ چشم زدن میں وہ ندی میں کود گئی۔ سردی کی رات تھی اس قدر شدت تھی سردی کی کہ ہڈیاں گلی..... اس پر ندی میں کودنا.....؟ لیکن میں نے پروا نہیں کی اور نہ ہی سردی کی شدت کی پروا کی۔ میں نے بھی چھلانگ لگادی۔ میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اگر زندگی اتنی ہی ہے تو ایسا ہی سہی..... پولیس افسر نہ تو مجرم سے ڈرتا ہے اور نہ موت سے..... میں کوئی پہلی مرتبہ موت کے منہ میں گھس تو نہیں رہا تھا۔ جانے کتنی مرتبہ موت کے منہ میں جاکر موت کو شکست دے چکا تھا۔ وہ کسی مچھلی کی طرح تیز تیر رہی تھی۔ اس پر نہ تو سردی کا اثر غالب آیا تھا اور نہ ہی سرد پانی سے اس کے تیز تیرنے کی رفتار میں کوئی فرق آیا تھا۔ اس طرح تیر رہی تھی جیسے موسم گرما میں دریا یا سمندر میں تیرا جاتا ہے۔ بڑی بے جگری تھی جو مجھے حیران کئے دے رہی تھی۔

میری زخمی ٹانگ میرا پوری طرح ساتھ نہیں دے رہی تھی لیکن میں پھر بھی تیرتا اور اس کے تعاقب میں تھا۔ میں نے سوچا کہ کہیں تو اس کا سانس پھولے گا..... کوئی آدھے گھنٹے کے بعد میں نے اسے جالیا۔ اس کی ٹانگ میرے ہاتھ میں آگئی۔ پدمنی نے لپک کے میری کلائی پر چھرے سے وار کیا تو میں نے اس کی کلائی پکڑ کے اس کے ہاتھ سے چھرا چھین لیا۔

”پدمنی.....! اب تمہاری ہر کوشش، جدوجہد، بیکار اور لاحاصل ہے..... قانون کے ہاتھ اتنے کمزور نہیں ہیں کہ تم انہیں کاٹ سکو..... تو عورت ہے تو عورت ہی رہ..... سیدھی طرح قابو میں نہیں آئے گی..... میں تجھے بتاتا ہوں کہ میں شمشیر راج ہوں..... میں پھر کہتا ہوں کہ تو سیدھی طرح قابو میں نہیں آئے گی تو..... کھال کھنچوا کے بھس بھردوں گا..... تو نے میرے کارنامے ضرور سنے ہوں گے.....؟“

پدمنی تڑپ کے بولی۔ ”شمشیر راج..... ! ٹھاکر ہونا..... تھو ہے تمہارے ٹھاکر ہونے پر..... مرد تھے تو سامنے آتے..... چھٹی کا دودھ یاد نہ دلایا ہوتا تو پدمنی میرا نام نہ تھا..... اب بھی ہمت ہے تو ایک بندوق تم لو..... اور ایک میں لیتی ہوں..... پدمنی تمہارا ہر وار بچا سکتی ہے..... لیکن تم میرے ایک ہی وار میں ٹھنڈے ہوجاؤ گے اور تمہارا قانون پدمنی کا بال تک بیکا نہیں کرسکتا.....؟ کیا تمہیں میرا یہ کھلا چیلنج منظور ہے.....؟ تم میں دم خم نہیں ہے۔“

میں چپ رہا۔ اس لئے کہ یہ وقت سوال و جواب کا نہیں تھا۔ چوں کہ وہ میرے قابو میں تھی۔ میں نے کسی نہ کسی طرح پدمنی کو ندی کے دوسرے کنارے پر نکالا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے کرنا کیا ہے۔ پدمنی اب میرے ہاتھ سے کسی قیمت پر بچ نہیں سکتی تھی۔

پانی سے باہر آتے ہی یخ بستہ ہواؤں سے ہمارے جسم اینٹھنے لگے۔ میری آتش رانی میں بے حد درد تھا۔ شاید کوئی اور وقت ہوتا تو یہ درد ناقابل ہوجاتا اور شاید میں ایک دلخراش چیخ مار کے بے ہوش ہوجاتا اور شاید زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا۔ چوں کہ اس وقت صورت حال کچھ ایسی تھی کہ جس نے درد کا احساس کم کردیا تھا۔

پھر میں نے سوچا کہ اسے سمجھانا بہتر ہے۔ میں نے اسے سمجھایا۔

''دیکھ پدمنی...... ! جو ہونا تھا وہ ہوگیا...... میں مانتا ہوں کہ تو بہت بہادر ہے...... تیری بہادری کا نشان میری ران پر موجود ہے...... لیکن تو گھڑی بھر کے لئے عورت بن کے سوچ...... کیا یہ سب کام عورتوں کے ہیں...... ؟ کیا ایک عورت کو زیب دیتا ہے...... ؟ سماج سے لڑ کے کون کب تک بچ سکتا ہے...... ؟ اس وقت تو نہ ڈاکوؤں کی سردار ہے اور نہ میں پولیس انسپکٹر...... ؟ ہم دونوں محض معمولی انسان ہیں...... جنہیں اس وقت ایک دوسرے کی مدد کی اشد ضرورت ہے...... تیری زندگی یا میری موت لوگوں کے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی...... ہمارا ناتا ہی کیا ہے...... ؟ ہوسکتا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوں...... لیکن انسانیت کے ناتے ایک عورت کو میں اتنی ٹھنڈ میں بھیگا نہیں دیکھ سکتا...... انسپکٹر ہوں تو کیا...... پہلے انسان ہوں...... تو بھی پہلے انسان ہے...... ایک عورت بعد میں کچھ اور۔

پھر میں نے پدمنی کے دونوں برف جیسے ٹھنڈے ہاتھ پکڑ کے پوچھا۔

''یہاں قریب ہی کوئی ایسی جگہ ہوگی کہ سردی سے بچا جاسکے...... ؟''

میں نے دیکھا کہ پدمنی میں اب پہلی جیسی تیزی نہیں رہی تھی۔ وہ مجھے سہارا دے کر پاس ہی ایک کھنڈر نما مندر میں لے گئی۔ کافی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے...... اس گہری خاموشی کے دوران میں نے محسوس کیا سردی زیادہ لگ رہی ہے۔ ایک تو گیلے کپڑے اور یخ بستہ ہوا...... پدمنی تھر تھر اس طرح کانپ رہی تھی جیسے ملیریا کا جاڑا لگ رہا ہو۔ نمونیہ ہوجانے کا خطرہ تھا اور ہم دونوں سردی کی تاب نہ لاکر مر بھی سکتے تھے۔

اب اس وقت سب سے بڑا سنگین اور پہلا مسئلہ یہ تھا کہ سردی سے کس طرح اور کیوں کر اور کیسے بچا جائے؟ معلوم نہیں کتنی دیر تک یہاں اس حالت میں رہنا ہوگا۔ تھوڑی دیر کی بات ہوتی برداشت کرلی جاتی۔ اب اس سرد موسم اور ٹھنڈے پانی میں تیر کے جانا بس کی بات نہیں تھی۔ پانچ سات منٹ بھی تیرا نہیں جاسکتا تھا اور پھر آس پاس کوئی بستی یا ایسی جگہ نظر نہیں آتی تھی جو قریب ہو اور پناہ لی جائے۔

میں نہ تو خود سردی سے ٹھٹھر کے مرنا چاہتا تھا اور نہ ہی پدمنی کو کسی قیمت پر مرنے دینا چاہتا تھا۔ اس لئے بھی کہ وہ قانون کی مجرم تھی۔ اب معاملہ قانون اور فرض شناسی کا نہیں تھا بلکہ انسانیات کا تھا۔ نہ صرف انسانیت بلکہ قانون کا بھی تقاضا تھا کہ اس کی جان کی حفاظت کروں۔ کیوں کہ اب وہ ایک طرح سے میری حراست میں تھی۔ اگر اسے کچھ ہوجاتا تو یہ میری نااہلی اور غیر ذمے داری تھی۔

میری جیب میں جو ماچس تھی وہ بھیگ چکی تھی۔ اب آگ جلانا تھی تاکہ ہم تاپ سکیں...... یہ ہی ایک ایسی صورت تھی جس سے سردی اور موت سے بچا جاسکتا تھا۔ پھر مجھے ایک خیال آیا تو میں سامنے والے کمرے میں گیا شاید کوئی چادر یا لباس مل جائے۔ ستاروں کی روشنی میں ایک چادر اور چارپائی نظر آئی۔ یہ چارپائی اتنی بڑی تھی کہ اس میں صرف ایک آدمی سو اور لیٹ سکتا تھا۔ چادر گرد و غبار سے اٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے خوب اچھی طرح جھاڑا۔ پھر اس سے چارپائی صاف کی۔ یہ کمرہ اور اس کی چھت بھی قدرے مخدوش سی تھی۔ کمرا خاصا بڑا اور کشادہ تھا۔ میں نے فوراً ہی باہر آکر دیکھا۔ پدمنی سردی سے کانپ رہی تھی اور سکڑ سمٹ کے گٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ اس کی حالت سردی نے غیر کردی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں جانے کتنے مردوں سے مقابلہ کیا لیکن اس نے سردی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

میں نے لکڑیاں چنیں اور گھاس زمین سے نکالنے لگا۔ پدمنی نے میری مدد کی۔ اور پھر میں نے بڑے بڑے پہاڑی پتھر تلاش کئے۔ پھر کمرے میں آکر لکڑیوں پر گھاس پھوس ڈال کے پتھروں کو آپس میں کئی بار رگڑا۔ گھاس پھوس نے جلدی آگ پکڑلی۔

''دیکھو پدمنی......! تم ایک عورت ہو...... لاکھ کیسی بھی سہی...... بہتر ہے کہ تم کپڑے نکال کے انہیں

اچھی طرح سے نچوڑ کے پہن لو۔ اس سے پہلے اس چادر سے نہ صرف بال بلکہ جسم بھی اچھی طرح خشک کرلو...... اس طرح سردی نہیں لگے گی...... میں کمرے سے باہر جا کر اپنے کپڑے نچوڑ لیتا ہوں...... مجھ پر بھروسا کرو...... میں نہ تو تمہیں بے لباس دیکھوں گا اور نہ فائدہ اٹھاؤں گا......''

پھر میں اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو دیکھا تو وہ آگ کے پاس بیٹھی آگ تاپ رہی ہے۔ اس کا لباس بدن سے چپک کر اسے بے لباس کر رہا تھا۔ وہ چارپائی آگ کے قریب کرکے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت شعلہ مجسم بنی ہوئی تھی۔ اس کا حسن و شباب اور نکھر گیا تھا اور جسم کی شادابیاں، رعنائیاں اور قیامتیں جیسے جاگ اٹھی تھیں، اس کے چہرے کا رنگ نکھر گیا تھا۔ وہ بے خوف اور اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔

میں چارپائی پر اس کے پاس بیٹھ گیا لیکن فاصلہ رکھا تو وہ بولی۔

''مجھے تو تم پر بھروسا ہے...... میں حیران ہوں کہ کیا تم واقعی پولیس کے آدمی ہو......؟''

''کیوں...... کیا پولیس آدمی نہیں ہوتے ہیں......؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''شاید ہوتے ہوں...... لیکن ان میں کالی بھیڑیں اور درندہ صفت اور بھیڑیے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔''

''یہ بات تم کس بنا پر کہہ رہی ہو......؟'' تو میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''پولیس جب کسی بے گناہ کو پکڑتی ہے...... اس کی ماں، بیٹی، بہن اور بہو جب اس کی بے گناہی کا یقین دلانے اور ضمانت دینے گئیں تو تھانوں میں ان کے ساتھ زیادتی کی گئی......'' وہ زہرناک لہجے میں بولی۔

''میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا...... ایسا ہوتا ہے...... ہندوستان اور بنگال میں ہر دس منٹ میں ایک لڑکی اور عورت آبروریزی کا نشانہ بنتی ہے۔ صرف پولیس کے ہاتھوں ہی نہیں بلکہ اور بھی بھیڑیا صفت کے ہاتھوں، قانون بے بس ہے...... اس میں لڑکیوں اور عورتوں کا بھی دوش ہوتا ہے...... وہ اس حالت میں نکلتی ہیں اور ایسا لباس پہنتی ہیں کہ بے لباس معلوم دیتی ہیں۔ جس سے برائیاں جنم لیتی ہیں۔''

پدمنی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ ہم دونوں کے درمیان گہری خاموشی کی دیوار کھڑی ہوگئی۔ پھر میں نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

''پدمنی......! عورت تو بڑی مہربان اور محبت والی ہوتی ہے۔ جیسے...... ماں...... بہن اور بیٹی پھر تو آخر ایسی کیوں ہوگئی......؟ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔''

پدمنی جو کسی گہری سوچ میں غرق تھی اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بڑبڑائی۔

''ماں...... بہن اور بیٹی...... بیوی...... لیکن عورت ان میں سے کچھ نہ ہو تو دنیا اسے بدن بیچنے والی طوائف بنا دیتی ہے...... پدمنی وہ بھی بن چکی ہے...... معلوم نہیں کیوں ایشور نے عورت کو اتنا حسین اور دلکش اور پرکشش...... اور ہیجان خیز بنا دیا کہ مرد بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں...... گدھ بن جاتے ہیں تب وہ ماں، بہن اور بیٹی کے مقدس رشتوں کو بھول جاتا ہے...... پامال کردیتا ہے...... اور ٹھاکر......؟ ٹوٹا ہوا انسان اس سے اچھا نہیں بن سکتا جو پدمنی بنی ہے...... کیا بنی ہے...... مرد یہ بات بھول جاتا ہے کہ جب کوئی عورت انتقام لینے پر تل جاتی ہے تو پھر وہ کسی مرد کو ہرگز ہرگز نہیں بخشتی اور رحم کھاتی ہے...... میرے انتقام کے اندر سے جنون نے کبھی کسی مرد پر رحم نہیں کھایا......؟ اس لئے کہ وہ رحم کے قابل نہیں ہوتا ہے۔''

پدمنی ایک لمحے کے لئے رک گئی جیسے کسی گہری کسک نے اس کے اندر کروٹ لی ہو۔

اب اس کی بڑی گہری سیاہ آنکھوں میں تشدد

نہیں تھا بلکہ درد جھانک رہا تھا...... درد کا گہرا سمندر اور چہرے پر کرب ابھر آیا۔

میں نے اپنا ہاتھ پدمنی کے سر پر رکھ کے تسلی دی۔ اس نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ کسمائی بھی نہیں...... اس نے شاید یہ محسوس کیا ہو کہ میں اس بہانے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے قریب کرلوں گا۔ چہرے پر جھک جاؤں گا۔ ایسی کوئی نیت نہیں تھی۔ اگر میں پیش قدمی کرتا تو شاید تعرض نہ کرتی...... اس کے بشرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خودسپردگی سے اپنے آپ کو میرے حوالے کردے گی۔

''پدمنی...... ! بہادر انسان ہی بہادر کی قدر کرتا ہے...... عزت کرنا جانتا ہے...... تو مجھے انسپکٹر نہیں...... بلکہ ایک معمولی انسان سمجھ کے صرف اتنا بتادے کہ کچھ اور کیوں نہیں بنی...... ؟''

''اور کچھ...... ؟'' پدمنی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد دل گرفتہ لہجے میں بولی۔ ''سنو ٹھاکر...... ! میں تمہیں بہت دور لئے چلتی ہوں...... یہاں سے اڑتالیس پچاس میل دور...... رانی پور...... اب تو صرف اس کا نام رہ گیا ہے...... آج سے پندرہ برس قبل میں وہاں تھی...... جب سے ہوش سنبھالا اپنے آپ کو رانی پور میں پایا...... میں کون ہوں...... ؟ کہاں سے اور کیسے اس مندر میں پہنچی...... اس کے متعلق بہت سارے قصے ہیں...... لوگ کہتے تھے کہ میں کسی کنواری لڑکی کا پاپ ہوں...... جسے وہ دنیا کے ڈر سے چیتھڑے میں لپیٹ کے مندر کے پچھواڑے چھوڑ گئی تھی...... وہ محبت کے اندھے جنون میں دھوکا کھا کے اپنا سب کچھ ہار گئی...... دوسری صبح مندر کے پجاری شرما آنند نے مجھے دیکھا تو اسے میری سندرتا پر بڑا پیار آیا اور وہ مجھے اٹھا کے لے آیا اور مجھے اپنی بیٹی کی طرح پالا۔

دھیرے دھیرے میں بڑی ہوتی گئی اور ایسے پجاری کا پیار بھی بڑھتا گیا۔ چاہت میں ایسی شدت تھی جیسے میں اس کی سگی اولاد ہوں۔ وہ میرے گھنے ریشمی سیاہ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا۔

''پدمنی...... ! تو ایک دیوی معلوم ہوتی ہے...... ایک دم رادھا کا روپ ہے......''

میں کبھی کبھی تنہائی میں کرشن کی مورتی آگے کھڑی ہوکر سوچتی اور دل میں کہتی۔

''کاش...... ! میں سچ مچ کی رادھا ہوتی...... میں کتنی خوش قسمت ہوں۔''

لوگ کہتے تھے کہ پجاری شرما آنند کے پاس ایسا کوئی منتر ہے جس سے بانجھ عورتوں کے ہاں اولاد ہوجاتی ہے...... میں نے دیکھا، ہفتے میں ایک دن بانجھ عورتوں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہوجاتی...... ان میں پندرہ سولہ برس کی بھی ہوتیں۔ نہایت حسین، سبک اندام اور جوانی سے بھرپور...... اس کے علاوہ ایسی عورتیں بھی جن کے انگ انگ سے مستی ابلی پڑتی رسیلے اور پکے پھل کی مانند...... انہیں اولاد کی بڑی تمنا ہوتی تھی جونند شرما پجاری کے پاس کھینچ لاتی۔

پھر کافی دیر تک بھجن کے بعد پجاری آنند شرما ایک نہایت حسین اور دلکش عورت کو چنتے اس پر گنگا جل چھڑک کر اسے ساتھ والے کمرے میں لے جاتے...... باہر کی عورتیں بھجن میں مگن ہوجاتیں۔

مجھے یہ سب کچھ بڑا عجیب اور پراسرار سا لگتا۔ میں بڑی سنسنی خیز محسوس کرتی اور میرا تجسس بیدار ہوجاتا۔

''تم کیا محسوس کررہی ہو...... ؟ تم بڑی خوش نصیب ہو۔ تم جلدی ہی ماں بن جاؤ گی......'' پجاری کہتے ہیں۔

ایک دن میرے تجسس اور اشتیاق نے اکسایا تو میں نے فیصلہ کیا کہ دیکھوں تو سہی پجاری کون سا ایسا منتر پڑھ کے پھونکتے ہیں جب وہ باہر آتی ہے تو اس پر نہ صرف سرشاری طاری ہوتی ہے بلکہ اس پر خمار چھایا ہوا ہوتا ہے...... ایک دن میں نے چھپ کر اندر جھانکا...... پجاری جی اور ساتھ والی عورت کو باہم پیوست پایا...... اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا یہ دونوں جانوروں کی سی حالت میں کیوں ہوجاتے

ہیں…… پھر میں دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے لگی۔ مجھے عجیب احساس ہوتا۔

وقت گزرتا رہا۔ میری ایک ایسی عورت سے دوستی ہوگئی جو ماں بننے کے لئے بے چین تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ اس نے مجھے جو کچھ بتایا وہ میرے لئے ناقابل یقین اور حیرت انگیز تھا۔ اس نے بتایا کہ بنارس، کارشی اور متھرا کے مندروں میں بھی یہی ہوتا ہے۔

سردیوں کی ایک اندھیری رات تھی۔ میں نوجوانی کی دہلیز پار کرچکی تھی اور شباب کی حدود میں قدم رکھا تھا۔ سولہ برس کی ہوگئی تھی جس کا احساس اور خیال ہی نہیں ہوا تھا۔ حالاں کہ مجھ میں جسمانی تبدیلیاں غیر محسوس انداز سے ہوئی تھیں اور نشوونما بھی……

میں کوٹھری بند کئے سوچ رہی تھی کل پجاری کس عورت کو ساتھ لے جائیں گے…… پھر وہی کھیل ہوگا…… جو ایک عرصے سے کھیلا جارہا ہے۔

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔ جب تک میں بکھرے بال اور لباس درست کرکے دروازے پر پہنچتی۔ پجاری جی اندر گھس آئے۔ ایک بار انہوں نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اور پھر شائستہ آواز میں بولے۔

”پدمنی……! چل مندر میں…… آج بانکے پجاری تجھ پر مہربان ہیں…… تجھے مندر میں بلایا ہے۔“

میں ان کے ساتھ مندر میں آگئی…… پجاری جی نے مندر کے دروازے مضبوطی سے اچھی طرح سے بند کئے۔ پھر میرے پاس آکر بولے۔

”تو رادھا بننا چاہتی ہے نا……؟ او دیکھ…… خوب دھیان سے دیکھ…… بانکے مسکرا رہے ہیں…… تیری سوا سے خوش ہوکر انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ آج وہ خود حاضر ہوں گے……“

میں نے سر ہلا کر ہاں کہہ دی…… انہوں نے ہون کنڈ میں ایک مٹھی مال گری ڈالی…… چاروں طرف ایک عجیب…… میٹھی میٹھی بو ہوا میں بھرنے لگی…… میری آنکھیں چپکنے لگیں…… انہوں نے میری کمر پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

”جے پربھو کی…… دیکھ پدمنی……! بانکے تیرے پتی ہیں…… تیرا من تن سب ان کا ہے…… میں تو پربھو کا سیوک ہوں…… اس وقت پربھو مجھ میں سمائے ہوئے ہیں…… وہ تجھ سے میرے روپ میں ملنا چاہتے ہیں…… اگر تو نے ان کے کسی کام میں رکاوٹ ڈالی تو جانتی ہے…… کوڑھی ہوجائے گی…… بدن کا ہر حصہ گل سڑ کے گر جائے گا۔ سوچ لے……“

میں نے جواب دیا کہ ”میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالوں گی……“ پھر جو نہیں ہونا تھا وہ ہوتا رہا۔

ایک دن…… دو دن…… بانکے مہربان ہوتے اور مجھ سے کہتے کہ…… یہ بھگوان کا پرشاد ہے۔ انکار کیا اور ٹھکرایا تو کوڑھی ہوجائے گی…… انکار کیا کرتی میں تو کھلونا بنی رہی…… اس پرشاد کا ایک دن نتیجہ ظاہر ہوگیا۔ آس پاس کانا پھوسی شروع ہوگئی۔ بات پھیلتے پھیلتے سارے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ہیں۔ اس وقت تک جو کچھ نہیں سمجھی بلکہ دل ہی دل میں ڈری ہوئی تھی کہ اگر میں رکاوٹ ڈالوں گی تو میرا بدن گل سڑ کے گرنا شروع ہوجائے گا۔

گاؤں والوں نے پنچایت بلائی…… مجھ سے پوچھا گیا کہ میں کس کا پاپ پال رہی ہوں……؟

میں نے سچ سچ سب کے سامنے بات کہہ دیا۔

میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اب کیا بولتی

لیکن کسی نے میری بات کا یقین نہیں کیا…… بھگوان جیسا دھرماتما برہمن بھلا ایسا کرسکتا ہے……؟ جس نے بیٹی کی طرح پالا……؟ اس پر گھناؤنا الزام لگاتے ہوئے زبان بھی نہیں کانپی……؟ یہ کیسی پاپی ہے……؟ پھر لوگوں نے مجھے مارا پیٹا اور آخر گاؤں سے نکال دیا…… اس مار پیٹ میں گناہ بھی وہیں ختم ہوگیا اور میرے پاؤں ہلکے ہوگئے۔

پھر میں یہاں…… وہاں…… نہ جانے کہاں کہاں بھٹکی…… سب میرے بدن کے بھوکے تھے

اس زندگی سے اکتا کے میں نے ناچ گانے کا پیشہ

اختیار کیا۔

دیلور پور کے زمیندار نے مجھے سہارا دیا...... یہ سچ ہے کہ وہ مجھے چاہنے لگا تھا۔ یوں میری زندگی میں ایک ٹھہراؤ آ گیا۔ وہ زندگی مجھے پسند تھی ۹ کرشن نگر میں ایک ڈاکو نے ڈاکہ ڈالا...... وہ لوٹ کے مال کے ساتھ مجھے بھی اٹھا کے لے گیا...... اس نے پھر زمین دار کو خط لکھا کہ اگر تم پدمنی کو چاہتے ہو تو پچاس ہزار روپے پہاڑوں کے پاس پہنچا دو۔ زمین دار نے پچاس ہزار روپے پہنچا دیئے۔

میں واپس آئی تو پولیس نے شنکر سوامی ڈاکو کا اڈا جاننے کے لئے مجھے گھیر لیا...... طرح طرح کے لالچ دیئے...... سختی کی...... تشدد کیا...... میں کسی قیمت پر بتانا نہیں چاہتی تھی...... لیکن مجھے مجبوراً پولیس کے ساتھ جانا پڑا...... لاکھ ہوشیاری سے میں پولیس کو ساتھ لے گئی۔ لیکن شنکر سوامی کو پہلے ہی خبر ہو چکی تھی۔ پولیس کو تو اس نے چن چن کر مارا ہی ساتھ ہی مجھے بھی ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ رکھ لیا۔

شنکر سوامی کے ساتھ رہ کے میں نے دیکھا کہ باہر کی دنیا کی گندگی سے میں یہاں زیادہ مزے میں ہوں...... شنکر سوامی کی بہادری اور اس کی نشانہ بازی نے مجھے اس کا غلام بنا لیا۔ اس نے میری مانگ میں سیندور بھر دیا۔ کہتا تھا۔

''پدمنی تو مجھے ایسا لڑکا دے کہ......'' میں شرم سے سمٹ جاتی تھی۔

شنکر سوامی ایک خطرناک ڈاکو تھا لیکن اس نے اپنی ساری زندگی میں کسی لڑکی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے جانے کتنے ڈاکے مارے تھے۔ وہ اندر سے ایک اچھا آدمی تھا۔ اس نے کئی لڑکیوں، عورتوں کی عزت و آبرو بچائی تھی۔ وہ دل سے عورت کی عزت کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب کبھی میں کسی عورت کو دیکھتا تھا اسے اپنی ماں بہن کی طرح محسوس کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری عورت ہو۔ میں بھی اسے ٹوٹ کے چاہنے لگی

قول

ارسطو نے ایک دفعہ اپنے شاگردوں سے کہا۔ ''حکمران ظالم کب بن بنتا ہے۔''

شاگردوں نے جواب دیا۔ ''استاد محترم آپ بہتر جانتے ہیں۔''

ارسطو نے فرمایا۔

حکمران خود ظالم نہیں بنتا بلکہ عوام اس کو ظالم بنا دیتی ہے۔ جب ظالم حکمران کے ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جائے گی تو اس کے ظلم کی اور حوصلہ افزائی ہوگی۔ ظالم حکمران ایک فرد ہوتا ہے جبکہ اسے تقویت دینے والے کروڑوں ہوتے ہیں۔ اگر یہ کروڑوں مل کر ظلم ختم کرنا چاہیں تو یہ ان کیلئے مشکل کام نہیں۔

پس ظالم حکمران نہیں ہوتا۔ ظالم خود عوام ہوتی ہے۔

(حسنین حیدر شاہین-لالیاں)

تھی۔ میری محبت، خود سپردگی اور والہانہ پن اس پر ہر لمحہ بدلی کی طرح برستی رہتی تھی۔ میرے نزدیک وہ انسان نہیں دیوتا تھا۔ ہزاروں غریبوں کو اپنے بچوں کی طرح پالتا تھا جیسے وہ اس کا خون ہوں۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ انہیں سکھ پہنچاتا تھا۔ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ اتنا صحیح نشانہ اس سے سیکھا۔ آواز پر گولی مارنا آسان کام نہیں ہے۔ ماہر سے ماہر نشانہ باز ایسا نہیں کرسکتا۔ ایک اندھیری رات شنکر سوامی نے اپنا گھوڑا دوڑایا تاکہ ایک مہم سر کر سکے۔

اسے جگہ کا صحیح اندازہ نہیں ہوا۔ گھوڑا دلدل میں جا دھنسا اس طرح اس کا دیہانت ہوگیا۔ مجھ پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی، میرا دل جانتا ہے۔ یہ میرا پہلا اور آخری عشق تھا جو میری بدبختی نے تاراج کر دیا تھا۔

اس کے مرتے ہی میں نے گروہ کی لگام اپنے

ہاتھ میں لے لی...... سردار بننے کے بعد میں نے سب سے پہلے رانی پور کو پھونک دیا...... پجاری میرے پیروں پر گر پڑا...... گڑگڑایا...... اس نے رحم کی بھیک مانگی...... میں نے اس سے پوچھا...... تو موت سے ڈرتا ہے...... تو نے مجھے پاپی کہا تھا...... تو نے میرا بدن دیکھا...... حسن و شباب دیکھا...... جوانی دیکھی...... ایک عورت کو دیکھا...... اب اس کا انتقام دیکھ۔'' پھر میں نے پجاری کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میں نے اپنے ہاتھوں سے جنگلی جانوروں کو کھلائے۔ جب میں جانوروں کو دیکھتی ہوں تو میری آنکھوں میں شرما آنند کی تصویر ناچ جاتی ہے۔ میرا خون کھول جاتا ہے۔''

پدمنی شاید اپنی بات کہہ چکی تھی۔ میں نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

''پدمنی......! تو کسی بات کی چنتا نہ کر...... میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ تیری سزا کم ہو جائے۔ تیری سزا کم ہونے کا دارومدار میری رپورٹ پر ہوگا...... پھر میری کوشش ہوگی تجھے جیل میں ایسی سہولتیں دلادوں کہ تو وہاں بھی زندگی سکون اور اطمینان سے گزار سکے...... تجھ سے وہاں ایسا کام لیا جائے گا جس سے تیری سزا کی میعاد بھی کم ہوتی جائے گی۔''

جواب میں پدمنی کے قہقہے سے سارا ماحول کانپ اٹھا۔ وہ جیسے پھنکاری۔

''کیا تم یہ سمجھتے ہو اور خود فریبی میں مبتلا ہو کہ پدمنی آسانی سے قانون کے ہاتھوں میں آجائے گی......؟ تم قانون کو اس کا مردہ بدن ہی دے سکو گے...... پدمنی اگر جان لے کے جینا جانتی ہے تو جان دے کر مرنا بھی جانتی ہے۔''

میں اس کی بات کو سمجھ نہ سکا۔ کاش......! تہہ میں پہنچ جاتا...... اس کی یہ بات سن کر گو میں چوکنا اور ہوشیار تو تھا کہ کہیں وہ کسی بہانے بھاگنے کی کوشش نہ کرے...... کیوں کہ آگ تاپنے سے نہ صرف کپڑے بالکل سوکھ گئے تھے اور جسم میں جان آگئی تھی۔ کہیں وہ پھر ندی میں کود نہ جائے...... پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا پدمنی نے بڑی پھرتی سے اپنی ہیرے کی انگوٹھی نگل لی۔

''ٹھاکر......! اب اگر قانون کے ہاتھوں میں طاقت ہے تو مجھے روکو...... گرفتار کر کے جیل میں ڈال دو۔''

میری آنکھوں کے سامنے لمحے کے لئے دھند سی چھاگئی۔ میں رندھے ہوئے گلے سے پھوٹ پڑا۔

''پدمنی......! یہ تو نے کیا کیا......؟ تو نے بڑی جلد بازی کی......؟''

میرے سامنے پدمنی کی نہیں بلکہ ایک عورت کی لاش تھی...... جو ڈاکوؤں کی سرغنہ بھی تھی اور اس علاقے کی بے تاج مہارانی...... جس کی حکومت تھی...... اس کے نام سے بڑے بڑے پولیس افسران بھی کانپتے تھے۔

زندگی میں پہلی بار میری آنکھوں سے آنسو گرے۔ مجھ پر سکتہ اور درد و کرب کی کیفیت بڑی دیر تک طاری رہی۔

وہ جو بھی تھی...... جیسی بھی تھی...... ایک عظیم اور مثالی عورت تھی...... اسے ایک پجاری نے آبرو باختہ اور ڈاکو بنایا تھا...... اس نے بتایا تھا کہ مندروں میں کیا ہوتا ہے...... بنارس کے ہی نہیں ہندوستان اور بنگال کے مندروں میں بھی یہ پجاری اور پنڈت کیسے کیسے پاپ کرتے ہیں......

صبح راہ گیروں کی مدد سے میں پدمنی کا تڑپتا بدن لے کے بنگلور پہنچا تو وہ مر چکی تھی۔

ہاں...... پدمنی مرگئی۔ میں نے خود اس کا کریا کرم کیا...... میں آج تک اس کا چہرہ نظروں سے ہٹا نہیں سکا ہوں اور نہ ہی ہٹا سکوں گا...... آج بھی میرے گرد بے شمار سوالوں کی بھیڑ جمع ہے۔''

وہ خاموش ہوگیا۔ غار کے ماحول میں ایک بوجھل اور روح فرسا سا سکوت طاری ہوگیا۔ اس سکوت کو آکاش نے توڑتے ہوئے کہا۔

''آپ کی کہانی بڑی دردناک ہے۔ میرا دل

بھی دکھ گیا...... پدمنی نے جو کچھ کیا اسے نہیں کرنا چاہیے تھی...... وہ ایک اچھی عورت بن جاتی۔''

''ہاں......'' شمشیر ٹھاکر نے گہری سانس لی۔

''وہ سادھوؤں سے زیادہ ان پجاریوں اور پنڈتوں کی دشمن تھی جو مندروں میں معصوم لڑکیوں اور عورتوں کو ورغلا، بہکا کے اور فریب دے کران کی آبرو سے کھیلتے تھے۔''

''آپ یہاں کس لئے آئے ہیں......؟ کیا کوئی مہم درپیش ہے؟'' آکاش نے سوال کیا۔

''میں یہاں ایک مفرور، قاتل، پجاری کی تلاش میں؟ آیا ہوں۔ جس نے ان کم سن لڑکیوں کو نشانہ بنا کر قتل کردیا۔ جنہوں نے مزاحمت کی تھی...... وہ سات لڑکیوں کا قاتل ہے...... اس علاقے میں کہیں روپوش ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''کیا آپ میرے ساتھ چلنا پسند کریں گے......!'' اس نے توقف کر کے اپنی دستی گھڑی پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ پھر بولا۔ باہر دن نکل آیا ہوگا۔ گھڑی میں صبح کے سات بجنے والے ہیں۔''

وہ اس کے ساتھ جانے سے معذور تھا۔ کیوں کہ ایک تو اسے نہ صرف نیلم کو پانا تھا بلکہ اپنا سایہ بھی پانا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد آکاش سے گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک پدمنی کے بارے میں سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

وہ کسی شور شرابے سے ایک دم بیدار ہوگیا۔ دوسرے لمحے امرتا رانی کی چاپ سے گونج اٹھا۔ اس نے دل میں سوچ لیا کہ وہ امرتا رانی کو نہ تو انسپکٹر کے بارے میں اور نہ ہی پدمنی کی کہانی کے متعلق کچھ بتائے گا۔ امرتا رانی شاید اسے سچ مانے۔ یقین نہ کرے گی اور پھر بتانے سے حاصل کیا...... وہ یہی کہے گی کہ اس نے یقیناً کوئی خواب دیکھا ہوگا...... بھلا اس غار میں کوئی گھس کرآ سکتا ہے۔

''آکاش جی......!'' وہ دور ہی سے مسرت آمیز لہجے میں چلائی۔ اس کی آواز کی بازگشت نے غار کے ہولناک سناٹے میں ایک ارتعاش سا پیدا کردیا۔

''کیا بات ہے امرتا رانی......! آکاش کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ''تم بہت خوش لگ رہی ہو؟'' وہ بولا۔ ''جلدی سے آؤ میرے پاس......''

چند لمحوں کے بعد امرتا رانی اس کے پاس آئی تو اس کے قرب نے آکاش کو بہکا دیا۔

''میں شنکر ناتھ کی آتما کو نرک کی آگ میں پہنچا کے آئی ہوں۔''

''خوش ہو جاؤ...... تمہاری پرچھائیں اب اس کے چنگل سے نکل پائی ہے۔''

''تو...... تو کیا...... میں اب اس اندھیرے غار میں سے نکل کے اجالوں میں آسکتا ہوں۔'' آکاش نے خوشی سے دیوانہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہیں ہوگا...... یقیناً ہوگا......'' اس کی آواز مسرت سے کانپ رہی تھی۔

''امرتا رانی......!'' آکاش نے کچھ کہنا اور پوچھنا چاہا۔ لیکن امرتا رانی کے لبوں نے اس کے ہونٹوں کو خاصی دیر تک بولنے نہیں دیا۔ وہ خوشی کے مارے جذباتی ہوئی جارہی تھی۔

آکاش کو اندازہ نہ تھا کہ امرتا رانی اس کی مصیبت سے نجات دلا کے اتنا خوش ہوجائے گی...... یہ عشق بھی کیا شے ہے......؟ جب عورت عشق میں گرفتار ہوتی ہے تو اس پر کیسا جنون اور جذبہ طاری ہوجاتا ہے۔

آکاش کے ہونٹوں میں ایک عجیب سی مٹھاس جذب ہونے لگی تو سارے بدن پر میٹھی سی سنسنی دوڑنے لگی۔ امرتا رانی کی محبت کا اٹوٹ اظہار اس کے دل و دماغ پر چھانے لگا۔

امرتا رانی نے اپنے لبوں کو اس کے ہونٹوں پر سے اٹھا کے سرشاری سے بولی۔

پھر وہ بولی۔ ''میں تمہاری خاطر کیا کچھ نہیں کرسکتی......؟ اگر میں ایسا نہ کرتی تو ورنہ وہ کمینہ اور مکار

کبھی نہ مارا جاتا..... تمہاری پرچھائیں تو اس کے پنجے سے نکل چکی ہے لیکن اسے ناگ دیوتا کے سیوکوں سے چھٹکارا نہیں ملا ہے۔‘‘

اس کا آخری فقرہ سن کر آکاش کا دل مایوسی کے اندھیرے میں ڈوب گیا..... امرتا رانی نے شنکر ناتھ کے چنگل سے نجات پانے کی خوشی میں اس سے جس عشق اور خودسپردگی سے پیش آئی اور والہانہ پن سے جو خوش کیا تھا اب اس کا نشہ اترنے لگا۔ جذبات کی گرم جوشی اور فراوانی سرد پڑنے لگی.....

دوسرے لمحے اس کیفیت کا تصور کرکے اس کے جسم پر خوف وہیبت کی سرد لہر کسی چاقو کی نوک کی طرح کاٹنے لگی..... اس پر پرچھائیں کی گمشدگی کے بعد جو روشنی اس پر طاری ہوئی تھی۔ اس کے تصور سے ہی وہ کانپ اٹھا..... یہ روشنی نہیں تھی۔ بس ایک تصور سا تھا جو زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا تھا۔

آکاش بولا۔’’اس اندھیرے میں میرا دم گھٹ رہا ہے امرتا رانی.....! ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی میری جان نکال رہا ہو..... مجھے جلدی سے کھلی روشنی میں لے چلو..... تاکہ میں کھلی جگہ پر سانس لے سکوں۔‘‘

’’تم پریشان نہ ہو اور اپنے من کو شانت رکھو.....‘‘ امرتا رانی نے اسے دلاسا دینے کے انداز میں اس کے ہاتھ اور ہونٹوں کو اپنے مرمریں اور گداز اور شیریں لبوں سے چوما۔’’بس..... ایک رات اور جبر، سکون اور ہمت سے گزارلو..... کل چاند کی آخری رات ہے..... صرف ایک رات کی بات ہے۔ وہ کٹ جائے گی..... پھر میں تمہیں اس اندھیرے سے نکال کے روشنی میں لے چلوں گی۔ میری بات پر بسواس کرو۔‘‘

آکاش نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کہتا بھی تو کیا۔ کچھ ایسے اسرار تھے کہ امرتا رانی جانتی تھی۔ وہ حالات اور پراسرار واقعات کے رحم و کرم پر تھا۔

تم جانتی اور سمجھتی بھی ہو کہ میرے لئے دن ہو یا رات ہو..... اس غار اور گہرے اندھیرے میں ایک ایک لمحہ مجھ پر کیسا گراں گزر رہا ہے.....؟ کس قدر کرب ناک ہے..... ایک ایک صدی کی طرح بھاری ہے۔‘‘ مجھ پر جو بیت رہی ہے وہ میں جانتا ہوں یا میرا دل..... ہی جانتا ہے۔‘‘ آکاش کے لہجے میں وحشت تھی۔

وہ سوچوں میں غرق تھا کہ امرتا رانی کی بات کا کیا جواب دے۔ کچھ دیر کے بعد بوجھل سکوت کے بعد غار کی فضا میں ایک نسوانی چیخ نے جو دل خراش تھی لرزا دیا تھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نوجوان لڑکی گہری نیند میں غرق تھی کہ کوئی بھیانک سپنا دیکھ کر لرز اٹھی ہو..... اس چیخ نے آکاش کو لمحے کے لئے ہراساں کردیا۔

وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا تو امرتا رانی نے اضطراری انداز سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

’’یہ کون لڑکی ہے..... امرتا رانی.....؟‘‘ اس نے امرتا رانی کے قریب ہوکر سرگوشی میں پوچھا۔

’’آکاش کو یاد آیا کہ جو کافی دیر قبل غار کی وحشت ناک تنہائی میں کسی دیوانے کی طرح ہنستے ہنستے شاید بے ہوش ہوگئی تھی۔ یہ بات اسے یاد نہیں رہی تھی۔ اس چیخ کو سن کر اسے خیال آگیا تھا۔

’’دھیرج رکھو..... تم بہت جلد جان لوگے کہ وہ لڑکی کون ہے.....؟‘‘ امرتا رانی نے جواب دیا۔

’’ابھی بتانے میں کیا حرج ہے.....؟ کیا کوئی مسئلہ ہے؟‘‘ آکاش نے پوچھا۔’’تمہیں بتانے میں پس وپیش کیوں ہو رہا ہے؟‘‘

’’اس لئے کہ ابھی اس راز سے پردہ اٹھانے کا سمے نہیں آیا ورنہ میں تمہیں بتادیتی.....‘‘ امرتا رانی تنک کے بولی۔’’تم بے صبرے کیوں ہو رہے ہو؟‘‘

اس وقت جو اس لڑکی کی چیخ سنائی دی تو پھر سنائی نہ دی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ لڑکی مسلسل چیخیں مارے گی۔ وہ ہمہ تن اس آواز کی طرف متوجہ تھا۔ اس چیخ کا دوبارہ سنائی نہ دینا کچھ عجیب اور غیر فطری سا لگ رہا تھا۔

’’ایسا لگ رہا ہے کہ وہ چیخ مار کے بے ہوش ہوگئی ہے۔‘‘ آکاش نے دوسرے لمحے خیال ظاہر کیا۔

''وہ شاید اندر بے ہوش پڑی ہوگی۔''

''بے ہوش......؟'' وہ دھیرے سے ہنسی اور بولی۔''میری جان! وہ اب غاروں کی اس بھول بھلیوں میں نہیں ہے۔''

''نہیں......نہیں......وہ اندر ہی ہے۔'' آکاش کا انداز تکرار کا سا تھا لیکن اس نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا۔''میں بھولا نہیں ہوں...... میں نے اسے بے ہوشی کی حالت میں چھوڑا تھا۔ تم میری بات کا وشواس کیوں نہیں کررہی ہو؟''

''بات یہ ہے میری جان......! اس کی چیخ بلا سبب نہیں تھی۔'' امرتا رانی بولی۔''اس لئے سنگیت اسے ابھی ابھی یہاں سے لے گئی ہے۔''

''لیکن یہاں سے تو کوئی گزرا نہیں......'' آکاش نے پھر تکرار کیا۔''ورنہ قدموں کی چاپ تو سنائی دیتی اس سناٹے میں۔''

''لیکن تم یہ بات بھول رہے ہو کہ اجنبیوں کے لئے یہ غار اندھے ہیں جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔'' امرتا رانی اسے بتانے لگی۔

''لیکن جاننے والوں کے لئے ایک نیا راستہ ہے...... سنگیت اسے لے جاچکی ہے۔''

''تم کسی شک و شبے اور اندیشوں میں مبتلا نہ ہو...... مجھ پر وشواس کرو...... میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھوں گی اور نہ ہی جھوٹ بولوں گی۔ اس لئے کہ تم میرے سب کچھ ہو...... میں تمہاری باندی ہوں...... پجارن ہوں......''

کچھ دیر بعد اسے اپنی محبوب اور جان از عزیز بیوی نیلم کی یاد آئی۔ چشم تصور میں اس کا تراشیدہ پیکر بھر آیا۔ دنیا میں کون لڑکی عورت اس کی ثانی ہوگی۔ وہ دونوں دنیا کا حسین ترین جوڑے تھے۔

نیلم کی پراسرار جدائی کے باعث اسے ان دیکھی اور اجنبی دنیاؤں اور غیر انسانی قوتوں کے دامن میں پناہ لینی پڑی تھی اور وہ ان کے رحم و کرم پر ہوگیا تھا۔ محتاج ہوگیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں یہ بات نہیں آئی تھی اسے یہ دن دیکھنا پڑیں گے۔

نیلم کی بازیابی کے لئے اس نے جو عہد کیا تھا اسے کسی لمحے اور کسی دن نہیں بھولا تھا اور نہ بھول سکتا...... یہ عہد فراموش کرنے کے لئے نہیں تھا۔ عہد بھی ایک سوگند کی طرح ہی ہوتا ہے...... یہ عہد اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ دل میں نقش تھا۔

لیکن کبھی کبھی ایک خیال اسے سوچنے پر مجبور کردیتا۔ امرتا رانی آخر کیوں اور کس لئے اس پر مرمٹی ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود وہ اپنی نیلم کو اس ناگ راجہ کی قید سے نکال لانے پر تلا ہوا تھا...... اس کے باوجود کہ حالات بہت پیچیدہ اور کٹھن تھے...... نیلم کی بازیابی اور ناگ محل کا سفر بار بار یوں ٹل رہا تھا کہ آکاش نے پہلے تو یہ خیال کیا تھا کہ شاید اتفاق ہے...... لیکن جب اس نے غور کیا تو اس کا ذہن ان تمام واقعات کو اتفاق ماننے کے لئے تیار نہیں تھا...... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسائل کا بار گراں ہلکا ہونے کے بجائے مختلف حیلوں، بہانوں سے اس کے دشمنوں کی تعداد تواتر سے بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اور وہ حالات کے بے رحم دھارے میں اتنا بے بس ہوکر رہ گیا تھا کہ کبھی سکون سے واقعات کو ان تمام کڑیوں پر غور کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا تھا۔

اسے یاد آیا کہ اس کا سب سے پہلا معرکہ اور سامنا امرتا رانی سے ہوا تھا۔

اور پھر یکے بعد دیگرے ناگ حویلی کے پراسرار حکمران...... ناگ راجہ اس کے کریہہ صورت اور مکار معاون شیو ناگ...... جل کماری جو ہوس پرست تھی اور ناگ دیوتا وغیرہ کے کردار ایک ایک کرکے سامنے آتے چلے گئے، جیسے فلموں میں مناظر اور ان کے کردار دکھائی دیتے ہیں...... اس پر جو افتاد آن پڑی تھی ان سے بچاؤ کے لئے کبھی اسے سمندروں کے نیچے اجنبی دنیا میں پناہ لینی پڑی اور کبھی دور دراز علاقوں میں روپوشی اختیار کرنی پڑی تھی جس کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا۔

اور پھر یک بیک کیا ہوا......؟ شنکر ناتھ اس کا دشمن ہوگیا تھا جسے امرتا رانی کے ہاتھوں موت کی بھینٹ چڑھنا پڑا...... موجودہ صورت حال میں اس کے لئے سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ ناگوں کی دھرتی پر پوجا جانے والا ناگ دیوتا کسی کنواری کی بھینٹ نہ ملنے کی وجہ سے اس کی پرچھائیں اس سے چھین لی گئی تھیں۔ جس کے باعث اس کی ایک ایسی مصیبت گلے میں طوق کی طرح ڈال دی گئی تھی...... اور پھر اس کے باعث وہ اس تنگ و تاریک اور بھیانک ماحول کے غار میں بند ہونے پر مجبور ہوگیا تھا۔ ایک طرح سے یہ غار نہیں جیسے عقوبت خانہ تھا۔

آکاش کو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے امرتا رانی دوستی، عشق اور اپنے عشوہ اور جلوؤں کی آڑ میں اس کے گرد اپنا جال مضبوط کرتی جارہی تھی...... وہ خوب جانتی تھی کہ اس کے دل میں نیلم کی جدائی کا جو گھاؤ لگا ہے وہ اتنی جلدی مندمل نہ ہوسکے گا......؟ اس کی جلن، تڑپ اور کسک چین لینے نہیں دے رہی ہوگی...... لہٰذا وہ اسے ناگ محل یا حویلی کے دلدل میں گرا کے ایسے حالات میں پھانستی جارہی تھی کہ وہ کبھی اس دلدل سے نکل نہ سکے...... دلدل میں ایک بار گرنے کے بعد اس سے نکلنا ناممکن ہوتا ہے۔ کیوں کہ بغیر کسی سہارے نکلنے کی کوشش میں آدمی دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ یہ عشق کا دلدل اور سراب...... مشکل دوسری طرف اس کا عشق جنون تھا...... ایسا اندھا عاشق جس کی مثال نہیں ملتی تھی۔

وہ کسی ماہر نفسیات اور قیافہ شناسی اور مرد کی کمزوریوں سے واقف تھی۔ اس کے پاس نفسیاتی حربوں کی کمی نہ تھی...... اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ پے در پے ناکامیوں اور مصائب سے دلبرداشتہ ہوکر نیلم کو فراموش کر بیٹھے اور کٹھن حالات اسے اپنی پتنی سے بیزار کردیں گے...... اس کی یہ کمزوری امرتا رانی کے لئے ایک سنہرا موقع ہوگا کہ دل میں جگہ بنالے...... دل میں نقش ہوجانا گویا ہر طرح سے جیت لینا تھا جس کے لئے امرتا کو خاصا وقت مل گیا...... امرتا رانی نے اسے ہر طرح سے خوش کیا تھا اور کررہی تھی۔ اس کی کسی بات سے انکار نہیں کیا...... اور پھر سنگیت جیسی شعلہ بدن کو اس کی نذر کیا تھا تاکہ وہ اس کے شکنجے سے نکل نہ سکے۔ اس سفید ناگن کے دل میں سنگیت کو اس کی زندگی کا جزو بناتے ہوئے رتی برابر بھی رقابت کا جذبہ جنم نہ لے سکا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو امرتا رانی کے قرب اور والہانہ پن سے پاگل ہوجاتا اور اپنی پتنی کو بھول جاتا۔

وہ جوں جوں ان خطوط پر سوچتا اور غور کرتا رہا اسے امرتا رانی مجرم نظر آنے لگی تھی...... واقعات اس کی لاتعلقی واضح تھی...... مگر یہ ضروری تھا کہ اس کی نگاہوں میں خود کو...... بے گناہ ثابت کرنے کے لئے وہ خود کو لاتعلق رکھتی۔

یہ احساس ہونے کے بعد کہ امرتا رانی اتنے عرصے تک اس کے عشق میں گرفتار ہوکر اپنے آپ کو اس کی جھولی میں پکے پھل کی طرح ڈال دیا تھا۔ اس نے کھلونے کی طرح جی بھر کے کھیلا اور اب بھی اس طرح کھیل رہی ہے جیسے اس کا جی بالکل بھی نہ بھرا ہو۔

وہ طیش میں آگیا۔ نفرت اور حقارت سے مٹھیاں بھینچ کے غار میں ٹہلتا رہا...... اس نے کئی بار سوچا کہ امرتا رانی کے آتے ہی وہ اسے ختم کرکے ہی دم لے گا...... یہ ناگن ہے...... اس نے جو عشق کا زہر اس کے وجود میں سرایت کیا ہے۔ وہ نس نس میں بس کررہ گیا ہے...... لیکن اس کے غصے پر مصلحت غالب آگئی۔ اسے نہ صرف دور اندیشی بلکہ سیاست اور چال بازی سے کام لینا ہوگا۔ جب تک اسے پرچھائیں کے روح فرسا عذاب سے نجات ملنے تک وہ اپنے بشرے اور حرکات وسکنات سے احساس ہونے نہیں دے گا۔ اگر امرتا رانی نے محسوس کرلیا سارا کام نہ صرف بگڑ جائے گا بلکہ بیڑا غرق ہوجائے گا۔ وہ یہ مت بھولے کہ امرتا رانی جتنی حسین ہے اتنی ہی خطرناک بھی۔

اسے سادھو مہاراج کے الفاظ خوب یاد تھے کہ امرتا رانی کے سہارے نیلم تک پہنچنے کے لئے بہت زیادہ ہوشیاری اور صبر سے کام لینا ہوگا۔ صرف یہی ایک ایسی

ہستی ہے جس کی بدولت وہ نیلم کو پا سکتا ہے۔ امرتا رانی کو خوش رکھے بغیر کام نہیں نکل سکتا ہے......

تو کیا اسے کٹھ پتلی اور کھلونا بنا ہوا رہنا ہوگا......؟ امرتا رانی کو ہر طرح سے خوش کرتے رہنا ہوگا......؟ اس کا جو جنون عشق ہے اور جذبات ہیں انہیں پورے کرنا ہوں گے...... اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہوگا......؟"

آکاش نے اس مہیب قدرتی قید خانے میں جو عقوبت خانہ لگ رہا تھا۔ اپنا باقی ماندہ وقت بہت ہی بے چینی اور کرب ناک اذیت سے گزارا۔ وقت گزاری کے لئے کئی بار اسے امرتا رانی کو طلب کرنے کا خیال آیا لیکن وہ اس خیال سے باز رہا کہ اس کے سامنے آتے ہی کہیں وہ اپنے مشتعل جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ اس طرح بنا بنایا کھیل بگڑ نہ جائے۔

اس غار میں مسلسل اور یکساں تاریکی کے باعث وقت جیسے جامد ہو کر رہ گیا تھا...... اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر سنگیت ہوتی تو وہ اس کی تنہائی دور کر دیتی۔ سنگیت سے اس کا رابطہ بھی تو نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سنگیت کے تصور میں غرق تھا کہ اس وقت امرتا رانی آئی۔ اس نے جان لیا کہ چاند کی آخری سیاہ شب آ پہنچی ہے۔

امرتا رانی نے اس کے گلے میں اپنی مرمریں بانہیں حمائل کر کے جذباتی انداز سے پیش آئی تو اس کے باوجود وہ اپنی سرد مہری چھپا نہ سکا۔

"کیا اپنی داسی سے خفا ہو گئے ہو...... میرے آکاش جی......!" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی اور اس کا ہاتھ تھام کے اسے غار کے ایک کونے میں لے گئی۔

"جواب دو نا...... کیا واقعی خفا ہو؟"

اسے بے اختیار وہ دن یاد آیا جب امرتا رانی نے الھڑ اور معصوم بنجارن بن کے روپ میں نہایت مکاری کے ساتھ اسے خود سپردگی سے پیش آ کر منکا واپس چھین لینا چاہا تھا۔

آکاش نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ اس کی خاموشی سرد مہری کو امرتا رانی نے محسوس کر کے دوبارہ سوال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ آکاش نے یہ بات محسوس کی کہ وہ افسردگی کی کامیاب اداکاری کر رہی ہے۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ ایک ناگن ہونے کے ناتے چال باز ہے۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں کھلی فضا میں نکل آئے۔ باہر شدید سردی تھی۔ ہوا تھی کہ برفانی نیزوں کی طرح بدن میں اور ہڈیوں میں چھید کر رہی تھی۔ اس نے چند گہرے سانس لے کر آس پاس نگاہیں دوڑائیں اور پھریری لے کر رہ گیا۔ امرتا رانی اس سے لپٹ کے چلنے لگی تھی تاکہ اس کی سردی کو دور کر دے۔ اس کا جسم سرد ہونے کے بجائے گرم ہو گیا تھا۔ وہ دونوں اس وقت بہت ہی خطرناک پہاڑیوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔

جس غار سے نکل کے وہ آئے تھے وہ ان کی پشت پر تھا اور وہ ایک مختصر سی چٹان پر کھڑے ہوئے تھے۔ جس سے ایک تنگ سی پگڈنڈی نچلی وادی میں جاتی دکھائی دیتی تھی۔ سامنے ہزاروں فٹ گہری کھائی تھی اور جس میں کسی پہاڑی کے خاصے شور سنائی دیتا تھا۔ نالوں کی چھاؤں میں اکا دکا جھاگ اڑاتی لہروں کا ایک خاکہ بھی نظر آ جاتا تھا...... وادی کے اس پار ایک اور فلک بوس پہاڑ تھا جس پر بے تحاشا جنگلات رہے ہوں گے...... چوں کہ اس جانب ہواؤں کا ہیبت شور آوارہ روحوں کے رونے کا سماں باندھ رہا تھا...... درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر چلنے والی سرد ہواؤں میں اس ہلکی ہلکی برف کی نمی رچی ہوئی تھی جو قرب و جوار کی پہاڑیوں پر چاندی کے ذروں کی طرح دور دور تک بکھری ہوئی تھی۔

رات سیاہ تھی اور صرف تاروں کی چھاؤں میں زیادہ دور تک دیکھنا ممکن نہیں تھا...... لیکن اس کے باوجود اسے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ انتہائی خطرناک اور دشوار گزار مقام پر کھڑا ہوا ہو۔

اس نے سر گھما کے امرتا رانی کی طرف دیکھا تو اس نے امرتا رانی کو اپنی طرف ہی متوجہ پایا۔

"میری جان......! تمہیں وہم ہوا ہے...... کیا میں تم سے خفا ہو سکتا ہوں...... اچھا یہ بتاؤ کہ اب ہمیں کہاں جانا ہے؟"

"جہاں جانا ہے، وہاں تو پہنچ ہی جائیں گے......" اس کے لہجے میں ابھی تک دکھ بھرا ہوا تھا۔

"لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم ابھی تک روٹھے ہوئے ہو...... سچ سچ بولو......! تا کہ میرے من کی کلی کھل جائے۔"

"یہ تم کس بنا پر کہہ رہی ہو......؟"

"لیکن تم نے بڑے رسمی انداز سے اور بڑے پھیکے لہجے میں میری بات کا جواب دیا ہے لیکن مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہو...... یقین نہیں آیا ہے تو میرے دھڑکتے سینے پر اپنا کان رکھو تو میرا من گواہی دے گا۔"

"دل کی باتوں پر نہ جاؤ...... سردی بہت ہے...... اگر میں نے تمہارے سینے پر کان رکھ دیا تو میرے جذبات بھڑک اٹھیں گے۔" اس نے امرتا رانی کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے اس کے رخسار کا رسمی انداز سے بوسہ لے لیا۔ "اب تو شکایت نہیں رہی نا......؟"

اسے اندازہ نہ تھا کہ امرتا رانی کے سینے میں کتنا بڑا دل ہے......؟ یہ کس قدر عظیم ہستی ہے...... کیا یہ عشق ایسا ہی ہوتا ہے......؟ امرتا رانی نے جذبات کی رو میں بہہ کے جو کہا تھا وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا...... یہ ایک حقیقت تھی۔ اس نے نیلم کی جدائی کا خلا پر کرنے کے لئے حسن وشباب سے دل بہلایا تھا۔ ایک طرف اس کی زندگی میں جو لڑکی عورت آئی تھی اس میں اس کا دوش تھا اس کی خوب صورتی اور مردانہ وجاہت اور پرکشش اور دل نواز شخصیت کا...... دوسری طرف جو لڑکیاں عورتیں وہ ان کے حسن وشباب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ ایک مرد جو تھا اور اسے جذبات پر قابو نہ رہا تھا۔ عورت آخر عورت ہوتی ہے...... وہ اس کے بدن کی داد دینے سے خود کو نہ بچا سکا تھا۔ وہ ایسا مہلک اور خطرناک ہتھیار تھا کہ اس سے بچنا آسان نہ تھا...... وہ صرف ان لڑکیوں کو دوش نہیں دے سکتا تھا جو عشق کے جنون میں اس کی تنہائی کی رفیقہ بنی تھیں۔

"یہ تم کیا سوچنے لگے ہو؟ کیا تم مجھے بتانا نہیں چاہتے......؟" امرتا رانی نے اس کا شانہ ہلایا۔

"دیکھو...... سردی کی شدت میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہو رہا ہے...... یہاں سے جتنا جلد ہو سکے چلنے کی کوشش کرو...... اور تمہارے دل کے کسی کونے میں شک وشبہ کی رمق بھی ہو تو اسے نکال پھینکو......" آکاش نے ایک کان کی دھواں اگلتی چمنی پر نظر جما کر کہا۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس سیاہ دھوئیں میں اس کے دل کا غبار بھی شامل ہو...... وہ نیلم کے فراق اور جدائی مین اس طرح دھیمے دھیمے سلگ رہا ہو جیسے بھٹی میں پڑے ہوئے کوئلے دیر تک چخ چخ کر دھیمے پڑتے جا رہے ہوں۔

"میرے دل کے مندر کے دیوتا......!" امرتا رانی ایک لخت اس کے قدموں میں کسی بیل کی طرح لپٹ گئی۔ پھر اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم مجھ سے پریم نہیں کرتے...... اور نہ ہی کر سکتے ہو...... میں جانتی ہوں کہ تمہارے من پر تمہاری پتنی کی سندر صورت راج کر رہی ہے اور تمہارے من کے نہاں خانوں میں وہ نقش ہے...... اس کے باوجود کہ تم دنیا میں سب سے زیادہ اسے چاہتے ہو اور تم صرف میرے حسن وشباب اور جسمانی دلکشی سے متاثر ہو اور دل بہلاتے ہو...... لیکن اس کے باوجود میرا ہرجائی من پھر بھی تمہاری طرف جھکتا ہے۔"

جانے کیوں آکاش کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ ریاکاری اور منافقت سے پیش آ رہی ہے۔

اس کا احساس ہوتے ہی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مشتعل ہو گیا...... اس نے محسوس کیا کہ امرتا رانی کا ایک ایک لفظ، جھوٹ اور عیاری کا پلندہ ہے...... عورت کتنی بڑی اداکارہ ہے...... وہ کس قدر چالاکی اور خوب صورتی

سے اپنے فریب کا بھرم رکھنے کی کوشش کر رہی ہے...... وہ اسے بے وقوف اور احمق سمجھ رہی ہے۔

پھر آکاش سے رہا نہ گیا۔ اس کی نفرت اور غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے امرتارانی کے شانے تھامے اور جھک کے ایک جھٹکے سے اسے گود میں اٹھالیا۔ امرتارانی یہ سمجھی کہ وہ اس کے چہرے پر جذباتی انداز سے جھک جائے گا۔

لیکن دوسرے لمحے اس کی غلط فہمی دور ہوگئی۔

پھر وہ بگڑ کے برہمی سے بولا۔

''کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تم اپنی ان باتوں سے دھوکا کھا کر تمہاری اس بکواس پر اندھا یقین کرلوں گا...... تم نے بڑی خود غرضی اور مکاری سے اپنے حسن کے جال میں اس لئے پھانسا کہ میری خوب صورتی اور مردانہ وجاہت سے اپنے ارمان پورے کرسکو...... مجھ سے ایک کھلونے کی طرح کھیلتی رہی ہو...... مجھے کھلونا بنالیا لیکن اس جذبے میں نہ تو محبت تھی...... اچھوتا جذبہ تھا اور نہ ہی میں نے خلوص محسوس کیا...... تمہاری اس سیاہ کاری کا پردہ چاک ہوگیا ہے......''

آکاش نے یہ بات کہتے ہوئے اس بات کی کوشش کی تھی کہ اس کا لہجہ قابو میں رہے...... لیکن وہ زہر آلود ہوتا گیا۔ امرتارانی کا چہرہ متغیر سا ہوتا گیا۔ کیوں کہ اس کا ایک ایک لفظ نشتر زنی کرتا گیا تھا امرتارانی کے وجود پر۔

''میں کیسی ابھاگن ہوں......'' امرتارانی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور پھر جیسے سسک پڑی۔ ''ہر وہ کام جو میں نے تمہیں اپنانے کے لئے اور تم سے قریب ہونے کے لئے اس کے برعکس اور الٹا ہی ہوا...... میں نے تمہارے کارن کیا کچھ نہیں کیا......؟ اپنی پوری جاتی کا بیر مول لیا...... ناگ حویلی کا راجہ میرے خون کا پیاسا ہوچکا ہے...... میں اب اونی نگر جاؤں تو میری جان لے کے رہے گا...... میں نے تمہارے لئے کیا کچھ نہیں کیا......؟ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود تمہارے دل کے کسی کونے میں اب میرے لئے کوئی جگہ نظر نہیں آتی...... میں اگن ناگ کی سوگند کھا کے کہتی ہوں کہ میں تمہاری پتنی کی جگہ لینا نہیں چاہتی...... اس لئے کہ وہ صرف اور صرف تمہاری ہے...... لیکن پھر میں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ نیلم کی داسی سمجھ کے پریم کے دو بول بول لیا کرو...... جب تک تم اسے پا نہیں لیتے ہو مجھے اس بات کی آگیا دو کہ میں تم پر مہربان ہوتی رہوں...... تمہیں خوش اس طرح کرتی رہوں جس طرح اب تک کرتی رہی ہوں...... اس لئے کہ تم اس کی جدائی اور فراق میں بے چین نہ رہو......''

''خاموش......'' اس کی زبان سے نیلم کا نام سن کے اس کے وجود میں دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ پہاڑوں سے اس کی آواز کی بازگشت ٹکرائی تو اس نے آکاش کو اور مشتعل کردیا۔ پھر اس سے برداشت نہ ہوسکا۔ اس نے بے اختیار امرتارانی پر ہاتھ چھوڑ دیا۔

اس گہرے سناٹے اور فضا میں تھپڑ کی آواز کے ساتھ ہی ایک طویل دل خراش چیخ گونجی تو سارا ماحول جیسے دہل کے رہ گیا تھا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی تھی کیوں کہ یہ امرتارانی کے لئے اچانک اور غیر متوقع تھا...... وہ لہرا کے چٹان کے سرے سے گہری کھائی میں لڑھک گئی...... وہ بجلی کی سی سرعت اور اضطراری کیفیت سے آگے بڑھا تاکہ امرتارانی کو پکڑلے...... لیکن بے سود...... کمان سے نکلا تیر واپس آنے سے رہا تھا...... امرتارانی کی چیخ تو معدوم ہوچکی تھی۔

آکاش نے بھونچکا ہوکر دیکھا...... امرتارانی کا سایہ اسے پہاڑی کی ڈھلان کی ہزاروں فٹ گہری کھائی میں چھائی ہوئی مہیب تاریکی میں غرق ہوتا نظر آیا تھا۔

اس نے اپنا سر پیٹ لیا...... جو کچھ ہوا وہ اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا...... اسے پچھتاوا سا ہوا کہ اس نے کیا کردیا......! اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی۔ کاش......! اکاش......! وہ یہ حماقت نہ کرتا......! (جاری ہے)

روح کا انتقام

ملک این اے کاوش۔ سلانوالی سرگودھا

کمرے میں محو خواب حسینہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی، کمرے کی لائٹ روشن تھی، اور پھر حسینہ نے اپنا گلا دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا، اور وہ آہستہ آہستہ بستر سے اوپر کو اٹھنے لگی اور چشم زدن میں ہوا میں معلق ہو گئی کہ پھر.........

خوف وتجسس اور سسپنس جو کہ پڑھنے والوں کو...... ورطۂ حیرت میں ڈال دے گا

رنبیز ملہوترا گاڑی سے اترا ہی تھا کہ اسے اپنے عقب سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی تو اس نے فوراً گردن گھما کر دیکھا۔

''انسپکٹر...... رنبیز ملہوترا نے انسپکٹر اور چند کانسٹیبلوں کو ایک طائرانہ نگاہ سے دیکھا اور پھر انسپکٹر سے مخاطب ہوا۔ ''کیا بات ہے آپ اور یہاں؟''

''جی ہاں۔ ہمیں یہاں دیکھ کر آپ ورطۂ حیرت میں ضرور مبتلا ہوئے ہوں گے کہ صبح ہی صبح آپ کے دفتر کے سامنے سے ہم آپ کو معذرت کے ساتھ اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے ہیں......'' انسپکٹر نے رنبیز ملہوترا کے پاس آ کر دھیمے لہجے میں کہا۔

رنبیز ملہوترا ممبئی کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھی۔ جس کے نام سے ہر کس و ناکس آشنا تھا۔ اندرون ملک ہی نہیں بیرون ممالک میں بھی اس کی کافی آشنائی تھی۔ اس کا بزنس اندرون بیرون وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا تھا۔ اندرون و بیرون ممالک اس کے ہسپتال اور وی آئی پی ہوٹلز چل رہے تھے۔ علاوہ ازیں وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا وسیع بزنس کا مالک تھا۔ اندرون بیرون کئی فیکٹریوں میں بھی اس کے شیئرز چل رہے تھے۔ ممبئی کی ایک جانی پہچانی اور امراء کی لسٹ میں سرفہرست نام کا مالک رنبیز ملہوترا اس وقت اپنے سامنے آن وارد ہونے والے پولیس انسپکٹر کو دیکھ کر واقعی حیران وششدر رہ گیا تھا۔

''میں پوچھ سکتا ہوں کہ کس سبب آپ مجھے لے جانے کی جرأت کر رہے ہیں؟'' رنبیز ملہوترا نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔

''آپ کے خلاف درخواست دی گئی ہے کہ آپ اپنے ہسپتالوں سے انسانوں کے اعضاء کی اسمگلنگ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کے نیشنل وانٹرنیشنل ہوٹلوں میں انسانی گوشت کی ایک اسپیشل ڈش تیار کی جاتی ہے......'' انسپکٹر نے معنی خیز آنکھوں سے رنبیز ملہوترا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں احساس ہے اپنے الفاظ کا انسپکٹر اور تم جانتے ہو کہ تمہارے مدمقابل کون کھڑا ہے......؟'' انسپکٹر کی بات سن کر رنبیز ملہوترا نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔ رنبیز ملہوترا انسپکٹر کی بات سن کر غصے سے پیچ وتاب کھا کر رہ گیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فوراً سے بھی پیشتر انسپکٹر کی گردن مروڑ ڈالے۔ دیکھا دیکھی میں ایک جم غفیر اکٹھا ہو چکا تھا۔

''جی ہاں کیوں نہیں مجھ سے زیادہ آپ سے کون

آشنا ہوگا ملہوترا صاحب.....'' انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آپ کا بزنس دنیا کے کونے کونے میں پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے ملک کی ترقی میں آپ کا کردار ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے ہم اس بات سے بھی بخوبی آشنا ہیں کہ یہ آپ کے کسی حریف کی کوئی چال ہے جو آپ کے اسٹیٹس سے جیلس ہے اور آپ کے خلاف گھناؤنا پلان تیار کر رہا ہے لیکن ملہوترا صاحب آپ چنتا نہ کریں اگر آپ بے قصور ہوئے تو میں آپ سے پرومس کرتا ہوں کہ آپ کے حریفوں کو ناکوں چنے چبواؤں گا اور امید بھی کرتا ہوں کہ آپ ہماری معاونت کرنے میں کسی بھی قسم کی کوئی کمی نہیں برتیں گے ہماری معاونت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔''

''ہوں..... چلیے آپ اپنی جانچ پڑتال بھی کرلیجیے انسپکٹر صاحب لیکن ہمیں وشواس نہیں ہو رہا کہ کوئی ہم پر ایسا گھٹیا الزام بھی لگا سکتا ہے.....'' رنبیر ملہوترا نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے پیشانی پر سلوٹیں عیاں کرتے ہوئے کہا۔

''خاطر جمع رکھیں آپ.....'' انسپکٹر نے ملہوترا کے ساتھ اس کی بلٹ پروف گاڑی میں براجمان ہوتے ہوئے کہا جبکہ باقی کانسٹیبل پولیس وین میں سوار ہوکے ان کے پیچھے ہولیے۔

''ہاں اب بتاؤ انسپکٹر کیا بات ہے.....؟'' رنبیر ملہوترا نے گاڑی گیئر میں ڈالتے ہی پُرتشویش لہجے میں اس سے پوچھا۔

ایک لڑکی آئی ہے پولیس اسٹیشن۔ اس کے ہاتھ شاید کچھ شواہد لگ گئے ہیں مگر وہ شواہد اس صورت میں پولیس کے حوالے کرنے کی حامی بھرتی ہے کہ اگر ہم آپ کو اریسٹ کرکے اس کے سامنے لائیں تو.....

انسپکٹر کی بات سن کر ملہوترا نے سوالیہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

کیا ایس ایچ او سالا بھی وہیں موجود ہے.....؟ ملہوترا نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

نہیں ملہوترا صاحب یہی تو غنیمت ہے کہ آج ایس ایچ او صاحب ایک ارجنٹ میٹنگ میں آؤٹ آف سٹی گئے ہیں.....'' انسپکٹر نے چہک کر جواب دیا۔

''ایسے بھی کون سے شواہد اس لڑکی کے ہتھے لگ گئے ہیں.....؟'' ملہوترا نے متواتر غصے سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے کہا۔'' جانتے ہو اب ہماری غیر موجودگی میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئی ہوں گی۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا تک بات پہنچنے سے قبل ہی اس بات کو دبانا ضروری ہے۔ تم نے بے وقوفیت کی انتہا کردی ہے تم اتنے مورکھ ثابت ہوگے میں نے کبھی تخیل میں بھی نہ سوچا تھا۔ مجھے فون کرلیتے میں ڈائریکٹ وہاں آجاتا۔''

ملہوترا کا غصہ بدستور اپنی جگہ قائم ودائم تھا۔ اس نے اب سارا غصہ انسپکٹر پر اتارنا شروع کردیا۔ کیونکہ آن کی آن میں وہاں لوگوں کا جم غفیر اکٹھا ہوگیا تھا۔ کوئی عام انسان ہوتا تو ممبئی جیسے پرہجوم شہر میں اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا جاتا، چاہے پولیس اسے گھسیٹتے ہوئے لے جاتی۔ مگر رنبیر ملہوترا جس کے نام کا ڈنکا پورے شہر میں بجتا تھا۔ ہر کس وناکس اس کے نام سے آشنا تھا۔ امراء کی فہرست میں اس کا نام بھی لکھا جاتا تھا۔ پیسے کی ریل پیل تھی۔

''بقول اس کے وہ آپ کے لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ جنہوں نے اسے پکڑ کر قبر میں موجود دوسرے لوگوں کے ساتھ تہہ خانے میں مقید کردیا مگر نجانے کیسے وہ سب کو چکمہ دے کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔ میں نے حوالدار کو سمجھا دیا ہے وہ اسے الگ روم میں بیٹھا آیا تھا۔ اور میں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ کسی بھی طور اسے باہر نہ نکلنے دیا جائے یہاں اتنے لوگوں کی موجودگی میں آپ کے پاس آنا مجبوری تھا کیونکہ میں پچھلے دو گھنٹوں سے پیہم آپ کا نمبر ملا رہا ہوں جو متواتر بند جا رہا ہے۔ ہم یہاں ضروری کام سے آئے تھے اور اوپر سے آپ بھی فی الفور آگئے تو معذرت چاہتا ہوں

ایسی گستاخی کرنی پڑی۔۔۔‘‘ انسپکٹر کی بات کرتے کرتے آنکھیں جھک گئیں۔

’’تم لوگ تو آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے بورے ہو۔ جب دیکھ بھی رہے ہو کہ لوگوں کی نگاہیں متواتر ہم پر جمی ہوئی ہیں تو ایسی تقصیر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔۔۔‘‘ ملہوترا نے اسٹیئرنگ گھما کر موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

’’سر آپ چنتامت کریں جب آپ واپس جائیں گے تو سب کو اطمینان ہو جائے گا کہ ایسا کچھ نہیں تھا۔۔۔‘‘ انسپکٹر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس میں آنکھیں ملا کر بات کرنے کی جسارت نہ تھی۔ گاڑی پولیس اسٹیشن کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ رنبیر ملہوترا نے گاڑی ڈائریکٹ پولیس اسٹیشن کے اندر جا کے کھڑی کی۔ پولیس وین بھی پیچھے ہی جا کر رک گئی۔ سب یکے بعد دیگرے باہر نکلے۔

☆......☆......☆

رنبیر ملہوترا نے تین شادیاں کی تھیں مگر تینوں بیویوں سے اس کی متواتر لڑکیاں ہی پیدا ہوئیں۔ اس وقت وہ پانچ بیٹیوں کا باپ تھا۔ اس نے کبھی اس بات کا ماتم نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنی بیٹیوں کو بھی مکمل توجہ اور پیار دیتا تھا۔ اس کی پانچوں بیٹیاں اعلیٰ اداروں میں اسٹوڈنٹس تھیں۔ رنبیر ملہوترا نے تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی شادی اس کی اپنی پھوپھی زاد گردھاوی ملہوترا سے ہوئی تھی جس سے بھگوان نے اسے دو بیٹی (گانتی ملہوترا، شیفتہ ملہوترا) سے نوازا جبکہ بیٹے کی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اس نے دوسری شادی آؤٹ آف فیملی ٹھاکر اوتار سنگھ کی بیٹی ساوتری ملہوترا سے کی تھی۔ ٹھاکر اوتار سنگھ کئی فیکٹریوں کے مالک تھے اور بدقسمتی کہ ان کی صرف ایک بیٹی تھی۔ بیٹی کی پیدائش کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کی پتنی سورگباش ہو گئی تھی۔ ساوتری سے بھی رنبیر ملہوترا کو دو بیٹی (لکشمی ملہوترا، فنامیہ ملہوترا) ہوئیں۔ اس کا دل پسیج کر مٹھی میں آ گیا۔ تبھی اس کی ملاقات کرن سے ہوئی۔ کرن ایک متوسط گھرانے کی تھی۔ مگر شرم و حیا کی چادر میں لپٹی وہ کوئی اپسرا دکھائی دیتی تھی۔ جلد ہی کرن اس کی پتنی بن کر کرن سے کرن ملہوترا بن گئی۔ اس سے بھی بھگوان نے رنبیر ملہوترا کو ایک بیٹی دی جس کا نام مادھوری ملہوترا رکھا گیا تھا۔

کرن ملہوترا کو ہمیشہ کم ذات کا رتبہ دیا جاتا تھا۔ گردھاوی ملہوترا اور ساوتری ملہوترا کا کرن ملہوترا کے ساتھ برتاؤ بہت برا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ کرن ملہوترا نے آج تک کسی کے لیے بھی اپنے دل میں میل تک نہ آنے دی تھی۔ سونے پہ سہاگا گردھاوی ملہوترا اور ساوتری ملہوترا کی اولاد نے بھی پر نکالنے شروع کر دیئے تھے۔ کبھی کبھی تو کرن ملہوترا کا من کرتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو لے کر اس گھر سے کہیں دور چلی جائے جہاں وہ اپنی بیٹی کی آزادانہ تعلیم و تربیت پر دھیان دے سکے۔ رنبیر ملہوترا کی موجودگی میں سب کا ماں بیٹی کے ساتھ برتاؤ ایسا ہوتا تھا جیسے ان سے بڑا ان دونوں کا کوئی خیر خواہ ہی نہ ہوا۔ مگر رنبیر ملہوترا کے جاتے ہی سب گرگٹ کی طرح رنگ دھار لیتی تھیں۔

خود رنبیر ملہوترا کرن ملہوترا سے دوسری دونوں بیویوں کی نسبت زیادہ محبت کرتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کرن ملہوترا خوبصورتی میں اپنا کوئی ثانی نہ رکھتی تھی۔ جبکہ گردھاوی ملہوترا اور ساوتری ملہوترا پورے پورے نین نقش کی مالک تھیں۔ مزید برآں گانتی ملہوترا، شیفتہ ملہوترا، لکشمی ملہوترا اور فنامیہ ملہوترا کی نسبت مادھوری ملہوترا بہت حسین و جمیل تھیں۔ رنبیر ملہوترا کی زیادہ توجہ ان دونوں ماں بیٹی کی طرف دیکھ کر گردھاوی ملہوترا اور ساوتری ملہوترا نے اندر ہی اندر تپنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ کرن ملہوترا اور اس کی بیٹی سے جیلس ہونے لگی تھیں۔ دوسری طرف کرن کے ضبط کا پیمانہ بھی لبریز ہوتا چلا جا رہا تھا۔

ایک شام جب دونوں سوکنوں نے ملی بھگت سے کچھ ملازموں کو چھٹی دے دی اور کچھ کو دوسرے کاموں میں الجھا دیا۔ پھر گردھاوی ملہوترا نے کرن ملہوترا کو

رات کا کھانا تیار کرنے کا کہا تو کرن ملہوترا کا چہرہ غصے سے لال ہوگیا۔ وہ سب سمجھ چکی تھی کہ دونوں مل کے اب اس کے خلاف کوئی نہ کوئی پلان بنا رہی ہیں لیکن اس نے منہ سے کچھ نہ کہا اور رات کا کھانا تیار کرنے میں مصروف ہوگئی۔ مادھوری ملہوترا نے ماں کو کام کرتے ہوئے دیکھا تو ماں کا ہاتھ بٹانے آگئی۔ کرن ملہوترا نے تو اسے منع بھی کیا کہ وہ جا کر اسٹڈی کرے مگر وہ بھی بضد رہی تو کرن ملہوترا کو ہی ہتھیار ڈالنے پڑ گئے۔

''ماں آپ پاپا سے بات کیوں نہیں کرتیں، ان کے سامنے تو یہ کیسے ہمدرد ہو جاتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے ہمیں ہاتھوں کا آبلہ بنا کے رکھا ہوا اور پاپا کے جاتے ساتھ ہی ان کے رنگ وروپ ہی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ کام ملازموں کے کرنے کے ہیں اور کس قدر ڈھٹائی سے انہوں نے آپ کو کہہ دیا ہے۔۔۔۔'' مادھوری نے پیاز کاٹتے ہوئے آنکھوں سے گرتے پانی کو دائیں ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں میری بچی تم تردد مت کرو۔ یہ جیلس ہوتی ہیں کیونکہ تمہارے پاپا کی تمام تر توجہ تم پر لگی ہوئی ہے۔ تمہاری تعلیم و تربیت پر انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ یہ بھی سچ ہے کہ دوسری بیٹیوں کے ساتھ بھی انہوں نے کوئی ناانصافی نہیں کی مگر جتنی توجہ اور پیار وہ تم پر لٹا رہے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ توجہ اور پیار میسر نہیں آسکا یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اندر ہی اندر جیلس ہو چکی ہیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا کہ ہمیں کچا چبا ڈالیں۔۔۔۔'' کرن ملہوترا نے بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ کہ سلاد تیار ہوا کہ نہیں، میں نے سارا کام مکمل کرلیا ہے۔''

''ارے آج بھوک سے کیا مارو گی کیا دونوں ماں بیٹیاں۔۔۔۔'' دستر خوان پہ سب جمع ہو چکے تھے۔ رنبیز ملہوترا کو سنانے کے لیے ساوتری ملہوترا نے طنزیہ لہجے میں زور سے انہیں پکارا حالانکہ ابھی وہ دیکھ کے گئی تھی کہ سب کچھ تیار تھا۔'' آج دونوں ماں بیٹیوں نے ملازموں کی بجائے کچن خود سنبھال لی ہے کہتی ہیں کسی کے ہاتھ کا پکا حلق سے نیچے نہیں اترتا۔''

ساوتری نے رنبیز ملہوترا کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ تیر چھوڑا لیکن آگے سے رنبیز ملہوترا کے جواب نے سب پر سکتہ طاری کر دیا۔

''یہ پہچان ہوتی ہے ایک سلیقہ شعار عورت کی۔ ملازمائیں نجانے پاکی ناپاکی کا کہاں تک خیال برتتی ہوں گی بہت اچھا کیا ہے بلکہ میں تو کرن کی اس بات کی داد دیتا ہوں، یقین مانو کرن تم نے آج میرا دل جیت لیا ہے۔ میری بیٹی کو گھرداری سکھاؤ، ان لوگوں کو تو اپنی بیٹیوں کا خیال ہی نہیں ہے نجانے کیسے سسرال پلے پڑیں۔۔۔۔'' رنبیز ملہوترا نے ساوتری کی بات کا جواب دیتے ہوئے کچن سے سامان اٹھاتے دونوں ماں بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس کی بات سن کر سب کو جیسے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔ سب نے کھا جانے والی آنکھوں سے دونوں زیر لب مسکراتی ماں بیٹی کو دیکھا۔ دونوں کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ جلوہ گر تھی۔ خاص کر مادھوری ملہوترا تو باپ کی بات سن کر خوشی سے باغ باغ ہوگئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی دونوں سوتیلی ماؤں نے ان دونوں بیٹیوں کے خلاف اس کے باپ کے کان بھرنے چاہے تھے مگر بے سود۔

''میری پیاری بچی بہت پیاری لگ رہی ہو تم مجھے بہت خوشی ہے تمہیں ماں کا ہاتھ بٹاتے دیکھ کر۔ یہ سب تعلیم و تربیت پر منحصر ہوتا ہے جیسی اولاد کی تربیت کی جائے ویسی ہی وہ پرورش پاتی ہیں۔۔۔۔'' رنبیز ملہوترا کی بات میں چھپا طنز نہ صرف اس کی دونوں بیویوں کی سمجھ میں آچکا تھا بلکہ اس کی اولاد بھی بات کو سمجھ چکی تھی جو کام کو ہاتھ لگانا گناہ گردانتی تھیں۔ پکی پکائی کھانے کی عادی ہو چکی تھیں۔ ان پر تو بس ایک ہی دھن سوار تھی۔ ہر وقت میک اپ کرنا، بیٹھے بٹھائے کھانا، ہمہ وقت کسی نہ کسی ڈے وناٹ محفل میں جانا مگر کرن ملہوترا اور اس کی بیٹی ان سب سے بہت مختلف تھیں۔ وہ

گھر میں رہنا ہی بہتر سمجھتی تھیں۔ غیر کے سامنے جانا وہ گناہ سمجھتی تھیں۔ جبکہ دوسری ازدواج اور بیٹیاں بلا جھجک جایا کرتی تھیں۔

رنبیر ملہوترا اپنی بیوی کرن ملہوترا اور بیٹی مادھوری ملہوترا سے بہت چاہت رکھتا تھا۔ سراٹھاتی گھریلوں کشیدگیوں سے بھی وہ آشنا تھا۔ مگراس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ کرن ملہوترا اور مادھوری ملہوترا ملنسار تھیں۔ رنبیر ملہوترا کو کبھی کبھی احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک غلط راہ پر چل رہا ہے۔ جس پر کسی بھی وقت وہ چلتے چلتے کسی آفت ناگہانی کا شکار ہو جائے گا۔ مگر افسوس کہ ہوس انسان پر جب ایک بار قابض ہو جاتا ہے تو انسان کے سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتیں مفقود پڑ جاتی ہیں۔ یہ وقتی احساس ہوتا تھا کہ وہ غلط ہے لیکن جلد ہی وہ یہ بات کہہ کر اپنے اس احساس کو غلط قرار دے دیتا کہ:

''غلط میں نہیں پوری دنیا ہے۔ ایسا کون سا منش پارسا ہے جو اپنی پارسائی کا دعویدار ہو۔ ویسے ہی طرح لوگ من کی دیوار پر پاپوں کے داغ دھبے چھپانے کے لیے دھرم اور خدمت خلق کا کیلنڈر لٹکا دیتے ہیں۔

''شہرت میں آفت ہے'' کے مقولے پر ایسے لوگ دھیان نہیں دیتے۔ جو لوگ ''رسک نہیں لیتے وہ عموماً گمنام زندگی گزارتے ہیں۔'' مگر رنبیر ملہوترا اس بات سے ناآشنا تھا کہ اس کی شہرت اس کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کی زندگی اب ایک نیا موڑ لینے والی تھی جس سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔

☆......☆......☆

تمہیں زندگی بچ جانے پر بھگوان کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا مورکھ لڑکی۔ تم نے ایک بار پھر ایک بہت بڑی غلطی کی ہے اب تو تمہارا انجام سیدھا موت ہی ہوگا۔۔۔'' رنبیر ملہوترا نے اس لڑکی کی طرف غصیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا

''تم مجھے مار بھی ڈالو تو اب مجھے اس کی کوئی چنتا نہیں ہے رنبیر ملہوترا، میں جانتی تھی کہ یہ رشوت کے لالچی تمہارے سامنے کتے کے جیسے دم ہلانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔۔۔'' لڑکی نے جواباً رنبیر ملہوترا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو اس کی بات پر رنبیر ملہوترا سمیت پولیس انسپکٹر بھی چونکے بنا نہ رہ سکا۔

''تمہارے کہنے کا مطلب کیا ہے۔۔۔؟''

رنبیر ملہوترا نے اس کی طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

جواباً لڑکی نے کوئی جواب دیئے بغیر ایک لفافہ اس کی طرف میز پر اچھال دیا۔ اس نے جھٹ لفافہ کھولا تو اگلا منظر دیکھ کر اس کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ اسے یوں لگا کہ ابھی آسمان ٹوٹ کر اس کے اوپر آ گرے گا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو بلا خوف و خطر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''یہ سب تمہارے پاس کہاں سے آیا۔۔۔؟''

رنبیر ملہوترا نے اس سے استفسار کیا جواباً لڑکی کے لبوں پہ معنی خیز مسکراہٹ عیاں ہوئی۔

''چونک گئے نہ تم رنبیر ملہوترا۔۔۔؟'' لڑکی نے اس کی بات کا جواب دیئے بنا سوال داغا۔

''کم ذات زبان چلاتی ہے میں تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں، بتا کس نے دیا ہے یہ سب کچھ تجھے۔۔۔؟'' رنبیر ملہوترا نے یکبارگی اٹھ کر اسے بالو سے پکڑ کر کرسی کی پشت سے لگاتے ہوئے کہا۔ ہاں اس نے آناً فاناً اتنی زور سے پکڑے تھے کہ لڑکی کی ہلکی سی سسکی نکلی مگر جلد ہی وہ اپنے منتشر ہوتے جذبات پر قابو پانے میں پھسل ہوگئی۔

''اسی نے جس نے مجھے تمہاری قید سے آزادی دلائی۔۔۔'' لڑکی نے شدت درد کو سہتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''بول کون ہے وہ میں تیری جان بخشی کر دوں گا اگر نہیں بتلائے گی تو تجھے کو یہیں ٹھونس دوں گا۔۔۔''

رنبیر ملہوترا کا غصہ عروج پر تھا۔ اس نے ناک سکیڑ کر پیشانی پر سلوٹیں عیاں کرتے ہوئے اب کی بار اس سے پوچھا۔

''ہوں۔۔۔کسی غلط فہمی میں رہ، تو میرے بھائی کا قاتل ہے۔ تو نے اس کے اعضاء نکلوا کے بیچ ڈالے۔ تو مجھے کیا بخشے گا اور نہ ہی میں جینا چاہتی ہوں۔۔۔بس تو کان کھول کر ایک اور خوشخبری سن لے یہ جو فوٹو تیرے ہاتھ میں ہیں ناں ان کی ایک ایک کاپی جگدیش کے پاس پہنچ چکی ہے اور صبح تک اخبار کے مین پیج پہ تیرے ان کارناموں کو منظر عام پر لایا جائے گا۔ علاوہ ازیں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا تیری جعلی عزت کی دھجیاں اڑادیں گے۔۔۔تو ایک ایسی موت مرے گا جس کا تو نے کبھی تخیل میں بھی نہ سوچا ہوگا۔۔۔'' لڑکی نے غصے سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے کہا۔ جبکہ رنبیز ملہوترا نے ایک طائرانہ نگاہ اس پر ڈالی، دوسرے ہی سمے اس نے لڑکی کی گردن مروڑ دی اور لڑکی کا مردہ جسم ایک طرف لڑھک کر فرش پر جا گرا۔

''سر۔۔۔'' انسپکٹر نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا لیکن اس کے مزید کچھ بولنے سے قبل ہی ایک نوٹوں کی گڈی اس کے ہاتھوں میں تھما تا رنبیز ملہوترا وہاں سے جا چکا تھا۔

☆......☆......☆

مادھوری اور جگدیش کی پہلی ملاقات یونیورسٹی میں ہی ہوئی تھی۔ جگدیش ایم اے صحافت کر رہا تھا۔ اسے صحافت سے بہت لگاؤ تھا۔ شروع سے ہی وہ ادبی دنیا سے رشتہ استوار کیے ہوئے تھا۔ ایک مقامی نیوز پیپر میں اس کا کالم بھی آتا تھا اور اس وقت وہ ماسٹر فرسٹ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا جب اسے ایک اخبار نے اپنے نمائندے کے طور پر رکھ لیا تھا۔ ایم اے صحافت مکمل کرنے تک وہ صحافت کی دنیا کا ایک مشہور صحافی بن چکا تھا۔ اس نے صحافت کی دنیا میں رہتے ہوئے ایسے ایسے کارنامہ ہائے سرانجام دیئے تھے کہ عقل انسانی دنگ رہ جائے۔

چند ماہ قبل اسے رنبیز ملہوترا سے متعلق کچھ انفارمیشن موصول ہوئی تھیں جو جلد ہی اسے پتہ چل گیا تھا کہ وہ حقیقت پر مبنی تھیں۔ لیکن کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے وہ رنبیز ملہوترا جیسے انٹرنیشنل شہرت کے حامل انسان پر ہاتھ ڈالنے سے گریز کرتا تھا۔ دوسری طرف مادھوری اور اس کے مابین محبت کی ایک روداد چل رہی تھی جو آخری مراحل میں تھی وہ جلد ہی اسے اپنی پتنی بنا لینا چاہتا تھا۔ مگر اس کی خواہش تھی کہ وہ اس سے قبل ہی رنبیز ملہوترا کی اصلیت دنیا کے سامنے عیاں کردے۔ جب اسے متواتر ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا تو اس نے ایک لیڈی ڈاکٹر کو جو کبھی اس کی گرویدہ رہ چکی تھی۔ اور ایک پارٹی میں اظہار عشق بھی کر چکی تھی اسے ساتھ دینے کا کہا تو اس نے فوراً سے بھی پیشتر حامی بھرلی۔

اسی دن سے دونوں کی محنت شروع ہوگئی۔ اس لیڈی ڈاکٹر نے جس کا نام ڈاکٹر منہما پرتاب تھا۔ ڈاکٹر منہما پرتاب پر تاثیر شخصیت تھی۔ جلد ہی اس نے اپنے اثر ورسوخ بڑھائے اور رنبیز ملہوترا کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے رنبیز ملہوترا کو مکمل اعتماد میں لے لیا۔ باوجود اس کے رنبیز ملہوترا نے کبھی اس پر اعتماد کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ اس نے کئی بار چاہا کہ رنبیز ملہوترا اس سے وہ باتیں شیئر کرے جن کے حصول کے لیے وہ یہاں آئی تھی مگر وہ اس بات سے بالکل ناآشنا تھی کہ اس کی مکمل طور پر نگرانی کی جارہی تھی اور جلد ہی اس کی اصلیت رنبیز ملہوترا کے سامنے آگئی اور اس نے اسے بھی قید میں پھینکوادیا جس میں سے نجانے کیسے وہ جان بچا کے رفو چکر ہوگئی اور اسے پکڑنے کے لیے رنبیز ملہوترا کے آدمی دن رات سرگرداں رہتے تھے۔ مگر وہ تو گدھے کے سر سے سینگ کے جیسے یوں نو دو گیارہ ہوئی گویا زمین نگل گئی ہو یا آسمان کھا گیا ہو۔ اب اسے یکبارگی سامنے دیکھ کر ایک بار تو اس کا ماتھا ٹھنکا تھا مگر پھر اسے خوشی بھی ہوئی کہ مچھلی خود ہی جال میں پھنس چکی ہے اس کی تمام حجت پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی مگر اس کے منہ سے اگلی بات سن کر اس کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی اس نے فوراً سے

بھی پیشتر اپنے آدمیوں کو جگدیش کے آفس بھیج دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ ثبوت وہاں سے نکال کے لے آئیں۔

ادھر مادھوری ملہوترا جگدیش سے ملنے اس کے آفس گئی مگر وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ابھی وہ آفس جگدیش کے انتظار میں بیٹھی ہی تھی کہ ایک ملازم ایک لفافہ جو ابھی UMS آیا تھا رکھ کر الٹے قدموں لوٹ گیا۔ ایسے ہی اس نے اس لفافے کو کھولا تو اگلا منظر دیکھ کر اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔ اسی لمحے اسے کسی کے بڑھتے قدموں کی چاپ سنائی دی اس نے فی الفور اس لفافے کو اپنے پرس میں چھپالیا۔ آنے والا کوئی اور نہیں جگدیش ہی تھا۔ جو اسے دیکھ کر چونکا نہیں بلکہ زیرلب مسکرادیا۔

''آج خیریت تو ہے جناب کے چہرے پر بارہ بجے ہوئے ہیں کوئی پریشانی لاحق تو نہیں ہے۔۔۔؟'' جگدیش نے اپنی چیئر پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔ مادھوری نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی اور ایک لمبی سانس خارج کی۔

''ہوں۔۔۔۔'' وہ زیرلب مسکرائی۔ مسکراہٹ کیا تھی گویا کرب کی کیفیت میں ہونٹوں نے کروٹ بدلی ہو۔ ''چہرہ ہی ایسا ہے۔''

''واہ۔۔ آج صبح ہی صبح مذاق لگتا ہے کوئی خاص بات ہے۔۔۔؟'' جگدیش نے سوالیہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''زندگی نام ہی مذاق کا ہے کبھی مذاق بنادی جاتی ہے تو کبھی مذاق بن جاتی ہے۔۔۔'' ماھوری نے ٹیبل پر پڑا پیپر ویٹ گھماتے ہوئے کہا۔

''کوئی خاص بات ہے ضرور۔۔۔۔؟'' اب کی بار جگدیش نے اس کی طرف سوالیہ آنکھوں سے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

'''تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو۔۔۔؟'' مادھوری نے اس کی طرف کھا جانے والی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے سوال داغا تو جگدیش پر جیسے بم آگرا ہو۔

''واٹ یو مین۔۔۔۔؟'' اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آئی مین کہ تم مجھے کس کام کے لیے یوز کرنا چاہتے ہو۔ یہ تو آشکار ہو چکا ہے مجھ پر کہ تم مجھ سے محبت کا ناٹک کرتے آئے ہو۔ میرے احساسات وجذبات کو روندتے آئے ہو لیکن سوال یہ ہے کہ ان سب باتوں کے پیچھے ایسی کون سی وجہ پنہاں ہے، جس کی وجہ سے تم ایسا کرتے آئے ہو۔۔۔؟'' مادھوری ملہوترا کی دائیں آنکھ کا دایاں کونا تقریباً بھیگ چکا تھا۔

''تم اضطرابیت کا شکار ہو یا تم نے کوئی خوفناک سپنا دیکھا ہے جو ہمارے حواس پر سوار ہو گیا ہے تبھی تو تم ایسی بہکی بہکی باتیں کررہی ہو۔۔۔۔'' جگدیش نے ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے کوئی اضطرابیت نہیں، نہ ہی میں نے کوئی خوفناک سپنا دیکھا ہے جو حقیقت ہے وہ میں جان چکی ہوں۔۔۔۔'' اتنا کہہ کر مادھوری نے نشست چھوڑ دی اور کھڑی ہو گئی۔

''ایک بات میری کان کھول کر سن لو جگدیش اگر تم نے کبھی میرے پتاجی کے خلاف کوئی کنواں کھودنے کی کوشش کی تو ہمیشہ مجھے اپنے مدمقابل پاؤ گے یو انڈرسٹینڈ''

''مادھوری تمہیں ہو کیا گیا ہے آخر تم پاگل تو نہیں ہو گئی، کیسی بیوقوفوں والی باتیں کر رہی ہو۔۔۔؟'' جگدیش بھی غصے سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے بولا اور اپنی نشست سے اٹھ کر اس کے قریب گیا۔ اتنا قریب کہ دونوں کو ایک دوسرے کے سانسوں کی زیروبم کی آوازیں مترنم سنائی دے رہی تھیں۔

''یہ بات تمہیں بھی سن لینی چاہیے کہ تمہارے پتاجی خونی ہیں، نجانے کتنے مظلوموں کی جان لے چکے ہیں لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے کہ میرا تم سے محبت کوئی ناٹک نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے اور میں نے آج تک تمہیں یوز کرنے کی کوشش تک نہیں کی۔ رہی بات اپنے

پتاجی کی ڈھال بننے کی تو تم بنو ایک بات یاد رکھنا
مادھوری میرا کام ہے دوسروں کی سیوا نہ کہ دوسروں پر
ظلم۔ میں قطعاً یہ بات برداشت نہیں کر سکتا کہ اس
قدر بے دردی سے لوگوں کے ساتھ ظلم وستم ہو، اور اگر تم
اس رشتے کو ختم کرنے کا مصمم ارادہ کر ہی چکی ہو تو میں
تمہیں روکوں گا نہیں لیکن یاد رکھنا میری تلوار کی
دھار کے نیچے جو بھی آیا مولی گاجر کی طرح کاٹ پھینکوں
گا اسے۔“

ابھی جگدیش نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر دوڑتے
قدموں کی بازگشت سن کر دونوں چونکے۔ دونوں نے
ایک دوسرے کی طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھا۔
مادھوری ملہوترا سمجھ چکی تھی کہ اس کے پتا کے کارندے
ثبوت حاصل کرنے کے لیے یہاں آچکے ہیں اور ممکن
ہے ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے وہ جگدیش کو ابدی نیند
سلادیں۔ اس کے دل میں چند سے پہلے پیدا ہونے
والی نفرت کا دھارا ایک بار پھر محبت کی طرف بہہ نکلا۔

تبھی دروازے کے دونوں پٹ زور سے کھلے اور
درجنوں مسلح نقاب پوش اندر داخل ہوئے جنہیں دیکھ کر
دونوں مبہوت رہ گئے۔ جگدیش نے ایک سوالیہ نظر
مادھوری ملہوترا پر ڈالی، مادھوری ملہوترا اس کے دیکھنے
سے سمجھ چکی تھی کہ وہ اسے قصوروار سمجھ رہا تھا مگر اس میں
اس کا کیا قصور تھا۔ حالات یکبارگی اتنی کشیدگی
اختیار کر جائیں گے مادھوری ملہوترا نے کبھی تخیل میں
بھی نہ سوچا تھا۔

”کہاں ہے وہ لفافہ جس میں UMS آیا
تھا۔۔۔؟“ ایک نقاب پوش نے جگدیش کی کنپٹی پر
پستول کی نال جماتے ہوئے پوچھا۔

”کون سا لفافہ۔۔۔؟ تم لوگ کس لفافے کی
بات کر رہے ہو اور ہو کون تم لوگ۔۔۔؟“ جگدیش
نے انگشت بدنداں ہو کر پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں خوف وتھرتھراہٹ نہ
تھی۔ لیکن وہ حیران وششدر ضرور تھا کہ یہ سب کون
ہیں اور کس لفافے کی بات کر رہے تھے؟ اسے تو کچھ سمجھ
نہیں آرہی تھی۔ بس اس کے دماغ میں ایک ہی بات
گردش کر رہی تھی کہ یہ سب مادھوری ملہوترا کا کیا دھرا
ہے جبکہ مادھوری تو اس کی آمد سے قبل ہی آئی تھی۔ اسے
مادھوری ملہوترا کے چہرے سے ہی نفرت ہوگئی تھی۔
خوبصورت دکھائی دینے والے چہرے کی حقیقت اس
قدر بھیانک ہو سکتی تھی اس نے تو کبھی تخیل میں بھی نہ
سوچا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آگے بڑھ کر اس
کا گلا گھونٹ ڈالے۔

جبکہ دوسری طرف مادھوری ملہوترا کو کچھ سمجھ نہیں
آرہی تھی کہ کرے تو کیا کرے۔ مسلح نقاب پوش اس
بات سے قطعی ناآشنا تھے کہ وہاں موجود دوشیزہ اس کے
باس کی ہی بیٹی ہے۔ مادھوری ملہوترا کی کنپٹی پر بھی ایک
مسلح نقاب پوش پستول کی نال جمائے کھڑا تھا جبکہ
جگدیش یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ سب مادھوری ملہوترا کی
چال ہے۔

”ارے کون سا لفافہ؟“

”سالے وہی لفافہ جو تیری اس ڈاکٹر منہما پرتاب
نے تجھے UMS کروایا تھا، جس میں ملہوترا صاحب
کے خلاف مکمل ثبوت تھے بول نہیں تو تیری گردن تیرے
دھڑ سے جدا کر ڈالوں گا۔۔۔“ اسی نوجوان نے
پستول ہٹا کر بازو کے شکنجے میں جگدیش کی گردن
جکڑتے ہوئے کہا۔ اس نے گردن اتنے زور سے
جکڑ رکھی تھی کہ جگدیش کو سانس لینے میں بھی دشواری
سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا اس کا رنگ ایک دم سے ہلدی
مائل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہیں متواتر مادھوری
ملہوترا پر ٹکی ہوئی تھیں جبکہ مادھوری ملہوترا شرم سے پانی
پانی ہوتی جارہی تھی۔ اسے کچھ بھائی نہ دے رہا تھا کہ
کرے تو کیا کرے۔

”ابھی تک تو مجھے ایسا کوئی UMS موصول نہیں
ہوا اور پرارتھنا کر کہ ملے بھی نا، اگر مل گیا تو رنبیر ملہوترا
کے تن پر سے چمڑی تک ادھیڑ لوں گا۔۔۔۔“
جگدیش نے اپنی تمام تر قوت کو یکجا کرتے ہوئے بڑی
مشکل سے کہا جبکہ اس کی کھا جانے والی آنکھیں متواتر

مادھوری ملہوترا پر ہی مرکوز تھیں۔ قبل اس کے کہ وہی مسلح نوجوان جس نے جگدیش کی گردن دبوچ رکھی تھی بولتا اس کا ایک اور ساتھی بول پڑا جس نے آفس کی ہر چیز کو اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر پھینکا تھا اور پورے آفس کا حلیہ ہی بدل کر رکھ دیا۔

''سر یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

اس کی بات سن کر اس نوجوان نے ایک نفرت بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

''اس کی تلاشی لو۔''

اس نے جگدیش کو اس کی طرف دھکا دیتے ہوئے کہا۔ اس کے بازوؤں میں جکڑی گردن چھوٹی تو جگدیش کی سانسوں میں سانس آئی۔ اس نے لمبے لمبے سانس لینے شروع کردیئے۔ جبکہ دونوں مسلح جوان اس کی تلاشی لے رہے تھے مگر اس کے پاس سے بھی کچھ نہ ملا۔ تو اس نوجوان نے مادھوری ملہوترا کی طرف منہ پھیرا۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتا مادھوری خود ہی بول پڑی۔

''کوئی غلط قدم اٹھانے سے قبل یہ بات ذہن نشین کرلو کہ میں رنبیز ملہوترا کی بیٹی مادھوری ملہوترا ہوں۔۔۔''

مادھوری ملہوترا کی بات سن کر نوجوان نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر فوراً سے بھی پیشتر اپنی جیب سے موبائل نکالا۔ مادھوری ملہوترا کا دل دھک دھک دھڑک رہا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ جب اس کے پتا کو اس بات کی خبر ہوگی کہ اس کے جگدیش کے ساتھ سمبندھ ہیں۔ وہ تو اس کو جان سے مار ڈالیں گے مگر اسے اگلا لائحہ عمل کیا اختیار کرنا تھا اس نے دل میں سوچ لیا تھا۔

''سر یہاں سے ویسے تو کوئی ثبوت نہیں ملا لیکن جگدیش کے آفس میں اس کے ساتھ ایک لڑکی ہے، جو کہتی ہے کہ وہ آپ کی بیٹی ہے مادھوری ملہوترا نام بتاتی ہے۔۔۔ جی ہاں سر۔۔۔ ٹھیک ہے سر۔۔۔'' نجانے دوسری طرف سے کیا کہا گیا۔ بات کرتے ہوئے اس نوجوان نے ایک بھرپور نگاہ مادھوری ملہوترا پر ڈالی دوسرے ہی لمحے موبائل مادھوری ملہوترا کے کانپتے ہاتھوں میں تھا۔

''جی پتا جی۔۔۔'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے بمشکل کہا جبکہ دوسری طرف رنبیز ملہوترا کو اپنی قوت سماعت پر وشواس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ جس سے بات کر رہا ہے وہ اس کی سب سے لاڈلی بیٹی مادھوری ہے۔

''مادھوری تم اور وہاں۔۔۔ واٹ آنان سینس۔۔۔ تم وہاں کیا کر رہی ہو۔۔۔؟'' رنبیز ملہوترا کے لہجے میں اچانک سے چاشنی سے ترشی پیدا ہوئی۔

''پتا جی انہیں کہیں کہ یہ مجھے آپ کے پاس لے آئیں پھر میں آپ کو ساری حقیقت بتاتی ہوں، آپ کے لیے ایک نہایت ہی اچھی نوید ہے۔۔۔'' اس نے آناً فاناً چہک کر کہا۔ اور ایک طائرانہ نگاہ جگدیش پر ڈالی۔

''تم وہیں رکو میں وہیں آرہا ہوں۔۔۔'' رنبیز ملہوترا نے مختصر جواب دیا اور مزید کچھ کہے سنے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔ تھوڑی ہی دیر میں رنبیز ملہوترا جگدیش کے آفس میں تھا۔

''پتا جی آپ کچھ غلط مت سوچیئے گا اگر میں بروقت نہ آتی تو ممکن تھا کہ آپ کی عزت، جاہ و جلال اور رعب و دبدبے کی دھجیاں اڑا دیتا یہ شخص۔۔۔'' مادھوری ملہوترا نے بات کرتے کرتے ایک دم جگدیش کی طرف مٹھی بھینچ کر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر پرس میں چھپایا وہ لفافہ نکال کر اپنے پتا جی کے ہاتھوں میں تھما دیا جسے دیکھتے ہی رنبیز ملہوترا کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس نے لفافے میں سے تصاویر نکال کر دیکھی۔

''پتا جی میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں اور آپ پر کوئی آنچ آئے میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی میں اپنی جان تو دے سکتی ہوں لیکن آپ کو کانٹا بھی چبھے مجھے برداشت نہیں''

مادھوری نے پتا سے لپٹتے ہوئے کہا تو جگدیش کی حیرت بڑھ گئی۔ وہ کبھی تخیل میں بھی نہ سوچ سکتا تھا کہ یہ

عورت جسے وہ دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا تھا اسے اس قدر ذلیل وخوار کرسکتی ہے۔اس نے تا زیست جس عورت سے محبت کی تھی وہ اتنی ہرجائی ثابت ہوسکتی تھی ۔اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

''میں تم دونوں باپ بیٹی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔۔۔'' جب جگدیش کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو اس نے پاس ہی مستعد ایستادہ نوجوان سے اس کی گن چھین کر ان دونوں کی طرف اس کی نال کرتے ہوئے کہا۔جسے دیکھ کر دونوں حواس باختہ ہوگئے مگر تب تک رنبیز ملہوترا کے ایک مسلح نوجوان کی گن جگدیش کا سینہ گولیوں سے چھلنی کرچکی تھی۔جگدیش کے ہاتھوں میں پکڑی گن زمین پر گرچکی تھی۔اس کی حیرت میں ڈوبی آنکھیں متواتر مادھوری ملہوترا پر ہی ٹکی ہوئی تھی۔وہ زیرلب بڑبڑایا مگر اس کی آواز کسی کی قوت سماعت سے بھی نہ ٹکرا پائی تھی۔دوسرے ہی لمحے اس کا مردہ جسم فرش پر جاگرا۔پورے کمرے میں خون کے دھبے پھیل چکے تھے۔مادھوری ملہوترا پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔وہ شخص جو اس سے جان سے بھی زیادہ محبت کرتا تھا اس کے ساتھ اس نے بے وفائی کی تھی۔اس کی موت کی ذمہ داری وہی تھی۔

''تم بہت عقل مند ہو بیٹی۔میرا مان آج تم پر اور بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔۔۔'' رنبیز ملہوترا نے مادھوری ملہوترا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''پتاجی۔۔۔'' مادھوری ملہوترا سوالیہ نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوئی تو رنبیز ملہوترا نے اس کی طرف دیکھا۔

''میں بھی آپ کے کاروبار میں شراکت اختیار کرنا چاہتی ہوں۔''

یہ ایک ایسا جملہ تھا جس نے رنبیز ملہوترا کو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن کرکے رکھ دیا۔اس نے ایک بھرپور نگاہ اپنی بیٹی پر ڈالی۔

دوسرے ہی لمحے رنبیز ملہوترا اور اس کے کارندوں کی گاڑیاں سرعت سے فراٹے بھرتی جارہی تھیں۔

مادھوری ملہوترا باپ کے ساتھ پچھلی نشست پر براجمان تھی۔جبکہ ڈرائیور کے علاوہ ایک مسلح کارندہ بھی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر براجمان تھا۔رنبیز ملہوترا اپنی بیٹی کو پورے راستے میں صرف یہی سمجھاتا آیا کہ اسے اس کے کاروبار میں شرکت کرکے کیا کرنا ہے اور کس طرح اپنے فرض منصبی پر پورا اترنا ہے اور کسی بھی قسم کی غفلت کے عوض اس کی جان لینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے گا۔پہلے تو مادھوری ملہوترا کو چنداں خوف کا احساس ہوا مگر جلد ہی خوف کی وہ لہر ختم ہوگئی کیونکہ جب دنیا میں وہ شخص ہی نہ رہا تھا جس کے ساتھ اس کی زندگی کی ڈوری جڑی تھی تو اسے زندہ رہنے یا مرنے میں فرق ہی کوئی نہ معلوم ہورہا تھا۔اس کا مقصد اب صرف ایسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا جو محبت کرتے ہیں اور محبت کے دعویدار بنتے ہیں۔

اس کی نظروں کے سامنے دو چہرے گھومنے لگے تھے۔اس کے بہت ہی قریبی چہرے،اس کے اپنے چہرے۔اس نے اس کام کی ابتدا اپنی محبت سے ہی تو کی تھی اور اپنوں کو ہی پہلے اس چکی میں پیسنے کی سوگند کھا چکی تھی۔

☆......☆......☆

پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا نے جگدیش کی موت پر پہیہ جام ہڑتال کررکھی تھی لیکن کسی کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہوسکنے کی بنا پر کسی پر انگلی اٹھانا بھی ممکن نہ تھا۔حالات کی کشیدگی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اعلیٰ حکام نے جلد از جلد انصاف کی یقین دہائی کرائی اور اسی دن ہڑتال اپنے انجام کو پہنچ گئی۔اور کئی بے گناہوں کے جیسے جگدیش کی فائل بھی پولیس کی ردی میں ڈال دی گئی۔

مادھوری ملہوترا کو رہ رہ کر اپنے عمل پر پچھتاوا ہورہا تھا۔اس نے جلد بازی میں اپنی ہی محبت کو ابدی نیند سلا دیا تھا۔وہ کرنا کچھ چاہ رہی تھی مگر آن کی آن میں ہو کچھ گیا تھا۔اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اپنی محبت کو اپنی آنکھوں کے سامنے تڑپتا،سسکتا موت کے گھاٹ

اثر تا دیکھے گی۔ لیکن نجانے کیوں اس کی زبان سے ایسے الفاظ پھسلنے لگے جنھوں نے پلک جھپکتے میں جگدیش کو موت کی وادی میں پہنچا دیا تھا۔

جگدیش تو اپنے انتقام کو پہنچ چکا تھا مگر مادھوری ملہوترا کا سکون غارت ہو چکا تھا۔ راتوں کی نیند کوسوں دور جا چکی تھی۔

وہ بیٹھے بیٹھے چونک اٹھتی۔ سوئے سوئے اچانک وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی۔ کئی بار اس کی ماں نے اس کیفیت کی وضاحت طلب کی تو اس نے یہی جواب دیا کہ ''سوئے ہوئے اچانک یوں لگتا ہے جیسے کوئی مجھے جھنجھوڑ رہا ہو لیکن جب آنکھ کھولتی ہوں تو خالی پن کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔''

اس کی ذات میں ایک بھونچال آ چکا تھا جس نے اس کی ذات کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ اسے خود سے بھی خوف محسوس ہوتا تھا۔ جگدیش کو چاہ کر بھی وہ دل و دماغ سے نکال نہ پا رہی تھی۔ اس نے خود ہی کنواں کھودا تھا اور اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی سچی محبت کو اس میں دھکیل کر اس کنویں کو بند کر دیا تھا۔ محبت کا ایک انوکھا باب تحریر کر کے خود ہی ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ کیا یہ ہی محبت کی حقیقت تھی۔

واقعی کسی چیز کی قدر و قیمت کا احساس تب ہی ہوتا ہے جب ہم اسے کھو بیٹھتے ہیں اور پھر اس کو پانے کے لیے کتنے ہی پاپڑ بیلیں بے سود۔ اور پھر انسان کوئی چیز تو نہیں ہوتا۔ انسان تو انس سے نکلا ہے اور انس انسیت سے بنتا ہے۔ پھر محبت تو انسان سے ہو کر انسان سے شروع ہوتی ہے اور جب اس انسان کو جس پر ہم دل و جان سے گرویدہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس کو کھو بیٹھیں تو زندگی بے فائدہ اور بے معنی لگنے لگتی ہے۔

مادھوری کی حالت ویدنی تھی۔ اس کے دل میں خود اپنے لیے ہی نفرت کے بوئے بیج تناور درخت کا روپ دھار رہے تھے۔ محبت کے نام پہ وہ خود ہی دھبہ بن چکی تھی۔ اور اب اس نے اس محبت کے نام کو ہی جڑ سے مٹانے کی ٹھان لی تھی۔ تبھی اس کی دھندلائی آنکھوں کے سامنے انسپکٹر پانڈے لال کا چہرہ گھومنے لگا۔ ایک نائٹ پارٹی میں انسپکٹر پانڈے نے اس سے اظہار محبت کیا تھا مگر اس نے معذرت کر لی تھی کہ وہ آل ریڈی کسی میں انٹرسٹڈ ہے اور پھر اس کے بعد انسپکٹر پانڈے نے کبھی اس کی ذات میں انٹر ہونے کی کوشش نہ کی تھی۔

''ہوں۔۔۔ محبت کرتا ہوں تم سے۔۔۔'' وہ طنزیہ انداز میں ناک سکیڑتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئی۔ اور دوسرے ہی پل ایک بھیانک پلان وہ بنا چکی تھی۔

☆......☆......☆

وہ دسمبر کی ایک کہر آلود اور ٹھنڈی شام تھی۔ ہر کس و ناکس بند کمروں کے بستروں میں دبکا ہوا تھا۔ دھند غیر ماورائی آسیب کی طرح گرد و پیش پر چھا رہی تھی۔ نیم پختہ سڑک کے کنارے نیم، املی اور شیشم کے گھنے درخت ملگجی سی چاندنی میں اور بھی ہولناک دکھائی دے رہے تھے۔ سونے پہ سہاگا دھند اپنا کام دکھا رہی تھی۔ دن بھر گلیوں میں پھرنے والے آوارہ کتے اس وقت خوانچہ فروشوں کی ریڑھیوں کے نیچے دم دبا کر بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔

فنامیہ ملہوترا خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔ جب اچانک ایک تیز ہوا کے جھونکے نے اس کے اوپر سے کمبل اڑا ڈالا۔ اس کی بند آنکھوں کے پٹ سرعت سے کھلے۔ نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ ٹیبل لیمپ جلایا مگر کمرہ مکمل طور پر مقفل تھا۔ ورطۂ حیرت میں ڈالنے والی یہ بات تھی کہ اس کمرے میں باہر چلنے والی ہوا کا داخل ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ خوف کی ایک سرد لہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ مگر اس نے اپنا وہم گردانتے ہوئے سر کو جھٹکا اور کمبل اوڑھ کر ایک بار پھر لیٹ گئی۔ لیکن ابھی لیٹی ہی تھی کہ اس کے اوپر سے کمبل جیسے زور سے کھینچا گیا تھا۔ اب کی بار تو دبی دبی سی ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ فوراً سے بھی پیشتر اس نے

میبل لیمپ جلایا اور یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئی کہ کمبل ہوا میں معلق لہرا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے چاروں کونوں کو پکڑ رکھا ہو اور اسے جھاڑ رہا ہو۔

خوف کا احساس ترقی پر تھا اور اس کے غالب ہونے کا احتمال تھا۔ آسودگی کی جگہ اضطراب، بے چینی اور بے سکونی کا راج تھا۔ آنکھوں کے جگنوں ماند پڑ رہے تھے۔ اسے اپنی قوت بینائی پر وشواس نہیں ہو رہا تھا۔ خوف سے وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ وہ جان بلب کیفیت سے دوچار تھی۔ قرین قیاس تھا کہ وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی۔ اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے۔ خوف کا احساس اس قدر غالب آ چکا تھا کہ وہ چیخنا، چلانا چاہتی تھی مگر بے سود۔ فر فر چلنے والی زبان تو جیسے آج اس کا ساتھ دینے سے ہی قاصر تھی۔ ابھی رات ہی کی تو بات تھی جب وہ اپنی سوتیلی ماں کرن ملہوترا اور سوتیلی بہن مادھوری ملہوترا کو بے تکے جملے سنا آئی تھی۔ جو کچھ منہ میں آیا تھا سنا دیا۔ دونوں اس کی باتیں سن کر خون کے آنسو پی کر رہ گئی تھیں۔ اس کی اس جرأت پر نہ صرف اس کی ماں ساوتری ملہوترا نے داد دی تھی بلکہ گردھاری ملہوترا نے بھی اس کے ان اقدام کو سراہا تھا اور اس کا حوصلہ بلند ہوا تھا۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ جلد ہی دونوں ماں بیٹیوں کو یہاں سے چلتا کرے گی مگر ہائے قسمت اسے کیا معلوم کہ اس کی زندگی کی مشعل آج رات بجھ جائے گی۔

ان کو چلتا کرنے کا خواب دیکھنے والی فامیہ ملہوترا خود ہی چلتی بنے گی۔ بے بسی اور بے چارگی کی کیفیت سے دوچار فامیہ ملہوترا ایسے ہوا میں معلق اپنے اس کمبل کو دیکھے جا رہی تھی۔ خوف اور سردی کی ملی جلی کیفیت سے دوچار وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے اپنے آپ میں ہی جکڑتی چلی جا رہی تھی۔ تبھی اس کی آنکھوں نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا اور پھر نجانے کیسے اس کے منہ سے ایک سماعت شکن چیخ برآمد ہوئی جسے گھر کے تمام افراد نے سنا اور فوراً سے بھی پیشتر فامیہ ملہوترا کے کمرے کی جانب دوڑے۔

☆......☆......☆

جنونی کیفیت سے دوچار مادھوری ملہوترا اس وقت ایک بس اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ لمبی پلکیں آنکھوں پر جھکی ہوئی اور زرد رخساروں پر ہلکی سرخی کا نشان مترشح دکھائی دے رہا تھا۔ کئی گزرتے نوجوانوں نے اس کی طرف الفت بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بس اسٹاپ پر اس کے علاوہ بھی کالج کی کئی اسٹوڈنٹس موجود تھیں مگر اس کے حسن میں جو کشش تھی وہ ان کے حسن میں نہ کہاں تھی۔ وہ آنے جانے والوں کی للچائی آنکھوں میں امڈتی چاہت کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اب اسی حسن کو اس نے آلہ کار بنانے کا عزم بنا لیا تھا۔ اور اس حسن کا پہلا شکار انسپکٹر پانڈے لال تھا۔

وہ جانتی تھی کہ انسپکٹر پانڈے اسی راستے سے ہمیشہ گزرتا ہے۔ اسی لیے وہ چنداں آگے ہو کر کھڑی تھی تاکہ دور سے ہی انسپکٹر پانڈے اسے دیکھ لے اور ایسا ہی ہوا جلد ہی اسے انسپکٹر پانڈے کی فراٹے بھرتی دور سے آتی گاڑی دکھائی دی۔ اس نے ادائے بے نیازی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر جیسے انسپکٹر خود ہی کھنچتا ہوا اس کی طرف گاڑی لے آیا۔ اس کے قریب گاڑی روک کر اس نے فرنٹ ڈور کھولا۔ بس اسٹاپ پر موجود ہر کس وناکس یہ سب دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر پانڈے بذات خود ایک خوبرو جوان تھا۔

مادھوری ملہوترا بلا چوں چراں فرنٹ سیٹ پر براجمان ہو گئی۔ انسپکٹر نے اس کی سمت ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔

”کیا بات ہے آج تمہیں پبلک ٹرانسپورٹ کی کیسے ضرورت محسوس ہوئی، تمہارے تو اپنے گھر میں گاڑیوں کی ایک لمبی لائن لگی ہوتی ہے۔۔۔؟“ انسپکٹر نے گاڑی گیئر پر ڈالتے ہوئے سوال داغا۔ مادھوری ملہوترا دیکھ رہی تھی کہ انسپکٹر پانڈے جس اسپیڈ سے پیچھے سے آ رہا تھا اس سے کئی گنا آہستہ اب آگے جا رہا تھا۔ شاید وہ زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ

گزارنے کا متمنی تھا اور یہی تو اس کی بھی خواہش تھی۔

''دراصل گاڑی پنکچر ہوگئی تھی۔گھر فون کر کے ڈرائیور کو بلوانے کی بجائے پبلک ٹرانسپورٹ کا مزہ اٹھانے کا سوچا اور بس اسٹاپ پر آگئی۔ پیچھے ورکشاپ میں گاڑی دی ہے۔۔۔'' مادھوری نے انسپکٹر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔وہ ہر طرح سے اسے اپنے جال میں پھنسانے کا مصمم ارادہ کر کے آئی تھی۔

''فار یور انفارمیشن کہ یہاں دو کلومیٹر دور تک کوئی ورکشاپ نہیں ہے۔۔۔۔'' انسپکٹر پانڈے نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے زیرلب مسکرا کر کہا تو وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔

''دراصل پبلک ٹرانسپورٹ کا مزہ لینا چاہتی تھی۔۔۔'' مادھوری ملہوترا نے دانت پیستے ہوئے کہا اور اس کا یہ تیر نشانے پر جا لگا۔

''تو یہ بات ہے۔۔۔'' انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک دم سے گاڑی کو بریک لگائی تو اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا۔۔۔؟'' اس نے آنکھیں پھاڑ کر انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔اس کی آنکھوں میں حیرت عود کر آئی تھی۔

''چنتا کیوں کر رہی ہیں آپ۔بس ہمارا من کر رہا ہے کہ آج آپ ہمارے ساتھ ایک چائے کی پیالی پی لیں۔اسی بہانے کچھ گفت وشنید کا موقع ہمیں بھی میسر آجائے گا اور ہمارے لیے یہ دن ناقابل فراموش ہو جائے گا وہ بھی اگر جناب کو گوارہ ہو تو۔۔۔؟'' انسپکٹر نے ایک بھرپور مگر محبت بھری نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے کہا تو وہ جواباً مسکرادی۔ اور اپنا بھاری بھرکم پرس تھامے گاڑی سے باہر نکلی۔

☆......☆......☆

کمرے میں ہر طرف گوشت کے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے۔یہی نہیں خون کے دھبے بھی کمرے میں چاروں اطراف دکھائی پڑ رہے تھے۔یہ ایک ایسا بھیانک اور جان لیوا منظر تھا کہ جسے دیکھتے ہی سب کی گھگھی بندھ گئی تھی۔پورہ گھرانہ ماتم کدہ بن چکا تھا۔ کوئی بھی اس آفت ناگہانی سے نبرد آزما ہونے کے لیے مستعد نہ تھا۔کسی کو کیا خبر کہ آن کی آن میں ان کا خوشیوں بھرا گھرانہ غموں کا گہوارہ بن جائے گا۔سونے پہ سہاگا چھت سے لٹکے پنکھے کے ساتھ فنا میہ ملہوترا کا لٹکا دھڑ سے کٹا سر سب کا منہ چڑا رہا تھا۔

ساوتری ملہوترا کا تو برا حال ہو چکا تھا۔رات چنگی بھلی اس کی بیٹی کمرے میں سوئی تھی۔کمرہ بھی اندر سے مقفل تھا۔رنبیر ملہوترا کی قہر آلود صورت پیلی پڑ گئی تھی۔آنکھوں سے خوف وحیرت کے ملے جلے جذبات کی وجہ سے آنسو بہہ رہے تھے۔کسی کو بھی کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔سب ایک دوسرے کو دلاسہ دے رہے تھے۔پولیس موقع واردات پر پہنچ چکی تھی۔

چند منٹ بعد ایک لمبے قد کا آدمی جس کا بدن گٹھیلا اور مضبوط، چہرہ جرأت واستقلال کی علامات لیے ہوئے تھا کمرے سے باہر نکلا۔وہ کوئی اور نہیں انسپکٹر پانڈے تھا۔اس کی نگاہیں ایک دم سے رنبیر ملہوترا پر جا ٹکیں۔ کپڑے شکن آلود اور سر کے بال پورے طور پر جمے ہوئے نہ تھے۔مونچھیں چھوٹی اور گھڑی گھڑی مگر دہانہ شجاعت کا نشان تھا۔لیکن اس کے چہرے کا سب سے حیرت انگیز حصہ اس کی بھوری تیز آنکھیں تھیں جو کبھی تیز کبھی متفکر نظر آتی تھیں۔جن میں شفقت اور ملائمت کی جھلک اکثر موجود رہتی تھی۔

''ملہوترا صاحب۔۔۔'' انسپکٹر پانڈے نے صوفے پر براجمان سوچوں کے بھنور میں پھنسے رنبیر ملہوترا کو مخاطب کیا تو اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔''میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں۔''

''تشریف رکھیے۔۔۔۔'' رنبیر ملہوترا نے تھکے تھکے لہجے میں ہاتھ کا اشارہ سامنے پڑے خالی صوفے کی طرف کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

''بہت شکریہ آپ کا۔۔۔۔'' انسپکٹر پانڈے نے بیٹھتے ہوئے کہا۔''کیا آپ مجھے کچھ ڈیٹیل سے بتانا پسند کریں گے کہ یہ سب کیسے ہوا؟''

انسپکٹر کی بات سن کر رنبیر ملہوترا نے ایک ٹشو سے اپنے آنسو صاف کیے اور ایک لمبی سانس خارج کی۔

انسپکٹر صاحب رات کا کھانا ہم سب اکٹھے کھاتے ہیں اور یہ معمول میرے آباؤ اجداد سے چلا آ رہا ہے۔ اگر گھر کا کوئی فرد کسی بھی وقت کھانے کی ٹیبل پر نہ ہو تو اس کا انتظار کیا جاتا ہے۔ پھر بھی وہ کسی وجہ سے نہ پہنچ پائے تو اس کے لیے الگ سے کھانا تیار نہیں کیا جاتا۔ رات بھی ہم سب اکٹھے کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں جا لیٹے۔ خاص کر فنامیہ میری بیٹی کی تو شروع سے خصلت ہے کہ وہ سرِ شام ہی اپنے کمرے میں جا دبکتی تھی۔ سارا سارا دن وہ انٹرنیٹ پر مصروف رہتی تھی۔ ویسے تو ہمارے گھر میں پیسے کی ریل پیل ہے مگر نجانے کیوں اسے ڈیٹا انٹری کرنے کا بہت چاؤ تھا۔ وہاں سے اسے منتھلی اچھی خاصا زرِ مبادلہ حاصل ہو جاتا تھا۔ میں نے کئی بار کوشس کی کہ وہ میرے کام میں ہی وقت دینے لگے مگر اس نے انکار کر دیا اور میں نے بھی کوئی دباؤ نہ دیا۔

''یقین مانیے انسپکٹر صاحب۔۔۔ میری بیٹی بہت ذہین تھی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ فی الفور اپنے کمرے میں گئی اور ہمیشہ کی طرح اس نے اپنے کمرے کو اندر سے مقفل کیا۔''

رنبیر ملہوترا جو اپنی کیفیت پر قابو پانے کی بار بار کوشس کر رہے تھے۔ لیکن پھر بھی آنسو تھے کہ چھلک پڑتے تھے۔ انہیں کچھ سجھائی نہ دے پا رہا تھا کہ کریں تو کیا کریں۔ لفظ تھے کہ ان کے حلق میں ہی اٹک جاتے تھے لیکن پھر بھی وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ کی مالا پروئے جا رہے تھے تبھی انسپکٹر نے ان کو ٹوکا۔

''معذرت کے ساتھ ملہوترا صاحب آپ کی بات ٹوک رہا ہوں۔ کیا آپ کو پورا وشواس ہے کہ آپ کی بیٹی۔۔۔ کیا نام بتایا تھا (سر میں کھجلی کرتے ہوئے) ہاں یاد آیا فنامیہ ملہوترا اس نے رات سونے سے قبل اپنے کمرے کو مقفل کیا تھا۔۔۔؟'' انسپکٹر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔۔۔'' رنبیر ملہوترا نے ایک لمبی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''میں کھانا کھا کر اس کے ساتھ ہی اوپر گیا تھا۔ کچھ روز قبل میں فارن کنٹری میں اپنے ایک فرم کا وزٹ کرنے گیا تھا اور آج ہی واپس لوٹا تھا۔ میں خود بھی تھکا ہوا تھا۔ میرے اٹھنے سے قبل ہی فنامیہ اٹھی تھی۔ اور میں نے اوپر جاتے ہوئے سوچا اس کے پاس کچھ سے گزار لوں دروازے کو دھکیلا تو وہ اندر سے مقفل تھا۔ پھر میں آگے بڑھ گیا اور رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی جب آناً فاناً فنامیہ کی سماعت شکن چیخ نے میری قوتِ سماعت پر دستک دی۔ میں فی الفور اٹھ بیٹھا تو یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا کہ میری پتنی کرن ملہوترا ابھی اٹھ کر براجمان خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی۔ میں رات اپنی پتنی کرن ملہوترا کے روم میں تھا۔ میں فوراً بیڈ سے اترا تو باہر شور سا سنائی دیا۔ ہم دونوں پتی پتنی باہر نکلے تو یہ دیکھ کر گنگ رہ گئے کہ سارے گھر والے اوپر فنامیہ کے روم کے باہر مجتمع تھے اور دروازہ پیٹ رہے تھے لیکن دروازہ کھولنے کے لیے فنامیہ حیات ہوتی تو کھولتی۔''

آخری جملہ رنبیر ملہوترا نے نہایت ہی دقت سے ادا کیا اور اس کو ادا کرتے کرتے ان کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔

''اور پھر جب۔۔۔ بمشکل دروازہ توڑ کر ہم لوگ اندر داخل ہوئے تو اگلا منظر دیکھ کر ہمارے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی۔۔۔ آسمان ٹوٹ پڑا ہمارے سروں پر۔۔۔ ہم نہیں جانتے ہماری بیٹی کا ایسا حال کس نے کیا ہے انسپکٹر صاحب لیکن وہ جو۔۔۔ جو کوئی بھی ہے یقین مانیے ایسی موت ماروں گا کہ دوبارہ جنم لینے کا خیال ہی من سے نکال دے گا۔''

آپ خاطر جمع رکھیے ملہوترا صاحب ہم لوگ پوری کوشش کر رہے ہیں۔ بھگوان کی دیا سے جلد ہی دوشی کو سب کے سامنے بے نقاب کریں گے۔۔۔ انسپکٹر نے رنبیر ملہوترا کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن ملہوترا صاحب سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر ایسا بھی

کون سا مجرم ہے جو آپ کے گھر میں داخل ہوا حالانکہ ہمہ وقت درجنوں محافظ آپ کے گھر کی نگہبانی کرتے ہیں۔یہی نہیں آپ کی دختر کا کمرہ میں اسی طرح جیسے آپ بتا رہے ہیں کہ اندر سے مقفل تھا اور آپ لوگوں نے توڑا تو آخر ایسا اور کونسا چور راستہ ہے جس کا آپ کو بھی نہیں پتا اور قاتل وہاں سے آیا اور آپ کی دختر کو موت کی آغوش میں سلا کر پھر وہیں سے ہی چلتا بنا؟‘‘

انسپکٹر کی بات سن کر اب پہلی بار رنبیر ملہوترا کا ماتھا ٹھنکا تھا۔یہ بات تو اسے بہت پہلے ہی سوچنی چاہیے تھی۔لیکن اس نے اس طرف دھیان دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔انسپکٹر کی بات میں واقعی دم تھا۔درجنوں محافظوں کی موجودگی میں آخر ایسا کونسا چور راستہ ہے جہاں سے آتے جاتے ہوئے قاتل کو کسی نے نہیں دیکھا اور قاتل بآسانی آ کر اپنا کام پورا کر کے چلتا بنا۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

’’آپ ٹھیک کہتے ہیں انسپکٹر صاحب۔۔۔‘‘ رنبیر ملہوترا نے ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو کر انسپکٹر پانڈے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’مجھے کچھ اور ہی چکر لگتا ہے ملہوترا صاحب۔۔۔‘‘ انسپکٹر پانڈے نے معنی خیز نگاہوں سے رنبیر ملہوترا پر نگاہیں ٹکاتے ہوئے کہا۔جبکہ جواباً رنبیر ملہوترا نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔

’’یہ بھی ممکن ہے ملہوترا صاحب کہ کوئی آتما واتما کا چکر ہو کیونکہ کسی بھی قسم کے کوئی فنگر پرنٹس نہیں ملے کوئی ثبوت نہیں ملا۔مجرم جتنا بھی آتش کا پرکالا ہو ملہوترا صاحب کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور چھوڑ جاتا ہے لیکن یہاں تو یوں لگتا ہے جیسے کسی ان دیکھی مخلوق نے یہ سب کچھ کیا ہے یا بقول آپ کے انٹرنیٹ میں سے ہی کوئی نکل کر آپ کی بیٹی کو موت کی نیند سلا گیا وہ بھی ایک اذیت ناک موت۔۔۔‘‘ انسپکٹر نے آخری لفظ آہستہ اور چبا کر ادا کیے اور رنبیر ملہوترا سوچوں کے بھنور میں پھنستا چلا گیا۔

’’سوچیے ملہوترا صاحب کہیں آپ کی بیٹی کا کسی کے ساتھ کوئی لفڑا نہ ہوا ہو یا آپ کی فیملی میں سے کسی کا کسی کے ساتھ۔اس ٹیکنالوجی کے دور میں ان باتوں پر وشواس کرنا بے وقوفیت سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت کو پس پشت ڈالنا در اصل حقیقت ہوتی ہے ملہوترا صاحب۔۔۔‘‘ انسپکٹر کی بات میں وزن تھا۔

وہ رنبیر ملہوترا کو عجیب کشمکش میں مبتلا کر کے خود چلا گیا تھا۔پولیس اپنی فرضی کارروائی کر کے چلی گئی تھی۔جبکہ فامیہ ملہوترا کے شریر کے بکھرے ٹکڑوں کو یکجا کر کے انہیں چتا کے حوالے کر دیا گیا اور اس کی ارتھی گنگا کے سپرد کر دی گئی۔اب رنبیر ملہوترا کو فکر لاحق ہو چکی تھی کہ اس کے ہاتھوں نہ سہی اس کے کارندوں کے ہاتھوں درجنوں افراد سپرد اجل ہو رہے ہیں۔اور یہی تو اس کا بزنس بھی تھا۔لیکن اسے جلد سے جلد ہی کوئی نہ کوئی اوپائے نکالنا تھا۔اس کے پاس روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔اسے کسی چیز کی کوئی چنتا تک نہ تھی۔وہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر بھی اس آتما کو نیست و نابود کرنا چاہتا تھا۔وہ جان چکا تھا کہ یہ کام کسی بھی منش کا نہیں ہے کیونکہ اگر یہ کام کسی منش کا ہوتا تو کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور مل چکا ہوتا۔اول تو کسی منش میں اتنی جسارت ہی نہیں کہ رنبیر ملہوترا کے گھر میں آ کر اس کے اہل خانہ کو ایذاء پہنچاتا تو درکنار اس کے گھر کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھ سکے۔

☆......☆......☆

مادھوری ملہوترا ہمیں جگدیش کی موت کا از حد رنج ہے لیکن ہونی سے کون واقف ہوتا ہے یہ تو بھگوان کے کام ہیں کسی کو لمبی عمر عطا کر دے تو کسی کو اذیت ناک موت سے دوچار کر دے۔۔۔‘‘ انسپکٹر پانڈے نے چائے کی چسکی حلق سے نیچے اتارتے ہوئے کہا تو مادھوری ملہوترا کو یوں لگا جیسے انسپکٹر کو حقیقت سے آشنائی ہو گئی ہو۔ایک بار تو اس نے غور سے اسے دیکھا لیکن انسپکٹر کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ حقیقت سے آشنا نہیں ہے۔

وہ بہت اچھے تھے۔سب کی بہت چنتا کرتے تھے

لیکن پتہ نہیں کس نے ان کے ساتھ ایسا کیا یقین مانیے انسپکٹر صاحب اگر مجھے پتہ چل جائے کہ جگدیش کے خون کا ذمہ دار کون ہے تو میں خود اسے اپنے ہاتھوں سے ابدی نیند سلاؤں گی۔۔۔۔۔ مادھوری ملہوترا نے معنی خیز نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ لیکن دل ہی دل میں ندامت سے پارہ پارہ ہوئے جارہی تھی۔ کیونکہ قاتل تو وہ خود تھی۔ اپنے پیار کی، اپنے محبوب کو خود اس نے ہی ابدی نیند سلوایا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس نے تڑپ تڑپ کر دم توڑا تھا۔

"حالات کبھی کبھی اس رخ بہنا شروع ہو جاتے ہیں مادھوری ملہوترا صاحبہ کہ انسان چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پاتا یہی بات لے لیجیے کہ آپ قاتل کو اپنے ہاتھوں سے ابدی نیند سلانے کی متمنی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قاتل کو آپ لقمہ اجل بنانے کی سکت نہیں رکھتیں۔۔۔" انسپکٹر کی بات سن کر ایک بار پھر وہ چونکے بنا نہ رہ سکی۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ بولی لیکن سوالیہ نگاہوں سے انسپکٹر کو گھورا۔ اس کی پیشانی ابر آلود ہو چکی تھی۔ شریر کے اندر چند اس تھرتھراہٹ پیدا ہو چکی تھی لیکن جلد ہی اس نے پانی کا ایک گلاس حلق میں انڈیل کر اپنی کیفیت پر قابو پایا۔

"کیا ہوا آپ کو اتنی پریشان کیوں ہو گئیں ایک دم۔۔۔؟" انسپکٹر نے اس کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہ میں نے۔۔۔" جگدیش کی چتا کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔۔۔ اس کا۔۔۔ اس کا پورا شریر گولیوں سے چھلنی کیا گیا تھا۔ وہ وقت یاد کر کے دل کانپ اٹھا ہے۔۔۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ بات کرتے کرتے ٹسوے بہانے کی کوشش لیکن بے سود۔

"خاطر جمع رکھیے آپ، حق گوئی کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے یہ دنیا کب کسی کو حق گوئی کرتے دیکھ سکتی ہے۔۔۔" انسپکٹر نے اس کی طرف ایک بھرپور نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر کو نجانے کیوں دال میں کچھ کالا لگ رہا تھا۔ اس نے بہت قریب سے محسوس کیا تھا کہ جگدیش کے موضوع پر بات کرنے سے نہ صرف مادھوری ملہوترا کترا رہی تھی بلکہ اس کی پیشانی ابر آلود ہو گئی تھی۔ وہ آنکھیں ملانے تک سے گریز کر رہی تھی۔ انسپکٹر کے اندر چھپا منش جاگ چکا تھا۔ اس کا من کہہ رہا تھا کہ اس خوبصورت اور حسین و جمیل چہرے کے پیچھے ضرورت کوئی بدصورتی پنہاں ہے۔ وہ اس بھید کو کریدنا چاہتا تھا لیکن ایسے نہیں اپنے طریقے سے اس لیے اس نے فوراً سے بھی پیشتر موضوع بدل ڈالا اور یہ دیکھ کر اس کی حیرت ختم ہوئی کہ موضوع بدلنے کی دیر تھی اور مادھوری ملہوترا ایک دم پھر ہشاش بشاش اور چہک چہک کر اس سے باتیں کرنے لگی تھی۔

☆.......☆.......☆

یکے بعد دیگرے گردھاری ملہوترا، ساوتری ملہوترا، پھر ایک ساتھ شگفتہ ملہوترا اور لکشمی ملہوترا کی اموات نے تہلکہ مچا کے رکھ دیا تھا۔ اب بچ گئے تھے تو رنبیر ملہوترا اس کی اہلیہ کرن ملہوترا اور دو بیٹیاں گائتی ملہوترا اور مادھوری ملہوترا۔ رنبیر ملہوترا کو کچھ سمجھ نہ آرہا تھا کہ آخر کون ہے جو رات سوتے اور دن دیہاڑے اس کے پریوار کو ابدی نیند سلانے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے۔ دوسری طرف مادھوری ملہوترا کے اندر بھی خوف و ہراس پیدا ہو چکا تھا۔ کئی روز سے وہ انسپکٹر پانڈے سے بھی ملاقات نہ کر پائی تھی۔ اس کی وقتاً فوقتاً کالز آتی رہتی تھیں لیکن گھریلو ناسازگاریوں کا بہانہ کر کے وہ ٹال دیتی۔ حقیقت یہ تھی کہ پریوار کے باقی فرد بھی اب موت کی بڑھتے قدموں کی بازگشت سن رہے تھے۔ سب جانتے تھے کہ جو بھی ہے ایک نہ ایک دن انہیں بھی ابدی نیند سلا کے رہے گا۔

دوسری طرف انسپکٹر پانڈے نے سونے پہ سہاگا کر کے رکھ دیا۔ ایک شام جب وہ اپنے ایک عزیز کے ساتھ رنبیر ملہوترا کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں کھانا کھانے گئے تو انہیں بھونے ہوئے گوشت میں

چند انسانی اعضاء مل گئے جنہیں انہوں نے سب کی آنکھوں سے بچا کر ٹشو میں لپیٹ کر کوٹ میں چھپالیا اور ایمرجنسی کا بہانہ کر کے وہاں سے نو دو گیارہ ہوگئے۔ لیبارٹری میں آکر ٹیسٹ کروایا تو طشت ازبام ہوا کہ وہ حقیقت میں انسانی اعضاء تھے۔ لہٰذا رات کے پچھلے پہر جب کسٹمرز کی آمدورفت کم پڑ چکی تھی اس نے بھاری نفری کے ساتھ دھاوا بول دیا اور پھر جلد ہی ہوٹل کے تہہ خانے سے ثبوت ان کے ہتھے لگ گئے۔

جب اسٹاف کی خاطر تواضع ہوئی تو انہوں نے رنبیر ملہوترا کے اندرون بیرون تمام دھندوں کا بھانڈا پھوڑ دیا اور اسی رات رنبیر ملہوترا کو اریسٹ کرلیا گیا۔ اندرون بیرون اس کے تمام ہوٹلز کو سیل کردیا گیا۔ یہی نہیں ان تمام ہوٹلز کے اسٹاف کو اریسٹ کرلیا گیا۔ دوسری طرف ہسپتالوں میں ہونے والے اس کے مکروہ دھندے کا پردہ بھی فاش ہوگیا۔ انسپکٹر پانڈے، انسپکٹر سے ڈائریکٹ کمشنر کی سیٹ پر جا بیٹھا۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا نے اسے ہیرو بنادیا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

رنبیر ملہوترا کی تمام پراپرٹی اور بینک بیلنس حکومت نے اپنے قبضے میں کرلیا اور دیکھتے ہی دیکھتے محلوں میں رہنے والوں کو جھونپڑی لگانے کے لیے کپڑا تک میسر نہ آسکا۔ ادھر ادھوری ملہوترا کے اندر آتش انتقام نے سر اٹھایا۔ وہ پانڈے کو اپنے ہاتھوں ابدی نیند سلانے کا مصمم ارادہ کرچکی تھی۔ اسی غرض سے اس نے پانڈے سے ملنے کی درخواست کی۔

☆......☆......☆

رنبیر ملہوترا کو سلاخوں کے پیچھے ہی یہ نوید سننے کو ملی کہ اس کی پتنی کرن ملہوترا اور اس کی بیٹی گانتی ملہوترا کو بھی کسی نے ابدی نیند سلادیا ہے۔ اسے اپنے پریوار کے ان دونوں افراد کی چتا کو آگ لگانے تک کی اجازت نہ مل سکی۔ اسے رہ رہ کر اپنی بے بسی و بے چارگی پر رونا آتا تھا۔ اب اس کی آخری بیٹی اور وہ خود بچ گئے تھے۔ نجانے کون تھا جو اپنی دانست میں اس کے پریوار کا صفایا کرتا جارہا تھا۔ رنبیر ملہوترا کو سب سے الگ ایک کال کوٹھری میں قید کرکے رکھا گیا تھا۔ عدالت نے اسے بیک وقت سات مرتبہ پھانسی کا اعلان سنایا تھا اور ساتھ میں یہ بھی سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ عدالتی حکم کے دو روز بعد ہی اسے پھانسی پر لٹکایا جائے اور اس کی طرف سے کوئی بھی درخواست دائر کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بنے روشن دان سے شام کا مٹیالا اجالا دھیرے دھیرے اندھیرے میں ختم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ خشک ہوا کے جھونکے نے اس کے کان میں نجانے ایسی کیا سرگوشی کی کہ وہ پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔ یادوں کے پنچھی اندھیری کوٹھڑی سے نکل کر دور افق میں محو پرواز ہونے ہی والے تھے جب اس کی آنکھوں نے ایک ناقابل فراموش منظر دیکھا۔

اندھیری کوٹھڑی میں دھواں بھرتا جارہا تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس دھویں نے ایک انسانی روپ دھار لیا۔ جسے دیکھنے کے ساتھ ہی رنبیر ملہوترا کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کے پریوار کو ابدی نیند سلانے والا کون تھا۔ انسپکٹر پانڈے کے الفاظ اس کی قوت سماعت سے ٹکرائے۔

"یہ بھی ممکن ہے ملہوترا صاحب کہ کوئی آتما واتما کا چکر ہو کیونکہ کسی بھی قسم کے کوئی فنگر پرنٹس نہیں ملے کوئی ثبوت نہیں ملا۔ ملزم جتنا بھی آتش کا پرکالا ہو ملہوترا صاحب کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور چھوڑ جاتا ہے لیکن یہاں تو یوں لگتا ہے جیسے کسی ان دیکھی مخلوق نے یہ سب کچھ کیا ہے یا بقول آپ کے انٹرنیٹ میں سے ہی کوئی نکل کر آپ کی بیٹی کو موت کی نیند سلا گیا وہ بھی ایک اذیت ناک موت"

واقعی انسپکٹر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ معاملہ کسی آتما کا ہے کیونکہ منش جتنا بھی آتش کا پرکالا ہو کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ اس کے سامنے دھویں سے انسانی روپ دھارنے والی آتما اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اب اس کی زندگی کے

دن گنے جا چکے ہیں۔ چند ساعتوں کے بعد ہی وہ لقمہ اجل ہو جائے گا لیکن اس کے بعد یہ آتما اس کی بیٹی کو ابدی نیند سلائے گی نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔میں اپنی جان دے کر اپنی بیٹی کی جان بچاؤں گا میں اس سے بنتی کروں گا کہ میری جان لے لے لیکن میری بیٹی کی جان بخشی کر دے۔ ابھی رنبیر ملہوترا سوچوں کے بھنور میں گم تھا جب اسے یکبارگی احساس ہوا کہ وہ اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا جا رہا ہے۔ وہ جیسے ایک دم چونکا اور پھر اس نے دیکھا کہ وہ واقعی ہوا میں معلق تھا۔ تبھی اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی بیٹی فنامیہ ملہوترا کا انجام دکھائی دیا۔ جس کے شریر کے ٹکڑے پورے کمرے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور خون کے دھبے بھی جگہ جگہ لگے ہوئے تھے جبکہ اس کا سر پنکھے سے لٹکا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا اس کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔ اپنے انجام کا سوچ کر اس کے منہ سے ایک سماعت شکن چیخ نکلی لیکن وہ چیخ اس کی زندگی نہ بچا سکی۔

☆......☆......☆

مجھے از حد رنج ہے کہ پولیس کسٹڈی میں ہونے کے باوجود ہم تمہارے پتا جی کو نہ بچا سکے۔۔۔'' کمشنر پانڈے نے مادھوری ملہوترا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

دونوں اس وقت ایک پبلک پارک میں ایک آئس کریم بار کے سامنے کرسیوں پر براجمان تھا۔ کمشنر کو مادھوری کی کال اس وقت آئی تھی جب وہ آفس سے گھر کے لیے نکلنے لگا تھا۔ اس لیے گھر جانے کی بجائے وہ سیدھا وہیں آن دھمکا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے چھ مسلح نوجوان بھی تھے۔ جو وہیں ان کے قریب ہی مستعد موجود تھے۔

''ہوں۔۔۔رنج اور تمہیں۔۔۔اس سارے کیے کرتے کے ذمہ دار تم ہی ہو پانڈے، ہمارے پریوار کی بربادی کا سبب۔۔۔'' مادھوری ملہوترا نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

''واٹ یو مین۔۔۔؟'' پانڈے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہارا اشارہ اس طرف ہے تو تمہارا باپ ایک نہایت ہی گھٹیا انسان تھا۔ نجانے بلاناغہ وہ روزانہ کتنے معصوموں کی جان لیتا تھا۔ ایسا ظالم اور سفاک انسان تو ہم نے نہیں دیکھا، نہ سنا اور نہ ہی کبھی تاریخ میں پڑھا۔ ایسے انسان کو تو زندہ جلا دینا چاہیے۔''

پانڈے کی بات سن کر مادھوری ملہوترا نے ہونٹ بھینچے۔ دوسرے ہی سے اس کے پسٹل کی نال پانڈے پر تنی ہوئی تھی۔ پانڈے کے مسلح جوانوں نے جب یہ منظر دیکھا تو اپنی بندوقوں کا رخ اس کی طرف کر کے اس کی طرف بڑھنے لگے۔

''وہیں رک جاؤ ورنہ ٹریگر دبا دوں گی۔۔۔'' مادھوری ملہوترا نے ان بڑھتے مسلح جوانوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جنہوں نے فوراً سے بھی پیشتر پانڈے لال کی طرف دیکھا۔ اس نے تصدیق کی تو وہ وہیں اس پر بندوقیں تان کر کھڑے ہو گئے۔ پارک میں براجمان باقی لوگ یہ منظر دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔

''تم غلط کر رہی ہو جانتی نہیں ہو کہ تمہارا یہاں سے بچ کر جانا ممکن نہیں ہے۔۔۔۔'' پانڈے لال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''پانڈے لال تمہیں ابدی نیند سلانے کے بعد مجھے جینے کا کوئی ادھیکار ہی نہیں ہے۔ میں جینا بھی کب چاہتی ہوں میں تو خود اپنے پریوار سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہوں۔ لیکن میرے پریوار کی خوشیوں کو چھین کر خود قسمت کا دھنی سمجھنے والا انسان مطلب تم، جب تک تمہیں ابدی نیند نہ سلا دوں میرے پریوار والوں کی آتماؤں کو چین نہیں آئے گا۔۔۔'' مادھوری ملہوترا نے پیشانی پر شکنیں عیاں کرتے ہوئے کہا۔ قبل اس کے کہ وہ ٹریگر دباتی ایک نہایت ہی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش وہاں موجود ہر کس و ناکس نے منظر دیکھا۔

پسٹل خود بخود اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں معلق ہو گیا۔ اس کی کیفیت تو کاٹو تو جان نہیں

والی ہو چلی تھی۔ دوسرے ہی سمے سب نے اس سے بھی حیرت انگیز منظر دیکھا جب اس کا شریر بھی ہوا میں معلق ہوگیا۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے سب کو پکار رہی تھی۔ ابھی سورج ڈوبا نہیں تھا۔ نہ ہی اندھیرے نے ماحول پر قبضہ جمایا تھا۔ ابھی سورج کی باقی ماندہ کرنوں نے کچھ اجالا کر رکھا تھا۔ اور اس اجالے میں سب نے دیکھا کہ وہاں دھواں اکٹھا ہو رہا تھا اور اس دھویں نے ایک انسانی روپ دھارنا شروع کردیا تھا۔ پھر جلد ہی دھویں سے ایک انسانی روپ بن گیا جسے دیکھتے ہی مادھوری ملہوترا کے ساتھ ساتھ کمشنر پانڈے لال بھی انگشت بدنداں رہ گیا۔

وہ کوئی اور نہیں جگدیش تھا۔ وہی جگدیش جسے مادھوری ملہوترا نے اپنے باپ کے کارندوں سے ابدی نیند سلوایا تھا۔ اس کی خونخوار آنکھیں مادھوری ملہوترا پر جمی ہوئی تھیں۔ سارے پارک میں شہر خموشاں کا سا سکوت طاری ہو چکا تھا۔ ہر کس و ناکس پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں انسان نہیں بلکہ پتھر کے مجسمے اکٹھے ہوں۔ جگدیش نے پانڈے لال کی طرف دیکھا۔

''پانڈے لال تمہیں تمہاری کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔۔۔۔'' دھویں سے انسانی روپ دھارنے والی جگدیش کی زبان میں جنبش پیدا ہوئی اور لفظوں کی ایک مالا نے پانڈے لال کی قوت سماعت پر دستک دی۔ جواباً اس نے تشکرانہ انداز میں سر ہلا دیا۔

''تم حیران تو ہوگے پانڈے لال۔۔۔ کہ ۔۔۔ موت کی وادی میں پہنچنے والا جگدیش آج ایک نئے روپ میں تمہارے سامنے کیسے آن وارد ہوا۔ پہلے تم پر اور مادھوری ملہوترا پر چند انکشافات کرتا چلوں۔''

ایک نظر دونوں کو دیکھ کر اس نے اپنے پورے شریر پر ایک نگاہ ڈالی۔ اس کی حالت زار پر سب کو رونا آیا۔ اس وقت اس کی حالت ایسی بن گئی کہ گویا ایک دکھوں کا لاوا اس کے دل میں یکجا ہو گیا ہو اور وہ پل بھر میں پھٹنے ہی والا ہو۔

''دنیا میں سب سے حسین بھگوان کا تحفہ محبت ہے۔ لیکن مجھے محبت کی آڑ میں دھوکہ دیا گیا۔ یہ عورت (مادھوری ملہوترا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) جس پر میں جان سے بھی زیادہ اعتماد کرتا تھا اس نے مجھے دھوکہ دیا اور میں نے ایک ایک کرکے اس کے پریوار کو ابدی نیند سلایا۔ یہی نہیں تمہاری انویسٹی گیشن کے دوران میں نے ہی رنبیز ملہوترا کے لوگوں کے اندر گھس کر تم پر بھید کھولے تھے۔ کیونکہ میری طرح تم نے بھی سدا سچائی کا دامن تھامے رکھا۔ میری اور تمہاری منزل ایک ہی تھی۔ ظالم کے ظلم سے مظلوم کو بچانا اور واقعی یہ کام ہم دونوں نے مل کر کیا۔ رنبیز ملہوترا اور اس کی اس بیٹی نے مل کر مجھے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا کیونکہ میرے پاس وہ تمام ثبوت پہنچ چکے تھے جن کی بنا پر میں رنبیز ملہوترا کو گھسیٹ گھسیٹ کر سلاخوں کے پیچھے لے جاسکتا تھا۔ میرا انتقام اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے اور آج ایک بار پھر محبت اور عشق و پیار کے جھانسے میں پھنسا کر یہ ظالم تمہیں ابدی نیند سلانے کا مصمم ارادہ کرچکی تھی لیکن اب اسے ایک ایسی موت دوں گا کہ یہاں موجود ہر کس و ناکس پر آشکار ہو جائے گا کہ اگر دوبارہ کسی نے محبت کی آڑ میں کسی کو دھوکہ دیا تو وہ کبھی بھی ایک بھیانک موت مرنے سے بچ نہیں پائے گا۔''

جگدیش کی بات سن کر پارک میں موجود لوگوں میں خوف و ہراس کی ایک لہر پھیل گئی۔ جگدیش نے سب کی طرف ایک بھرپور نگاہ سے دیکھا اور پھر سب نے ایک بھیانک منظر دیکھا۔ آسمان کی وسعتوں سے آن کی آن میں بے شمار بھیانک شکلوں والے چھوٹے چڑیوں کی جسامت کے پرندے آتے دکھائی دیے۔ مادھوری ملہوترا جگدیش سے زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔ جبکہ جگدیش کے کانوں پر جوں تک نہ رینگنے والی تھی۔ اور پھر جلد ہی پرندے اس کے سر پر پہنچ گئے اور ہوا میں معلق مادھوری ملہوترا کے شریر سے گوشت نوچ نوچ کر کھانے لگے۔ شدت تکلیف کے باعث مادھوری

ملہوترا کی سماعت شکن چیخیں پورے ماحول کو خوفناک بنا رہی تھیں۔ ہر کس و ناکس کی آنکھیں اسی منظر پر ٹکی ہوئی تھیں۔ مادھوری ملہوترا خود کو ان پرندوں کے چنگل سے بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی مگر بے سود وہ جس قدر ہاتھ پاؤں مارتی وہ پرندے اسی قدر اس پر تیزی سے جھپٹتے اور پھر آن کی آن میں وہ مادھوری ملہوترا کی ہڈیاں تک چٹ کر گئے۔ دوسرے ہی سے پرندے دوبارہ آسمان کی وسعتوں کی طرف محو پرواز تھے۔

سب حیرت کے بت بنے ہوئے تھے۔ کسی کو بھی اپنی قوت بینائی پر شواس نہ ہو پا رہا تھا۔ جگدیش کی آتما بھی جا چکی تھی۔ اس کی آتما کے جاتے ساتھ ہی جیسے سب آناً فاناً ہوش میں آ گئے تھے۔ لوگوں کے رگ و پے میں خوف سرایت کر چکا تھا۔ دوسری طرف پانڈے لال کو ایک نامکمل فائل کو مکمل کرنے کے لیے ثبوت مل چکے تھے۔ اس کے پاس گواہوں کی کمی نہ تھی۔ اس نے ایک نگاہ ٹیبل پر پڑی آئس کریموں کو دیکھا۔ وہ پانی کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ مادھوری ملہوترا کی آئس کریم کے ساتھ ہی مادھوری ملہوترا کا پرس بھی ٹیبل پر پڑا تھا۔ اس نے اسے اٹھایا اور کھولا تو حیران و ششدر رہ گیا تھا۔

اس میں جگدیش کی ایک ساتھ کئی تصاویر تھیں۔ اور ایک چھوٹی سی ڈائری بھی تھی۔ جسے اس نے کھول کر دیکھا اور ورق گردانی کرتے کرتے اچانک اس کی نگاہ ایک ورق پر پڑی جس پر کچھ اس طرح تحریر لکھی تھی۔

”میرے جان جگر۔۔۔ میری گیسوؤں کے اسیر۔۔۔ میرے سپنوں کے راجہ۔۔۔ میرے خیالوں کا محور۔۔۔ میرے ہاتھوں کی ریکھا۔۔۔ میرے جینے کی وجہ۔۔۔ میرے مرنے کا سبب۔۔۔ میرے دل کا گلستان اور گلستان میں لہلہاتے ماحول کو معطر کرتے پھولوں کی خوشبو سے بنے۔۔۔ میرے گوہر ہائے آبدار۔۔۔ تمہارے بنا میرا جینا ادھورا۔۔۔ میری زندگی ادھوری۔۔۔ تمہاری کمی کا احساس مجھے محسوس ہوتا ہے۔۔۔ من میں دہکتے تمہاری محبت کی آتش کے شعلوں نے جینا محال کر رکھا ہے۔۔۔ ماہی بے آب کی سی اس زندگی سے من اکتا چکا ہے۔۔۔ میں ماہی بے آب کی طرح تمہاری یادوں میں تڑپنا نہیں چاہتی۔۔۔ مجھے اپنے پاس بلا لو۔۔۔ میرے ہمسفر۔۔۔ میرے دلربا۔“

اس سے اگلے ورق پر ایک اور تحریر تھی جس کی عبارت یہ تھی۔

”میں نے تو تمہیں بچانا چاہا تھا۔ تم تو جانتے بھی نہ تھے کہ وہ لفافہ تمہارے آفس تک پہنچا بھی ہے کہ نہیں تمہیں بچانے کے لیے ڈھونگ رچایا مگر مجھے کیا خبر کہ وہ پلک جھپکتے میں تمہیں ابدی نیند سلا دیں گے۔ میں کتنی خود غرض ثابت ہوئی کہ اپنے ہی ہاتھوں تمہیں ابدی نیند سلانے کا اہتمام کیا۔ کیا ایسی بھی کوئی محبت کرتا ہے۔“

پانڈے لال کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ مادھوری ملہوترا اپنی دانست میں جگدیش سے واقعی بہت چاہت رکھتی تھی لیکن وہ کرنا کچھ چاہتی تھی کر کچھ بیٹھی۔ جگدیش کی آتما حقیقت سے آشنا نہ تھی، اے کاش کہ وہ ایک بار تو اس کے من میں جھانک کر دیکھ لیتا۔ اصل مجرم تو رنبیر ملہوترا تھا اس کی موت کے ساتھ ہی سارا قصہ تمام ہو جانا تھا لیکن اس ایک ظالم سفاک کی وجہ سے کئی بے گناہوں کو ابدی نیند سونا پڑا اور اسی لپیٹ میں اس کے اپنے بھی آ گئے۔

”سر یہاں مزید رکنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔۔۔“ اچانک پانڈے لال کی قوت سماعت سے اس کے ایک مسلح جوان کی بازگشت ٹکرائی تو اس نے ایک لمبا سانس خارج کیا۔ دور زمین پر پڑے پسٹل کو اس کے ایک جوان نے قبضے میں لے لیا۔ اس نے ایک نگاہ اپنے اطراف میں ڈالی۔ ٹیبل پر پڑے گلاسز کو پہنا اور پھر ان کے ساتھ ہو لیا۔ پیچھے کھڑے لوگ ہکا بکا ابھی تک یقین نہیں کر رہے تھے کہ جو کچھ ہوا آیا حقیقت پر مبنی تھا کہ ان کی آنکھوں کا دھوکہ تھا لیکن حقیقت سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

اک ہاتھ خوابوں کی دولت، اک ہاتھ میں کاسہ لائے ہیں
ہم "خاک نشین" تیری چوکھٹ پر اک سجدہ کرنے آئے ہیں
کوئی صحرا پار نہیں بھٹکا، کوئی دریا بیچ نہیں ڈوبا
یہ جھوٹے سچے قصے تو کچھ لوگوں نے پھیلائے ہیں!
(انتخاب: ساحل دعا بخاری......بصیر پور)

کسی کو راس آئی بے وفائی
کسی کو کردیا رسوا وفا نے
(بلقیس خان......پشاور)

دن بدلے نہیں میرے وہ دامن چھڑا گئے
ہم چپ رہ کے بھی اپنا دل جلا گئے
دل و جاں سے جو عزیز تھے احباب بھی
وقت پڑنے پہ وہ بھی نگاہیں چرا گئے
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

حالات کا کیا شکوہ کرنا حالات نے کس کا ساتھ دیا
تم خود کو بدل کر دیکھو تو حالات بدل ہی جائیں گے
(عثمان غنی......پشاور)

اور کیسے بتاؤں اپنی بے بسی کی انتہا حبیب
زنداں میں قید ہوں چڑیا گھر کے شیروں کی طرح
(رانا حبیب الرحمٰن......سینٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور)

مرجھا چکے ہیں پھول تیری یاد کے مگر
محسوس ہو رہی ہے عجیب تازگی مجھے
دیکھا خلوص موت کا تو یاد آگیا
کتنے فریب دیتی رہی زندگی مجھے
(انتخاب: کاوش عبید کاوش......بنگرام)

رہے گا تیری گرد میری دعاؤں کا دائرہ حلیم
زندگی کے ہر قدم پہ حفاظت تیری خدا کرے
(محسن عزیز حلیم......کوٹھا کلاں)

کون کسی کے ساتھ کتنا مخلص ہے راشد
وقت ہر رشتے کی اوقات بتا دیتا ہے
(راشد عزیز......کوٹھا کلاں)

بچھڑ کے مجھ سے اب وہ تک نہ رویا
کوئی تو ہمدرد تھا اس کا جس نے میری یاد تک نہ آنے دی
(وارث آصف خان......واں بھچراں)

تمام عمر کی آوارگی پہ بھاری ہے
وہ ایک شب جو تری یاد میں گزاری ہے
مجھے یہ ناز ہے کہ میں حسن کا مصور ہوں
انہیں یہ فخر کہ تصویر تو ہماری ہے
(حسنین حیدر شاہین......لالیاں)

پتھر بنا دیا مجھے رونے نہیں دیا
دامن بھی تیرے غم میں بھگونے نہیں دیا
تنہائیاں تمہارا پتہ پوچھتی رہیں
شب بھر تمہاری یاد نے سونے نہیں دیا
(انتخاب: اسحاق انجم......کنگن پور)

یہ کہہ رہی ہے تمہیں چھو کے آنے والی ہوا
اداس میں ہی نہیں بے قرار تو بھی ہے
(عمر دراز......کھڈیاں خاص)

تیری محبت میں یہ کیسا احساس ہے
کہ تو دور ہو کر بھی میرے دل کے پاس ہے
(نسیم......قصور)

جانے کیوں یہ گماں ہوتا ہے
کہ وہ نظر آئے گا سرِ راہ چلتے وقت
خدا لکھ دے گا اسے میری قسمت میں
کسی قبولیت کی گھڑی میں شام ڈھلتے وقت
(عبدالستار انجم اسلم......قصور)

یہ بات عیاں ہے دنیا پر ہم پھول بھی ہیں تلوار بھی ہیں
عزت سے جئے تو جی لیں گے جام شہادت پی لیں گے
(عرفان علی......دیپالپور)

ہاتھوں کی لکیروں میں ہم جسے ڈھونڈتے رہے
پتہ چلا وہ کسی اور کا نصیب تھا
(رخسانہ......دیپالپور)

شکوہ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلائے جاتے
(عابد......کراچی)

☆☆

غزل

ڈوبتے چاند کا منظر نہیں دیکھا جاتا
ہم سے آنکھوں کا سمندر نہیں دیکھا جاتا
چاروں اطراف میں پھیلی ہوئی ویرانی ہے
اب، اجڑا سا یہ اب گھر نہیں دیکھا جاتا
ہم نے ہر موڑ پہ مانگی ہے محبت تم سے
تیرے ہاتھوں میں یہ پتھر نہیں دیکھا جاتا
حاکم وقت سے سمجھوتہ میں کیسے کرلوں!
دل میں اترا ہوا خنجر نہیں دیکھا جاتا
کسی معصوم کی آنکھوں سے چھلکتے آنسو!
کسی مفلس کا مقدر نہیں دیکھا جاتا
بجھ نہ جائے کہیں امید کی شمع ہی حکیم
اب تو آنکھوں سے کھلا در نہیں دیکھا جاتا
(حکیم خان حکیم......حضرو)

آج پھر کوئی یاد ماضی سے ہم رکاب نظر آتی ہے
چاندنی سی جب کوئی دہلیز اتر آتی ہے
اکثر اس دل پہ قیامت سی گزر جاتی ہے
جب وہ دور ہی سے اپنا آنچل لہراتی ہے
میرے وطن کی فضائیں حسین تر ہو جاتی ہیں
جب گھٹا چار سو اپنا رنگ دکھلاتی ہے
جب کبھی میں تیرہ کشتوں کی بات کرتا ہوں
ہر دل میں قندیل سی جلتی نظر آتی ہے
خود بڑھ کے تھام لیتی ہے منزل ان کو
پائے استقامت میں لرزش سی جن کے نظر آتی ہے
شیریں فرہاد لیلیٰ مجنوں وامق عذرا کے زمانے تو گئے
اب تو عاشقی گلی گلی در بدر نظر آتی ہے
کاغذی پیرہن ہے اعضاء کی نمائش جاری ہے
بے حیائی سڑکوں پہ بال کھولے نظر آتی ہے
اس نازنین دلربا کی تو کیا بات ہے واجد
قدم پھولوں پر پڑتا ہے نظر تاروں پہ جاتی ہے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

درد دل پال کے میں نے یہ جانا ہے
ترے پیچھے صدیوں صحرا چھانا ہے
آؤ کسی دن بھول کے دل کی نگری میں
تم کو اپنے دل کا راز بتانا ہے
کیسے سمجھو گے تم پیار کی باتوں کو
اپنا حال وہی ہے، روگ پرانا ہے
ایک کمی محسوس تمہاری ہوتی ہے
موسم آج بھی کتنا سہانا ہے
ہاتھوں میں اب جام اٹھالو رانا جی
تھوڑی دیر کو اپنا دور بھلانا ہے
(قدیر رانا......راولپنڈی)

تم مجھے چاہو گے اک دن دیکھنا
ہاں چلے آؤ گے اک دن دیکھنا
یوں کرو مت میرے جذبوں سے مذاق
ورنہ پچھتاؤ گے اک دن دیکھنا
سوچ لو یہ بے رخی اچھی نہیں
خود کو تڑپاؤ گے اک دن دیکھنا
میرے چہرے کی جھلک کے واسطے
تم ترس جاؤ گے اک دن دیکھنا
آہ سوزاں نے جلایا ہے مجھے
تم بھی جل جاؤ گے اک دن دیکھنا
درد اتنا سہہ نہ پاؤ گے سنو
لوٹ کر آؤ گے اک دن دیکھنا
خانم اپنے دل کی یہ آواز ہے
تم سمجھ جاؤ گے اک دن دیکھنا
(فریدہ خانم......لاہور)

سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے بہاروں کا
کس نے مقام پرکھا ہے تاروں کا
حوصلہ دیتے ہیں آج کل کے یار بھی
وہ پہلے سا جلوہ نہ تھا نظاروں کا
ہاتھ ملا کے بھی لوگ چھوڑ جاتے ہیں یہاں
زندگی رستہ ہے پھر سے خار زادوں کا
بے رخی سے تیری یہ زخم ملے ہیں ہم کو

وہ پہلے سا جذبہ نہیں رہا اب سہاروں کا
(محمد اسلم جاوید ...... فیصل آباد)

نہیں "تعبیر" تھی اس کی ......
اسے اک شب سلا آئے ......!!!
(انتخاب: دعا عالم بخاری ...... بصیر پور)

جب ملنے لگا اس کی محبت میں سکون
پھر یوں ہوا وہ میرا ساتھ چھوڑ گیا
ابھی بہت تھیں حسرتیں دل میں
مگر وہ شخص ادھوری ملاقات چھوڑ گیا
فخر تو یہ ہے کہ وہ تھا میرا ہم سفر کبھی
دکھ یہ ہے کہ وہ بیچ راہ میں میرا ہاتھ چھوڑ گیا
بن اس کے رہنا اب اک عذاب سا لگتا ہے
نہ جانے زندگی میں وہ کیسے جذبات چھوڑ گیا
وہ بے وفا شخص تو چلا گیا اس زندگی سے
مگر آنکھوں میں میری آنسوؤں کی برسات چھوڑ گیا
(وارث آصف خان ...... بھچراں)

تنہا گھر سے باہر جانا ٹھیک نہیں
تم معصوم ہو اور زمانہ ٹھیک نہیں
صاف دلوں کو پھر سے میلا کردیں گی
گزری باتوں کو پھر سے دہرانا ٹھیک نہیں
ایسی چیزیں دور سے اچھی لگتی ہیں
چاند کو اپنے پاس بلانا ٹھیک نہیں
آؤ میرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھو
سائل کو خالی ہاتھ لوٹانا ٹھیک نہیں
رفتہ رفتہ تعبیریں بہہ جاتی ہیں
نم آنکھوں میں خواب سجانا ٹھیک نہیں
چھوڑ نوید ان پتھر دل انسانوں کو
اپنے دل کا حال سنانا ٹھیک نہیں
(نوید قمر ...... کلفٹن کراچی)

کہو! وہ چاند کیسا تھا ......؟
جدھر آنکھیں گنوا آئے، جدھر سب کچھ لٹا آئے
کہا! سیلاب جیسا تھا ......
بہت چاہا کہ بچ نکلیں، مگر سب کچھ بہا آئے
کہو ...... وہ ہجر کیسا تھا؟
جو انگلی سے چھوا تم نے، تو تم نے کیا بھلا پایا؟
کہا! بس آگ جیسا تھا، اسے چھو کر تو اپنی روح
یہ تن من جلا آئے ......
کہو! وہ وصل کیسا تھا؟
تمہیں جب چھو لیا اس نے، تو کیا احساس جاگا تھا؟
کہا! بس راستوں جیسا ...... جدھر سے بس گزرنا تھا
مکان لیکن بنا آئے ......
کہو! وہ عشق کیسا تھا؟
بنا سوچے، بنا سمجھے، بنا پرکھے کیا تم نے ......؟
کہا! ساحلوں پہ لکھے نام جیسا تھا
اسے اک دن، کسی پل، کسی رو میں مٹا آئے ......
کہو! وہ چاند کیسا تھا ......؟
آسمان سے جو اتر آیا ...... تمہاری آنکھوں میں بسنے؟
کہا! بس خواب جیسا تھا ......

میرے قرب سے میرے وجود تک
اسے اختلاف تو سدا کا تھا
میرے غم سے میرے جنون تک
یہ فاصلہ بس انا کا تھا
میری زندگی سے میری سانس تک
وہ فلسفہ بس دعا کا تھا
میری بات سے تیرے ذکر تک
کوئی سلسلہ جو ہوا کا تھا
میرے حقیقت سے تیرے خواب تک
وہ بے خبر انتہا کا تھا
میرے وہم سے میرے گمان تک
یہ مرحلہ جس وفا کا تھا
میری طلب سے میرے نصیب تک
یہ معاملہ تو صرف خدا کا تھا
(بلقیس خان ...... پشاور)

لہو کی کھاد بھی جادو اثر نکلتی ہے

مٹھاس شاخ پہ بن کر ثمر نکلتی ہے
جو میرے ساتھ ہے اس کو تو ڈھونڈنے کے لئے
چراغ ہاتھ میں لے کر سحر نکلتی ہے
مری طرف سے اجازت ہے دیکھ لو خود بھی
کوئی جدائی کی صورت اگر نکلتی ہے
عجیب بات ہے آئی ہو جب کوئی مشکل
تو پہلی فال مرے نام پر نکلتی ہے
غرور اتنا نہ کرا اپنی شان و شوکت کا
یہ خوش گمانی تو کٹوا کے سر نکلتی ہے
میرے خیال میں تسخیر شش جہت کیلئے
تری گلی سے کوئی رہگزر نکلتی ہے
نہ رات سنتی ہے راحت فغاں صید یہاں
نہ دھوپ دیکھ کے ظرف سحر نکلتی ہے!

(انتخاب: کاشف عبید کاوش...... بٹہ موڑی بٹگرام)

اک دن یہ بھی تماشا ہوجاتا ہے
ہنستا بستا دریا صحرا ہوجاتا ہے
جیسے کوئی خوف سے پیلا پڑجائے
چاند اچانک ایسے نیلا ہوجاتا ہے
جانے اس کو کیسے منتر آتے ہیں
جو بھی اس کو دیکھے اس کا ہوجاتا ہے
تین اکیلے، چار اکیلے، سات اکیلے
اور پھر ہر کوئی اکیلا ہوجاتا ہے
جانے اس کو چھونے کی تاثیر ہے کیسی
زخم کوئی بھی ہو، سچ مچ اچھا ہوجاتا ہے

(حسنین حیدر شاہین...... لالیاں)

اللہ کے ہم بن کے سپاہی راہ حق میں جان لٹائیں
مظلوموں کے حامی بن کر ظالم سے ہم ٹکرائیں!
آپس کے سب جھگڑے مٹا کر اپنا علم لہراتے جائیں!
دور کریں ہم دل سے نفرت یکسوئی سے قدم بڑھائیں
جن کا جہاں میں کوئی نہیں ان کا سہارا بن کر ہم
مدد کریں ہم ان کی مل کر! ان کا ہاتھ بٹائیں
دل نہ دکھائیں کبھی کسی کا مثبت ہو تنقید ہماری!
علم و ہنر کو سامنے رکھ کر بات ہم اپنی منائیں
تب وہ ہماری بات سنیں گے تب وہ ہمارے ساتھ چلیں گے!
دانش مندی کا ہے تقاضا پیار محبت سے پیش آئیں!
الفت سے ہم جوڑ کے رشتہ نفرت سے ہم توڑ کے رشتہ!
لوگوں کی اصلاح کی خاطر اک اچھی تنظیم بنائیں

(محمد شفیق اعوان...... حضرو، اٹک)

بے وفا سے مانگتے ہو وفا کیا کرتے ہو
اور دل ٹوٹے تو کرتے ہو مقدر پہ شکوہ کیا کرتے ہو
جو رکھتے نہیں دل میں اپنے درد محبت
درد دل کی مانگتے ہو ان سے دوا کیا کرتے ہو
چھوڑ جائیں جو تمہیں دے کر زخم جدائی کا یارو
پھر بھی کرتے ہو ان سے وفا کیا کرتے ہو
جس شجر کو تم زمین میں لگا ہی نہیں پائے
کیوں مانگتے ہو پھر اس سے نشوونما کیا کرتے ہو
جنہیں فرق نہیں پڑتا تیرے ہونے یا نہ ہونے سے
بات بات پہ ہوجاتے ہو ان سے خفا کیا کرتے ہو
آج بنے ہوئے ہیں جو حبیب تمہاری جان کے دشمن
اور تم مانگتے ہو ان کی زندگی کی دعا کیا کرتے ہو

(رانا حبیب الرحمٰن...... سینٹرل جیل لاہور)

چہرے سے کتاب کا آنکھوں سے غزلوں کا پیام لگتی ہو
تم مجھے خوبصورت شاعری کا منتخب کلام لگتی ہو
جان بہار بدلتے موسموں کی طرح چاہا ہے تمہیں
کہ تم مجھے سردیوں کی دوپہر گرمیوں کی شام لگتی ہو
جی نہیں بھرتا میرا جتنی بار بھی پڑھوں تمہیں
کہ تم مجھے محبت کے خط میں پیار بھرا پیام لگتی ہو
ہر کوئی یہ خوشی اپنے سر لینے کو تیار ہے
کہ تم مجھے محبت کا خوب صورت الزام لگتی ہو
صبح جان کر بھی مانی نہیں کبھی کسی کی بات
کہ میری طرح تم بھی اپنے دل کی غلام لگتی ہو
جی چاہتا ہے ایک ہی سانس میں پی جاؤں تمہیں
کہ تم مجھے شراب کا بھرا جام لگتی ہو
جسے دیکھو حاصل کرنے کی جستجو میں ہے

کہ تم مجھے محبت کا اعلیٰ مقام لگتی ہو
کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی
کہ تم مجھے کہانی نا تمام لگتی ہو
(احسان سحر......میانوالی)

ہم تیرے لئے کیا کرتے ہیں لب کھول کے تو دیکھ ذرا
سب کچھ کریں گے تیری خاطر کچھ بول کے تو دیکھ ذرا
ہنس کے سہیں گے سب ستم تیرے اف نہ کریں گے قسم سے
رو ہی بیاباں یا جنگل میں رول کے تو دیکھ ذرا
ہر ایک عہد ہر اک قول ہر اک بات ہر وعدے میرے
بے وزن نہیں ملیں گے تم کو تول کے تو دیکھ ذرا
ہم نے کتنے شوق سے لگائی تھی دل سے پریت تمہی سے
میرے دل میں جو بات ہے وہ تم پر جول کے تو دیکھ ذرا
اپنی ہر اک خوشی میں تجھ پر لٹادوں گا سوں رب دی
تو کبھی اپنے دل کے دکھڑے ہم سے بول کر تو دیکھ ذرا
میرا دعویٰ ہے مجھ سا نہ ملے گا قسم سے کوئی تمہیں
ہم جگ میں سے کوئی مطلوب سا گول کے تو دیکھ ذرا
(مطلوب اللہ خان......وہاڑی)

چھیڑو نہ زخم پرانے دوستو
آئی ہے یاد طیبہ کی رلانے دوستو
پھٹتا ہے کلیجہ میرا طیبہ کی جدائی میں
لگی ہے میری روح اب کرلانے دوستو
پھر کارواں عام سفر ہوئے دیوانوں کو لے کر
کب ہوگا نصیب میں اپنے جانے دوستو
آئی ہیں یاد مدینے کی وہ پر نور فضائیں
لگی ہیں میری آنکھیں اشک بہانے دوستو
سینے میں اٹھتی ہیں درد کی لہریں ہر دم
لگی ہے سنہری جالی مجھے تڑپانے دوستو
حجرۂ اماں عائشہؓ ہے مرکز انوار رحمت
کب جاؤں گا میں یہ رحمتیں پانے دوستو
دور ہوں تو کیا مجھے ہے یقین اک دن
وہ آئیں گے خواب میں جلوہ دکھانے دوستو
دعا ہے بخاری خدا سے یوں جائیں مدینے
ہو جاری لبوں پہ صل علی کے ترانے دوستو
(مریم شاہ بخاری......سرگودھا)

کیوں تم اس دنیا کو ظلم کا نشانہ بنانے لگے ہو
کیوں تم ایک دوسرے کا خون بہانے لگے ہو
کیوں آخرت کو بھلا رہے ہو
کیوں اس دنیا کو اپنا رہے ہو
کیوں آزادی کو ٹھکرا رہے ہو
کیوں غلامی کو اپنا رہے ہو
کیوں ہمدردی کو بھلا رہے ہو
کیوں دولت کو اپنا رہے ہو
کیوں نعیم! انسان علم کو بھلانے لگے ہیں
کیوں جاہلیت کو اپنانے لگے ہیں
(نعیم اللہ......ہڈالی)

اس نے جس روز مجھے دل سے بھلایا ہوگا
خون آنکھوں سے سر شام بہایا ہوگا
مسکرا کر جو کسی سے بھی وہ ملتا ہوگا
اس کی باتوں میں میرا ذکر تو آیا ہوگا
اس نے ماضی کی تصویر اٹھائی ہوگی
اور پھر سر کو بھی دیوار سے ٹکرایا ہوگا
سوچتا ہوگا میرے بارے میں بے تابی سے
اپنی انگلی کو دانتوں میں دبایا ہوگا
یاد آیا ہوں، تو یاد آتا رہوں گا اس کو
جس نے لکھ لکھ کر میرا نام مٹایا ہوگا
جانتا ہوں کہ وہ تنہائی میں روتا ہوگا
میری تصویر کو سینے سے لگایا ہوگا
بھلا کر بھی مجھے یاد کرتا ہوگا وہ
کئی بار اسے میرا خیال آیا ہوگا
اس کا دل زور سے دھڑکا بھی ہوگا حلیم
عکس جس نے میرا کاغذ پہ بنایا ہوگا
(محسن عزیز حلیم......کوٹھا کلاں)

☆☆

ستم بن گئی، مہربانی تمہاری
یہاں تک بڑھی، بدگمانی تمہاری
یقین ہے چلو بات مانی تمہاری
وفاؤں کے وعدے زبانی تمہاری
مجھے ہجر میں چین ملتا نہیں ہے
ستاتی ہے یاد آ کے جانی تمہاری
قیامت کی شوخی بلا کی ادائیں
غضب کی ہے کافر جوانی تمہاری
تمہارا لڑکپن ہے اس کی ضمانت
اٹھائے گی فتنے جوانی تمہاری
نہ تم امتیاز اس جگہ جاؤ ہرگز
جہاں پہ نہ ہو قدر دانی تمہاری
(ایس امتیاز احمد..... کراچی)

غم حیات نے رکھی ہے آبرو میری
وگرنہ سنتا یہاں کون گفتگو میری!
ہر ایک لمحہ تجھے دل صدائیں دیتا ہے
تلاش کرتی ہے تجھ کو یہ آرزو میری
دیار عشق کو بخشی ہیں شہرتیں میں نے
ہر ایک لب پہ کہانی ہے سرخرو میری
خوشی سے دیکھ کے اس کو چھلک پڑے آنسو
بوقت دید رہی آنکھ باوضو میری
گرادیا تھا کبھی جس نے اپنی نظروں سے
سنا ہے آج اسی کو ہے جستجو میری
زبان کھولی تھی میں نے حکیم حق کے لئے
سنی گئی نہ کسی سے بھی گفتگو میری
(حکیم خان حکیم..... کامل پور موسیٰ)

ظلم لگا تھا حد سے بڑھنے
جہل لگا دل میں گھر کرنے
تب ایسے میں آئے آقاؐ
دنیا پر پھر چھائے آقاؐ
لوگوں کی امید بندھی تھی
لطف کی تب بارش ہوئی تھی
پردے جہاں کے ہٹتے دیکھے
اندھیارے سب چھٹتے دیکھے
بول ہوا تھا حق کا بالا
تھے اخلاق سبھی کے اعلیٰ
مظلوموں کے غم بھاگے تھے
ستم رسیدہ شاد ہوئے تھے
بے چینیوں کو ملا قرار
علم کا جگ میں بڑھا وقار
نقشہ بدل گیا دنیا کا
اسلامی پرچم لہرایا
(چوہدری قمر جہاں علی پوری..... ملتان)

کیوں مجھے ملا نہیں
تو مرا ہوا نہیں
آدمی نہ کہہ اسے
جس میں کچھ انا نہیں
عشق مرض لا دوا
عشق کی دوا نہیں
مجھ کو صبر و ضبط کا
کچھ صلہ ملا نہیں
جو ملا ہے کوڑے پر
ماں بھی اس کی کیا نہیں؟
ہے قلم پر فخر کیوں؟
منصف ہو خدا نہیں
دعا کا صرف رب نے بھی
یہی لگا! سنا نہیں
(فریدہ خانم..... لاہور)

وہ اک شخص تھا جس سے شکایتیں تھیں بہت
وہی عزیز تھا اس سے محبتیں تھیں بہت
وہ جب ملا تو دل میں کوئی طلب ہی نہ تھی
بچھڑ گیا تو ہماری ضرورتیں تھیں بہت
ہمیں خود اپنوں نے ہی کردیا رسوا
کہ بات کچھ بھی نہ تھی اور وضاحتیں تھیں بہت
ہر موڑ پہ ہم ٹوٹتے بکھرتے رہے
ہماری روح تھی تنہا اور قیامتیں تھیں بہت
(ملک این اے کاوش..... سلانوالی)

میرے وطن کی شاہراہیں
خون سے سرخ، سرخ اور صرف سرخ رہینگی
میرے وطن کی مائیں.....!
بیٹوں کو کفن پہناتی رہینگی
میرے وطن کے معصوم لوگ
کٹتے رہینگے مرتے رہینگے
مگر.....! یہ دعویٰ ہے میرا.....!
میرے وطن کی تاریک گلیوں میں
امید کا روشن دیا ضرور جلے گا
محبتیں لوٹ آئینگی
روشنی لوٹ آئیگی
....
دعا ہے.....!
عداوتیں روٹھ جائیں
مسکراہٹیں لوٹ آئیں
بہاریں لوٹ آئیں
خوشیاں لوٹ آئیں
نفرتیں دفن ہو جائیں
تاریکیاں دور ہو جائیں.....
اپنے لوٹ آئیں
تعبیریں میرے سپنوں کی
حاصل ہونگی، میرے وطن کی مٹی سے.....
(مدثر بخاری..... شہر سلطان)

دیوانوں کی دیوانگی پر ہنسنے والے بہت
زندگی کو سزا بنانے والے بہت
یہ طے ہے کہ غم کسی سے نہیں کہنا
بن آنسو آنکھوں کو رلانے والے بہت
آنکھوں کے دیپ جلے یا جیا جلے
یہاں درد کے سودے باز بہت
کاش کہ لفظوں کو خول پہنا سکوں
درد کشید کرنے والے تماشائی بہت
کسی کو پرکھنا مت اے سحر
عزت سے رسوا کرنے والے بہت
(وجیہہ سحر..... جوہر آباد)

☆☆

خاموشی

ساحل دعا بخاری۔ بصیر پور

نوجوان حصار میں بیٹھا عمل پڑھ رہا تھا، اسے تاکید کی گئی تھی کہ وہ چوکس و چوکنا رہے اور غلطی نہ کرنے کی احتیاط برتے، لیکن نوجوان سے غلطی سر زد ہوتے ہی موت نے جھپٹا مارا اور نوجوان کا گلہ دبوچ لیا۔

برسوں دل ودماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت کے لبادے میں لپٹی ہوئی شاہکار کہانی

اس کی چال میں صدیوں کی تھکن تھی۔ گرد آلود پاؤں، طویل مسافت کا پتہ دیتے تھے...... بلیک ٹراؤزر اور بلیوٹی شرٹ سلوٹوں سے پرتھی۔ پیشانی پہ بکھرے بال بھی اس کی لاپرواہی کے شاہد تھے۔ سیاہ، گہری آنکھیں حزن میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ شیو ہلکی بڑھی ہوئی تھی اور لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے...... وہ ''گداگر'' تھا...... ہاں! وہ محبت کا گداگر تھا...... اس سے قبل اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ کسی سے کچھ ''مانگ'' بھی سکتا ہے؟ مانگنا اس کی سرشت میں شامل ہی نہ تھا...... یہ اس کی ''فطرت'' کے برعکس تھا۔ مگر...... محبت ایسی ہی منہ زور اور سرکش ہوتی ہے۔ ''مقدر'' کی طرح منہ زور اپنی مرضی سے انسان کو جدھر چاہے، ہانک کے لئے جائے، شاہ کو گدا بنادے...... اور ''موت'' کی صورت، سرکش...... انسان لاکھ بھاگ

لے، مگر اس سے کسی طور بچ نہیں سکتا...... عقاب اور چیتے
کی طرح جھپٹ کر دبوچ لینے والی......

اگر دیکھا جائے تو انسان کی پوری زندگی ان تین
''میموں'' کے مدار میں گھومتی ہے...... ہر چیز کا معاوضہ
ہے۔ انسان معاوضہ دے کر کوئی بھی کام دوسرے سے
کرواسکتا ہے، مگر یہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کا کوئی
معاوضہ نہیں...... یہ تینوں انسان کو خود اپنی ذات پہ جھیلنی
پڑتی ہیں۔

''مقدر، محبت، اور موت......'' انسان ہر چیز
دوسروں سے بدل سکتا ہے...... جوتے، کپڑے حتیٰ کہ
جسمانی اعضاء بھی...... لیکن...... انسان کسی سے اپنا
''مقدر'' نہیں بدل سکتا...... معاوضہ دے کر اپنے حصے کی
''مشقت'' تو دوسروں کے حوالے کرسکتا ہے، مگر اپنا
''مقدر'' نہیں...... مقدر میں لکھے دکھ، لکھی ٹھوکریں بہر
صورت خود ہی کو کھانا پڑتی ہیں۔ اسی طرح، انسان اپنے
جذبات، اپنی محبت بھی کسی صورت، کسی اور کے حوالے
نہیں کرسکتا۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ''مجھ سے فلاں چیز لے لو،
مگر اس کے بدلے محبت کی اذیت تم جھیل لو......''

نہیں...... ایسا نہیں ہوتا...... محبت کا کرب بھی
بہر حال خود کو ہی سہنا ہوتا ہے...... اور ٹھیک اسی طرح
انسان اپنے حصے کی ''موت'' بھی دوسرے کو نہیں دے
سکتا...... پوری کائنات کی قیمت پر بھی نہیں...... مرنا بھی
ہر صورت، ہر حال میں، ہر طور ''خود'' ہی پڑتا ہے......
ان کے آگے انسان مکمل ''بے بس'' ہے...... بے بس تو
اور بھی بہت سی چیزوں میں ہے، مگر ان میں سے بچنے کی
کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی ہے، کچھ خواہشات بھی
بے بس کردیتی ہیں...... اگر موت سے بچا جاسکتا تو انبیاء
کرام علیہم السلام ہمیشہ یہیں رہتے...... کبھی ''پردہ پوش''
نہ ہوتے......

اگر محبت سے بھاگا جاسکتا تو گریباں چاک کیے
مجنوں ہوکر صحراؤں کا رخ نہ کرتا...... رانجھا کبھی ''جوگ''
نہ لیتا...... سسی بھی صحراؤں کی گرم ریت میں دفن نہ
ہوتی...... ان تینوں چیزوں کی گرفت سے بچنا ناممکن
ہے...... قطعاً ناممکن......!

وہ بھی ''محبت اور مقدر'' کا ڈسا ہوا تھا۔ اس کے
بھی مقدر میں قوی محبت لکھی تھی اور محبت نے اسے گدا بنا
ڈالا تھا۔ وہ چپ گمر کے جنگل میں محبت مانگنے آیا
تھا...... وہ مقدر سے محبت مانگنے آیا تھا...... یعنی ''میم''
سے ''میم'' مانگنے آیا تھا۔ مقدر عین اس کے سر پہ، کسی
بادشاہ کی صورت براجمان تھا...... اس کی شان و شوکت
بلاشبہ سکندر ذوالقرنین اور دارا سے بھی زیادہ تھی، وہی تو
تھا جس نے ان کو بھی ''حکومت'' بخشی تھی۔ اللہ نے
زمین پر کسی کسی کو حکومت بخشی ہے۔

☆......☆......☆

فاروق حیدر نے درخت سے زمین پہ بکھرے
خشک پتوں کو ہٹا کر جگہ صاف کی...... ٹراؤزر کی جیب
سے چھری نکال کر، حصار کھینچا اور لب بھینچ کر بیٹھ گیا......
حصار کے باہر بھی خاموشی تھی اور حصار کے اندر بھی
خاموشی تھی...... اس نے موت سے بچنے کے لئے حصار
کھینچا تھا...... حصار کے باہر موت تھی، حصار کے اندر
محبت اور حصار کے اوپر مقدر...... وہ ایک ''میم'' سے
دوسری ''میم'' مانگ رہا تھا...... اور تیسری میم...... تیسری
میم کا کیا کردار تھا؟ اس کا فیصلہ تو پہلی میم نے کرنا تھا۔

فاروق کی سیاہ آنکھوں میں ''دل نور'' کی شبیہ
تھی...... دل نور...... وہ پیکر نور...... جو اس کے دل کا ہی
نہیں، روح کا بھی نور تھی...... اور آنکھوں کا نور تو تھی
ہی...... اس کے لب خاموش تھے...... سختی سے بھینچے تھے،
مگر...... دل مسلسل ایک ہی نام کا ورد کررہا تھا......
آنکھیں بظاہر سامنے درخت پر جمی تھیں مگر بصیرت و
بصارت ایک ہی چہرے کا طواف کررہی تھی...... وہ سراپا
بے بس، سراپا سوال تھا...... محو دعا، محو التجا، محو ندا تھا......
مقدر سے محبت...... میم سے میم مانگ رہا تھا...... سر پر
براجمان میم نے اسے ''میم'' دینے کا فیصلہ کرلیا...... مگر
ابھی اسے مانگنے والے کی ''طلب'' کو پرکھنا تھا۔ پھر بعد
میں......

☆......☆......☆

دل نور شیرازی اس کی خالہ زاد تھی۔ لیکن ستم یہ کہ ”صرف“ خالہ زاد نہیں تھی۔ اس کی پسند تھی...... اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز ہمیں اچھی لگتی ہے پھر دلچسپی بڑھنے لگتی ہے، حتیٰ کہ وہ چیز ہماری خواہش، پھر طلب، پھر ضرورت اور پھر مجبوری بن جاتی ہے، اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا...... دل نور اس کی ضرورت سے بھی آگے بڑھ کر ”مجبوری“ بن گئی تھی۔

بھکاری ”خواہش“ نہیں بناتی، بھکاری ”مجبوری“ بناتی ہے...... مثلاً ہمیں کوئی سوٹ پسند آجاتا ہے، ہم اسے لینے کی خواہش کرتے ہیں، لیکن اگر وہ سوٹ پہلے ہی کوئی اور لے چکا ہو یا پھر اس میں کوئی ”نقص“ نکل آئے تو ہم اس سے دستبردار ہوجاتے ہیں...... یہ خواہش ہے......

لیکن...... اگر ہمیں پیاس لگی ہے، ہم پیاس سے قریب المرگ ہیں اور کسی کے پاس پانی ہے، مگر پیالہ ٹوٹا ہوا ہے، ہم اس ٹوٹے ہوئے پیالے میں پانی پی لیں گے...... یہ مجبوری ہے...... مجبوری نقص سمیت قبول کرنے کا نام ہے......

اس کی محبت بھی ایسی ہی تھی بلکہ محبت ہوتی ہی ایسی ہے...... تمام تر خامیوں اور نقائص سمیت اسی اور صرف ”اسی“ کو پانے کی طلب میں پاگل...... محبت مجبوری ہے...... اور مجبوری تو نہ چاہتے ہوئے بھی ”کرنے“ کا نام ہے...... یہ از حد حقارت سے ہمارے ہاتھوں میں کشکول تھما دیتی ہے اور ہم نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کشکول تھام لیتے ہیں...... اور پھر اسے بھرنے کی چاہ میں نکل کھڑے ہوتے ہیں مگر یہ اور بات ہمیشہ ایک ہی در پہ کسی اجڑے ہوئے درخت کی طرح منجمد کھڑے رہتے ہیں...... پھر اگر اس ”کاسہ دل“ میں ”کاسہ عشق“ میں حسن چاہت کی، توجہ کی خیرات کا ایک سکہ بھی ڈال دے تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا...... گویا دونوں جہاں مل گئے...... لیکن اگر ”وہ“ ایک نظر کا سکہ بھی نہ ڈالے اور باقی پوری دنیا کی دولت ومحبت اس کاسے میں ڈال دی جائے تب بھی یہ خالی کا خالی ہی رہتا ہے کیونکہ کسی اور سے یہ کبھی بھرنے والا نہیں...... اسے صرف ”وہی“ بھر سکتا ہے...... وہ نہ بھرے تو کوئی بھی نہیں بھر سکتا......

اس کا کاسہ دل بھی خالی کا خالی تھا...... اور یہ خالی پن کسی طور بے قرار کرتا ہے، کاش! اس کے لئے کوئی لفظ ہوتا جو بیان کیا جاسکتا...... مگر...... فاروق اکلوتا تھا......

حیدر شیرازی ایک کامیاب بزنس مین تھے اور صوفیہ حیدر سوشل ورکر...... دولت کی فراوانی اور ماں باپ کی محبتوں نے فاروق حیدر کا وہی حال کردیا تھا جو کرنا چاہئے تھا وہ مغرور تھا...... خود پسند تھا اور...... لا ابالی تھا...... اسے دولت، محبت اور خوبصورتی وراثت میں ملی تھی...... مگر اسے مقدر وراثت میں نہیں ملا تھا...... مقدر ہر ایک کا جدا جدا ہوتا ہے...... اس کا بھی جدا تھا......

☆......☆......☆

تاریکی بے حد گہری تھی...... بے حد گاڑھی...... تنہائی نے کسی بوڑھے سے برگد کی طرح زمین میں دور دور تک تک اپنی جڑیں پھیلا رکھی تھیں، قبروں کے کتبے کسی عفریت کی طرح لگتے تھے...... برگد کا اکلوتا پیڑ عالم یاس میں سر جھکائے ہوئے تھا اور پیڑ پہ ”مسکن“ خاموشی کی دہشت، موت کی دہشت پہ بھی بھاری محسوس ہوتی تھی۔

قبرستان میں جا بجا موت بکھری تھی...... زندگی مرگئی تھی...... آوازیں مرگئی تھیں...... اور جب زندگی مرجائے تو موت اسے زیر زمین لے جاتی ہے......

خاموش زندگی کو زیر زمین پاکر خدا جانے مطمئن تھی یا پھر افسردہ...... اس کا اندازہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ...... وہ خاموش تھی...... اور اس کا چہرہ سپاٹ تھا...... کسی بھی تاثر سے یکسر عاری......

قبرستان میں خاموشی کی حکومت ایسی قوی تھی کہ مسلسل چیختے رہنے والے جھینگر بھی دم سادھے ہوئے تھے۔ قبرستان کی شکستہ چار دیواری ٹوٹ پھوٹ کے

باوجود سرتا نے کھڑی تھی۔ موت اس چار دیواری کے اندر ''محصور'' تھی۔ مگر...... کیا واقعی موت ''محصور'' تھی؟ اس وقت ایک ایک سایہ قبرستان میں بکھری، موت سے بچ بچ کر چل رہا تھا...... مگر خشک پتوں کی طرح جابجا بکھری موت پہ پھر بھی اس کا پاؤں آہی گیا...... اس کا دل دھک سے رہ گیا...... خوف نے اس کے دل کو فولادی گھونسہ رسید کیا اور اس کی روح تک ٹھٹھر اگئی تھی۔

قبرستان خاموشی کا گھر تھا اور وہ خاموشی سے ''زبان'' مانگنے آیا تھا...... آواز مانگنے آیا تھا...... قبرستان موت کا گھر تھا...... اور وہ ''موت'' سے ''زندگی'' مانگنے آیا تھا...... مقدر اب بھی اس کے سر پہ سایہ فگن تھا اور یہ ہمیشہ سر پہ سایہ فگن ہی رہتا ہے......

محبت اب بھی اس کے دل، اس کی رگوں، اس کی روح اور اس کی شہ رگ میں اپنے نوکیلے دانت گاڑے ہوئے تھی...... اور اس کے نوکیلے دانتوں کی چبھن اسے بے قرار کیے دیتی تھی۔ اور یہ بے قراری اس کے وجود میں ''پارہ'' بن کر چل رہی تھی...... ایک عجیب سا خوف اس کی رگوں میں پنجے گاڑنے لگا تھا۔

وہ بزدل تو کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ مگر قبرستان کا ماحول ایسا ہولناک اور وہاں خودرو جھاڑیوں کی طرح سر ابھارے ہوئے ''موت'' کا تاثر ایسا بھیانک تھا کہ اس جیسا نڈر انسان بھی ہراساں تھا...... گاڑھی تاریکی، مہیب خاموشی، چلاتا سناٹا، سنسناتا سکوت اور قبروں میں لیٹی موت...... کسی کو بھی خوفزدہ کرسکتی تھی۔ ویرانی ایسی تھی کہ اسے لگا اس کا سارا وجود، روح سمیت یکایک ویران...... بے حد ویران ہوگیا ہے۔ سارے خیالات کہیں تحلیل ہوگئے تھے۔ یکایک ایک آواز اس کی سماعتوں میں نیزے کی انی بن کر اتری...... ''مجھے نفرت ہے تم سے......'' اس کے دل کو کسی نے جلتے انگاروں پہ رکھ چھوڑا تھا۔ سنہری مائل سبز آنکھوں کی ناگواری اسے بری طرح تڑپا گئی تھی اس نے بے اختیارانہ ضبط کی کوشش میں نچلا لب دانتوں تلے کچل ڈالا۔ اس کی بصیرت و بصارت ایک ہی چہرے پر مرکوز ہوگئی۔ وہ

سنہری رنگت، تیکھی ناک، یاقوتی ہونٹ اور شفاف، سنہری مائل سبز آنکھیں...... کمر تک گرتی سیاہ آبشار اور سانچ میں ڈھلا کانچ کا پیکر...... اسی کو پانے کے لئے تو وہ اتنی خطرناک جگہ، ایک خطرناک عمل کرنے آیا تھا۔

☆......☆......☆

ان دنوں دل نور کے لئے ایک رشتہ آیا ہوا تھا، لڑکا مہروز بخت امریکہ کا رہائشی تھا اور دل نور کو کافی پسند تھا وہ......

اسے اس بابت علم ہوا تو وہ اس کے مقابل جا ٹھہرا...... ''آخر کیا ہے اس میں، جو مجھ میں نہیں؟'' آنچ دیتا لہجہ ہلکا سا تلخ تھا۔ ''پتہ نہیں۔'' اس کی سبز آنکھوں میں ناگواری در آئی۔ ''تم مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہو دل نور؟'' ٹوٹا ہوا لہجہ بکھرا بکھرا تھا۔

''تم مجھ سے محبت کیوں کرتے ہو فاروق؟'' اس نے ابرو اچکا کر پوچھا۔ لہجہ سرد تھا۔

''پتہ نہیں......'' اس کے انداز میں بھرپور بے بسی تھی۔ بھلا محبت کا کیا جواز پیش کیا جاسکتا ہے؟''

''اسی طرح مجھے بھی نہیں پتہ کہ مجھے تم سے نفرت کیوں ہے۔'' اس نے نرمی سے وضاحت کی تھی اور اس کا ''نرم انداز'' بھی اس کی آنکھوں میں کرچیاں بن کر چبھا تھا۔

''پلیز...... مجھ سے شادی کرلو دل! تمہیں بہت خوش رکھوں گا، جو کہوگی، کروں گا، تمہاری ہر بات مانوں گا۔'' کیسی شدت کی خواہش مچل رہی تھی اس کی آواز و انداز میں......

''سوری فاروق! مگر میں تم سے شادی نہیں کرسکتی اور پلیز اگر تم میں ذرا بھی انسانیت باقی ہے تو آئندہ میرے راستے میں نہ آنا۔'' یہ کہہ کر وہ ایک جھٹکے سے مڑگئی۔

وہ پتھر کا بت بنا اس کی لہراتی زلفوں اور سرسراتے دوپٹے کو دیکھے گیا۔ لفظ بھی کیا جادو بھرے ہوتے ہیں۔ پل بھر میں جیتے جاگتے وجود کو پتھر میں ڈھال دیتے ہیں۔'' ایک ہی لفظ کہا تھا اس نے۔

"پتھر کا ہو گیا ہوں میں" پاس ابھرنے والی سرسراہٹ اسے حال میں کھینچ لائی۔ اسے یاد آیا کہ وہ شہر خموشاں میں کھڑا ہے، اس نے کچھ دیر خالی خالی نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ ان نظروں میں فقط ویرانی تھی۔ جیسے قبرستان میں پھیلی ساری ویرانی ایک دم اس کی آنکھوں میں آن سمائی تھی۔ اس نے سر جھٹک کر خود کو سنبھالنے کی حواس میں لانے کی سعی کی جو کہ قدرے کامیاب ٹھہری، اس نے جگہ منتخب کرنے کے لئے سیل فون روشن کیا۔ تاریکی آن کی آن میں اپنا زخم زخم وجود لئے نو دو گیارہ ہوگئی۔ چند لمحے روشنی چار سو رقص کرتی رہی۔ پھر ایک جگہ ٹھہر گئی...... جیسے اسے کسی نے کیلوں کی مدد سے گاڑ دیا ہو......

جگہ منتخب ہوگئی...... مگر وہ جگہ کس شے کے لئے منتخب ہوئی تھی۔ یہ خدا ہی جانتا تھا...... تخت، یا تختہ...... زندگی، یا موت...... وہ چند قبروں کے بیچ خالی پڑی جگہ تھی۔

اسے دائرہ کھینچ کر وہاں بیٹھنے میں محض چند لمحے ہی لگے تھے...... اب پھر...... اس کے لب تختی سے پیوست تھے...... لہو کی روانی، دل کی دھڑکن اور سانس کی لرزش ایک ہی نام کا ورد کر رہی تھی...... بصیرتوں اور بصارتوں پہ ایک ہی چہرہ معلق تھا۔ خاموشی آنکھوں میں طیش لئے اسے تک رہی تھی اور اس کے سر پہ سایہ فگن، بخت کا سنہرا، جھلملاتا تاج پہنے "مقدر" اس کی طلب کی "شدت" کو پرکھ رہا تھا۔ جانچ رہا تھا...... فاروق کی آنکھوں میں نمی آن ٹھہری تھی۔

☆......☆......☆

اسے خود بھی خبر نہ ہوئی تھی کہ کب دل نور اس کے دل میں آن بسی تھی۔ اسے علم بھی ہوا تھا جب دل کے چپے چپے پہ اس کی حکمرانی ہوگئی تھی۔ پہلے وہ حیران ہوا تھا...... مگر یہ محبت ہمیشہ "شب خون" ہی مارتی ہے...... پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا تھا کہ اس کی محبت اس کی دسترس میں تھی۔ لہٰذا اس نے بڑے آرام سے صوفیہ حیدر کی آغوش میں سر رکھ کر اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔

"ہاں کیوں نہیں، خود میرا اور سونیا کا بھی یہی خیال تھا۔ میں آج ہی سونیا سے بات کرتی ہوں۔ میرے خیال میں شایان بھائی اور خود دل نور کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" وہ پرجوش ہوگئیں۔

اگلے چند دن میں بہت کچھ ہوگیا تھا...... دل نور نے انکار کر دیا تھا۔ وہ وجہ جاننے کو اس کے پاس گیا تو اس نے دل نور کی سنہری مائل سبز آنکھوں کی بیزاری دیکھ کر اسے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جسے ہم سب سے زیادہ چاہیں، اس کی ہم سے بیزاری تکلیف تو دیتی ہے ناں!

وجہ دل نور نے یہ بتائی تھی کہ "کوئی وجہ نہیں۔ بس فاروق! میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ شاپنگ کے لئے جا رہی تھی۔ اسے وجہ بتا کر گاڑی میں بیٹھی اور...... چلی گئی۔

دنیا

دنیا میں کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ ان جیسی کوئی چیز نہیں جیسا کہ آب زم زم جیسا کوئی پانی نہیں۔

نماز جیسی کوئی عبادت نہیں۔

حج جیسی کوئی زیارت نہیں۔

اسلام جیسا کوئی مذہب نہیں۔

قرآن پاک جیسی کوئی کتاب نہیں۔

مدینے جیسا کوئی شہر نہیں۔

درود شریف جیسا کوئی خزانہ نہیں۔

مکے جیسی کوئی دولت نہیں۔

جمعے جیسا کوئی دن نہیں

رمضان جیسا کوئی مہینہ نہیں۔

(شرف الدین جیلانی - ٹنڈو الہ یار)

فاروق ناکام پلٹ آیا...... اگلے چند ہفتوں میں اس نے بخوبی جان لیا کہ وہ لاکھ کوشش کرلے، مگر نہ تو وہ دل نور کے بغیر رہ سکتا ہے اور نہ ہی اسے کسی اور کا ہوتا دیکھ سکتا ہے۔ اس نے دل نور کو بھلانے کی ہر کوشش کر ڈالی تھی۔ مگر ناکامی ہی ہاتھ آئی تھی۔

ڈرنک کے نشے میں دھت ہو کر بھی اس کے دل و دماغ پہ فقط اسی کا خیال مسلط رہتا تھا۔ پارٹیز میں جگمگاتا ہر چہرہ دل نور کے ملیح چہرے میں ڈھل جاتا تھا۔

بہر حال ہر ممکن کوشش کرنے کے بعد اس نے ہار مان لی تھی۔

☆......☆......☆

''یار! میں ایک باباجی کو جانتا ہوں جو گارنٹی دیتے ہیں کہ ''سنگدل سے سنگدل محبوب آپ کے قدموں میں۔'' سنگر کی بات پہ بیزاری سے لیٹا فاروق ایک دم سیدھا ہوا تھا۔

''کیا ایسا ہو سکتا ہے؟'' اس نے بے یقینی سے دریافت کیا۔

''سلویٰ فیروز یاد ہے تمہیں؟ وہ جو بائی ڈپارٹمنٹ کی تھی اور ارسلان حسن کے بغیر تقریباً پاگل ہو گئی تھی؟'' وہ محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ ''وہ انہی باباجی کے پاس گئی تھی اور دیکھ لو، آج ارسلان حسن کی چہیتی بیوی ہے۔''

فاروق کی بجھی آنکھیں ایک دم روشن ہوئی تھیں۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' اگلے ہی لمحے وہ اسفر کو کھینچ کر گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔

پھر وہ عامل کے پاس پہنچ گئے۔ ساری باتوں کے بعد عامل بولا۔

''عمل بظاہر آسان ہے...... مگر...... بے حد خطرناک ہے۔ یہ کسی خاموش جگہ کرنا ہوگا اور بنا کوئی بھی آواز نکالے...... کوئی بھی منظر ہو، تمہیں اف بھی نہیں کرنا...... اگر تم نے منہ سے ذرا بھی آواز نکالی تو...... جان سے جاؤ گے۔'' وہ اسے عمل کی بابت مزید بتانے لگے کہ اس کے تصور میں مطلوب چہرہ ہی رہنا چاہئے۔ نیز ہر سانس اور ہر دھڑکن کو اسی کا نام لینا چاہئے...... عامل نے مزید بتایا کہ ''یہ عمل محض تین دن کا ہے۔ ایک رات ویرانے میں یا جنگل میں اور دوسری دو راتیں قبرستان میں کرنا ہوگا۔ اس نے اس عمل سے کامیاب ہونے والوں کے نام گنوائے۔ جو آج اپنی محبت کو پا چکے تھے۔

☆......☆......☆

گھور اندھیروں کی بستی میں، جس ہنر نیلام کریں
پھر سے ہم یہ آنسو بیچیں، روشنیاں نیلام کریں
اک دنیا ہے دشمن اپنی، ایک زمانہ قاتل ہے
کس کس کے سر تہمت باندھیں؟ کس کس کو بدنام کریں؟
دھوپ سے اجلا روپ ہے اس کا، سونے جیسی صورت ہے
ہم اجڑی تقدیروں والے، کیسے اس کو رام کریں......؟
اک اڑتے بادل کا سایہ، کب تک ساتھ نبھائے گا......؟
پھر بھی کچھ ستالیں یارو! کچھ لمحے آرام کریں
گو کہ وہ ''دشمن جاں'' ہے مگر پھر بھی ہماری ''جان'' ہے
زیست کے یہ آخری لمحات بھی، آؤ! اسی کے نام کریں
معلوم ہمیں ہے کہ ہماری یاد اسے پل بھر کو بھی نہ چھوتی ہوگی
پھر بھی ہر پل سوچیں اس کو، اس کے عشق میں صبح و شام کریں

تاریکی آسمان پہ چمکتے تاروں کے باوجود بے حد مہیب تھی۔ خاموشی کسی بھٹکتی ہوئی بدروح کی مانند قبروں کے بیچ چکراتی پھرتی تھی۔ اس نے ننگے پاؤں سہمے سہمے انداز میں اٹھتے اور پڑتے تھے، خاموشی کو گمان تھا کہ وہاں صرف اس کی حکومت ہے۔ وہاں اور کوئی نہیں......

مگر اسے غلط لگتا تھا۔ وہاں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا...... وہاں تین ''میمیں'' تھیں...... اور چوتھی میم کا انتظار کر رہی تھیں...... ہاں! وہاں ایک عدالت بجی تھی۔ ایک فیصلہ ہونا تھا۔ وہاں مقدر منصف تھا۔ فیصلہ اسی کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں محبت اک شان بے نیازی سے براجمان تھی...... وہاں موت ایک جھاڑی کے عقب میں محو انتظار تھی...... موقع کی تاک میں تھی کہ

کب اسے موقع ملے اور وہ کسی چیتے کی طرح جھپٹ کر اپنے شکار کو دبوچ لے...... اور وہ سب تیسری میم یعنی ''مانگنے'' والے کا، فاروق کا انتظار کر رہی تھیں، وہ آج پھر مانگنے آرہا تھا...... اب پتہ نہیں اسے آج کیا ملنے والا تھا۔ لیکن وہ بے خبر تھیں کہ وہاں ایک پانچویں میم بھی موجود ہے...... اور وہ ان سے بھی زیادہ شدت سے آنے والے کا انتظار کر رہی ہے......

دفعتاً خاموشی کے قدم تھم گئے...... آنے والا آرہا تھا...... قدموں کی موہوم سی آہٹ اس کی آمد کا پتہ دیتی تھی۔ آج قبرستان میں خشک پتوں کی بہتات تھی۔ دور کہیں گیدڑ بین کر کے رونے لگا۔ اس کی منحوس چیخوں نے خاموشی کے کانچ کے نازک وجود میں گویا پتھر دے مارا۔ خاموشی کا وجود ترخ گیا اور اس میں دراڑیں پڑگئیں...... جیسے بنجر زمین میں پڑی ہوتی ہیں......

پھر برگد کے درخت پہ الو چلایا تو خاموشی کا وجود ریزہ ریزہ ہوگیا۔ فاروق کے قدم خشک پتوں پہ پڑے تھے اور خاموشی کی سسکیاں خشک پتوں کی کراہوں میں ڈوب ڈوب جاتی تھیں۔

ٹارچ کا روشن دائرہ کل والی جگہ آکر تھم گیا۔ خوف گویا ہر قبر سے سر باہر نکال رہا تھا۔

فاروق نے حصار کھینچا اور محصور ہوگیا۔ خاموشی کے وجود کے بکھرے ریزے...... جو کہ ریت کی مانند بکھر چکے تھے، یکا یک یکجا ہوگئے۔ یوں کہ جیسے کبھی بکھرے ہی نہ تھے۔ اب ''خاموشی'' چپ چپ، دم سادھے، فاروق کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں ''سکوت'' تھا، مگر ''سکون'' نہیں تھا...... بے چینی حصار کے گرد تیزی سے چکرا رہی تھی...... بے قراری ہر قبر پہ بیٹھی رو رہی تھی اور خوف...... خوف اژدھے کا روپ دھارے سارے میں بل کھا رہا تھا۔ ستارے گاہے بگاہے پلکیں جھپکتے تھے۔ چاند کا نام ونشان بھی نہ تھا۔

فاروق...... محو التجا تھا...... محو ندا تھا...... محو صدا تھا...... محو دعا تھا...... لمحے ایک ایک کر کے قبروں پر سے پھسلتے رہے...... آج رات زیادہ سخت تھی مگر فاروق بنا ڈرے بیٹھا تھا...... سانپوں کا خوف، قبرستان کے تمام مردے جو کہ یکبارگی قبریں پھاڑ کر باہر نکل آنے والے تھے، ان کا خوف، حتیٰ کہ موت کا خوف بھی اس کے پاس نہ پھٹکا تھا...... بس اب کچھ ہی دیر جاتی تھی اسے منزل ملنے والی تھی...... سر پر براجمان مقدر نے قلم تھاما اور فیصلہ کھینچ ڈالا...... مگر وہ فیصلہ کیا تھا؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا سوائے اللہ کے...... اور اللہ تو ہر چیز سے بخوبی واقف ہے ہی......

دفعتاً ایک زبردست گونج پیدا ہوئی...... جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں...... جیسے آسمان یکلخت گر پڑے ہوں...... جیسے زمین یکا یک ''دولخت'' ہوگئی ہو...... جیسے سورج کا گولہ پھٹ گیا ہو...... فاروق کی بصارتوں نے دیکھا کہ ایک طویل ترین سایہ اس کی طرف آرہا تھا۔ نجانے کیوں مگر اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑک اٹھا۔ سایہ قریب آتا گیا...... اس کا چہرہ تیرگی کے وجود میں بھی واضح تھا اور اس کے خدوخال...... بے حد عجیب اور دہشت آمیز تھے، اسے دیکھ کر خود بخود ہی دل پر اس کی نوکیلی جھاڑی سے جا الجھتا تھا، اس کی سرخ آنکھوں میں آگ دہک رہی تھی اور پشت پہ بکھرے لمبے بال ہوا سے مسلسل لہرا رہے ہوں...... ''یہاں میری حکمرانی ہے۔ کیوں میری سلطنت میں آیا ہے؟'' اس نے غرا کر کہا۔ اس کی غراہٹ کسی درندے کی دھاڑ سے مشابہہ تھی۔

فاروق جواباً خاموش رہا...... اسے خاموش ہی رہنا تھا۔

''میں پوچھتی ہوں کیوں آیا یہاں؟'' وہ چلا اٹھی۔

مگر نتیجہ صدا بصحرا۔

''تو تو نے یہ طے کر رکھا ہے کہ نہیں بولے گا؟ دیکھ اب کیسے بولتا ہے تو......'' اس آواز کی رعد کی سی کڑک تھی۔ وہ ایک دم پلٹی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی چلی گئی۔ وہ بے نیازی سے بیٹھا رہا۔

مگر...... اگلا لمحہ ایسا تھا کہ وہ ''بے نیازی'' کو

بھول گیا۔ وہ طویل نسوانی پیکر آ رہا تھا اور اس کے ساتھ کوئی تھا اور...... اور وہ ''کوئی'' دل نور تھی۔ ہاں بلاشک ولاریب وہ دل نور ہی تھی......

تاریکی کے اندھے وجود کی کوکھ میں بھی وہ دل نور کو...... دیکھ سکتا تھا۔

''باہر آ کر اسے بچا سکتے ہو، تو بچالو......'' خاموشی غرائی۔

اس نے اپنا منہ کھولا...... اس کے لمبے...... تلوار کے سے دانت چمکے...... دل نور سہم گئی۔ ''مم...... مجھے بچالو فاروق۔'' اس کی آواز دہشت زدہ تھی۔

فاروق کی رگوں میں بہتا سارا خون یکبارگی اضطراب میں ڈھل گیا، خاموشی نے اپنی نوکیلی انگلیوں سے دل نور کے نازک وجود کو دبوچ لیا۔

''فاروق......!'' دل نور بے قراری سے پکار اٹھی۔ وہ ''بیقرار'' تھی تو پھر فاروق کیسے ''قرار'' سے رہ سکتا تھا؟''

''اوکے! تم شاید اسی لئے یہ عمل کر رہے ہو کہ میں مرجاؤں، تو ٹھیک ہے، مجھے مرنے دو۔'' دل نور نے کہا اور وہ تڑپ اٹھا۔

''دل نور......'' اس کے لب بے ساختہ پکار اٹھے۔ اس کی یہ حرکت قطعاً لاشعوری تھی...... وہ بھول گیا تھا کہ اسے دوران عمل بالکل خاموش رہنا تھا...... وہ بھول گیا تھا کہ دکھائی دیتا منظر نظر کا فریب ہے۔ اسے یاد رہا تھا تو صرف اتنا کہ دل نور مشکل میں ہے۔

خاموشی اب دل نور کا گلا دبوچ رہی تھی۔ ''دل نور......'' وہ بے اختیار اٹھ کر اس کی جانب لپکا۔

''عمل'' اس کے بولنے سے ٹوٹ گیا تھا۔

''حصار'' اس کے باہر نکلنے سے ٹوٹ گیا...... خاموشی کے ہاتھ ساکت رہ گئے...... دل نور کسی بے جان شے کی طرح اس کی گرفت سے پھسل کر گر گئی...... شان بے نیازی سے بیٹھی محبت سناٹے میں رہ گئی...... مقدر دلچسپی سے دیکھے گیا...... عین اسی لمحے...... موت نے کسی چیتے کی سی پھرتی سے جھپٹا مارا اور فاروق کا گلا دبوچ لیا......

وہ سانس لینے کے لئے تڑپنے لگا...... اس کا دم گھٹتا جاتا تھا...... دل رقص بسمل کر رہا تھا...... سانس، سانس لینے کی طلب میں بری طرح تڑپ رہی تھی...... پھیپھڑے جواب دے رہے تھے...... کافی دیر زندگی اور موت کے بیچ کشمکش جاری رہی...... سانس نے اپنا زخم زخم وجود موت کے سفاک پنجوں سے چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر بے سود...... سانس، سانس لینے کی کوشش میں بری طرح ہانپ رہی تھی...... تڑپ رہی تھی......

پھر ''نیم جان'' سانس ''بے جان'' ہوگئی......

زندگی کا تڑپتا وجود موت کی سفاک آغوش میں جا کر ساکت ہوگیا...... ایک میم ''مانگنے والے'' کی صورت مرگئی تھی، دوسری میم ''موت'' نے اپنا پیٹ بھر لیا تھا، تیسری میم ''مقدر'' اپنے فیصلے پہ مطمئن تھی...... اس نے مانگنے والے کی طلب کی شدت کو پرکھا تھا، پھر ہی فیصلہ کیا تھا۔

اسے غصہ تھا کہ مانگنے والے نے اللہ سے مانگنے کے بجائے اوروں کے آگے ہاتھ کیوں پھیلائے تھے؟ بھلا اللہ کسی کو خالی ہاتھ لوٹاتا ہے؟ نہیں...... تو پھر......؟ کیا جو شے اللہ نہ دینا چاہے، وہ ''کوئی اور'' دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں...... تو پھر......؟ ہاں کسی سے اپنے لئے ''دعا کروانا'' جائز ہے...... مگر ''مانگنا'' نہیں......

اللہ عزوجل نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا کہ ''اے موسیٰؑ! مجھ سے اس زبان سے دعا مانگا کرو، جس زبان سے تم نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔''

حضرت موسیٰؑ نے عرض کی۔ ''یا اللہ! ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' اللہ نے فرمایا کہ ''تم دوسروں سے اپنے لئے دعا کروایا کرو، کیونکہ ''ان'' کی زبان سے ''تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔'' تو پھر دعا کروانا اچھا ہے۔

مگر مانگنا تو صرف اللہ ہی سے چاہئے ناں! دینے والا صرف وہی ہے...... ارشاد باری تعالیٰ ہے، ''کیا جانتا ہے، جو کہتا ہے میرے سوا کسی چیز کو، ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے؟ پس میری طلب کر، پالے گا۔''

سو اگر ہم اللہ سے طلب کریں تو پالیں گے اور

اگر کسی اور سے طلب کریں تو نہیں پائیں گے...... لہٰذا مقدر مطمئن تھا چوتھی میم "محبت" اپنا لہولہو وجود لئے ماتم کناں تھی...... اور پانچویں میم...... فی الحال محوانتظار تھی...... خاموشی سینے پر ہاتھ باندھ کر جا کر برگد کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

عین اسی جگہ فاروق حیدر کی قبر تھی۔ جہاں کل رات وہ منگتا بنا بیٹھا تھا اور وہ پانچویں میم "مٹی" تھی...... قبر کی مٹی...... جو شدت سے اس کی آمد کی منتظر تھی۔ قبر جسے ہم دن میں ایک بار بھی یاد نہیں کرتے اور جو ہمیں دن میں ستر بار یاد کرتی ہے...... کچھ دیر قبل، جب فاروق ابھی "دفن" نہ ہوا تھا، تب دل نور آئی تھی...... وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ اسے یکا یک فاروق حیدر سے محبت ہوگئی تھی۔

ان کو ہم سے محبت کا احساس جب ہوا
ہمارے پاس آکر وہ دیر تک روتے رہے
اور ہم بھی کتنے "بے حس" نکلے یارو......!
کہ منہ کفن میں چھپائے چپ چاپ سوتے رہے......

اور کفن میں لپٹے لوگ بھی بھلا کبھی بولے ہیں؟

اور اب...... فاروق حیدر کو دفن کر کے سب لوگ دعائے مغفرت کر کے چلے گئے تھے۔

خاموشی کی حکومت پھر قائم تھی مگر وہ پھر بھی سوگوار تھی...... قدموں کی چاپ ابھری خاموشی نے ناگواری سے دیکھا...... دل نور لٹی لٹی سی آرہی تھی...... چہرے پہ آنسوؤں کی لکیریں، بکھرے بال، زمین پہ گھسٹتا دوپٹہ...... اس کی اجڑی بجڑی حالت پہ خاموشی کو بے اختیار ترس آگیا...... اس کی متلاشی نظریں موت کو جابجا بکھری موت کو بے قراری سے ٹٹول رہی تھیں۔ بالآخر انہیں "منزل" مل گئی۔ سرخ گلابوں سے ڈھکی قبر پہ جا کر وہ یوں رونے لگی گویا سب کچھ ختم ہوگیا ہو...... اور جب سب چھن جائے، پوری کائنات لٹ جائے تو رونا تو بنتا ہی ہے...... اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ دل نور رو رہی تھی اور...... اور خاموشی بھی اس کے ساتھ سسکنے لگی تھی...... اس سے قبل ہمیشہ اسے "آوازوں" سے وحشت ہوتی تھی...... اس قدر وحشت کہ اس کا دل کرتا تھا کہ ساری آوازیں مر جائیں...... چار سو خاموشی ہو...... صرف اس کی حکومت...... اور وہ ہر آواز کو "مار" بھی دیتی تھی۔ لیکن آج ...... آج وہ خود دل نور کے اجڑنے پر افسردہ تھی۔

دل نور رو رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی...... فاروق حیدر کو بے قراری سے پکار رہی تھی...... اس کی متلاشی نظریں بار بار قبر کی مٹی پر عالم وحشت میں سر پٹختی تھیں...... مٹی کے ذروں سے لپٹتی تھیں۔ اسی ایک چہرے کو ڈھونڈتی تھیں...... اور ہر بار ناکام لوٹ آتی تھیں......

اپنی آنکھوں پر بھی اس دن رحم سا آیا مجھے
کچھ نہیں تھا سامنے، جب "دیکھنا" آیا مجھے

اور یہ ناکامی انہیں بار بار نمکین سمندر میں تبدیل کر دیتی تھی...... فاروق حیدر "مجبور" تھا۔ وگرنہ بھلا وہ ایسا کر سکتا تھا دل نور...... اس کی دل نور روتی رہے...... اور...... اور وہ "بے حس" بنا رہے...... پتھر بنا رہے......؟ وہ مجبور تھا...... ورنہ......

میرا جسم ہو چکا تھا خاک، اپنی خاک میں
جب مقدر کا ستارہ ڈھونڈتا آیا مجھے......!

خاموشی وہاں سے اٹھ گئی...... دل نور بھی جانے کے لئے اٹھ گئی...... وہ قبرستان سے "باہر" نہیں جا رہی تھی، وہ قبرستان کو اپنے "اندر" اٹھائے جا رہی تھی۔ اس کا دل قبرستان بن گیا تھا اور قبرستان تو صرف موت کی علامت ہوتے ہیں...... دل نور کو بھی اب ساری زندگی "موت" کی پناہوں میں گزارنی تھی...... اور موت کی "پناہ" بھلا کیسی ہوتی ہے؟ سرد، ٹھٹھرا دینے والی، روح تک کو منجمد کر دینے والی...... دل جب قبر بن جائے تو زندگی قبرستان میں بھٹکنے والی روح کی طرح ہی گزرا کرتی ہے۔

دل نور جا چکی تھی...... ایک قبرستان کو وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی اور...... دوسرے قبرستان میں خاموشی برگد کے تنے اور شاخوں سے لپٹ کر سسک رہی تھی۔

خناس

چوتھی قسط

وجیہہ سحر

خوف و ہراس کی وادی میں خراماں سرگرداں دل گرفتہ دل شکستہ حالات سے پر اپنی نوعیت کی ناقابل یقین و ناقابل فراموش حالات سے دو چار عجیب و غریب دل و دماغ کو مسوستی حیرت سے روشناس کراتی سوچ کے افق پر جھلمل کرتی تحیر انگیزی میں سب سے آگے ویران و اجاڑ وادی کے نشیب وفراز میں چنگھاڑتی و دندناتی ذہن سے محو نہ ہونے والی ایڈونچر شاہکار کہانی

اچھی کہانیوں کے متلاشی قارئین کیلئے حیرت انگیز خوفناک حیرتناک حقیقی کہانی

ساحل نے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بات شروع کی۔ ”میں آپ کو جو بتانا چاہتا ہوں۔ وہ آپ کو اس طرح سمجھ نہیں آئے گا جس وقت آنٹی ماریہ کا قتل ہوا تو میں گاڑی سے ان کا موبائل نکال رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لڑکی کو جو سفید فراک میں ملبوس تھی ان کے قریب دیکھا، میں اس لڑکی کا چہرہ نہیں دیکھ سکا، اس لڑکی نے آنٹی ماریہ کی گردن پر اپنے دانت نصب کردیئے جونہی خون اس کے منہ سے لگا، اس کی فراک سات رنگ کی دھاریوں کے ڈیزائن میں بدل گئی اور پھر اچانک غائب ہوگئی۔ میں نے آنٹی کو سنبھالا تو میں نے ہوا میں کسی تتلی کو پھڑ پھڑاتے ہوئے دیکھا اس کے پَروں میں وہی سات رنگ تھے جو اس لڑکی کے فراک میں تھے۔

وہ بہت پُر اسرار تھی، وہ میری آنکھوں کے سامنے غائب ہوئی۔ جب اس لڑکی نے آنٹی پر حملہ کیا تو میرا ویڈیو کیمرہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا وہ کیمرہ آن تھا اس وقت جو ویڈیو بنی میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔“

یہ کہہ کر ساحل نے ہینڈی کیم کی ویڈیو کمپیوٹر پر چلائی۔

اس نے غیر ضروری سین پاس کرتے ہوئے وہیں سے ویڈیو چلائی جہاں سے ماریہ کا قتل ہوا۔ اس روح فرسا منظر پر سب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ظفر کی بے چین آنکھیں سکرین ٹٹولنے لگیں۔ ”مگر یہ سب کس نے کیا، کوئی دکھائی کیوں نہیں دے رہا اور کہاں ہے وہ لڑکی تم جس کی بات کررہے تھے۔“

”آپ نے ویڈیو غور سے نہیں دیکھی۔“ یہ کہہ کر ساحل نے ویڈیو کو تھوڑا سا ریورس کیا۔

اس نے سکرین پر انگلی رکھی۔ ”یہ دیکھیں آنٹی ماریہ کی گردن کے قریب یہ ستارہ سا ٹمٹما رہا ہے تھوڑی ہی دیر میں ان کی گردن سے لہو بہنے لگتا ہے۔ آپ اپنی نظریں روشنی کے اس ڈاٹ پر مرکوز رکھیں۔“ اس نے ایک بار پھر روشنی کے اس ڈاٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ دیکھو یہ ہوا میں حرکت کرتا ہوا اسی جگہ اوپر نیچے حرکت کررہا ہے جہاں میں نے اس تتلی کو دیکھا تھا۔“

زبیر اور توقیر کی آنکھوں میں حیرت اور خوف تھا، زبیر نے توقیر کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں کہا۔ ”یہ نظر انداز کیا جانے والا کوئی روشنی کا ڈاٹ نہیں یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے دور سے دکھائی دینے والا ٹمٹماتا ہوا ستارہ۔ جس میں آگ دہک رہی ہو مگر یہ ہے کیا؟“

ساحل ویڈیو بند کرکے ان کے قریب بیٹھ گیا۔ ”میں جو کہنے جارہا ہوں، آپ کے لیے اس پر یقین کرنا مشکل ہے لیکن یہ سب سچ ہے۔

میں نے خود ایک لڑکی کو سفید فراک میں آنٹی ماریہ کے قریب دیکھا تھا جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ

جونہی اس لڑکی کے دانتوں پر لہو لگا اس کا لباس سات رنگوں میں بدل گیا اور پھر وہ ایک خوبصورت تتلی کا روپ دھار گئی، اس تتلی کے پَروں پر بھی وہی سات رنگ تھے جو اس لڑکی کے لباس پر تھے۔ یہ ڈاٹ اسی پُراسرار لڑکی کے وجود کی نشاندہی کررہا ہے۔"

توقیر نے ساحل کی بات کا مفہوم بیان کرنے کی کوشش کی۔ "تمہارا کہنے کا مطلب ہے کہ جو قتل ہو رہے ہیں، ان کے پیچھے کسی انسان کا ہاتھ نہیں بلکہ مافوق الفطرت مخلوق ہے جیسے آسیب یا روح یا کوئی شیطانی طاقت۔"

ظفر بھی کسی گہری سوچ میں کھویا کھویا بولا۔ "ساحل ٹھیک کہہ رہا ہے کیونکہ میں نے شمعون کی گردن پر وہی دو دانتوں کے نشان دیکھے تھے جو ماریہ کی گردن پر تھے۔ شمعون کی اور اس کے ساتھیوں کی اموات بھی بہت پُراسرار تھیں، ان کے جسم بھی جھلس گئے تھے کوئی ان کی موت کی وجہ نہیں جان سکا اور تابش اور مہک کی اموات بھی اسی طرح سے بہت عجیب تھیں۔ اور پھر حوریہ کا اس واقعہ کا ذکر کرنا جب ایک مُردہ لڑکی میں رُخسانہ نے حوریہ کی آواز سنی...... کسی بڑے راز کی طرف اشارہ ہے۔"

زبیر جو خاموشی سے سب کی باتیں سن رہا تھا، ظفر سے مخاطب ہوا۔ "کوئی رائے قائم کرنے کے لیے یہ سب باتیں کافی نہیں ہیں...... یہ سب قتل کرنے والا کوئی انسان ہے، درندہ ہے یا کوئی ہوائی مخلوق، یہ جاننے کے لیے ہمیں کوئی ٹھوس ثبوت ڈھونڈنا ہوگا۔"

ساحل نے زبیر کی طرف دیکھا۔ "قتل کرنے والا چاہے انسان ہو یا روح، ہمیں ایک ٹیم بنانی ہوگی، پولیس پر بھروسا کرکے ہم نے کتنا وقت برباد کیا، ہم خود اس معاملے کی تہہ تک پہنچیں گے۔"

ظفر نے بھی ساحل کی تائید کی۔ "میرا خیال ہے کہ ساحل بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے، ہمیں مزید دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں ایک ٹیم بنانی ہوگی یہ کام پُرخطر بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ میں توقیر اور زبیر تو اتنے پھرتیلے نہیں، میرا خیال ہے کہ ساحل اور عارفین کو ہم بھاگ دوڑ کا کام سونپیں گے باقی جو ہم کرسکے کریں گے۔" توقیر کسی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔

ظفر نے اسے ٹوکا۔ "تم سن رہے ہو نا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، تم کس سوچ میں گم ہو۔"

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ساحل اور عارفین کے علاوہ اور کون جوان ہو سکتا ہے تو مجھے پروفیسر حسنان کا خیال آیا ہے۔ ہمیں ویسے بھی سارا معاملہ ان سے ڈسکس کرنا چاہیے، ہم نے انہیں بالکل لاتعلق کررکھا ہے، وہ ہماری بہت مدد کرسکتے ہیں۔"

توقیر کی اس بات پر ظفر نے کہا۔ "یہ تو تم نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ ویسے بھی میرے ذہن میں کتنے ہی سوال اُٹھے ہیں جس کا جواب پروفیسر حسنان ہی دے سکتا ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ پروفیسر کو شک تھا کہ ہمارے بچوں نے میوزیم سے کچھ Stuffed چرائے ہیں۔ اگر وشاء، خیام، فواد اور حوریہ نے وہ Stuffed چرائے ہوں تو انہوں نے اس کا کیا ہوگا۔"

ایک جھرجھری سی جیسے ساحل کے پورے وجود سے گزر گئی وہ تھرتھراتی آواز میں بولا۔ "ہاں...... ان Stuffed میں ایک تتلی بھی تھی۔"

ظفر نے سوالیہ نظروں سے ساحل کی طرف دیکھا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہمیں ان ویمپائرز کا پتہ لگانا ہوگا جو لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار رہے ہیں۔" ساحل نے کہا۔

"مگر ہم کس طرح ان ویمپائرز تک پہنچ سکتے ہیں۔" زبیر نے پوچھا۔

"حوریہ کے ذریعے ہم ان تک پہنچ سکتے ہیں۔" ساحل نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"مگر حوریہ......؟" توقیر پریشانی میں کچھ کہنے لگا۔

ظفر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "تم نے کہا تھا کہ ہم حوریہ کو عامل کے پاس لے جائیں گے۔ تم اپنی بات پر قائم رہو، عامل جو کچھ بھی کرے گا ہمارے سامنے کرے گا، حوریہ کو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ سب بہت ضروری ہے تم اس بات پر یقین کرلو کہ حوریہ ذہنی مریض نہیں ہے۔"

توقیر سر جھکائے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ظفر نے دوبارہ بات شروع کی۔ "ہم خواتین کو اس مشن سے دور ہی رکھیں گے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کل ہی پروفیسر حسنان اور عارفین سے ساری بات کریں گے۔ یہاں سے تقریباً تین

گھنٹوں کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے وہاں ایک بزرگ ہیں، ہم نے کافی سنا ہے ان کے بارے میں...... ہم حوریہ کو وہاں لے جائیں گے، حوریہ کو شک نہ ہو اس لیے رُخسانہ اور توقیر کو جانا ہوگا ساتھ میں بھی چلا جاؤں گا۔"

توقیر رضامند ہوگیا۔ وہ سارے آدھا گھنٹہ اور گفتگو میں مصروف رہے پھر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ اگلی صبح ماریہ کے قل تھے۔ دوپہر تک ظفر اور راحت مہمانوں میں اور کچھ مذہبی رسومات میں مصروف رہے۔ توقیر، زبیر اور وقار احمد کی فیملیز بھی وہیں تھیں۔

دوپہر کے بعد ظفر نے ان سب کو رُکنے کے لیے کہا اور سارے وسوسے اور خدشات بیان کیے جو ان اموات کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ جو کچھ ظفر کہہ رہا تھا وہ بھیانک حقائق سب کے لیے قابل قبول نہیں تھے۔

بہرحال عارفین ان کی ٹیم میں شامل ہوگیا۔ تقریباً چار بجے وہ لوگ اپنے گھروں کو لوٹ گئے مگر توقیر اور رُخسانہ، حوریہ، ظفر کے گھر ہی تھے۔ آدھے گھنٹے کے بعد توقیر، رُخسانہ اور حوریہ کے ساتھ ظفر اس گاؤں کے لیے روانہ ہوگئے جہاں اس بزرگ کی حویلی تھی۔

تین گھنٹے کا سفر کافی زیادہ تھا۔ ظفر پچھلی سیٹ پر حوریہ کے ساتھ بیٹھا تھا حوریہ اس طرح منہ بنائے بیٹھی تھی جیسا اسے شک ہوگیا ہو۔

حالات اور واقعات کی وجہ سے سب ویسے ہی پریشان تھے اوپر سے حوریہ کی مسلسل خاموشی ایک خوف سا پھیلائے ہوئے تھی۔ سفر میں خوامخواہ کی رکاوٹیں پیدا ہورہی تھیں، تین گھنٹے کا سفر چار گھنٹے کا بن گیا تھا۔ بزرگ رحمان سائیں کی حویلی پہنچے تو انہوں نے ان سب کو مہمان خانہ میں بٹھایا۔ ملازم نے چائے پیش کی تو رُخسانہ نے ملازم سے پوچھا۔

"سائیں کی فیملی بھی یہیں رہتی ہے۔"

"نہیں...... بیگم صاحبہ! یہاں سائیں جی اور ان کے ملازم رہتے ہیں۔ سائیں جی کے گھر والے تو دوسرے گاؤں میں رہتے ہیں آپ بس یہ چائے پئیں، سائیں جی آ رہے ہیں۔"

ملازم کے جانے کے تھوڑی دیر بعد سائیں جی مہمان خانہ میں داخل ہوئے۔ سائیں جی کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی حوریہ نے دروازے پر ٹکٹکی باندھ لی تھی۔ اسے جیسے سائیں جی کی آمد کا پہلے ہی پتہ چل گیا تھا۔ سائیں جی بھی کمرے میں داخل ہوتے ہی جیسے پتھر کے ہوگئے وہ مسلسل حوریہ کی طرف دیکھتے رہے اور حوریہ بھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے اس طرح گھور رہی تھی جیسے اسے دھمکی دے رہی ہو کہ وہ اس کا راز افشانہ کرے۔

توقیر نے حوریہ کو ٹوکا۔ "حوریہ نظریں نیچے کرو بزرگوں کو اس طرح دیکھتے ہیں؟"

سائیں رحمان مسکراتے ہوئے تحمل سے بیٹھ گئے۔

"اسے کچھ مت کہیں، یہ آپ کی تابع نہیں ہے۔"

ظفر نے اور رُخسانہ نے سائیں کو سلام کیا اور پھر اپنے آپ کا موقف بیان کیا۔ بزرگ نے انہیں اشارہ کیا کہ حوریہ کے سامنے مزید کچھ اور نہ بتائیں۔ پھر انہوں نے حوریہ کی آنکھیں دیکھیں، اس کی نبض چیک کی اور رُخسانہ سے مخاطب ہوا۔ "آپ بچی کو حویلی دکھائیں۔"

رُخسانہ سمجھ گئی کہ سائیں ظفر اور توقیر سے اکیلے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ حوریہ کو لے کر باہر چلی گئی۔

سائیں، توقیر سے مخاطب ہوا۔ "اب آپ مجھے سب تفصیل سے بتائیں۔"

توقیر نے سب کچھ سائیں کو بتایا۔ سائیں ساری صورتِ حال جان کر پریشان ہوگئے۔ "میں حوریہ کو دیکھ کر کچھ باتیں تو جان گیا ہوں لیکن ابھی میں آپ سے کچھ نہیں کہوں گا، آپ مجھے حوریہ کی تاریخ پیدائش لکھوا دیں۔ میں اس کا حساب نکال لوں تو پھر میں خود آپ لوگوں سے رابطہ کروں گا آپ سب بہت بڑی مصیبت میں گھر گئے ہیں۔ بہت اچھا کیا جو میرے پاس آگئے، مجھ سے جو کچھ ہوسکا، میں کروں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے مٹی کی ہانڈی سے کچھ تعویذ نکالے اور وہ تعویذ ظفر کے ہاتھ میں دے دیئے۔ "میں آپ کو ایک مشورہ دوں آپ سب دوست اپنی فیملیز سمیت ایک ہی جگہ ٹھہر جائیں۔ یہ تعویذ پانی میں بھگو کر گھر کے سارے کونوں میں چھڑک دیں، خدا کے فضل سے جو بھی بلا ہے وہ اس گھر میں آپ کو نقصان نہیں پہنچائے گی جب تک کوئی واضح حقیقت

سامنے نہیں آجاتی، آپ لوگوں کو ایک ہی جگہ رہنا چاہیے آج رات حوریہ کا حساب نکال کر میں کل خود آپ کے گھر آؤں گا، آپ مجھے اپنا گھر سمجھادیں۔"

ظفر نے بزرگ کو اپنا گھر سمجھادیا اور پھر وہ لوگ وہاں سے روانہ ہوگئے۔

O.....✧.....O

اگلے روز توقیر اور رُخسانہ، حوریہ کے ساتھ ظفر کے گھر پر ہی تھے۔ حوریہ اندر لیونگ روم میں بیٹھی تھی۔ ظفر نے توقیر اور رُخسانہ کو باہر لان میں بیٹھنے کے لیے کہا، ابھی صبح کے نو بج رہے تھے۔ باہر بیٹھنے کے بعد رُخسانہ نے پیچھے کی طرف دیکھا کہ کہیں حوریہ ان کے پیچھے باہر تو نہیں آرہی پھر اس نے ظفر سے بات شروع کی۔ "ظفر بھائی رات تو ہم آپ کے گھر اس لیے ٹھہر گئے تھے کہ سفر میں دیر ہوگئی تھی مگر اب ہمیں چلنا چاہیے...... بزرگ کی یہ بات ہمارے لیے ناممکن ہے کہ ہم سب اپنے گھر چھوڑ کر ایک ہی جگہ پر رہیں۔"

"مگر بھابی اس بزرگ نے کوئی ایسی بات محسوس کی ہو گی تب ہی تو ایسا کہا ہے، یہ ضروری ہے کہ ہم کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں تو ہی اکٹھے ہوں...... ہم احتیاطاً تو کر سکتے ہیں۔"

توقیر جو خاموشی سے ظفر کی بات سن رہا تھا رُخسانہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ظفر اور ہم لوگ اکٹھے رہ لیں اور زبیر اور وقار احمد کی فیملی ایک ساتھ رہ لیں۔"

رُخسانہ نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ "کوئی تمہاری بات نہیں مانے گا، کس بنیاد پر کوئی یہ فیصلہ لے گا صرف ایک وہم کی بنیاد پر۔"

ظفر نے ہاتھ سے بحث کو ختم کرنے کا اشارہ کیا۔ "یہ فیصلہ ہم بعد میں کرلیں گے، ابھی تو میں سائیں رحمان کو اپنے گھر آنے کے لیے کہہ چکا ہوں، جب تک وہ نہیں آتے آپ لوگ یہیں ٹھہریں، دوپہر تک باقی سب بھی آرہے ہیں، ایک بار بزرگ کی بات سن لیں پھر آگے کا سوچیں گے۔"

رُخسانہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ "وہ بزرگ میری حوریہ کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچائیں گے۔" ظفر نے اسے تسلی دی۔ "وہ صرف حوریہ سے بات کریں گے، ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

توقیر خاموشی کی گہری سوچ میں گم تھا۔ "تم کیا سوچ رہے ہو؟" ظفر نے توقیر سے پوچھا۔

"ویسے یہ عجیب بات ہے، سائیں نے یہ کیوں کہا کہ فواد اور خیام کے گھر والے بھی موجود ہوں، عامل تو ایسے کاموں میں تنہائی چاہتے ہیں اور حوریہ بھی شاید پسند نہ کرے۔" توقیر نے کہا۔

"اس میں اتنا سوچنے والی کیا بات ہے۔ وہ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہوں گے اس کا تعلق وشاء، فواد اور خیام سے بھی ہوگا شاید ان کے بارے میں ہمیں علم ہو جائے گا۔ ویسے بھی جب بزرگ چاہیں گے تو ہی ہم ان کے پاس جائیں گے۔"

توقیر جلدی سے بولا۔ "رُخسانہ اور میں حوریہ کے پاس ہی رہیں گے۔"

"ہاں...... تم لوگ حوریہ کے پاس ہی رہنا۔" ظفر نے توقیر کو تسلی دی۔

دوپہر تک ان کے دوسرے دوست اور ان کی فیملیز بھی آگئیں۔ تقریباً چار بجے تک قرآن خوانی ہوتی رہی۔ پانچ بجے کے قریب سائیں جی کے خاص بندے کا فون آیا کہ سائیں جی تقریباً سات بجے کے قریب آپ کے گھر پہنچ جائیں گے۔

ظفر کو یہ جان کر تسلی ہوگئی کہ سائیں جی کے آنے تک خاص دوستوں کے علاوہ باقی سب لوگ جا چکے ہوں گے۔ ظفر کے گھر ایک بڑا سانحہ ہوا تھا وہ خود ابھی تک اس صدمے سے باہر نہیں آسکا تھا مگر ان کی چھٹی حس انہیں اشارہ کر رہی تھی کہ خطرہ ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے اس لیے وہ اس خطرے سے نبرد آزما ہونے کی تیاری کرنے لگے تھے۔

سورہ یاسین الماری میں رکھنے کے بعد رُخسانہ بجھی بجھی سی توقیر کے پاس آبیٹھی۔ "حوریہ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا بس گم صم سی بیٹھی ہے...... یہی کہتی ہے کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔ نہ ہاتھ منہ دھویا ہے نہ بال سنوارے ہیں، عجیب سی حالت بنائی ہوئی ہے۔"

"کوئی جوس وغیرہ دے دو یا پھل دے دو۔" توقیر نے کہا۔

"جوس بھی لے گئی تھی اور پھل بھی کمرے میں رکھ دیئے ہیں مگر وہ کچھ نہیں لے رہی...... آپ جائیں شاید وہ آپ

کی بات مان لے۔"

توقیر اندر کمرے میں حوریہ کے پاس گیا۔ وہ واقعی عجیب سی حالت میں دیوار سے سر ٹکائے بیٹھی تھی۔ توقیر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ "کیا بات ہے حوریہ یہ اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔"

حوریہ نے غصیلی نظروں سے توقیر کی طرف دیکھا۔

"آپ لوگ مجھ سے جھوٹی ہمدردیاں نہ کیا کریں۔"

"بیٹی یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو، تمہارے اندر تو ہماری جان پھنسی ہے۔"

"جھوٹ بولتے ہیں آپ اگر مجھ سے پیار کرتے ہیں تو سائیں کو کیوں بلا رہے ہیں۔ وہ مجھے اذیتیں دے گا۔"

"وہ تمہیں بھلا کیوں اذیتیں دے گا۔ میں اور تمہاری امی تمہارے پاس ہوں گے۔ وہ بس تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

رُخسانہ اورنج جوس لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔

"یہ لیں اپنی بیٹی کو خود اپنے ہاتھ سے جوس پلائیں۔"

توقیر نے جوس کا گلاس لیا اور حوریہ کی طرف بڑھایا۔ حوریہ نے آرام سے جوس پی لیا۔

توقیر نے اس کے سر پر پیار دیا "گڈ گرل" رُخسانہ کو بھی کچھ تسلی ہوگئی۔ توقیر اور رُخسانہ سب کے ساتھ باہر لان میں بیٹھ گئے۔ لان میں فواد کے والدین وقار احمد اور ایمن اور خیام کے والدین زبیر اور ماہین سب موجود تھے۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں بھی خوف کا سناٹا محوگشت تھا۔

کسی کے پاس جیسے کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

جن کے ذہنوں میں بے شمار سوالات تھے مگر ان کے جواب کسی کے پاس نہ تھے۔ سب کے من کو ایک کھٹکا لگا تھا...... جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ کچھ دیر کے بعد ملازم نے ظفر کو بتایا کہ باہر کوئی بزرگ آئے ہیں۔ ظفر نے ملازم سے انہیں اندر بلانے کو کہا۔

سائیں رحمان اپنے دو مریدوں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔

ظفر نے انہیں باہر لان میں ہی بٹھایا۔ اس نے گھنے درختوں والی سائیڈ کی طرف ایک چارپائی بچھادی۔ انہوں نے ان کی خاطر تواضع کرنی چاہی تو انہوں نے ہر چیز سے منع کر دیا صرف سادہ پانی مانگا...... اور بہت جلد ہی وہ اصل بات کی طرف آگئے۔ "مجھے حوریہ سے ملنا ہے۔"

توقیر اور رُخسانہ، سائیں کے قریب ہو کے بیٹھ گئے۔

"سائیں جی آپ نے حوریہ کا حساب نکالا تھا، کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے۔"

سائیں نے تشویش بھری نظروں سے رُخسانہ کی طرف دیکھا۔ "آپ مجھے بتائیں کہ آپ نے حوریہ کی تاریخ پیدائش اور دوسری معلومات درست دی تھیں۔"

"جی سائیں! اس میں کوئی قباحت نہیں تھی۔" توقیر نے کہا۔

بزرگ نے تاسفانہ انداز میں نگاہیں جھکالیں۔

"میرے حساب کے مطابق تو حوریہ کو مرے ایک سال ہو گیا ہے۔"

رُخسانہ تڑپ کر رہ گئی، جیسے کسی نے اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا ہو۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔"

بزرگ کی اس بات سے سب چونک گئے۔ ساحل بزرگ کے قریب آیا اور حیرت سے پوچھنے لگا۔ "جو حوریہ ہمارے ساتھ رہ رہی ہے وہ کون ہے۔"

"میں اسی کا تو پتہ لگانے آیا ہوں......؟"

توقیر اشتعال انگیزی میں اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔ "یہ بزرگ کیسی باتیں کر رہے ہیں، میں اسی لیے کہتا تھا کہ ان بزرگوں کے چکر میں نہ پڑیں۔ میری حوریہ زندہ ہے اور ہمارے ساتھ ہے۔"

ظفر نے توقیر کو شانوں سے پکڑتے ہوئے بٹھایا۔

"سائیں جی کو حوریہ سے بات تو کرنے دو، اس طرح بولو گے تو سائیں جی اپنا کام کیسے کریں گے۔"

توقیر چیخ چیخ کر بولنے لگا۔ "یہ میری حوریہ کو اذیتیں دیں گے، مجھے حوریہ کو انہیں نہیں دکھانا۔"

سائیں جی نے اپنا ہاتھ ہوا میں اکڑا لیا۔ "اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہو جو زندہ ہی نہیں ہے۔"

ظفر نے توقیر کو سمجھایا اور زبیر اور ماہین نے رُخسانہ کو سمجھایا اور انہیں بمشکل آمادہ کیا کہ سائیں جی کو حوریہ سے بات کرنے دیں۔ سائیں جی درخت کے قریب بچھی چارپائی پر بیٹھ گئے اور ظفر سے گویا ہوئے۔ "حوریہ کو ادھر لے آؤ، کھلی ہوا میں، درختوں کے قریب اس سے پوچھنا زیادہ بہتر ہوگا۔"

رُخسانہ اندر سے حوریہ کو لے آئی۔

سائیں جی کی چارپائی کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر حوریہ بیٹھ گئی۔

سائیں جی نے سب کی طرف نظر دوڑائی۔ رُخسانہ، توقیر، ساحل اور ظفران کے قریب ہی بیٹھے تھے باقی لوگ کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے۔ باباجی نے کسی کو بھی جانے کے لیے نہیں کہا۔

انہوں نے حوریہ سے بہت پیار سے پوچھا۔ ''آپ کا کیانام ہے بیٹی......''

حوریہ نے انتہائی معصومیت سے کہا۔ ''یہ سب کہتے ہیں کہ میرا نام حوریہ ہے اس لیے آپ بھی سمجھ لیں کہ میں حوریہ ہوں۔''

''آپ کے ذہن میں کیسا خاکہ ہے آپ کے گھر آپ کے والدین کا......''

''میرے والدین اور میرے گھر کا جس طرح کا خاکہ مدھم سا میرے ذہن میں ہے وہ نہ تو ان لوگوں جیسا ہے اور نہ اس گھر جیسا۔'' حوریہ نے اُداس لہجے میں کہا۔

سائیں جی نے اپنے تھیلے سے سفید رنگ کی پانی کی بوتل نکالی اور توقیر سے ایک کرسی منگوالی۔ توقیر کرسی لے آیا۔ سائیں جی نے وہ کرسی حوریہ کی کرسی کے قریب رکھی اور پانی کی بوتل لے کر حوریہ کے پاس بیٹھ گیا۔

''میں جو پڑھ رہا ہوں اسے غور سے سنو۔'' یہ کہہ کر سائیں جی نے سورہ بقرہ کی آیت پڑھنا شروع کی۔

وہ بوتل کو اپنے منہ کے قریب لے جاکے اس طرح آیتیں پڑھ رہے تھے کہ آواز سے بوتل کے پانی میں ارتعاش پیدا ہورہا تھا۔

حوریہ سکتے کی سی کیفیت میں آیتیں سنتی رہی پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ سائیں نے لحہ بھر کے لیے پڑھنا چھوڑا اور توقیر سے کہنے لگا۔ ''دوخواتین حوریہ کے قریب کھڑی ہوجائیں۔''

رُخسانہ اور ایمن حوریہ کی کرسی کے قریب کھڑی ہو گئیں۔ سائیں جی نے پھر دوبارہ اسی انداز سے پڑھنا شروع کردیا۔

رُخسانہ کی نظر حوریہ کے بازوؤں پر پڑی، بوتل کے پانی جیسی تھرتھراہٹ اس کے جسم میں بھی تھی۔ اس کے بازوؤں کی جلد اس طرح کانپ رہی تھی کہ رُخسانہ نے خوفزدہ ہوتے ہوئے ایمن کی طرف دیکھا...... ایمن نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ رفتہ رفتہ حوریہ کے پورے جسم میں تھرتھراہٹ محسوس ہونے لگی، مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ پھر اس کا جسم کرسی پر سے پھسلتا ہوا زمین کی طرف ڈھیر ہونے لگا۔

رُخسانہ آگے بڑھ کر حوریہ کو پکڑنے لگی تو سائیں نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اسے ابھی کوئی ہاتھ نہ لگائے وہ مسلسل اونچی آواز میں سورۃ بقرہ کی آیتیں پڑھتے رہے۔ اسی دوران انہوں نے اپنے مرید کو کچھ اشارہ کیا۔

مرید اپنی جگہ سے اُٹھا اس نے تھیلے سے ایک چاک نکالا اور جہاں سب لوگ کھڑے تھے وہاں منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے چاک سے دائرہ کھینچ دیا اور ظفر سے مخاطب ہوا۔

''سائیں جی چاہتے ہیں کہ جو یہاں رُکنا چاہتا ہے، وہ اس دائرے میں آجائے۔''

ان سب نے سائیں کی بات مانی اور سب اکٹھے ایک ہی دائرے میں کھڑے ہوگئے۔ حوریہ زمین پر لیٹی کانپ رہی تھی۔ پھر ایک دم اس کے جسم سے کپکپاہٹ ختم ہوگئی۔ جس کے ساتھ ہی سائیں نے پڑھنا چھوڑ دیا اور حوریہ کو ہاتھوں اور پیروں میں زنجیریں ڈال کر اس زنجیر کا سرا درخت سے باندھ دیا۔ توقیر چلا کر بولا۔ ''یہ کیا کررہے ہیں......؟''

سائیں نے سختی سے اپنا ہاتھ اکڑایا۔ ''دائرے سے باہر مت آنا، میں اسے کوئی اذیت نہیں دے رہا، اب میرے عمل کے دوران مت بولنا ورنہ نقصان کے ذمہ دار تم خود ہوگے۔''

ظفر نے توقیر کو شانوں سے پکڑ کے روکا اور اسے سمجھایا۔ سائیں زمین پر حوریہ کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے حوریہ کی پیشانی پر انگوٹھا رکھا تو حوریہ اس طرح تڑپنے لگی جیسے کسی نے اس کی پیشانی پر دہکتا کوئلہ رکھ دیا ہو۔

سائیں اپنی بھاری آواز میں بولا۔ ''کون ہو تم؟''

حوریہ نے آنکھیں کھولیں تو اس کی آنکھوں میں بے حسی اور جارحانہ پن تھا۔

"کون ہو تم......؟" سائیں نے اپنا سوال دہرایا۔

"میں حوریہ ہوں۔" وہ ڈبل آواز میں بولی۔ ایک موٹی اور ایک باریک۔ اس کی آواز میں سیٹی کی سی چیخ تھی جو بات ختم ہونے کے بعد میں فضا میں گونجتی رہتی تھی۔

"مجھے سچ سچ بتاؤ ورنہ میں تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہوں۔"

سائیں کی اس دھمکی پر وہ اونچا اونچا ہنسنے لگی۔ "میں حوریہ ہی ہوں مگر میرے پاس وہ ناتواں کمزور جسم نہیں جسے تم نقصان پہنچا سکو، میں تو ہوا ہوں، شیطانی طاقتوں کی ملکہ، کسی بھی وقت کہیں بھی کوئی بھی روپ دھار سکتی ہوں۔ میرے معاملات میں دخل اندازی مت کرو ورنہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

حوریہ کی زبان سے یہ سب سن کے رُخسانہ اور توقیر پر سکتہ طاری ہوگیا۔

دائرے میں کھڑے ہوئے سب لوگ ہی حواس باختہ تھے۔ سائیں نے ایک بار پھر پانی کی بوتل میں پڑھنا شروع کردیا۔ حوریہ کسی جانور کی طرح دھاڑیں مارنے لگی اور اپنے جسم کو زور زور سے پٹختے ہوئے زنجیریں توڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ رُخسانہ تو منہ پہ دوپٹہ رکھے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سائیں جی جوں جوں پڑھتے جارہے تھے حوریہ کی تڑپن بڑھتی جارہی تھی۔ سائیں نے بوتل میں سے تھوڑا سا پانی نکال کر اس کے چہرے پہ چھڑکا تو اس کی دلخراش چیخیں فضا میں گونجنے لگیں۔ اس نے انگاروں کی طرح دہکتی آنکھیں سائیں کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"تُو نے زنجیریں اس لڑکی کے جسم پر ڈالی ہیں، مجھ پر نہیں، ایک بار مجھے اس جسم سے باہر آنے دے، مجھ پر سے اپنا عمل ختم کردے، ورنہ میں اس لڑکی کو ختم کردوں گی۔"

سائیں نے اپنے لہجے کی تلخی تھوڑی کم کی اور تحمل سے کہا۔ "تم میرے چند سوالات کے جواب دے دو پھر تم اس جسم سے چلی جانا۔ اگر تم ہوا ہو تو اس ناتواں جسم کی مالک لڑکی کون ہے اور اس کا چہرہ تمہارے جیسا کیسا ہے۔"

حوریہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "یہ شاہ ہے، میں نے اپنی طاقت کے بل پر اس کے چہرے کو اپنا روپ دے دیا۔ میں اور کیا کچھ کرسکتی ہوں، تمہیں اندازہ نہیں ہے۔"

سائیں نے پھر دوبارہ ہونٹوں کی تیز جنبش کے ساتھ پڑھنا شروع کردیا۔ سائیں کے دونوں مرید بھی کتابیں کھولے خاص کلام پڑھ رہے تھے۔ پورے ماحول میں خوف وہراس پھیلا ہوا تھا۔

حوریہ کے چہرے کی جلد پتھریلی اور بے جان دکھائی دے رہی تھی۔ کسی مُردے کی طرح اس کے پورے جسم کی رنگت سیاہی مائل ہورہی تھی۔

"خیام، فواد اور شاہ کہاں ہیں؟"

سائیں کے پوچھنے پر حوریہ نے قہقہہ لگایا۔ "ہم چاروں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ تھوڑی دیر تک وہ تینوں خود یہاں آجائیں گے، پھر دیکھ لینا کہ وہ کیسے ہیں...... جب بھی ہم میں سے کوئی مصیبت میں ہوتا ہے، ہمیں خبر ہوجاتی ہے اور ہم وہاں پہنچ جاتے ہیں۔"

تھوڑی دیر کے لیے تو سائیں کے چہرے پہ خوف کے تاثرات عیاں ہوگئے مگر اس نے خوف کو خود پہ حاوی کیے بغیر پانی کی بوتل میں سورۃ کی آیات پڑھنا شروع کردیں، پانی کے ارتعاش کے ساتھ ساتھ حوریہ کے جسم کی کپکپاہٹ بھی بڑھ گئی۔

اس کا مقصد حوریہ کی روح کو اس معصوم لڑکی کے جسم سے باہر نکالنا تھا۔ سائیں کا عمل جاری تھا۔ دائرے میں کھڑے ہوئے لوگ سکتے کی سی کیفیت میں یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

اچانک لان کے پھولوں پر ایک خوبصورت تتلی منڈلانے لگی اور ساتھ سیاہ دھوئیں کی بدلی ہوا میں نمودار ہوئی۔ پڑھتے پڑھتے جیسے سائیں کی زبان پہ بل آگیا، ان کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے، کسی پُراسرار غیبی طاقت کی آمد کا انہیں احساس ہوگیا۔ چند ساعتوں کے لیے ہی ان کا حوریہ پر سے دھیان ہٹا تو حوریہ کی روح اس لڑکی کے جسم سے نکل گئی اور وہ لڑکی شاہ اب اپنی اصل شکل میں تھی۔ سائیں نے جلدی سے اُٹھ کر اسے

چیک کیا تو وہ مر چکی تھی۔

حوریہ اسے ختم کر کے اس کے جسم سے نکل چکی تھی۔

سائیں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”یہ تو مر چکی ہے۔“ توقیر اور رُخسانہ حقیقت سے بے خبر چیختے ہوئے لڑکی کی لاش کی طرف بڑھے۔

سائیں آہنی دیوار کی طرح لاش کے آگے کھڑا ہو گیا۔ ”تم لوگوں کو دائرے سے باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔ ادھر بہت زیادہ خطرہ ہے۔“

توقیر حسب عادت طیش میں بولنے لگا۔ ”نہ جانے کیا جادو منتر کر کے تم ہمیں بیوقوف بنا رہے ہو اور اب تم نے ہماری بیٹی کو ہی مار ڈالا۔“

سائیں لاش سے پیچھے ہٹ گیا۔ ”یہ دیکھو کیا یہ تمہاری بیٹی ہے؟“

توقیر اور رُخسانہ نے اس لڑکی کو قریب سے دیکھا۔ ”یہ تو ہماری حوریہ نہیں ہے۔ مگر یہ سب......“ رُخسانہ نے پریشانی میں کہا۔

سائیں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”یہ ثناء ہے۔ جس کے جسم میں حوریہ کی روح داخل ہوئی تھی اور اسے اپنا روپ دے دیا تھا۔ اب وہ اس کے جسم سے نکلی تو اسے قتل کر کے۔“

اچانک ہی رُخسانہ کی آنکھیں باہر کو اُبل پڑیں وہ چیخنے لگی۔ توقیر نے اسے شانوں سے پکڑتے ہوئے سنبھالا تو اس نے انگلی سے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ سامنے حوریہ سفید لباس میں ملبوس ہوا میں معلق تھی اس کا جسم ہوائی تھا۔ توقیر رُخسانہ کا ہاتھ کھینچتا ہوا اسے دائرے میں لے گیا۔

سائیں اپنے عمل کا جاپ کرنے لگا تو حوریہ شیطانی انداز میں ہنسنے لگی...... ”اب تمہارا یہ عمل کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ اب میں اکیلی نہیں ہوں۔“ چند ہی ساعتوں میں حوریہ کے ہوائی جسم کے دائیں طرف ایک تتلی پھڑ پھڑانے لگی اور بائیں جانب سیاہ دھوئیں کی بدلی سی نمودار ہو گئی۔ سب کی آنکھوں کے سامنے تتلی وشاء کے روپ میں بدل گئی اور سیاہ دھواں فواد کے روپ میں۔

تینوں کے چہروں کے نقوش وہی تھے مگر ان کے چہرے اس طرح بھیانک تھے جیسے قبر کے گلے سڑے مُردے۔

وشاء اپنے ہوائی وجود کے ساتھ ہوا میں پرواز کرتی ہوئی سائیں کے قریب آئی اور اس نے اپنے سامنے کے دو لمبے نوکیلے دانت سائیں کی گردن میں پیوست کر دیئے۔

سائیں کی چیخیں فضا میں گونجنے لگیں۔ فواد نے اپنے چہرے پہ ہاتھ رکھا اور پھر ہاتھ سے سائیں کے مریدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہوا میں پھونکا۔

دونوں آدمی نہ دکھائی دینے والی آگ میں جھلسنے لگے۔ کچھ لوگ بے اختیار دائرے سے باہر نکلنے لگے تو سائیں نے تڑپتے تڑپتے بھی انہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور زمین پر گرتے گرتے بھی اس نے اپنی قوت مجتمع کی اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ ”دائرے سے مت نکلنا۔ یہ وشاء، فواد اور حوریہ کی روحیں...... ان کے ہمزاد ہیں۔ جن کی طاقت عام روح اور جنات سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی اموات کے بعد کی رسومات پوری کرو۔“ زندگی نے سائیں کو اتنی ہی مہلت دی کہ وہ اتنا ہی بتا سکے پھر لقمہ اجل ہو گئے۔ ان کے مرید بھی جھلس کر زمین پر ڈھیر ہو گئے۔

حوریہ، فواد اور وشاء نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا اور غائب ہو گئے۔

O......❖......O

اس بھیانک واقعہ کو دو روز گزر گئے۔ سب کا ایک جگہ پر رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ زندگی کے معمولات سے ہٹ کر اپنے گھروں میں محصور ہو گئے تھے۔ ایک انجانا سا خوف ہر لمحہ ان کے جسموں میں لہو کے ساتھ دوڑنے لگا تھا۔

اپنی اولادوں کو اس طرح شیطانی روپ میں دیکھ کر وہ جیتے جی ہی مر گئے تھے۔ مگر ایک سوال سب کے ذہنوں میں گونج رہا تھا۔ خیام کہاں ہے، حوریہ کے مطابق وہ چاروں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں تو خیام ان لوگوں میں کیوں نہیں تھا۔

ساحل اور ظفر اکٹھے بیٹھے تھے۔ ظفر جیبیں پیائی کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اتنا بڑا شیطانی کھیل، یہ سب تو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہم ٹیم بھی بنا لیں تو بھی ہم اس جنگ میں جیت نہیں سکتے۔ کون ہے جو ان شیطانی طاقتوں سے مقابلے میں ہماری مدد کرے گا۔ سائیں رحمان اور اس کے

مرید ہمیں بچاتے بچاتے خود موت کے منہ میں چلے گئے۔"

ساحل نے ظفر کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما۔ "جنگ لڑنے سے پہلے ہی آپ نے شکست قبول کر لی۔ بے شک ہمیں شیطانی طاقتوں سے لڑنا نہیں آتا مگر کوشش کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں نا کہ کالے جادو کا توڑ قرآن پاک سے کیا جاتا ہے۔ ہم بھی ہمت نہیں ہاریں گے، آپ کی پروفیسر حسنان سے بات ہوئی تھی؟"

"ہاں...... میں نے عارفین سے بھی بات کی ہے۔ پروفیسر حسنان اور عارفین ابھی کچھ دیر میں یہاں آنے والے ہیں۔ پورا ایک سال ہم ان چاروں کو ڈھونڈتے رہے۔ کیا معلوم تھا کہ وہ اس روپ میں ہمارے سامنے آئیں گے۔ میں تو اس آس پہ زندہ تھا کہ میری وشاء واپس ضرور آئے گی۔ میں نے تو ایک پل کے لیے بھی اپنے ذہن کو یہ سوچنے کی جسارت نہیں دی کہ میری بیٹی مر گئی ہے۔" ظفر کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور وہ چہرہ چھپائے دوسری طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔

ساحل نے ان کے شانے کو تھپتھپایا۔ "ہمت کریں انکل...... انکل توقیر، آنٹی رخسانہ، انکل زبیر، آنٹی ماہین، انکل وقار احمد اور آنٹی ایمن، ان سب کا اور آپ کا دکھ ایک ہے، ان کی بھی اُمید آپ کی طرح ٹوٹی ہے۔ وہ بھی خود کو سنبھال نہیں پا رہے مجھے تو اس بات کا شک اسی روز ہو گیا تھا جب آنٹی ماریہ کا قتل ہوا کہ وشاء اور اس تتلی کا کوئی تعلق ہے۔ مگر میرا ذہن اس محیر العقول سچ کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ تتلی وشاء کا ہی روپ ہے۔" بات کرتے کرتے ساحل کسی خیال سے چونک گیا۔ "ہمزاد...... کے بارے میں سائیں رحمان کیا کہہ رہے تھے۔"

"ہمزاد کے بارے میں، میں بھی کچھ نہیں جانتا میں نے کل پروفیسر حسنان سے اس بارے میں بھی بات کی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ان کے پاس کچھ ایسی کتابیں ہیں جن کے مطالعہ سے کچھ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔" اسی دوران باہر بیل ہوئی ساحل نے دروازہ کھولا تو پروفیسر حسنان اور عارفین تھے۔

ساحل انہیں اندر لیونگ روم میں لے آیا جہاں ظفر بیٹھا تھا۔ وہ دونوں ظفر کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ انہوں نے سارے معاملے پر انتہائی رنج اور افسوس کا اظہار کیا۔ ساحل ان کے لیے کولڈ ڈرنکس لے آیا۔

پروفیسر حسنان نے ہاتھ سے نہیں کا اشارہ کیا۔ "ہمارا اس وقت کچھ بھی کھانے پینے میں دل نہیں ہے۔ اتنے لوگوں کی اموات ہو گئی مگر آپ نے ہم سے رابطہ نہیں کیا۔"

پروفیسر کے اس گلے پر ظفر نے بتایا۔ "ہم خود اس خوفناک حقیقت سے بے خبر تھے۔ ہم تو اسی اُمید پر حوریہ کو پہاڑی علاقے میں لے گئے کہ وہ ہمیں وشاء، خیام اور فواد کے بارے میں کچھ بتائے گی۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ جسے ہم حوریہ سمجھ رہے ہیں وہ حوریہ کی روح ہے۔ ہم تو اپنے بچوں کے زندہ و سلامت واپس آنے کا انتظار کر رہے تھے ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ نہیں بلکہ ان کی روحیں بھٹک رہی ہیں۔"

ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ پروفیسر حسنان نے ظفر کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ "ہمت رکھو یہ دکھ صرف تمہارے ساتھ نہیں خیام، فواد اور حوریہ کے والدین بھی اسی کیفیت سے دوچار ہیں۔ مگر اس وقت آپ اپنے اس دکھ کو نظر انداز کر کے یہ سوچیں کہ دوسرے لوگوں کی زندگیوں کو ہم ان شیاطین سے کیسے بچائیں۔"

سائیں کے کہنے کے مطابق فواد، حوریہ اور وشاء جنہیں تم لوگوں نے دیکھا ہے اصل میں وہ ان کے ہمزاد ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں، کسی بڑے عامل نے ان کے مُردہ جسموں سے ان کے ہمزاد مسخر کیے ہیں۔ وہ عامل جب چاہے جس طرح چاہے ہمزاد سے کام کروا سکتا ہے۔ جس طرح حوریہ کے ہمزاد نے ثناء کے جسم میں داخل ہو کے حوریہ کا روپ لے لیا اسی طرح کسی بھی وقت یہ ہمزاد ہمیں دھوکہ دے سکتے ہیں۔

ہمارے جسم میں بُرائی کی ترغیب دینے والے جن ہمزاد کو موت کے بعد اگر کوئی عامل مسخر کر لے تو وہ ہمزاد سینکڑوں آسیبوں کی طاقت رکھتا ہے۔ اگر کسی عامل کا کنٹرول ہمزاد پر سے ختم ہو جائے تو وہ ہمزاد عاملوں کو بھی ختم کر دیتا ہے۔"

"آپ ہمیں کچھ تفصیل سے بتائیں گے ہمزاد کے بارے میں۔" ساحل نے بے چینی سے پوچھا۔

پروفیسر حسنان نے لمبا سانس کھینچا۔ ”ہمزاد جسے عبرانی میں ”لطیف“ عربی میں ”قرین“ یا ہمزات، فارسی میں ہمزاد، اردو میں ہمسایہ یا ہم نام سنسکرت میں سایہ اور انگریزی میں Duplicat spiritual body۔ جبکہ اسلامی ماہرین روحانیت اسے ”جسم لطیف“ یا ”جسم مثالی“ کہتے ہیں۔

روحانیت کی رُو سے ہر کسی کے دو جسم ہوتے ہیں، ایک مادی، مرئی، کثیف اور ظاہری جبکہ دوسرا روحانی غیر مرئی لطیف اور باطنی جسم ہوتا ہے اسی روحانی، غیر مرئی لطیف اور باطنی جسم کو ہمزاد کہتے ہیں...... جو مادی، مرئی، کثیف اور ظاہری جسم کی موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔

کیونکہ ہمزاد جسم لطیف ہوتا ہے لہٰذا یہ زمان و مکان "Timed and space" کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ اپنی اس خوبی کی وجہ سے ہمزاد دنیا کے کسی بھی گوشہ میں پہنچ سکتا ہے اور ہر قسم کی خبر اپنے عامل کو لا کے دے سکتا ہے۔ بعض اعملیات کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے ہمزاد اس قدر طاقتور ہوتے ہیں کہ وزنی سے وزنی چیز اُٹھا سکتے ہیں، عامل کو دنیا کی سیر کرا سکتے ہیں۔ جو چاہے روپ لے سکتے ہیں۔

لہٰذا ہر دور میں لوگ ہمزاد کی تسخیر کرتے آئے ہیں۔ اگر کوئی شخص ہمزاد مسخر کر لے تو وہ دنیا کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ ساری صورت حال کا جائزہ لو تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ خیام، نواد اور دشاء اور حوریہ نے سپر پاور بننے کے لیے زندگی کو نظر انداز کر دیا۔ لوگوں کے دل و دماغ پر حکومت کر کے اپنا آپ منوانے کے لیے وہ کالے جادو جیسے علم کی طرف مائل ہو گئے۔ اس بھیانک علم کی گرفت نے انہیں گمراہ کر دیا انہوں نے میوزیم سے کچھ Stuffed چرائے۔ جن میں ایک تتلی بھی تھی۔ ان کی گمراہی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کسی عامل نے ان کے ہمزاد مسخر کر لیے اور ان کے مادی وجود کو موت کی نیند سلا دیا۔ ہمیں کسی طرح اس عامل کو ڈھونڈنا ہوگا۔“

”ابھی فی الحال ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ ظفر نے اپنے دونوں ہاتھ اکڑا لیے۔

پروفیسر نے ساحل اور ظفر کی طرف دیکھا۔ ”سب سے پہلے وہ کام کرو جو سائیں نے کہا تھا۔“

”کیا......؟“ ساحل نے پوچھا۔

پروفیسر نے متاسفانہ انداز میں آنکھیں جھکا لیں۔ ”اپنے بچوں کی اموات کو دل سے تسلیم کر کے ان کی آخری رسومات ادا کرو۔ پھر سوچیں گے آگے کیا کرنا ہے۔“

”ان سارے واقعات میں ہم نے خیام کو کہیں بھی نہیں دیکھا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ خیام زندہ ہو۔“ ساحل نے پروفیسر حسنان سے کہا۔

پروفیسر حسنان گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ عارفین ساحل سے مخاطب ہوا۔ ”میرے خیال سے ہمیں اس چکر میں نہیں پڑنا چاہیے کہ خیام زندہ ہے یا نہیں، ہمیں اس کی آخری رسومات ادا کر دینی چاہئیں۔“

حسنان نے عارفین کی تائید کی۔ ”عارفین درست کہہ رہا ہے، اگر خیام زندہ ہوتا تو حوریہ یہ کیوں کہتی کہ ہم چاروں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں یقیناً وہ انہی میں سے ہو گا۔ ہمارے مذہب کے مطابق مُردے کی تدفین و تکفین کی خاص رسومات سے روح بھٹکتی نہیں بلکہ اپنے خاص مقام پر پہنچ جاتی ہے ان چاروں کے ہمزاد کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہوں، آخری رسومات کا کچھ نہ کچھ اثر ان پر ضرور ہوگا۔ جتنا سوچتے جائیں گے، اتنا ہی بھٹکتے جائیں گے، ہمیں فی الحال ان چاروں کی آخری رسومات کی تیاری کرنی چاہیے۔ ہمیں فوری کسی عامل سے رجوع کرنا چاہیے۔ ان آخری رسومات میں کسی عامل کا ہونا ضروری ہے۔

میں عاملوں کے بارے میں زیادہ تو نہیں جانتا لیکن ایک سائیکاٹرسٹ ہیں مس عمارہ، وہ عاملہ بھی ہیں۔ ان کا اپنا کلینک ہے وہ اپنے کام میں مصروف رہتی ہیں مگر میں نے سنا ہے کہ اس طرح کے روحانی معاملات وہ بخوبی حل کر لیتی ہیں۔ میں ان سے ملا تھا اور انہیں ساری صورت حال سے آگاہ بھی کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جب اس کی ضرورت ہو اسے فون کر لیا جائے۔“

ساحل نے متعجب نظروں سے حسنان کی طرف دیکھا۔ ”اس قدر خطرناک معاملات سے ایک لڑکی کیسے نبرد آزما ہو سکتی ہے؟“

پروفیسر حسنان نے ٹھنڈی آہ بھری اور معنی خیز انداز میں بولے۔ ”یہ معاملات جسمانی طاقت سے نہیں ذہانت سے لڑے جاتے ہیں۔ پرسوں جمعہ کے روز ہم ایک ہی گھر میں ان چاروں کی آخری رسومات ادا کر لیتے ہیں۔ میں مس عمارہ کو اطلاع دے دوں گا۔“

ظفر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، ہمیں سب سے بات کرنی ہو گی، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“ تقریباً ایک گھنٹہ وہ سب گفت و شنید میں مصروف رہے پھر عارفین اور حسنان وہاں سے چلے گئے حسنان کے جانے کے بعد ظفر نے فون کر کے خیام، فواد اور حوریہ کے والدین کو کل اپنے گھر آنے کے لیے کہا۔

ظفر کے گھر اکٹھے ہو کر باہم مشورے سے سب نے یہ طے کیا کہ ظفر کے گھر ہی سارا انتظام کیا جائے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس طرح سسکنے اور تڑپنے کے بجائے اپنے بچوں کی اموات کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی آخری رسومات ادا کر دی جائیں۔

ویسے بھی خدا کے احکامات میں بے پناہ راز پوشیدہ ہیں، تدفین و تکفین کی خاص رسومات کے بعد لواحقین کو خدا کی طرف سے ڈھارس مل جاتی ہے۔ بروز جمعہ ظفر کے گھر میں رونے کی، بین کرنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ عزیز و اقارب بھی جمع تھے۔ جان پہچان والے لوگوں میں جس جس کو فواد، حوریہ، وشاء اور خیام کی اموات کا پتہ چل رہا تھا وہ غمزدہ ہو کے چلے آرہے تھے۔ لوگوں کا ایک ہجوم تھا ظفر کے گھر پر۔ لوگ دریوں پر بیٹھے تسبیحات اور قرآن پاک پڑھنے میں مصروف تھے۔

اس ساری صورتِ حال کا علم زرغام کو ہو چکا تھا وہ بے چینی سے اپنے گھر کے لان میں ٹہل رہا تھا۔ پھر درخت کے قریب کھڑے ہو کے کسی سے باتیں کرنے لگا شاید نہ دکھائی دینے والے لطیف جسم سے۔ ”پہلے ہی میں خیام کی وجہ سے پریشان ہوں اوپر سے یہ ان چاروں کی اموات کی آخری رسومات، اس کا اثر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ دل تو چاہتا ہے کہ ان چاروں کے گھر والوں کو موت کی نیند سلا دوں مگر ابھی وقت نہیں۔ سب سے پہلے تو میں ظفر اور ساحل کو ٹھکانے لگاؤں گا، ابھی میری ساری توجہ خیام کی طرف ہے...... تم کسی بھی طریقے سے خیام کا پتہ لگاؤ ورنہ میری ساری محنت رائیگاں جائے گی۔“

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھا اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے دراز سے پتھروں کی انگوٹھیاں نکالیں اور تیزی سے اپنی ساری انگلیوں میں پہن لیں اور بیڈ پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس کے شیطانی دماغ نے کچھ طے کیا اور وہ نہانے کے لیے باتھ روم چلا گیا۔

فواد، حوریہ، وشاء اور خیام کے گھر والوں کے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ایک سال سے درد و غم کا رُکا ہوا آتش فشاں لاوا برسا رہا تھا۔ آج اُمید اور آس کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ سینے میں سوائے درد کے اور کچھ نہیں تھا۔ ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر رو کے اپنا غم بانٹ رہے تھے...... مگر غم تھا کہ نڈھال کیے جا رہا تھا...... ان کے گھروں کے چراغ بجھ گئے تھے، آنکھیں مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈوب گئی تھیں۔

ان کے پیاروں کی میتیں بھی ان کے سامنے نہیں تھیں ایک دوسرے کے شانے پر سر رکھ کر رو کے وہ اپنے غم کا کچھ بوجھ کم کر سکتے تھے۔

O......✣......O

باہر لان میں مردوں کے لیے بندوبست کیا گیا تھا اور اندر گھر میں زمین پر دریاں بچھا کے خواتین بیٹھی تھیں اور قرآن پاک پڑھنے میں مشغول تھیں۔ ظفر بھی دوسرے مردوں کے ساتھ قرآن پاک پڑھنے میں مشغول تھا۔ ساحل بھی اس کے قریب بیٹھا تھا۔

ظفر کے موبائل کی رنگ بجی، اس نے موبائل سنا۔

”جی بہتر میں باہر آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے موبائل بند کر دیا۔

”کس کا فون تھا۔“ ساحل نے تسبیح پڑھتے ہوئے پوچھا۔

”عمارہ کا فون تھا، وہی سائیکاٹرسٹ جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا وہ باہر آ گئی ہیں۔ میں انہیں گھر کی خواتین سے ملوا کے آتا ہوں۔“

ظفر نے اپنا پارہ میز پر رکھا اور چلا گیا۔ عمارہ ابھی تک گاڑی پارک کر رہی تھی۔ اس نے مناسب جگہ دیکھ کر گاڑی پارک کی اور پھر گاڑی سے باہر نکلی۔ 28 سالہ عمارہ دبلی پتلی

اور انتہائی خوبصورت تھی۔ چہرے کی رنگت صاف اور نقوش تیکھے اور پُرکشش تھے۔ اس نے ریڈ لائن قمیص اور ٹراؤزر کے ساتھ سکارف اوڑھا ہوا تھا۔

اس نے سکارف سے اپنے بال چھپا رکھے تھے سیاہ سکارف نے اس کی خوبصورتی کو بڑھا دیا تھا اس نے ظفر کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! بہت شکریہ آپ کے آنے کا...... میں تو سوچ رہا تھا کہ شاید آپ ہمارے لیے وقت نہ نکال سکیں۔'' ظفر نے اس کے ہاتھ سے اس کا سامان لیتے ہوئے کہا۔

عمارہ نے ایک نظر پوری کوٹھی پر ڈالی اور پھر مسکراتے ہوئے گویا ہوئی۔ ''میں اپنی زبان کی پکی ہوں، میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں آؤں گی۔''

''آئیے میں آپ کو اندر کا راستہ دکھاتا ہوں۔''

ظفر اسے رُخسانہ اور ایمن کے پاس لے گیا عمارہ، رُخسانہ کے پاس بیٹھ گئی۔

ظفر نے رُخسانہ سے کہا۔ ''یہ عمارہ ہیں...... میں تفصیل سے ان کے بارے میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا...... فی الحال یہ ہماری مہمان ہیں۔'' یہ کہہ کر ظفر باہر چلا گیا۔

رُخسانہ اور ایمن رو رو کے نڈھال تھیں۔ ان کی آنکھوں کے نیچے زخم بن گئے تھے۔ عمارہ نے ان کا یہ حال دیکھا تو اس کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے میز سے پارہ لیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

○......☆......○
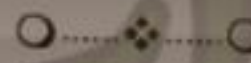
عارفین، حسان اور ساحل کو اردگرد کے ماحول پر نظر رکھنے کی تاکید کی گئی تھی۔ وہ گھر سے باہر لان میں ٹہل رہے تھے۔ انہیں خاص تاکید کی گئی تھی کہ کوئی مشکوک شخص دیکھیں یا کوئی عجیب الخلقت مخلوق تو فوراً الرٹ ہو جائیں۔ وہ ایک ٹیم کی طرح کام کر رہے تھے ان کے موبائل ایک دوسرے سے منسلک تھے۔

عمارہ کے ہاتھ میں دسواں پارہ تھا۔ تمام خواتین قرآن پاک پڑھنے میں مشغول تھیں، قرآن پاک کی تلاوت کی مسحور کن آوازوں نے فضا میں ایسا سکون سرایت کر دیا تھا کہ کسی کے بھی ذہن میں خوف نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

عمارہ نے اپنا پارہ مکمل کیا تو اس نے رُخسانہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ''جو غم دیتا ہے وہ مرہم بھی رکھتا ہے۔ حقیقت تو یہی تھی مگر آپ لوگوں نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں بہت وقت لگا دیا۔ شاید اگر یہ سب پہلے ہو جاتا تو وہ شیطانی طاقتیں اس قدر نہ بڑھتیں۔''

''آپ......؟'' رُخسانہ نے سوالیہ نظروں سے عمارہ کی طرف دیکھا۔

''میں ایک سائیکاٹرسٹ ہوں اور Exorcist بھی ہوں۔ میں زیادہ دعوے نہیں کرتی مگر جو کچھ بھی مجھ سے ہو سکا میں کروں گی۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کا گھر دیکھ لوں۔''

''ہاں کیوں نہیں، میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔'' رُخسانہ اپنا پارہ میز پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ عمارہ نے اپنے بیگ سے چھوٹی سی کتاب اور تسبیح نکالی۔ ''آپ مجھے صرف وشاء کا کمرہ دکھا دیں باقی میں خود دیکھ لوں گی۔''

رُخسانہ، عمارہ کے ساتھ گئی اور اسے وشاء کے کمرے میں لے گئی۔ وشاء کے کمرے میں داخل ہونے پر عمارہ کے چہرے کے تاثرات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی اسے سب کچھ نارمل لگ رہا تھا۔ اس نے تسبیح پڑھنا شروع کی اور ساتھ پورے کمرے کا جائزہ لیتی رہی۔

رُخسانہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''وشاء جو چیز جہاں جہاں رکھتی تھی، سب کچھ ویسے ہی ہے۔ ظفر بھائی نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔''

عمارہ نے سائیڈ ٹیبل سے ایک فوٹو فریم اٹھایا۔ رُخسانہ نے عمارہ کے ہاتھ میں تصویر دیکھی تو تاسف بھرے انداز میں بولی۔ ''یہ ان چاروں کی تصویر ہے۔'' پھر اس نے تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے بتایا۔

''یہ وشاء اور حوریہ ہیں اور یہ دونوں فواد اور خیام ہیں۔''

عمارہ نے وشاء کی تصویر پر انگشت رکھی۔ ''میری معلومات کے مطابق وشاء، حوریہ اور فواد کو آپ لوگوں نے دیکھا ہے مگر خیام کو نہیں دیکھا۔'' پھر اس نے خیام کی تصویر پر انگلی رکھی۔ ''یہی خیام ہے؟''

رُخسانہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں یہی خیام ہے۔''

"یہ تصویر میں اپنے پاس رکھ سکتی ہوں۔"

"رکھ لیں۔"

عمارہ نے تصویر فریم سے نکالی اور اپنے بیگ میں ڈال لی، پھر وہ رُخسانہ سے مخاطب ہوئی۔ "اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو کچھ دیر کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔"

رُخسانہ اسے وشاء کے کمرے میں چھوڑ کر دوبارہ خواتین کے ساتھ بیٹھ کر قرآن پاک پڑھنے لگی۔ عمارہ، وشاء کے کمرے سے باہر آگئی اور تسبیح کا ورد کرتے ہوئے گھر کے باقی کمروں کا جائزہ لینے لگی، وہ پورے گھر میں پھری مگر اس نے ایسی کوئی غیر معمولی حرکت محسوس نہیں کی۔ ظفر اور حسنان گھر میں داخل ہوئے تو عمارہ پورچ میں کھڑی تھی۔

وہ عمارت کے قریب آئے۔ "سب ٹھیک ہے۔"

"فی الحال تو آپ کے گھر میں کوئی عجیب الخلقت مخلوق نہیں ہے مجھے ان چیزوں کا کوئی اثر بھی محسوس نہیں ہوا...... مگر ان بدروحوں کا کوئی بھروسا نہیں...... لیکن یہ تسلی رکھیں۔ گھر میں قرآن پاک پڑھا جارہا ہے کوئی شیطانی مخلوق آپ کو ایذا نہیں دے سکتی...... اس ناگہانی آفت سے نبرد آزما ہونے کے لیے جتنا ہوسکے قرآن پاک پڑھیں، میں شام تک ادھر ہی ہوں۔ آپ بلاخوف اپنی رسومات پوری کریں۔"

اس نے اپنے بیگ سے دو A-meter نکالے، ایک اس نے داخلی دروازے کے قریب پڑے ہوئے گملے کے پیچھے نصب کردیا اور دوسرا اس نے ظفر کو دیا۔ "اسے باہر لان میں کسی درخت کے ساتھ لگادو، جونہی کوئی عجیب الخلقت مخلوق اس گھر میں داخل ہوگی A-meter کی سوئیاں ہلنے لگیں گی۔"

اس کے کہنے پر ظفر نے باہر لان میں انار کے درخت کے ساتھ A-meter لگادیا۔ عمارہ رُخسانہ کے پاس آئی۔

"خیام کی والدہ کہاں ہیں؟"

"وہ سامنے انگوری رنگ کے جوڑے میں جو خاتون ہیں وہ ماہین ہیں خیام کی والدہ......" رُخسانہ نے اُنگلی سے اشارہ کیا۔

عمارہ ماہین کے پاس گئی۔ ماہین گٹھلیاں پڑھ رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی اور اس کے ساتھ گٹھلیاں پڑھنے لگی۔ "آپ کیا پڑھ رہی ہیں۔"

"دوسرا کلمہ۔" ماہین دھیمے سے لہجے میں بولی۔ عمارہ بھی گٹھلیوں پر دوسرا کلمہ پڑھنے لگی۔ ٹوکری میں پڑی ہوئی گٹھلیاں پڑھی گئیں تو عمارہ، ماہین سے مخاطب ہوئی۔ "آپ خیام کی والدہ ہیں۔"

ماہین نے اثبات میں سر ہلایا، خیام کا نام سنتے ہی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، اس نے بھیگی آنکھوں سے عمارہ کی طرف دیکھا۔ "معذرت چاہتی ہوں میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

عمارہ نے اپنی مہین سی آواز میں کہا۔ "کیسے پہچانیں گی میں آپ سے پہلی بار مل رہی ہوں۔ میرا نام عمارہ ہے۔ پروفیشن میں ایک سائیکاٹرسٹ ہوں مگر عاملہ بھی ہوں شاید میں آپ لوگوں کے کام آسکوں۔"

"اب کیا کسی نے ہمارے کام آنا، ہماری تو دنیا ہی لٹ چکی ہے۔"

"اس حادثہ کے بعد کیا آپ کو کبھی خیام دکھائی دیا جس طرح باقی لوگوں نے وشاء، فواد اور حور یہ کو دیکھا۔"

ماہین کی نظریں کسی ایک جگہ پہ ٹھہر گئیں۔ "سب کہتے ہیں کہ وہ چاروں دوست ایک ہی کڑی میں بندھے ہیں۔ خیام کو کسی نے نہیں دیکھا مگر سب کا کہنا ہے کہ خیام بھی ان تینوں جیسا ہوگا۔"

عمارہ نے ماہین کے شانوں پر ہاتھ رکھا اور فضا میں نظریں گھمانے لگی۔ "اگر خیام ان جیسا نہیں ہوگا تو پتہ چل جائے گا اس کا ہمزاد اگر نیکی کے کاموں کا نمائندہ ہوا تو وہ یہاں ضرور آئے گا۔"

ماہین نے بے چین ہوکر عمارہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میں اسے دیکھ سکوں گی؟"

عمارہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ "روح کو دیکھنا اتنا آسان نہیں ہوتا مگر کسی نہ کسی چیز کی غیر معمولی حرکت روح کی موجودگی بتادیتی ہے۔"

یہ کہہ کر عمارہ دوبارہ گٹھلیاں پڑھنے لگی۔ لان میں اشخاص کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ خواتین بھی کمروں میں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ ابھی مزید اور لوگ بھی آرہے تھے۔ ساحل اور

عارفین کی ڈیوٹی میں یہ بھی شامل تھا کہ گیٹ سے داخل ہونے والے لوگوں پر نظر رکھیں۔

لیکن یہ کام ان کے لیے انتہائی مشکل تھا۔ ظفر، وقار، زبیر اور توقیر کے جان پہچان والے سب ادھر ہی آ رہے تھے، جن میں سے زیادہ تر لوگوں کو ساحل اور عارفین نہیں جانتے تھے...... بس وہ اتنا ہی خیال رکھ رہے تھے کہ اگر کوئی مشکوک شخص نظر آئے تو چوکنا ہو جائیں۔

تقریباً ایک بجے کے قریب ایک بوڑھا شخص کوٹھی میں داخل ہوا۔ ساحل اور عارفین نے اسے بھی ان لوگوں کی طرح نظر انداز کیا جنہیں وہ جانتے نہیں تھے۔ وہ بوڑھا شخص دوسرے مردوں کے ساتھ دری پہ بیٹھ گیا اور گٹھلیاں پڑھنے لگا۔

جس جگہ وہ بوڑھا شخص بیٹھا تھا، اس کے بالکل سامنے ساحل اور عارفین کرسیوں پر بیٹھے آپس میں کوئی بات کر رہے تھے۔ بوڑھے شخص کی نظریں ان دونوں پر ٹھہر گئیں۔ وہ اپنے دانے اُٹھا رہا تھا اور پھینک رہا تھا مگر اس کی زبان پہ کوئی لغزش نہیں تھی اور کچھ نہیں پڑھ رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی بے چینی تھی۔

ساحل نے تاسف بھرے انداز میں اردگرد کے ماحول پر نظر دوڑائی اور ٹھنڈی آہ بھر کر تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ ''ہم کیسے ان شیطانی طاقتوں کا مقابلہ کریں گے جو کچھ ہو چکا ہے وہ سب اس قدر اذیت ناک ہے کہ اس کا خیال ایک پل کو سونے نہیں دیتا اور نہ جانے آگے کیا ہونے والا ہے۔ مادی وجود رکھنے والے حریف کو تو ہتھیار سے چھلنی چھلنی کیا جا سکتا ہے مگر یہ سفید ہیولے جو موت کے سائے بن کے ہمارے اردگرد منڈلا رہے ہیں انہیں کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔''

عارفین نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''جنگ صرف ہتھیار سے نہیں لڑی جاتی...... جنگ تو جذبوں کی بھی ہوتی ہے...... قلم کی بھی...... تصورات کی بھی...... مگر ہر جنگ میں راہ دکھانے والی ذات اس پروردگار کی ہی ہے...... اس پر بھروسا رکھو۔ مایوسی ہمت توڑتی ہے، خدا پر بھروسا ہی راہ دکھاتا ہے۔ ہمیں بھی کوئی نہ کوئی راہ مل جائے گی۔ جس سے ہم ان بدروحوں سے نجات حاصل کر سکیں گے۔'' ساحل اور عارفین کی نظر اس بوڑھے شخص کی طرف نہیں تھی۔

بوڑھا شخص اپنی جگہ سے اُٹھ کر ایسی جگہ پر بیٹھا جہاں سے ہال کا داخلی دروازہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہال میں خواتین بیٹھی تھیں۔ ساحل عارفین سے باتیں کر رہا تھا اور عارفین خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی نظریں A-meter کی طرف تھیں۔ A-meter کی سوئیاں بالکل ساکن تھیں۔ اچانک ہی A-meter کی سوئیاں جنبش کرنے لگیں۔

عارفین کے دل کی دھڑکن یک دم تیز ہو گئی اس نے ساحل کے شانے کو جھنکا دیا اور A-meter کی طرف اشارہ کیا۔ ساحل نے جنبش کرتی ہوئی سوئی کی طرف دیکھا تو اس نے موبائل نکالا اور فوراً عمارہ کو فون کیا۔

عمارہ نے فون سنا اور آہستگی سے بولی۔ ''ٹھیک ہے تم ظفر اور حسنان کو بتا دو اور بہت محتاط ہو کے اردگرد کے ماحول پر نظر رکھو۔'' یہ کہہ کر عمارہ نے موبائل بند کر دیا۔

وہ تیز تیز قدموں سے ہال کے داخلی دروازے کی طرف بڑھی۔

وہ اس جگہ پہنچی جہاں A-meter لگا تھا A-meter کی سوئیاں جامد تھیں۔ اسے اس بات کی تسلی ہوئی۔ مافوق الفطرت مخلوق جس کا اشارہ باہر ہوا ہے وہ ابھی ہال میں داخل نہیں ہوئی۔

O......❖......O

مشکوک بوڑھا شخص اپنی جگہ پر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے اسے کوئی خاص اطلاع مل گئی ہے وہ تیز قدم چلتا ہوا لوگوں کے بیچ میں سے نکلتا ہوا ٹینٹ سے باہر آ گیا۔

اس کی متلاشی نگاہیں چاروں اور گھومنے لگیں۔ اس وقت وہ لوگوں کی نظروں سے بے نیاز، بے خوف و خطر کسی کی تلاش میں تھا۔ وہ کسی جوان کی طرح مستعد تھا۔ ایک دم سے اس کے بوڑھے جسم میں کسی نوجوان جیسی توانائی اور پھرتی آ گئی تھی، مگر وہ ابھی تک کسی کی نظر میں نہیں آیا تھا۔ وہ بار بار اپنی جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا جیسے اس کے پاس کوئی ہتھیار ہو مگر اردگرد لوگوں کی موجودگی میں وہ کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔

عمارہ ہونٹوں کی تیز جنبش کے ساتھ تسبیح کے دانوں پر کچھ پڑھ رہی تھی۔ وہ ہال کے داخلی دروازے کے قریب ہی

کھڑی تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی قوت اس کا خدا پر بھروسا اور حوصلہ ہی تھا ورنہ اس طرح کے معاملات کا اس کے پاس کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔

وہ جس طرح بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ عورتوں کی نظریں اس پر ٹھہر گئی تھیں۔ ان میں سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔

ماہین اور رُخسانہ اس کے پاس آئیں۔ ''خیریت ہے.....'' رُخسانہ نے پوچھا۔

عمارہ کے چہرے سے پریشانی صاف عیاں ہو رہی تھی اس نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ ''نہیں خیریت نہیں ہے۔ باہر A-meter کی سوئیاں بتا رہی ہیں کہ کوئی غیبی مخلوق لان میں موجود ہے۔ شاید گھر کے دوسرے حصوں میں بھی ہو۔''

پھر اس نے گملے کے پیچھے لگے ہوئے A-meter کی طرف اشارہ کیا، اگر وہ غیبی مخلوق اس کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی سوئیاں جنبش کرنے لگیں گی۔

ماہین اور رُخسانہ کی خوف سے آنکھیں پھیل گئیں۔ ''اب کیا ہوگا، اگر ان شیطانی طاقتوں نے اِدھر حملہ کر دیا تو یہاں تو لوگوں کا ہجوم ہے۔ ہم کیسے لوگوں کو ان بدروحوں سے بچائیں گے۔''

رُخسانہ کے لہجے میں بھی کپکپاہٹ تھی۔ عمارہ نے تسبیح پڑھتے ہوئے ایک نظر رُخسانہ کی طرف دیکھا۔ ''اس طرح کی باتیں کر کے آپ میرا حوصلہ کم نہ کریں بس دُعا کریں۔ سورۃ الناس پڑھیں وہ شیطانی مخلوق ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ ویسے بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ غیبی مخلوق شیطانی مخلوق ہی ہو۔''

اس دوران میں A-meter کی سوئیاں جنبش کرنے لگیں۔ کپکپاہٹ کا جھنکار رُخسانہ کے وجود سے گزر گیا اور ماہین بھی خوف سے جیسے پتھر کی ہوگئی۔ عمارہ نے فوراً ظفر کو فون کیا۔ چند ساعتوں میں ہی ظفر اور حسنان ہال میں پہنچ گئے۔

توقیر اور وقار گھر کے دوسرے حصوں میں چلے گئے۔ وہ سب پورے گھر میں تقسیم ہوگئے۔ ابھی تک غیبی مخلوق کا بس اشارہ ملا تھا مگر کوئی عجیب حرکت سامنے نہیں آئی تھی۔ ظفر عمارہ کے پاس آیا تو عمارہ نے گھبراہٹ سے کہا۔ ''وہ غیبی مخلوق ہال میں داخل ہوگئی ہے۔''

''ہمت سے کام لیں، عورتوں پر نظر رکھیں ہم دونوں اِدھر ہی ہیں۔''

عورتوں تک یہ بات پہنچ گئی۔ ان میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ بوڑھا شخص تیزی سے ہال کی طرف بڑھنے لگا تو ساحل کی نظر اس پر پڑ گئی۔ ساحل تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ ''بابا جی آپ اندر کہاں جا رہے ہیں؟''

''اندر میری بیوی ہے، اسے بلانا تھا۔''

''آپ اپنی بیوی کا نام بتائیں، میں بلا لاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے ساحل نے اسے قریب سے دیکھا تو اسے بوڑھے کا چہرہ مصنوعی سا لگا۔ اس نے بہت ہوشیاری سے اس کے چہرے پر چٹکی بھر دی۔ بوڑھے نے ساحل کا ہاتھ پیچھے کیا تو اس کے چہرے کا ماسک ساحل کے ہاتھ میں آ گیا۔ زرغام بے نقاب ہو گیا۔

زرغام برق سرعت سے وہاں سے بھاگا، ساحل اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ زرغام لوگوں کو دھکیلتا ہوا، گرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا..... ساحل بھی لوگوں کو دھکیلتا ہوا اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے ساحل کے لیے اسے پکڑنا مشکل تھا لیکن وہ ساحل کی نظروں سے دور نہیں گیا تھا۔ ساحل مسلسل اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

پھر اچانک ہی وہ شخص اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ''اوہ شٹ'' ساحل نے درخت سے مکا ٹکرایا۔ وہ کچھ دیر تک اسے ڈھونڈتا رہا پھر اسے ہال کا خیال آیا کہ خواتین کسی مشکل میں نہ ہوں۔ وہ تیزی سے واپس ہال کی طرف بڑھا۔ اندر ہال میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ ساری خواتین کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

ظفر، وقار احمد اور عارفین بھی اندر ہال میں ہی تھے۔ باقی ساتھی باہر لان میں تھے۔ عمارہ ہونٹوں کی تیز جنبش کے ساتھ کچھ پڑھتے ہوئے ہال میں گشت کر رہی تھی۔ پھر وہ ہال کے وسط میں کھڑی ہوگئی اور اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے چلائی۔

''کون ہو تم، ہمارے سامنے آؤ.....''

عمارہ نے یہ بات تین بار دہرائی مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے لمبا سانس کھینچا اور ایک بار پھر بلند آواز میں بولی۔

''میں جانتی ہوں کہ تم یہاں ہال میں موجود ہو اگر سامنے نہیں آنا

چاہتے تو ہمیں اپنی موجودگی کا ثبوت دو.....“

ہال کی چھت پر لگا ہوا کرسٹل کا فانونس بُری طرح جھولنے لگا۔ جو خواتین اس فانوس کے نیچے تھیں، وہ تیزی سے وہاں سے پیچھے ہٹ گئیں۔ فانونس زور دار دھماکے کے ساتھ زمین پر آ گرا۔ اس پر لگی کرسٹل کی گولیاں دور دور تک بکھر گئیں۔

عورتیں چیختی چلاتی ہال سے باہر بھاگنے لگیں۔ عمارہ انہیں روکنے کی کوشش کرتی رہی۔ ”آپ اس طرح باہر نہ جائیں باہر بھی آپ کی جان کو خطرہ ہے، آپ اسی جگہ پر رہیں تو میں آپ کی جانیں بچانے کی کوشش کروں گی۔“

مگر عورتیں عمارہ کی بات سننے کو تیار نہیں تھیں۔ پانی کے ریلے کی طرح باہر نکلتی عورتوں میں کب زرغام اندر گھس آیا کسی کو بھی خبر نہ ہوئی۔ کچھ خواتین نے عمارہ کی بات سمجھ لی اور وہیں رُک گئیں۔ زرغام بے خوف سب کے سامنے آ گیا اس نے اپنی جیب سے لوہے کی چمٹی نکالی۔

”کون ہو تم.....؟“ ساحل اشتعال میں زرغام کی طرف بڑھنے لگا تو ظفر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”وہ جو کوئی بھی ہے اسے کرنے دو جو وہ کر رہا ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ ہماری دسترس سے باہر نہیں ہے۔“ وہ لوہے کی چمٹی کو مختلف زاویوں میں حرکت دینے لگا۔

ایک خاص سمت کی طرف وہ لوہے کی چمٹی اپنے آپ بجنے لگی۔ زرغام نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا ڈبہ نکالا، اس نے جلدی سے اس ڈبے سے چٹکی بھر راکھ نکالی اور اسے اس سمت میں اُچھال دیا۔

چمٹی بجنا بند ہو گئی اور اس کا رُخ خود بخود دوسری جانب ہو گیا اور وہ پھر سے بجنے لگی۔ زرغام نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اس سمت میں راکھ اُچھال دی..... راکھ کے ذرات میں غیر مرئی وجود ظاہر ہو گیا۔

ماہین چیخ اُٹھی۔ ”خیام! میرا بیٹا.....“ فضا سے راکھ جھڑتے ہی وہ روحانی جسم غائب ہو گیا زرغام نے پھر اپنی چمٹی کو حرکت دی اور خیام کی موجودگی ظاہر ہونے پر اس نے مٹھی بھر راکھ ہوا میں اُچھال دی۔

خیام کا ہوا میں معلق روحانی جسم ایک بار پھر ظاہر ہو گیا۔ اس بار اس کی نظریں ماہین کی طرف تھیں۔ چہرے پہ وفا کے احساسات اور آنکھوں میں چاہت کی تڑپ تھی۔ ماں کو سامنے دیکھ کر وہ زرغام جیسے حریف کو بھول گیا تھا۔

ماہین جذبات کی رو میں بہتی ہوئی اس سپید سائے کی طرف بھاگی جو چند ساعتوں میں ہی غائب ہو گیا۔ وقار احمد آگے جا کے اسے لے آیا۔ ”خود پر قابو رکھو۔ تمہاری غفلت سب کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔“

زرغام تفتیش میں اپنے اصل روپ میں آ گیا۔

”جن طاقتوں پر تجھے اتنا گھمنڈ ہے یہ میری ہی دی ہوئی ہیں، مجھ سے آنکھ مچولی نہ کھیل اگر واقعی طاقتوں کا حامل ہے تو آ مجھ سے مقابلہ کر۔“ ہوا میں ایک روشنی کی شعاع ظاہر ہوئی اور چھت کی طرف بڑھتی ہوئی غائب ہو گئی۔

زرغام سمجھ گیا کہ خیام نے اس کا چیلنج قبول کر لیا ہے۔

وہ ہال کے دروازے کی طرف بھاگا اور ہال سے باہر نکل کر کھلے میدان میں کھڑا ہو گیا۔ روشنی کی شعاع ایک بار پھر ظاہر ہوئی اور زرغام کے سامنے زمین کی طرف بڑھتی ہوئی خیام کے وجود میں تبدیل ہو گئی۔ اطراف میں کھڑے ہوئے لوگ چیختے چلاتے پیچھے ہٹنے لگے۔ ہال میں موجود تمام لوگ باہر آ گئے۔

یہ سنسنی خیز منظر دیکھ کر لوگ خوف زدہ ہو گئے۔ بیٹے کو سامنے دیکھ کر ماہین اور وقار احمد تڑپ کر رہ گئے۔ عمارہ نے تذبذب سی کیفیت میں ساحل کی طرف دیکھا۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے، یہ دوسرا شخص کون ہے ہم ان دونوں میں سے کس کو اپنا دوست سمجھیں۔“

”ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہر حال آج بہت بڑے راز سے پردہ ہٹ جائے گا۔“

○.....✧.....○
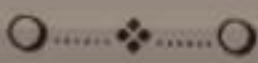
زرغام نے قہقہہ بلند کیا۔ ”مجھے پوری اُمید تھی کہ تم مجھے یہاں ضرور ملو گے۔ تمہیں میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے..... ورنہ تم میرے اشاروں پہ چلنے پر کبھی انکار نہ کرتے۔“

”میرا راستہ وہ نہیں جو تُو نے وشا، فواد اور حوریہ کو دکھایا تھا میرا ہمزاد مسخر کر کے بے شک تم نے مجھے بہت سی طاقتیں دی ہیں مگر مجھ پر تیرا عمل اُلٹا ہو گیا۔ میرے ساتھ جو روحانی طاقتیں ہیں وہ شیطانی نہیں ہیں۔ مجھے رب نے تیری موت کے لیے چنا ہے شاید اسی لیے مجھ سے میرا مادی وجود

لے لیا ہے۔“

زرغام نے تمسخرانہ انداز سے خیام کے روحانی جسم کو دیکھا جس میں سے آر پار کی چیزیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

”اگر مجھ سے مقابلہ کرنا ہے تو مادی وجود میں آؤ......“

خیام نے مسکراتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں جوڑا اور اپنی پیشانی پر رکھ لیا۔ وہ ایک بھیانک بھیڑیئے کی صورت اختیار کر گیا ایسا بھیڑیا جس کا جسم تو انسان جیسا تھا مگر اس کی بالوں والی جلد اور چہرہ بالکل بھیڑیئے جیسا تھا۔ زرغام نے بھی وہی عمل دہرایا اور ویسا ہی روپ دھار گیا۔ وہ خونخوار بھیڑیئے ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔

لوگوں نے خوفزدہ ہو کر بھاگنا شروع کر دیا، وہ ظفر کے گھر سے جلد از جلد باہر نکلنا چاہتے تھے لوگ اپنی اپنی سواریوں میں برق رفتاری سے وہاں سے نکل گئے۔ تھوڑے سے لوگ جو بچ گئے تھے وہ دہشت سے ایک دوسرے سے چپکے کھڑے تھے۔

دو خون آشام بھیڑیئے دھاڑتے ہوئے اپنے لمبے لمبے نوکیلے دانت ایک دوسرے کے جسم میں پیوست کر رہے تھے۔ ظفر نے ساحل سے اپنی پسٹل لانے کے لیے کہا ساحل جلدی سے اس کی پسٹل لے آیا اور اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس نے پینٹ کی جیب میں پسٹل ڈال لی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ ان خونخوار بھیڑیوں کے قریب پہنچ کے ظفر نے اپنی پسٹل نکال لی اور بہت احتیاط سے لوگوں کے پیچھے چھپتے ہوئے اس نے اپنی پسٹل کا نشانہ سیٹ کیا۔ وہ بھیڑیئے بن مانسوں کی طرح چھلانگیں مارتے ہوئے ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے۔ وہ خنجر جیسے نوکیلے پنجوں سے ایک دوسرے کو زمین پر پٹختے۔

ظفر نے تذبذب سی کیفیت میں ساحل کی طرف دیکھنے لگا۔ ”پتہ ہی نہیں چل رہا کہ ان دونوں میں سے زرغام کون ہے۔“

ساحل نے ان کی پسٹل کی نال کو پیچھے کر دیا۔ ”آپ اپنی پسٹل جیب میں واپس ڈال لیں۔ ہمیں زرغام کو زندہ سلامت پکڑنا ہوگا۔“ ایک خونخوار بھیڑیا ہوا میں اڑتا ہوا گھر کی چھت پر جا کھڑا ہوا۔ دوسرا بھی دھاڑتا ہوا ہوا میں اڑتا ہوا چھت پر چلا گیا اور پھر ان کی خوفناک جنگ شروع ہو گئی۔ فضا میں خوفناک غرغراہٹ اور دلخراش چیخیں گونجنے لگیں، بالکل ایسے ہی جیسے ایک درندہ مارے تکلیف کے تڑپتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ساحل اور ظفر بے چینی سے انہیں ڈھونڈنے لگے مگر اب وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ساحل دوڑتا ہوا پورچ کی طرف بڑھا۔ وہاں گاڑیوں کی لمبی قطار تھی۔ وہ ظفر کی گاڑی میں خاموشی سے بیٹھ گیا، اس کی نظر کبھی بائیں اطراف کی گاڑیوں کی طرف جاتی تو کبھی بائیں طرف کھڑی گاڑیوں کی طرف جاتی۔

کچھ ہی دیر بعد زرغام زخمی حالت میں اسے گاڑیوں کے قریب نظر آیا۔ وہ سلور کلر کی کلٹس میں بیٹھا اور اپنی گاڑی پارکنگ سے نکال کر وہاں سے نکل پڑا۔ ساحل نے فوراً اپنی گاڑی پارکنگ سے نہیں نکالی تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنی گاڑی وہاں سے نکالی اور بہت ہوشیاری کے ساتھ زرغام کی گاڑی کے پیچھے لگا دی۔

وہ زرغام کا ٹھکانا جاننا چاہتا تھا جہاں پر رہ کے وہ یہ شیطانی کھیل کھیلتا تھا۔ زرغام کی گاڑی کے پیچھے ایک گاڑی تھی، اس کے پیچھے ساحل کی گاڑی تھی۔ اس لیے زرغام کو شائبہ تک نہ ہوا وہ کافی دور تک زرغام کا پیچھا کرتا رہا۔

مگر اشارے کے لیے ٹریفک سگنلز پر گاڑیاں رکیں تو زرغام کو سائیڈ مرر سے ساحل کی گاڑی نظر آ گئی۔ گرین سگنل کا اشارہ ملتے ہی گاڑیاں دوڑنے لگیں، زرغام انتہائی تیز سپیڈ سے وہاں سے نکل گیا ساحل نے دوسری گاڑیوں کو کراس کر کے گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔

CNG کی ریڈ لائٹ اشارہ دینے لگی کہ CNG ختم ہو گئی ہے، گاڑی پٹرول پر کرنی ہو گی ساحل نے گاڑی پٹرول پر کری مگر کچھ گڑبڑ ہو گئی، گاڑی جھٹکے کھانے لگی اور پھر بند ہو گئی ساحل نے گاڑی دوبارہ سٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر گاڑی تو جیسے جام ہو گئی۔ اس نے اسٹیرنگ پر زور سے ہاتھ مارا۔ ”او میرے خدایا! یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔“

زرغام وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

عمارہ نے وہاں پر موجود مردوں اور خواتین کو تسلی دی۔ ”آپ سب اطمینان سے بیٹھ جائیں، خطرہ ٹل گیا ہے۔“

اس نے خواتین سے التماس کی کہ وہ ہال میں بیٹھ کر قرآن پاک پڑھیں۔ ”یہ قرآن پاک کی برکت ہی ہے کہ ہم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ہم سب محفوظ ہیں۔ آیئے ہم سب خدا کی عبادت کر کے دعا مانگتے ہیں کہ خدا ہمیں ان شیطانی طاقتوں سے بچنے کا راستہ بتائے۔“

رُخسانہ اور ایمن نے بھی خواتین کو حوصلہ دیا اور وہ سب دوبارہ ہال میں بیٹھ کے قرآن پاک پڑھنے لگیں۔

کوئی نہیں جان سکا کہ جیت خیام کی ہوئی یا زرغام کی۔ سب کے دل و دماغ میں بس تجسس بھرا خوف رہ گیا۔ بچنے کی راہ ملی بھی اور گم بھی ہوگئی۔ خیام کی جھلک دیکھنے کے بعد سے ہی ماہین کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ڈیپریشن سے اس کا بلڈ پریشر ہائی ہوگیا۔ وقار احمد نے اسے بیڈ پر لٹایا، اسے میڈیسن دی۔ عمارہ بھی ماہین کے قریب بیٹھ گئی۔ اس نے خلوص سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”آپ پریشان کیوں ہورہی ہیں۔ یہ بات تو آپ نے تسلیم کرلی تھی نا کہ خیام اب دنیا میں نہیں ہے۔ مگر آپ کو اس بات پر فخر ہونا چاہیے کہ خیام کی روح نیک مقصد کی طرف مسخر ہے۔ وہ ان بدروحوں میں سے نہیں ہے، جو لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار رہی ہیں بلکہ شاید وہ، ہم سب کے لیے مسیحا بن کے آیا ہے۔“

پھر عمارہ نے ساحل کی طرف دیکھا۔ ”تم کہہ رہے تھے نا کہ ہم بغیر ہتھیار کے جنگ لڑ رہے ہیں اور ہمیں وہ راہ بھی معلوم نہیں جس سے ہم دشمن تک پہنچ سکیں۔ اب ہمارے پاس ہتھیار بھی ہوں گے اور وہ راستے بھی جن سے ہم اپنے دشمن تک پہنچ سکیں گے میں دھیان گیان کے ذریعے خیام کی روح سے رابطہ کروں گی۔“

”تم روح کا نام لیتی ہو تو میرا کلیجہ کٹتا ہے میری آنکھوں میں میرا جیتا جاگتا خیام ہی بسا ہے۔ رب میری جان لے لیتا مگر میرے بیٹے کو کچھ نہ ہوتا۔“ ماہین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وقار احمد اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ظفر اور عمارہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے، وقار احمد نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”نا سمجھ عورت! خدا سے گلے کررہی ہے۔ فواد، حوریہ، وشاء اور خیام تو حرام موت مرے ہیں..... ان کی موت خودکشی ہی ہے، نہ ہی ان کی روحوں کو چین آئے گا اور نہ ہمیں۔“

ظفر نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ ”ماہین تو عورت ہے کمزور ہے، تم تو حوصلہ رکھو۔“

پھر ظفر، عمارہ سے مخاطب ہوا۔ ”تم جو بات کہہ رہی تھی وہ ٹھیک ہے لیکن میرے خیال میں ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آج کے عمل کے بعد وہ بدروحیں ہمیں نقصان پہنچاتی ہیں یا نہیں۔ ہمیں انہیں خود سے چھیڑنا نہیں چاہیے۔ اگر ہمیں ان کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس ہوتو ہم کوئی اقدام کریں گے۔“

عمارہ تمسخر آمیز انداز میں مسکرائی۔ ”روشنی کی رفتار سے سفر کرنے والی بدروحیں ہمیں اتنی مہلت نہیں دیں گی کہ ہم کوئی اقدام کرسکیں۔ آپ لوگ بس اتنا کریں کہ روزانہ قرآن پاک پڑھیں نماز باقاعدگی سے ادا کریں۔ مجھے جو کرنا ہے وہ میں نے سوچ لیا ہے۔ جب بھی آپ کو کوئی خطرہ محسوس ہو آپ نے مجھ سے رابطہ کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر عمارہ نے اپنا کارڈ ظفر کی طرف بڑھایا۔ ”اس میں میرے کلینک کا بھی نمبر ہے اور گھر کا بھی۔“

ساحل، عمارہ کی طرف بڑھا۔ ”آپ تو ابھی کچھ دیر رُکیں گی نا......“

”نہیں...... مجھے جانا ہوگا، میں نے ایک Patient کو وقت دیا ہے۔ وہ کلینک میں میرا ویٹ کررہا ہوگا آپ لوگ مجھ سے ہر وقت رابطہ رکھیں جب کہیں گے، میں آجاؤں گی۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ لوگ کس قدر گمبھیر صورت حال سے گزر رہے ہیں۔ اب میں چلتی ہوں۔“

عمارہ نے جاتے ہوئے پلٹ کر ساحل کی طرف دیکھا۔ ”تم نے زرغام کا پتہ لگانا ہے ہمارا اس تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔“

”اس شیطانی درندے کا پتہ تو میں ضرور لگاؤں گا۔ میں اور عارفین مل کر یہ کام کریں گے۔“ ساحل نے کہا۔

عمارہ وہاں سے چلی گئی۔ رُخسانہ، ماہین کے پاس بیٹھ گئی اور اس کا سر دابنے لگی۔ رُخسانہ کی اپنی بھی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ان سب کا درد مشترک تھا۔

○......❖......○

عمارہ کے والد فوت ہوئے نو برس ہو چکے تھے۔ وہ اپنی

والدہ کا واحد سہارا تھی۔ ظفر کے گھر سے وہ سیدھی اپنے کلینک گئی۔ دو خواتین مریضہ اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس نے ان دونوں کو باری باری چیک کیا۔ فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنی اسسٹنٹ سے چائے منگوانے کو کہا۔ اس کی اسسٹنٹ عنبر اس کے لیے چائے لائی تو عمارہ سر پکڑے بیٹھی تھی۔

''خیریت ہے، آپ پریشان لگ رہی ہیں۔'' عنبر نے پوچھا۔

عمارہ نے اپنی اُنگلیوں کی پوروں سے اپنی آنکھوں کے پپوٹوں کو دھیرے دھیرے سے دباؤ دیا اور اپنے سر کو کرسی کی پشت سے ٹکالیا۔

''بہت پیچیدہ مسئلہ ہے، میں نے اپنی آٹھ سال کی پریکٹس میں ایسا مسئلہ handle نہیں کیا۔ مگر وہ خاندان اتنی مشکل میں ہے کہ میں ہر حال میں ان کی مدد کروں گی۔''

''آخر ایسا کیا معاملہ ہے؟''

''بتاؤں گی تمہیں...... کیونکہ مجھے تمہاری مدد بھی چاہیے ہوگی۔''

اسی دوران عمارہ کے گھر سے فون آگیا۔ اس کی والدہ رابعہ آن لائن تھیں۔

''جی امی جان......'' عمارہ نے فون ریسیو کیا۔

''امی کی جان! تم نے پورے سات بجے گھر آجانا ہے...... کسی مریض کو چیک نہیں کرنا...... تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری امی بالکل اکیلی ہوتی ہے۔''

عمارہ نے ہونٹوں کو چباتے ہوئے عنبر کی طرف دیکھا اور بھنوؤں کو اُچکاتے سوچنے لگی کہ ماں کو کیسے مناؤں کہ آج اسے نو بجے تک کلینک میں ہی رہنا ہے۔ اس نے ہمت کر کے بات شروع کی۔

''امی جان! آپ کی بات درست ہے، میں پوری کوشش کرتی ہوں کہ سات بجے آپ کے پاس پہنچ جاؤں مگر کبھی کوئی ایسا مریض آجاتا ہے کہ رُکنا پڑتا ہے، آپ سے بڑی معذرت چاہتی ہوں، مجھے نو بجے تک کلینک میں رُکنا ہوگا، بہت ضروری کام ہے۔ میں گھر آکے آپ کو سب کچھ سمجھادوں گی پلیز امی جان...... آپ کے پاس ملازمہ ہے نا، آپ اسے نو بجے سے پہلے گھر مت بھیجنا۔''

''جو مرضی کرو، تمہارے پاس اپنی ماں کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔'' رابعہ نے خفگی سے فون بند کر دیا۔

''امی......'' عمارہ بس بولتی ہی رہ گئی۔ اس نے ریسیور رکھا اور بک شیلف سے کوئی کتاب ڈھونڈنے لگی۔

اسے اپنی مطلوبہ کتاب مل گئی۔ وہ کتاب لے کر پڑھنے بیٹھ گئی۔ عنبر الماری کی کتابیں ترتیب سے رکھنے لگی عمارہ نے ترچھی نظر سے عنبر کی طرف دیکھا۔ ''تم ایسا کرو سٹور روم میں جتنی بھی ہمزاد سے متعلق کتابیں ہیں سب لے آؤ......''

عنبر نے بھنوؤں کو اُچکاتے ہوئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عمارہ کی طرف دیکھا۔ ''ہمزاد......؟ عمارہ باجی! آپ کس قسم کا کیس ہینڈل کر رہی ہیں۔''

''فی الحال میں نے جو تم سے کہا ہے وہ کرو، باقی باتیں میں تمہیں بعد میں سمجھا دوں گی۔'' عمارہ کتاب کے صفحات تیزی سے پلٹ رہی تھی شاید اسے وہ موضوع نہیں مل رہا تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ عنبر کمرے سے جا چکی تھی اسے سٹور روم میں کتابیں ڈھونڈنے میں کافی وقت لگ گیا۔ عمارہ نے اتنی دیر میں بک شیلف سے دو کتابیں اور نکال لیں۔

عنبر دھول سے اَٹی ہوئی چار کتابیں لے کر آفس میں داخل ہوئی تو عمارہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ عنبر خود دھول سے اَٹی آثار قدیمہ کا کوئی مجسمہ دکھائی دے رہی تھی۔

''ہنس لیں آپ اتنا تو ہوتا نہیں کہ ملازمہ سے کہہ کے سٹور روم کی صفائی کروالیں۔''

اس نے ٹھپ سے دھول سے اَٹی کتابیں میز پر رکھ دیں عمارہ بیزاری سے کھانسنے لگی۔ ''کتابیں تو صاف کر دیتیں، سارا ٹیبل گندا ہو گیا ہے۔ مجھے کپڑا دو میں صاف کر دیتی ہوں۔ تم جا کے اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔''

عنبر وہاں سے چلی گئی۔ عمارہ نے کتابیں صاف کیں اور پھر ان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد عنبر بھی آگئی۔ عمارہ نے ایک کتاب عنبر کی طرف بڑھائی۔ ''تم یہ کتاب پڑھو، کوئی خاص بات نظر آئے تو مجھے بتانا۔'' عنبر بھی عمارہ کے ساتھ مطالعہ میں مصروف ہوگئی۔

عمارہ نے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا اور خاص خاص معلومات جو اس نے کتابوں سے اکٹھی کیں لیپ ٹاپ میں

Save کرنے لگی۔

عنبر نے کتاب عمارہ کی طرف بڑھائی۔ ''یہ دیکھو ہمزاد مسخر کرنے کا طریقہ۔''

عمارہ نے کتاب سامنے رکھی اور وہ معلومات بھی Save کرلی۔ اس نے کتاب عنبر کی طرف بڑھائی۔ ''اس کتاب میں ڈھونڈو کہ شیطانی عملوں میں سرگرم ہمزاد کو کس طرح قابو کیا جاسکتا ہے۔''

عنبر نے کتاب لی اور دوبارہ پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ اس نے تقریباً پوری کتاب کا مطالعہ کیا مگر اسے ایسی کوئی معلومات نہ ملی۔ اس نے کتاب بند کی اور عمارہ سے مخاطب ہوئی ''تم نیٹ پر ڈھونڈو......''

''نیٹ پر کام تو میں گھر جا کے بھی کرسکتی ہوں۔ مجھے بس آفس کی کتابیں چیک کرنی ہیں۔'' عمارہ Keyboard پر انگلیوں کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔ اسی مصروفیات میں کب آٹھ بج گئے پتہ ہی نہیں چلا۔ عمارہ اپنے کلینک کا چکر لگا کے دوبارہ آفس میں آکر بیٹھ گئی۔

عنبر نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ہم دونوں اکیلے اس کلینک میں کیا کریں گے تم نے Reception والوں کو اور Gate keeper کو بھیج دیا ہے۔ یہاں تک کہ میڈیسنز کے سٹور میں بھی کوئی نہیں ہے۔''

عمارہ اپنی کرسی سے اٹھی اور دھیرے دھیرے سے چلتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ ''جو کام ہم نے کرنا ہے اس کے لیے تنہائی بہت ضروری ہے۔ تم نئی ہو اس لیے گھبرا رہی ہو، تم نے تو اسی کمرے میں رہنا ہے، بس یہ خیال رکھنا ہے کہ مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ کلینک کو کھلا دیکھ کر کوئی بھی آسکتا ہے...... اور پھر جو کام میں کرنے جا رہی ہوں، اس میں کوئی بھی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔''

عمارہ نے اپنا کوٹ اُتارا اور اپنا دوپٹہ سر پر اوڑھ لیا اس نے آفس کی دیوار میں لگا دروازہ کھولا اور اس کمرے میں داخل ہوگئی۔ جو اس نے خاص طور پر روحانی علاج کے لیے مخصوص کیا تھا۔

کمرے کی دیواروں پہ قرآنی آیات آویزاں تھیں۔ کمرے میں کوئی الیکٹرک لائٹ آن نہیں تھی۔ بڑی کینڈلز پیتل کے اور لکڑی کے اسٹینڈز پر لگی ہوئی تھیں۔ زمین پر بھی دائروں میں بے شمار دیے اور کینڈلز پڑی ہوئی تھیں کمرے میں خاص فرنیچر نہیں تھا۔

ایک دیوان سیٹ تھا اور ایک سنگل پلنگ جس پر مریض کو لٹا کے عمارہ روحانی اور نفسیاتی دونوں طرح کے علاج کرتی تھی۔ عمارہ کینڈلز جلانے لگی۔ عنبر اس کے کہنے کے مطابق اس دوسرے کمرے میں ہی بیٹھی تھی۔ کمرے میں کچھ روشنی ہوگئی تو عمارہ نے دروازہ بند کرلیا اور باقی کینڈلز بھی جلانے لگی۔ کمرے میں اس کی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

ساری کینڈلز جلانے کے بعد وہ دائرے میں پڑے ہوئے دیوں اور کینڈلز کی طرف آئی۔ اس نے دیے روشن کیے اور کینڈلز بھی جلادیں۔ پورے کمرے میں موم بتیوں کی ملگجی سی پُراسرار روشنی پھیل گئی۔

عمارہ موم بتیوں اور دیوں کی روشنی سے جگمگاتے ہوئے دائرے میں داخل ہوگئی اور پھر زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کے پاس ہی ایک شیشے کا گلاس اور تاش کے پتے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک نظر اس سامان کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگی۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح کچھ پڑھتی رہی پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اس نے زمین پر ایک چھوٹی سی شیٹ بچھائی۔ شیٹ پر کچھ زائچے سے کھنچے ہوئے تھے۔ اس نے شیٹ کے درمیان میں شیشے کا گلاس رکھ دیا اور اس کے چاروں طرف تاش کے پتے رکھ دیے تاش کے پتوں کو اس نے اس طرح رکھا کہ Kings کی تصاویر اوپر تھیں اور تاش کے نمبر اور پان والی سائیڈ نیچے تھی۔

اس نے تاش کے پتوں کے اوپر اپنی اُنگلیاں رکھیں اور پتوں کے اوپر اپنی اُنگلیوں کو اس طرح حرکت دینے لگی گویا کہ وہ پیانو بجا رہی ہو۔ اس عمل کے ساتھ ساتھ وہ کچھ پڑھ بھی رہی تھی۔ اس کے عمل کے مطابق اس کے ہاتھوں کی اُنگلیوں کی حرکت کے ساتھ تاش کے پتوں میں بھی حرکت ہونی چاہیے تھی مگر تاش کے پتے ساکت ہی رہے۔ پھر اس نے اُلٹے رکھے ہوئے گلاس کے اوپر اپنی انگشت رکھی اور آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگی وہ خاصی دیر تک اپنا خاص

عمل پڑھتی رہی مگر گلاس میں بھی کوئی حرکت نہیں آئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور مبہوت نظروں سے گلاس اور تاش کے پتوں کی طرف دیکھنے لگی۔

"اس طریقے سے میں نے کئی بار روحوں سے بات کی ہے مگر آج کیا بات ہے میرا عمل کام نہیں کر رہا۔"

اس نے وہی سارا عمل دوبارہ دہرایا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا آخر کار وہ مایوس ہو کے اٹھ گئی۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور ساری کینڈلز بجھا دیں۔ وہ بجھی بجھی سی کمرے سے باہر نکلی تو عنبر نے حیرت سے پوچھا۔ "اتنی جلدی عمل ختم ہو گیا۔"

"بات نہیں بنی، سات دن کے بعد دوبارہ کوشش کروں گی۔ اب گھر چلتے ہیں۔" عمارہ نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھا لیا۔

عنبر نے سکھ کا سانس لیا۔ "شکر ہے....." عمارہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

"پلیز اس طرح گھور کر مت دیکھو یوں لگتا ہے کہ آپ کے اندر کوئی روح آ گئی ہے۔"

عنبر نے آفس کا سامان سمیٹتے ہوئے کہا۔

"بکواس بند کرو اور جلدی چیزیں سمیٹو" عمارہ نے کہا اور پھر خود بھی اس کی مدد کرنے لگی۔

دونوں نے مل کر ساری چیزیں سمیٹیں اور پھر آفس بند کر کے دونوں گاڑی میں بیٹھ گئیں، عمارہ گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی..... وہ سارے راستے خاموش ہی رہی۔ اس نے پہلے عنبر کو ڈراپ کیا اس کے بعد اپنے گھر کے راستے کی طرف چل پڑی۔

اس کے ذہن میں سوچوں کا ایک جال سا بن گیا تھا جس میں وہ الجھی جا رہی تھی۔

عمارہ اپنے دھیان میں گاڑی چلا رہی تھی کہ اچانک اس کا ذہن سو گیا..... اس کے اعصاب جیسے کسی اور کے ذہن کے تابع ہو گئے۔ اس نے گاڑی کسی اور سمت موڑ لی۔

شہر کی آبادی سے دور اس کی گاڑی دھول اڑاتی ہوئی کچی زمین میں رک گئی۔ خواب سے بیدار ہونے جیسی کیفیت میں اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔

اس نے اپنے چاروں اور دیکھا تو خوف و تھرتھراہٹ کی جھرجھری اس کے پورے وجود سے گزر گئی۔ وہ قبرستان میں تھی۔ اس نے اسٹیئرنگ پر رکھے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔

"میں یہاں کیسے آ گئی....."

اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور ریورس گیئر لگایا مگر اس کے ذہن میں خیال سا ابھرا۔ "کہ کوئی طاقت ہے جو اسے یہاں تک لائی ہے اسے کچھ دیر یہاں رکنا چاہیے۔"

اس نے گاڑی روک لی اور گیئر نارمل کرتے ہوئے ہینڈ بریک کھینچ لیا۔ وہ گاڑی سے اتری تو ایک بار پھر قبرستان کے خوفناک سناٹے نے اس کے قدم روکے۔

اس نے حوصلے کا لمبا سانس کھینچا اور چل پڑی۔ قبرستان میں خوف سے تھرتھراتی خاموشی، گھمبیر تاریکی اور چھوٹے چھوٹے جانوروں کی سناٹے کو چیرتی ہوئی بری بری آوازیں گونج رہی تھیں۔

چاند کی چودھویں رات تھی، اتنی روشنی تھی کہ عمارہ باآسانی چل سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی مگر اسے ابھی اس کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی تھی۔ وہ فضا میں سہمی سہمی نظریں گھماتے ہوئے دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ تنگ کچا راستہ تھا جس کے دونوں اطراف قبریں تھیں..... وہ بہت احتیاط سے چل رہی تھی۔ وہ ذہنی طور پر کسی بھی پراسرار قوت کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی جو اسے یہاں تک لے آئی تھی۔

اسے کسی لڑکی کے چیخنے کی آواز آئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لیتی ہوئی بوکھلائی ہوئی بولی۔

"کون ہے وہاں.....؟"

وہ آواز قبرستان کے دائیں جانب سے آئی تھی۔ وہ دائیں جانب کی قبروں کی طرف بڑھنے لگی۔ اس جگہ چلنا بہت مشکل تھا۔ قبریں بہت قریب قریب تھیں اس کا پاؤں کبھی کسی قبر پر اور کبھی کسی قبر پر رکھا جاتا۔

وہ اپنے قدموں کو سکیڑ کر احتیاط سے چلنے لگی۔ کافی دیر چلنے کے بعد اسے ایک قبر دکھائی دی جس کے اوپر چراغ جل رہا تھا۔ اس قبر کے آس پاس کافی کھلی جگہ تھی۔ وہ قبر عمارہ کی توجہ کا مرکز بن گئی وہ اس قبر کے قریب گئی۔ قبر کے اوپر تازہ پھول کی پتیاں تھیں۔

اس نے پھول کی پتیوں کو ہاتھ میں لیا۔ ''لگتا ہے کہ یہ قبر آج ہی بنی ہے۔ مگر لڑکی کے چیخنے کی آواز کہاں سے آئی تھی۔''

یہ سوال اس کے ذہن میں گونج ہی رہا تھا کہ لڑکی کی چیخ کی آواز ایک بار پھر اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس بار وہ آواز اس کے پیروں کے پاس سے زمین سے آرہی تھی۔

وہ لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے اپنے قدموں کو پیچھے سکیڑنے لگی کہ اچانک اس کے قدموں کے قریب زمین کے نیچے سے درجنوں بلیاں نکلنے لگیں۔ یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہو رہا تھا کہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ بلیاں زمین سے سوراخ کرکے نکل رہی ہیں یا زمین سے اُبھر رہی ہیں وہ خونخوار بلیاں اس پر جھپٹ پڑیں۔ عمارہ سر کے بل زمین پر گر پڑی۔ بلیوں کے ناخن چھری کی دھار جیسے تیز تھے۔

کچھ بلیاں اس کے پیروں کو چمٹی ہوئی تھیں، کچھ اس کے بازوؤں پر اور دو بلیاں اس کی گردن پر جھپٹ پڑیں۔ عمارہ نے اپنے بازوؤں پر چمٹی بلیوں کو جھٹکے سے دور پھینکا اور اپنے گلے میں چمٹی ہوئی بلیوں کو ہاتھوں سے کھینچنے لگی۔ اس کے گلے سے خون بہنے لگا اور پاؤں بھی زخمی ہوگئے۔

عمارہ ساتھ ساتھ خاص آیتیں پڑھنے لگی، آہستہ آہستہ وہ خونخوار بلیاں غائب ہوگئیں۔

عمارہ کھانستی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ اس کے جسم کے سارے زخم اس طرح بھر گئے تھے گویا کہ زخم لگے ہی نہ ہوں۔ اس نے سہمی سہمی نظروں سے اپنے اردگرد دیکھا اور اسی جگہ یوگا کے سٹائل میں آلتی پالتی مار کے اپنے بازوؤں کو گھٹنوں سیدھا کرکے اپنی بڑی انگلی اور انگوٹھے کو آپس میں جوڑ لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ اس سے پہلے کہ اس پر کوئی اور حملہ ہوتا اس نے دھیان لگانا شروع کردیا۔

اس نے اپنی کمر اور سر کو سیدھا کیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اس نے اپنا سارا دھیان اپنی سانسوں کی طرف کردیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اردگرد کے ماحول سے بے خبر ہوگئی اور روحانی دنیا میں داخل ہوگئی۔ اس کا مادی وجود بے وقعت ہوگیا اور لطیف وجود حرکت میں آگیا۔ اس نے اپنے من کی آواز سے کسی سے بات کی۔ ''تم جو کوئی بھی ہو، میرے سامنے آؤ، مجھ سے بات کرو اس طرح چھپ چھپ کر مجھ پر وار نہ کرو..... میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

عمارہ کی آنکھیں بند تھیں مگر اس کی وجدانی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ جس جگہ بیٹھی تھی اس جگہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی اس بات کے جواب میں کوئی سامنے نہیں آیا، اس نے ایک بار پھر سب کچھ ایسے ہی دہرایا۔

اس کے سامنے درخت سے ایک شعاع زمین کی طرف بڑھی اور پھر وہ شعاع خیام کے روحانی وجود میں تبدیل ہوگئی۔ ایسا روشنی کا وجود جس سے اس کے پیچھے کی چیزیں بھی دکھائی دے رہی تھیں..... جس سے آر پار جایا جاسکتا تھا۔ عمارہ دھیرے سے مسکرائی۔

''اچھا تو یہ تم ہو.....'' خیام تمسخرانہ انداز میں مسکراتا ہوا عمارہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''مجھ پر اس طرح حملہ کرانے کا مقصد.....؟'' عمارہ نے سوال کیا۔

خیام ابھی بھی تمسخرانہ انداز میں عمارہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عمارہ نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ ''مجھ پر حملہ کیوں کرایا۔''

خیام نے مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''آپ اس چھوٹے سے واقعے کو حملہ کیوں کہہ رہی ہیں..... میں تو صرف دیکھ رہا تھا کہ جس لڑکی نے زرغام سے مقابلہ کرنے کی ٹھانی ہے وہ کتنی حوصلہ مند ہے۔''

عمارہ نے اپنی سانسوں کی مشق جاری رکھی۔ ''میں حوصلہ مند ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی۔ بس ایک ارادہ لے کر نکلی ہوں اور پُرامید ہوں کہ خدا میرا ساتھ دے گا۔ کوشش ہے اور تمہارے لیے بس اتنا ہی بتا سکتی ہوں کہ مجھے اپنی زندگی پیاری نہیں۔ نیک مقصد کے لیے جان چلی جائے تو چلی جائے۔ تم بتاؤ کہ زرغام کے خلاف اس جنگ میں ہمارا ساتھ دو گے۔''

خیام کچھ دیر کے توقف کے بعد بولا۔ ''میں تو اس میدان جنگ میں اس وقت سے ہوں جب آپ نہیں آئی تھیں۔ میں زرغام کے خلاف کیسے لڑتا ہوں کیسے نہیں۔ یہ کسی کو معلوم نہیں ہوگا۔ یہ نیک ہمزاد کی شیطان ہمزاد سے جنگ ہے۔ آپ سے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آپ اور آپ کی ٹیم کی ہر لمحے کی خبر ہے۔ جس وقت آپ کو میری

ضرورت ہوگی میں خود آجاؤں گا...... آپ مجھے بلانے کی کوشش مت کرنا۔"

"کیوں......؟" عمارہ نے پوچھا۔

"روحانی دنیا بہت پیچیدہ ہے راز دگیان کی باتیں آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ آپ اب گھر جائیں۔" یہ کہہ کر خیام غائب ہوگیا۔

عمارہ نے بھی آنکھیں کھول لیں۔ وہ جلد از جلد قبرستان سے نکل گئی اور گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

○......❖......○

چھ ماہ گزر گئے۔ سب دوست معمولات زندگی میں مصروف رہے۔ اس دوران کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا۔ عمارہ نے بھی ان دوستوں کے ہاں کئی بار چکر لگایا مگر کسی غیبی مخلوق یا روحانی اجسام کی موجودگی کے کوئی اثرات نہیں ملے۔

ان سب کو ایک اطمینان سا ہوگیا کہ شاید وشاء، فواد، حوریہ کی روحیں آخری رسومات کے بعد کسی خاص مقام پر چلی گئی ہیں۔ ان کے دل ودماغ پہ محیط ڈر ابھی ختم نہیں ہوا تھا لیکن انہوں نے خود فریبی کے احساس میں اپنا دھیان روزمرہ کے کاموں میں لگالیا تھا۔ عمارہ انہیں یہی سمجھاتی تھی کہ وہ کبھی بھی لاپروانہ ہوں۔ وہ تین ہمزاد کسی بھی وقت دوبارہ ان کی زندگی میں آسکتے ہیں۔

مگر وہ جیسے ڈر کے احساس سے نکل کر دوبارہ اس میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اتنے عرصے میں انہوں نے زرغام کا پتہ لگانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

خیام کے منع کرنے کی وجہ سے عمارہ نے بھی اسے بلانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بھی اپنے کلینک میں مصروف ہو گئی۔ عمارہ اپنے کلینک میں مصروف تھی۔ کوئی خاتون تھیں جو اپنے کسی نفسیاتی مسئلے کے سلسلے میں آئی تھیں، عمارہ اس خاتون کی گفتگو بہت توجہ سے سن رہی تھی کہ اس کی دوست کا فون آیا۔

عمارہ نے فون سنا۔ "میں ابھی مصروف ہوں، کچھ دیر کے بعد میں خود فون کرلوں گی۔"

"پلیز فون بند نہ کرنا، میں تمہارا زیادہ ٹائم نہیں لوں گی صرف تمہیں یہ بتانا ہے کہ رومان ہوٹل میں مصوری کی نمائش ہے...... سنا ہے کہ بہت اچھی اچھی پینٹنگز لگائی ہیں انہوں نے نمائش میں...... شام چار بجے کا وقت ہے بس تم نے میرے ساتھ چلنا ہے۔"

عمارہ نے دوست سے معذرت کے ساتھ کہا۔ "آج تو رات تک میرے پاس وقت نہیں ہے...... تم کسی اور کو لے جاؤ۔"

اس کی دوست نے غصے سے فون بند کردیا۔ عمارہ نے خفیف سے انداز میں سر کو جھٹکا اور پھر اس خاتون کے ساتھ مصروف ہوگئی۔

رومان ہوٹل شہر کا مہنگاترین ہوٹل تھا اس لیے یہ نمائش بھی خاص تھی۔ باذوق لوگوں کے لیے جنہیں آرٹ سے خاص لگاؤ تھا۔ لوگ اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر اس نمائش میں جانے کے لیے تیار تھے۔ نمائش کا وقت شام چار بجے سے لے کر رات دس بجے تک تھا۔

چار بجے تک تو ہوٹل میں دو یا تین لوگ ہی پہنچے تھے مگر آٹھ بجے ہال لوگوں سے فل تھا۔

نمائش میں تعلیمی اداروں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ شائقین بہت دلچسپی سے پینٹنگ دیکھ رہے تھے۔ پینٹنگز مختلف موضوعات کی عکاسی کررہی تھیں کچھ کا مطلب صاف اور واضح تھا، مگر کچھ تصاویر مخفی خصوصیات کی حامل تھیں۔ جنہیں دیکھ کر لوگ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ ان میں زیادہ تر ایبسٹریکٹ آرٹ کا نمونہ تھیں۔

چائے کا بندوبست ہوٹل والوں کی طرف سے تھا جس کے ساتھ sweets اور بیکری کی اشیاء تھیں۔ باقی لوگوں کی اپنی مرضی تھی وہ ہوٹل سے کچھ بھی آرڈر کرسکتے تھے۔ تین پینٹنگز خاص طور پر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔

ایک پینٹنگ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے فیشن کی عکاس تھی۔ جس کا عنوان ینگ ایج تھا۔ رنگوں کو مختلف زاویوں سے پھینک کر ایک لڑکی کا سراپا وجود ظاہر کیا گیا تھا۔ مصور کی تخلیقی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آرہی تھیں۔ دوسری پینٹنگ میں غروب آفتاب کا منظر تھا جس میں زندگی کی رعنائیاں دم توڑتی دکھائی گئی تھیں، کیسے سورج اپنی چلچلاتی روشنی سمیٹ کر بھیگی آنکھوں جیسی سرخی فضا میں بھر دیتا ہے۔ سرخی مائل سورج کا عکس جھیل پر پڑ رہا تھا، گویا جھیل اس کی غم گسار تھی، نزدیک ہی

ایک چھوٹی سی کٹیا تھی جس کے آس پاس سرکنڈے کی فصل تھی۔اس نظارے میں خاص مقناطیسیت تھی۔

تیسری خوبصورت پینٹنگ میں صبح کا منظر تھا۔اس کلچرپینٹنگ میں گاؤں کا ماحول دکھایا گیا تھا۔آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔پرندوں کے غول مستی میں مخمور محوِ پرواز تھے۔تصویر بول نہیں سکتی مگر مصور نے فضا میں سُروں کے نشان دے کر ظاہر کیا تھا کہ پُرمسرت صبح پرندوں کی چہچہاہٹ سے بھرپور ہے۔بھرے بھرے کھیتوں میں لوگوں کو اپنے کاموں میں مشغول دکھایا گیا تھا۔

خواتین بھی مختلف کاموں میں مشغول دکھائی گئی تھیں۔اس نمائش میں دو اخباروں کے صحافی بھی موجود تھے جو ان پینٹنگ کی تصاویر لے رہے تھے۔عمارہ کی دوست نوشی بھی اس نمائش میں موجود تھی۔پانچ منزلہ عمارت کا یہ ہوٹل روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔

سب سے اوپر کی منزل بالکل خالی تھی وہاں باتھ روم اور سٹور روم کے علاوہ کوئی کمرہ نہیں تھا کھلی چھت میں خوبصورت پودوں کی بہترین کولیکشن تھی۔چھت پر بے شمار گملے تھے۔اس بلند بالا عمارت کے اس حصے سے شہر کا نظارہ بہت خوب دکھائی دیتا تھا۔مگر رات کے اس پہر میں یہ حصہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

ہوٹل کے نچلے حصوں میں لوگوں کی چہل پہل اور رونق تھی جبکہ اس حصے میں سناٹے کی سرسراہٹیں تھیں۔صحافی مائیک لے کر نوشی کی طرف بڑھا۔''آپ کا نام۔''

''میرا نام نوشی ہے۔''

''آپ کیا کرتی ہیں۔''

''جی میں بی کام کر رہی ہوں۔''

''بہت خوب......ہم ایکسپریس نیوز کے لیے ریکارڈنگ کر رہے ہیں۔آپ کا اس نمائش کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

نوشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔''آج کی نمائش بہت زبردست ہے۔مجھے ساری پینٹنگز ہی بہت اچھی لگی ہیں لیکن حامد صاحب اور وجاہت صاحب کی پینٹنگز منفرد ہیں۔خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ان میں ایک پیغام بھی ہے۔''

''آپ ہماری ٹیم کے ذریعے کوئی پیغام لوگوں تک پہنچانا چاہتی ہیں۔''

نوشی نے کیمرے کی طرف دیکھا۔''اس طرح کی exibitions منعقد کر کے ہمیں آرٹسٹوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے،اس طرح نیا ٹیلنٹ بھی سامنے آئے گا بلاشبہ یہ لوگ بھی معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرداں ہیں۔''

''Thanks......'' یہ کہہ کر express news کا نمائندہ دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور ان سے ان کی رائے معلوم کرنے لگا۔نوشی کے موبائل کی رنگ بجی۔نوشی نے موبائل دیکھا تو سکرین پر عمارہ کا نام تھا......اس نے منہ بسورتے ہوئے کال کاٹ دی۔

عمارہ نے پھر نمبر ملایا......نوشی نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اس کا فون سنا۔''اب کیوں فون کیا ہے جب میں نے آنے کو کہا تو صاف انکار کر دیا۔''

عمارہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔''اتنی جلدی خفا ہو جاتی ہو میں جونہی فارغ ہو جاؤں گی،تھوڑی دیر کے لیے آ جاؤں گی۔''

''ہاتھ لگانے آؤ گی تو ایسے آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''ابھی مریض بیٹھے ہیں،میں کوشش کروں گی۔''

''اچھا ٹھیک ہے میں ایک گھنٹے تک ادھر ہوں اگر تم آ گئی تو ٹھیک ہے ورنہ میں گھر چلی جاؤں گی۔''نوشی نے موڈ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

عمارہ نے فون بند کر دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔کچھ لوگ نمائش دیکھ کر جا رہے تھے اور کچھ آ رہے تھے۔دھیمی دھیمی موسیقی نے فضا میں سرور بھر دیا تھا۔لوگ خوشگوار ماحول میں اس تقریب سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ہوٹل کی آخری منزل جہاں سناٹے اور تاریکی کا راج تھا دیوار پر لگے الیکٹرک ساکٹ سے شعلے نکل رہے تھے......جس کا تعلق نچلی منزلوں سے تھا۔

سب سے نچلے حصے کا میٹر الگ تھا مگر اوپر کی منزلوں میں بجلی کم تیز ہونے لگی تھی۔چھت پر لگے الیکٹرک ساکٹ کے شعلے بڑھنے لگے تھے،ہوٹل کے فرنٹ پر چھت کی طرف لگی ہوئی ڈیکوریشنز لائیٹز بجھ گئی تھیں۔ہوٹل کا اوپر کا حصہ باہر سے بھی اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔

اندھیرے میں ڈوبی ہوئی چھت کے اوپر آسمان میں عجیب پُراسراری حرکات ہو رہی تھیں، روشنی کے تین دائرے ایک دوسرے کے آگے پیچھے تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ روشنی کے وہ دائرے چھت کی طرف بڑھنے لگے اور پھر چھت کے وسط میں روشنی کے تین ہالے نمودار ہوئے۔

ہوٹل کی درمیانی منزل میں بجلی کبھی بند ہو جاتی اور کبھی آ جاتی، ان جلتی بجھتی روشنیوں میں لوگوں نے شور مچا دیا۔ الیکٹریشن اپنے اوزار لے کر چھت پر پہنچے اور ساکٹ بورڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کرنے لگے، الیکٹرک ساکٹ سے چنگاریاں نکل کر دور دور تک گر رہی تھیں۔

بالآخر مین سوئچ زوردار دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔ نچلی دونوں منزلیں اندھیرے میں ڈوب گئیں۔ ان حالات میں نہ تو جنریٹر چلایا جا سکتا تھا اور نہ ہی UPS استعمال ہو سکتا تھا۔ ایمرجنسی لائٹس استعمال کر کے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی جانے لگی۔

ہوٹل کے دوسرے حصوں میں لوگوں کو منتقل کیا جانے لگا۔ الیکٹریشن اپنے کام میں مصروف تھے مگر اب ان کا کام لمبا ہو گیا بجلی کی دوبارہ بحالی کے لیے اب انہیں خاصا وقت درکار تھا۔ پینٹنگز کی نمائش اسی طرح جاری تھی لوگ بہت دلچسپی سے یہ تصاویر دیکھ رہے تھے۔ پینٹنگز کے ساتھ ان کی قیمت بھی درج تھی۔ بہت سی پینٹنگز لوگوں نے خرید لی تھیں، مگر نمائش ختم ہونے تک وہ پینٹنگز اپنی جگہ پر ہی ٹنگی تھیں۔

دو لڑکیاں ینگ ایج کے عنوان سے لگی پینٹنگ کے بارے میں اپنا اظہار خیال ایک دوسرے سے شیئر کر رہی تھیں۔ اچانک وہ دونوں لڑکیاں اپنے منہ پر ہاتھ رکھے چیخنے لگیں۔ لوگ ان کی چیخ و پکار سن کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پینٹنگ کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

لڑکیوں کے گرد جمع ہونے والے لوگ بھی اپنی جگہ جامد ہو کے رہ گئے تھے۔ پینٹنگ میں جو ایک لڑکی کا محض سراپا دکھایا گیا تھا وہ ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر میں بدل گیا تھا جس کے پَر بھی تھے...... پوری تصویر میں خون کے چھینٹے تھے۔ نمائش میں آئے ہوئے تقریباً سبھی لوگ اس پینٹنگ کے گرد جمع تھے۔

صحافی بھی اس پینٹنگ کی تصاویر لے رہے تھے، لوگ خوفزدہ سہمے سہمے کھڑے تھے۔ مگر نوشی جس پینٹنگ کے سامنے کھڑی تھی، اس کے قدم وہیں منجمد ہو گئے تھے۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا، اس کی قوتِ گویائی سلب ہو گئی تھی۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھی کہ آرٹ گیلری میں کیا ہو رہا ہے اس کی تو نظریں اپنے سامنے والی پینٹنگ میں جڑی تھیں۔ کسی خوفناک مصور نے اس پینٹنگ کا منظر ہی بدل دیا تھا۔

وہ پینٹنگ جس میں غروب آفتاب کا منظر تھا یک لخت دہکتی آگ کے منظر میں بدل گیا۔ سرکنڈے کی فصل کو آگ لگی ہوئی تھی اور اس کا سیاہ دھواں پوری فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ جس نے ہر جگہ سیاہی بھر دی تھی۔

وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ایک شخص کی نظر اس پر پڑی تو اس نے اس کے قریب آ کر وہ پینٹنگ دیکھی، وہ بے ساختہ چلایا۔ ”یہ دیکھو اس پینٹنگ کا منظر بھی تبدیل ہو گیا ہے۔“

پچھلی پینٹنگ کو چھوڑ کے لوگ اس پینٹنگ کے گرد جمع ہو گئے، مگر نوشی پتھر کی بنی اپنی جگہ پر ہی کھڑی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں تجسس بھی تھا اور خوف بھی، صحافی بھی دھڑا دھڑ تصاویر کھینچ رہے تھے۔ ابھی لوگ اپنے دلوں کو سنبھال بھی نہ پائے تھے کہ ہال میں دل کو مدہوش کرنے والی خوبصورت نسوانی آواز گونجنے لگی۔

کوئی لڑکی اپنی مسحور کن آواز میں کوئی گیت گا رہی تھی جو لوگوں کے دلوں کو کھینچ رہا تھا مگر وہ زبان سمجھ میں نہیں آ رہی تھی جس میں وہ گیت گا رہی تھی۔ اس آواز میں ایسی کشش تھی کہ لوگ دیوانوں کی طرح اس آواز کی طرف کھنچے جا رہے تھے۔

اس آواز کے پیچھے چلتے ہوئے لوگ اس پینٹنگ تک پہنچ گئے۔ جس میں گاؤں کے فطری ماحول کی عکاسی کی گئی تھی مگر اب اس پینٹنگ کا منظر ہیبت ناک تھا۔ پینٹنگ میں اپنے اپنے کاموں میں مصروف دکھائے گئے لوگ خون میں لت پت گرے ہوئے تھے۔ پرندے بھی زخمی حالت میں آسمان سے زمین کی طرف گر رہے تھے۔

یہ خوفناک بدلا ہوا منظر لوگوں کو حیران نہیں کر رہا تھا کیونکہ وہ سب لوگ جادوئی آواز کے سحر میں مبتلا تھے۔

O......✣......O

عمارہ اپنی مریضہ کے ساتھ مصروف تھی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد اس نے نوشی کے نمبر پر فون کیا۔ بیل جا رہی تھی مگر کوئی فون نہیں اُٹھا رہا تھا۔ ''کیسی لاپرواہ لڑکی ہے۔''

عمارہ نے دوبارہ فون ملایا مگر اب بھی یہی صورتِ حال تھی۔ اس نے موبائل پر ٹائم دیکھا۔ ''اوہ نو بج گئے ہیں آج تو وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔'' اس نے عنبر کی مدد سے آفس کا سامان سمیٹا اور پھر وہاں سے نکل گئی۔ عنبر بھی اس کے ساتھ تھی حسب معمول اس نے پہلے عنبر کو ڈراپ کیا پھر اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔

گھر پہنچ کر اس نے پھرتی سے اپنے کپڑے چینج کیے۔ اپنا ہینڈ بیگ لیا اور اپنی والدہ کو بتا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ رابعہ اس کے پیچھے پیچھے پورچ تک آگئیں۔ ''اتنی دیر سے جا رہی ہو اب وہاں زیادہ وقت نہ لگانا اور گاڑی آہستہ آہستہ چلانا۔''

''اوکے مما!'' عمارہ نے مسکراتے ہوئے گاڑی ریورس کی اور پھر تیزی سے وہاں سے نکل گئی۔ اسے بھی پینٹنگ سے خاصا لگاؤ تھا۔ وہ ہوٹل کی طرف جا رہی تھی۔ وہ ہوٹل کے قریب پہنچی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

ہوٹل کے آگے لوگوں کا ہجوم تھا۔ 1122 کی گاڑیاں، پولیس کی گاڑیاں، ایمبولینس گاڑیاں لوگوں میں گھری کھڑی تھیں۔ لوگوں کے ہجوم کو پولیس والوں نے لوہے کی زنجیر سے روکا ہوا تھا۔

کچھ لوگ جو امدادی کارروائیوں میں مدد کر رہے تھے کسی نہ کسی طریقے سے اندر چلے گئے تھے۔ عمارہ کا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا وہ گاڑی بند کر کے لوگوں کے ہجوم کی طرف بڑھی۔ وہ لوگوں کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ درد میں ڈوبی ہوئی آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔

''میرا بیٹا اندر ہے...... پلیز آپ مجھے اندر جانے دیں۔'' کوئی اپنی بہن کے لیے رو رہا تھا، اس کا تو بس دل گھبرا رہا تھا جو کسی خطرے کی طرف اشارہ تھا۔ وہ لوگوں کو پیچھے دھکیلتی ہوئی لوہے کی زنجیر کے قریب پہنچ گئی اور انسپکٹر سے کہنے لگی۔

''یہ سب کیا ہے؟ اندر کیا ہوا ہے؟''

''ابھی ہم آپ کو کچھ نہیں بتا سکتے۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔

عمارہ نے التجا کی۔ ''پلیز آپ مجھے اندر جانے دیں۔''

انسپکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم کسی کو اندر نہیں بھیج سکتے، پولیس کی کارروائی ہو رہی ہے۔''

عمارہ نے اپنا کارڈ دکھایا۔ ''میں ایک ڈاکٹر ہوں، آپ لوگوں کی مدد کر سکتی ہوں۔''

انسپکٹر نے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی اور اسے بمشکل زنجیر میں سے گزار دیا۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا...... کوئی کہیں بیٹھا رو رہا تھا اور کوئی کہیں، مگر عمارہ کو کوئی کچھ نہیں بتا رہا تھا کہ آخر ہوا کیا ہے۔ ایک پولیس سولجر عمارہ کے پاس سے گزرا تو عمارہ نے اسے بلایا۔ ''ایکسکیوزمی!''

وہ عمارہ کے قریب آیا۔ ''جی فرمائیے۔''

''میں اندر جانا چاہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر عمارہ نے اسے اپنا کارڈ دکھایا۔

سولجر نے وہ کارڈ لے لیا۔ ''آپ ادھر ہی رُکیں میں پرمیشن لے کر آتا ہوں۔''

عمارہ اسی جگہ کھڑی رہی۔ کچھ دیر کے بعد وہ سولجر عمارہ کے قریب آیا۔ ''آپ آئیں میرے ساتھ۔''

عمارہ اس شخص کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ وہ شخص ہال کے قریب جا کے رُک گیا۔ ''آپ اندر جائیں۔''

یہ کہہ کر وہ شخص وہاں سے چلا گیا۔ اندر کا ہولناک منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ سر چکرایا اور وہ لڑکھڑا کے رہ گئی۔ ہال میں لوگوں کی لاشیں بچھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر پینٹنگ لگی تھیں مگر فرش لوگوں کے خون سے رنگا ہوا تھا۔

ہال میں Investigation کے لیے پولیس کے چار افراد اور دو ڈاکٹرز تھے۔

لوگوں کی اموات بہت عجیب طریقے سے ہوئی تھیں۔ کسی کے کانوں سے خون بہہ رہا تھا اور ساتھ ناک سے بھی بہہ رہا تھا جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کی موت دماغ کی رگیں پھٹنے سے ہوئی ہے، کسی کی گردن پر دو دانتوں کے نشان تھے جس سے اس کا جسم اس طرح نیلا پڑ گیا تھا جیسے کسی نے اس کا خون چوس لیا ہو اور کوئی جھلسا ہوا تھا۔

عمارہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے مگر وہ دل

پر ہاتھ رکھ کے آگے بڑھ رہی تھی۔ چلتے چلتے ایک دم اس کے قدم رُک گئے وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور اونچا اونچا رونے لگی۔ نوشی خون میں لت پت زمین پر ڈھیر تھی۔ اس کی بھی موت دماغ کی رگیں پھٹنے سے ہوئی تھی۔ وہ اس لاش کے قریب دو زانو بیٹھ گئی۔

"مجھ سے ایسی بھی کیا ناراضگی کہ اتنی دور چلی گئی۔"

ایک آفیسر عمارہ کے قریب آیا۔"یہ آپ کی کیا لگتی ہیں۔"

"یہ میری دوست ہے۔" عمارہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

"آپ خود کو سنبھالیں، آپ جیسے لوگ بھی ہمت چھوڑ دیں گے تو کمزور دل لوگوں کو کون سنبھالے گا۔ آپ ان کے گھر والوں کو بھی اطلاع کر دیں۔ پچاس لوگوں کا مرڈر ہوا ہے، صورت حال بہت گمبھیر ہے۔ پولیس کی ضروری کارروائی پوری ہو جائے تو لاشیں ان کے لواحقین کے سپرد کر دی جائیں گی۔"

یہ کہہ کر وہ آفیسر اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ دوبارہ Disscusions میں مصروف ہو گیا۔ نوشی کی آوازیں ابھی بھی عمارہ کے ذہن میں گونج رہی تھیں کہ کس طرح وہ اسے نمائش میں آنے کے لیے مجبور کر رہی تھی۔

وہ کچھ دیر نوشی کی لاش کے پاس بیٹھی رہی پھر اُٹھ کر باقی لاشوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے صرف اپنی دوست کی موت کا غم نہیں تھا، مرنے والے تمام لوگوں کے لیے اس کا دل چُور چُور تھا۔ جسم اس طرح نڈھال تھا جیسے وہ اپنے قدموں کو گھسیٹتے ہوئے چل رہی تھی۔ اس نے اپنا زمین پر لٹکتا ہوا دوپٹہ اکٹھا کیا تو اس کا دوپٹہ سیاہ راکھ سے بھر گیا، اس نے اپنے دوپٹے کو چھوا تو اس کے ہاتھ بھی سیاہ ہو گئے۔

اس نے سراسیمہ نگاہوں سے چاروں اور دیکھا۔ ہال کی کتنی ہی چیزیں سیاہ دھوئیں سے کالی ہو گئی تھیں۔ اس نے گروہ کی شکل میں کھڑے ہوئے آفیسر سے بلا تامل پوچھا۔

"ادھر آگ لگی تھی؟"

آفیسر نے فوری جواب دیا۔"نہیں۔" پھر وہ عمارہ کے قریب آیا۔"اس طرح معلوم ہو رہا ہے جیسے سیاہ دھواں کھڑکیوں اور دروازوں سے اندر داخل ہوا ہے جبکہ نہ تو باہر آگ لگی ہے اور نہ ہی اس ہوٹل کے آس پاس اور نہ ہی الیکٹرک تار جلی ہے۔ کوئی ایک شخص بھی نہیں بچا جس سے پوچھا جائے کہ آخر ہوا کیا تھا، اس کیس میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جس سے عقل دنگ رہ جاتی ہے ابھی کچھ دیر پہلے آرٹسٹ آئے تھے جن کی پینٹنگ کی نمائش تھی۔ ان میں سے ایک دو اشخاص نے تو سب کو حیران کر دیا، ان کا کہنا تھا کہ تین پینٹنگز کے مناظر چینج ہو گئے ہیں۔ یہ کام اس قدر صفائی سے کوئی انسان نہیں کر سکتا۔ آپ ایک عاملہ بھی ہیں آپ ہماری مدد کریں۔"

وہ آفیسر عمارہ کو ان پینٹنگز کے پاس لے گیا۔ عمارہ نے وہ تینوں پینٹنگز دیکھیں تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ تینوں پینٹنگز میں ایک خوفناک پیغام تھا، پروں والی لڑکی، آگ سے اُٹھتا سیاہ دھواں اور موت کی نیند سلا دینے والی خوبصورت آواز۔

عمارہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔"مارنے والوں نے ان پینٹنگز کے ذریعے پہلے ہی موت کا اعلان کر دیا تھا۔"

آفیسر بوکھلا سا گیا۔"کیا آپ ہمیں بتا سکتی ہیں کہ یہ قتل کیسے ہوئے؟"

"میں فی الحال کچھ نہیں بتا سکتی سوائے اس کے کہ یہ سب کالے جادو سے کیا گیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے داخلی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ گروپ میں کھڑا ہوا ایک آفیسر تضحیک آمیز انداز میں مسکرایا۔"ہم یہاں قاتل ڈھونڈ رہے ہیں کہ اسے ہتھکڑی پہنائی جائے اور آپ کالے جادو کی بات کر رہی ہیں۔"

عمارہ نے باہر کی طرف جاتے ہوئے قدم روک لیے اور پلٹ کر آفیسر کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں بولی۔

"قتل کرنے والا کوئی انسان نہیں جسے آپ ہتھکڑی پہنا دیں، وہ ایک ہمزاد ہے۔"

عمارہ خوف سے تھرتھراتا ہوا اس فقرے کا تیر ہوا میں چھوڑ کر وہاں سے چلی گئی۔ اس ساری صورت حال میں ٹی وی چینل کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی، کیمرہ آن تھا۔ میڈیا کے ذریعے یہ خبر لوگوں میں پھیل گئی۔ لوگ خوفزدہ ہو کے من گھڑت کہانیاں گھڑنے لگے۔ ہمزاد موت کا سایہ بن کر ہر ایک کے حواس پر سوار ہو گیا۔

ظفر، توقیر اور اس کے دوسرے دوستوں نے بھی یہ

ریکارڈنگ دیکھی، ان کی تو جیسے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

ظفر نے عمارہ سے رابطہ کیا۔ عمارہ نے موبائل اُٹھایا اور تھکے تھکے لہجے میں بولی۔ "وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ زرغام نے ان تینوں کے ہمزاد کو اپنے خطرناک مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ خوف دہراس ایک شیطان کی طاقت کو بڑھا دیتا ہے۔ اتنے لوگوں کے قتل کے بعد بھی ان کی طاقتیں بڑھ گئی ہوں گی۔ آپ وشاء، فواد اور حوریہ کے گھر والوں کو یہ ہدایت کریں کہ وہ محتاط ہو کے رہیں آپ اور ساحل میرے گھر آئیں۔"

یہ کہہ کر عمارہ نے فون بند کر دیا۔ عمارہ نے صوفے سے پشت لگالی اور سر کو جھٹکے سے پیچھے کی طرف رکھ دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ظفر اور ساحل اس کے گھر آ گئے۔ عمارہ نے انہیں مہمان خانہ میں بٹھایا عمارہ کی والدہ بھی وہیں آ گئیں۔

وہ بھی اس خوفناک واقعہ پر بہت رنجیدہ تھیں مگر اصل حقائق سے بے خبر تھیں۔ "تم عمارہ سے باتیں کرو میں ملازمہ کے ہاتھ چائے بھیجتی ہوں۔"

یہ کہہ کر عمارہ کی والدہ وہاں سے چلی گئیں۔ ساحل نے عمارہ کے پریشان چہرے کی طرف دیکھا۔ "آپ کی دوست کے بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا۔"

عمارہ کانپتی آواز میں بولی۔ "وہ پچاس لاشیں ابھی بھی میری آنکھوں کے سامنے آ رہی ہیں، ان کے لواحقین کے بین ابھی بھی میری سماعتوں میں گونج رہے ہیں۔ میں نے آپ دونوں کو اس لیے بلایا ہے کہ کسی بھی طریقے سے ہمیں زرغام تک پہنچنا ہے۔ ہمارے لیے ہمزاد سے مقابلہ کرنا مشکل ہے مگر مادی وجود رکھنے والے ایک انسان کو تو ہم قابو کر سکتے ہیں۔ اگر ہم نے اس شخص کو ختم کر دیا تو یہ قتل و غارت بھی ختم ہو جائے گی۔"

ساحل کی پیشانی پہ شکنیں اُبھر آئیں۔ "اس خبیث کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

ظفر نے فوراً ساحل کو ٹوکا۔ "یہ معاملے جوش سے نہیں ہوش سے ہینڈل کیے جاتے ہیں۔"

ساحل ایک بار پھر تڑپ کر بولا۔ "ہم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور خون آشام درندہ سرعام پھر رہا ہے۔ ایک دفعہ ہی موقع ملا تھا زرغام کے ٹھکانے تک پہنچنے کا، نہ جانے کیسے وہ چند منٹوں میں نظروں سے اوجھل ہو گیا، کتنی عجیب بات ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ان پچاس لوگوں کا قتل وشاء، فواد اور حوریہ نے کیا ہے مگر کچھ نہیں کر سکتے۔"

عمارہ نے پریشان کن لہجے میں کہا۔ "ساحل یہ بھی یاد رکھو کہ وہ تینوں مر چکے ہیں اور مرے ہوئے لوگوں پر پولیس کیس نہیں کرتی۔ مجھے آپ لوگوں سے بس یہی کہنا ہے کہ کچھ بھی تدبیر سوچیں مگر ہمیں زرغام تک پہنچنا ہے۔ اتنے بڑے واقعہ کے بعد کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ان کا اگلا نشانہ کون ہوگا۔"

"ایک اور پریشانی کی بات ہے۔" ظفر نے جبیں پیمائی کی۔

"کیا......؟" عمارہ نے پوچھا۔

ظفر نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "وینا کے والدین نے وینا اور عارفین کی شادی کی تاریخ رکھ دی ہے اسی مہینے کی پندرہ تاریخ۔"

"اوہ میرے خدایا! آج جمعرات ہے اور اگلے جمعہ کو وینا کی شادی ہے۔ ان حالات میں انہیں تاریخ رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم اس مسئلے کا کوئی حل تو ڈھونڈ لیتے۔"

"وہ لوگ کہتے ہیں کہ عارفین نے انگلینڈ جانا ہے۔ شادی جلدی کرنا ان کی مجبوری ہے۔" ساحل نے کہا۔

عمارہ بے چینی سے چہل قدمی کرنے لگی۔ "بے شک عارفین شادی کے بغیر انگلینڈ چلا جاتا، وہ لوگ کوئی بھی حل نکال لیتے مگر ابھی وینا کے نکاح کا مطلب ہے کہ فواد کو للکارنا۔"

ساحل نے بے چینی سے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ "کیا ہم ان بدروحوں کے خوف سے اپنی زندگی کے معاملات ہی ختم کر دیں۔"

عمارہ نے اپنا ہاتھ میز پر مارا۔ "جب تک ہم ان کے شیطانی ہمزاد کو قابو نہیں کر لیتے ہم لاپروا نہیں ہو سکتے۔ ہماری تھوڑی سی غفلت کئی لوگوں کی موت کا سبب بن سکتی ہے۔"

ظفر نے عمارہ کی تائید کی۔ "ساحل! عمارہ ٹھیک کہہ رہی ہے، میں وینا کے گھر والوں سے بات کروں گا کہ فی الحال اس شادی کا ارادہ ترک کر دیں نمائش میں ہونے والے واقعے سے وہ پہلے ہی بہت خوفزدہ ہیں یقیناً میری بات سمجھنے کی کوشش

کریں گے۔"

ساحل اور ظفر کچھ دیر کے بعد عمارہ کے گھر سے چل پڑے۔ دونوں بے حد پریشان تھے۔ حالات نے سنگین ترین صورت اختیار کرلی تھی۔ ظفر نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے ساحل کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ "میرے گھر ہی چلو مل کر کچھ سوچتے ہیں اس مسئلے کے بارے میں۔"

ساحل نے ظفر کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ "میں باتیں کرکر کے تھک گیا ہوں اب کچھ عملی طور پر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے میرے گھر چھوڑ دیں پلیز آپ سب سے رابطہ کریں، ہمیں مل کر اس مصیبت سے نبرد آزما ہونا ہے۔ ہمارے پاس اب وقت نہیں ہے۔ جس سے جو ہوتا ہے وہ کریں۔"

ظفر، ساحل کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اچانک اس نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔ "ایک تجویز ہے میرے ذہن میں۔"

"کیا.....؟"

"عمارہ کے منہ سے "ہمزاد" کا نام سن کر ہر طرف میڈیا میں سنسنی خیز خبریں پھیل گئی ہیں۔ لوگوں میں خوف و ہراس پھیل چکا ہے۔ پولیس اور رینجرز تو اسے محض توہمات پرستی سمجھتے ہیں مگر کچھ ایسے عالم ہوں گے جنہوں نے اس بات کو سنجیدگی سے لیا ہوگا۔ کیوں نہ ہم ایک پریس کانفرنس کریں اور میڈیا کے ذریعے کسی کو مدد کے لیے پکاریں۔"

ساحل نے اثبات میں سر ہلایا۔ "آپ کی بات میں دم ہے مگر میڈیا والے ہمارے لیے مسائل پیدا کردیں گے، ہماری مدد کرنے کے بجائے اس معاملے کو Intertainment کے لیے استعمال کریں گے۔ مرچ مصالحے لگا کر سنسنی خیز خبروں کے ذریعے لوگوں کی دلچسپی حاصل کریں گے۔ ہمیں اپنا کام نہیں کرنے دیں گے۔ ہمیں لوگوں کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔

عمارہ تو لوگوں کے سامنے آچکی ہے اگر کسی نے ہماری مدد کرنی ہوگی تو وہ خود سامنے آجائے گا ہمیں صرف یہ سوچنا ہے کہ زرغام کو کیسے ڈھونڈا جائے۔ کس طرح انسانوں کا قتل عام روکا جائے۔" انہی باتوں میں ساحل کا گھر آگیا۔

ظفر نے گاڑی روک دی۔ ساحل گاڑی سے اُتر گیا، اس نے گاڑی کے دروازے پر بازو رکھا۔ "کل دس بجے آپ سب کو بلالیں۔"

ظفر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔"

ساحل گھر میں داخل ہوا تو اس کی والدہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ "کہاں تھے تم۔ کب سے میں تمہیں فون کر رہی ہوں۔"

"کیوں خیریت تھی؟" ساحل نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

راحت اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ "جب تم موبائل ریسیو نہیں کرتے تو طرح طرح کے اوہام میرا سینہ چیرتے ہیں۔ کتنے لوگ لقمۂ اجل ہوگئے ہیں۔ مجھے تو اس فکر میں نیند نہیں آتی کہ میرا بیٹا خود ان بدروحوں سے مقابلہ کررہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ میرے بیٹے......"

ساحل نے ماں کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ "آپ کو تو فخر ہونا چاہیے کہ آپ کا بیٹا لوگوں کی حفاظت کررہا ہے۔ یہ شیطانی مخلوقات کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہوں، قرآن پاک اور نماز پڑھنے والے مومن یا مومنہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ آپ آیتیں پڑھ کر مجھ پر پھونک دیا کریں اور اپنے بیٹے کو اللہ کے سپرد کرکے مطمئن ہوجایا کریں۔ یہ بدروحیں آپ کے بیٹے کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔"

ردا کھانا لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ "ماں! بھائی ٹھیک کہہ رہا ہے آپ خدا پر بھروسا رکھیں اور دُعا کریں کہ خدا کوئی ایسا راستہ دکھائے کہ ہم سب کو ان شیطانی ہمزاد سے نجات مل جائے۔"

ردا نے کھانا ساحل کے سامنے رکھا اور راحت کے پاس بیٹھ گئی۔ "آپ کی دُعا اس وقت ساحل کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔"

راحت نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "ماں ہوں نا اس لیے پریشان ہوجاتی ہوں۔ نہ جانے کیسی آزمائشیں آگئی ہیں ہم سب کے لیے۔" یہ کہہ کر راحت وہاں سے اُٹھ گئی۔

ساحل اور ردا اسی موضوع پر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ردا سے باتیں کرکے ساحل کے دل کا بوجھ کچھ کم ہوا۔

اکتوبر کا مہینہ تھا...... موسم خوشگوار تھا...... نہ ہی سردی

تھی اور نہ ہی گرمی...... خصوصاً راتیں ٹھنڈی تھیں۔ رات کے دس بج رہے تھے، راحت اور ردا اندر کمرے میں اپنے اپنے بستر میں گھسی ہوئی تھیں۔

ساحل اپنے کمرے میں لیٹا گہری سوچ میں گم تھا۔ نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ عجیب سی بے چینی تھی جو ذہن کو الجھائے جارہی تھی۔ اسے گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ وہ کمرے سے نکل کر صحن میں آگیا۔ اسے باہر کھلی ہوا میں قدرے سکون محسوس ہوا۔ اس نے صحن میں چارپائی بچھائی اور اندر سے تکیہ بھی لے آیا۔

سرہانہ چارپائی پہ رکھ کر وہ چت لیٹ گیا۔ آسمان پر ستارے کسی سیاہ چادر پر چمکتے نگینوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی بے خواب آنکھوں میں وشاء کا خوبصورت چہرہ جھلملانے لگا۔ اس کی خوبصورت مسکراہٹ کے خیال نے ساحل کے لبوں پہ بھی مسکراہٹ بکھیر دی۔ ایک خوبصورت سے خیال نے ساحل کے دل کی دھڑکنوں میں ہلچل سی مچادی۔

جب وشاء ان کے گھر آئی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں اسے علم ہوا کہ مجھے گاجر کا حلوہ بہت پسند ہے اس نے ضد کی کہ ردا اسے گاجر کا حلوہ بنانا سکھائے۔

ردا نے مجھ سے حلوے کا سامان منگوایا۔ میں سامان لے تو آیا مگر من ہی من میں ہنس رہا تھا کہ جس لڑکی نے کبھی چولہا نہیں جلایا، وہ حلوہ کیسے بنائے گی۔ امی نے گاجریں کش کر دیں...... ردا اور وشاء کچن میں چلی گئیں حلوہ بنانے کے لیے۔

ردا نے کڑاہی چولہے پر رکھی اور اس میں گھی ڈال دیا، گھی کڑکڑانے کے بعد اس میں کش کی ہوئی گاجریں ڈال دیں اور وشاء کو چمچ دے کر چولہے کے پاس کھڑا کر دیا۔ میں بھی ان دونوں کی کارستانیاں دیکھنے کے لیے کچن میں ہی آگیا۔ ''میں نے سوچا کہ میں بھی حلوہ بنانا سیکھ لوں۔''

میں نے وشاء کے قریب کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا، جو حلوہ میں چمچ بھی بین کی طرح چلارہی تھی، ردا کسی کام سے باہر چلی گئی تھی۔ میری ہنسی چھوٹ گئی۔

''یہ تم حلوہ بنارہی ہو یا کڑاہی میں نقش ونگار بنارہی ہو۔''

وشاء نروس ہو کے چمچ ٹھیک طرح سے چلانے لگی تو اس کا ہاتھ کڑاہی سے لگ گیا۔ وشاء چیخ کر پیچھے ہٹی تو مجھ سے جا لگی۔ میں نے چولہا بند کیا اور جلدی سے ٹیوب لے آیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور زخم پہ ٹیوب لگانے لگا، میں اس سے تلخ روئی سے بولنے لگا۔ ''کیا ضرورت تھی چولہے کا کام کرنے کی، جبکہ تم نے گھر میں کبھی یہ کام نہیں کیے۔''

وشاء کی آنکھوں میں آنسو تھے، معمولی زخم سے بھی وہ چھوٹی سی بچی کی طرح رونے لگی تھی۔ میں اس کی ڈریسنگ کررہا تھا اور وہ بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر اس طرح مسکرانے لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ ایسا زخم تو بار بار لگے۔ ڈریسنگ پوری ہوئی تو وہ تیز تیز قدموں سے وہاں سے چلی گئی۔ راحت کی آواز سے ساحل اپنے خیال سے چونک گیا۔

''ساحل بیٹا! باہر کیا کررہے ہو اندر آجاؤ۔'' ساحل نے اونچی آواز سے کہا۔ ''تھوڑی دیر بعد آجاؤں گا اندر گھٹن ہو رہی تھی باہر کافی سکون ہے۔''

''تھوڑی دیر بعد آجانا......'' راحت نے کہا۔ ساحل نے پھر سے ستاروں پر نظر ٹکادی۔ اس کی آنکھوں میں دلکش رنگ سے چمکائے، اس نے ستاروں سے نظر ہٹائی تو ایک خوبصورت تتلی اس کے قریب قریب اڑ رہی تھی۔

تتلی کے دیدہ زیب رنگوں پر تو نظریں جمانے کو دل چاہ رہا تھا مگر من میں خوف کی ایک ٹیس بھی اٹھ رہی تھی...... دھڑکنیں کسی انجانے سے خوف کا احساس دلا رہی تھیں۔ وہ تتلی اڑتے اڑتے انار کے درخت پر بیٹھ گئی۔ ساحل کچھ دیر خاموشی سے تتلی کی طرف دیکھتا رہا پھر اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

''ہر تتلی وشاء تو نہیں ہوسکتی۔''

''میں وشاء ہی ہوں۔'' ساحل کو اپنے عقب سے آواز آئی۔ وہ خوف کے جھٹکے سے پیچھے پلٹا مگر جونہی اس نے وشاء کو دیکھا اس کا خوف ہوا ہو گیا۔

وشاء انار کے درخت کی شاخ کو تھامے اس کے قریب کھڑی تھی۔ جو خیال ساحل دیکھ رہا تھا وشاء جیسے اس خیال سے نکل کر باہر آگئی تھی کیونکہ اس نے وہی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پہ وہی معصومیت آنکھوں میں وہی وفا کی چمک تھی۔ وہ دھیرے سے بولی۔

''پہلے تو میرے معمولی سے زخم سے تڑپ اٹھتے تھے

اور اب مجھے اس طرح میرے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ تم ہی تو میرے پُرسان حال تھے مگر تم نے ایک بار بھی نہ پوچھا کہ میں کس اذیت سے گزر رہی ہوں۔''

اس کے لہجے میں عجیب سی مقناطیسیت تھی۔ ساحل اس کی طرف کھنچتا ہوا اس کے قریب چلا گیا۔ ساحل نے اس کی بھیگی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ''تم اذیت کی بات کر رہی ہو، تم تو خوبصورت بلا ہو جو لوگوں کو اپنے رنگوں میں محو کر کے انہیں سرخ خون میں نہلا دیتی ہو۔''

وشاء نے ایک ساعت میں ہی ساحل کے شانے پر سر رکھ دیا۔ ''تمہارے پاس اس وقت وہی وشاء ہے۔ جو تمہیں اپنی جان سے زیادہ پیار کرتی تھی۔ بڑی مشکل سے اپنے ہمزاد سے کچھ دیر کے لیے یہ روپ چرایا ہے۔ صرف ایک سوال پوچھنے کے لیے۔''

ساحل جذبات سے سلگتی کسی موم کی طرح پگھلنے لگا۔ اس نے وشاء کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے خود سے پیچھے کیا۔ وشاء کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے ساحل نے خود کو اور وشاء کو اسی مقام پر محسوس کیا جب ان دونوں کے دل ایک ہی جذبے کے لیے دھڑکتے تھے۔

ساحل نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''کیسا سوال؟''

''تم نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کیوں کیا تھا۔ کیا کمی تھی میرے اندر..... کیا تم میری وفا کی حدت سے واقف نہیں تھے؟''

ساحل نے وشاء کے آنسو پونچھے۔ ''اگر تم وہی وشاء بن کر مجھ سے یہ سوال کر رہی ہو تو میں بھی وہی ساحل ہوں۔ کمی تم میں نہیں تھی مجھ میں تھی، میں تمہیں تمہارے ملازموں کے کوارٹرز جیسی جگہ پر نہیں رکھ سکتا تھا..... معاشی طور پر اس قدر بدحال تھا کہ وہ آسائشیں تمہیں نہیں دے سکتا تھا جس کی تم عادی تھیں۔

ایسی محبت کیا جو اپنے محبوب کو مشکل میں ڈال دے۔ تم تو سردی کی وہ دھوپ تھی جو جس کے آنگن میں بھی اُترتی ہر طرف تسکین بھر دیتی۔ غریب تو اپنے جذبات امیروں سے چھپا چھپا کے رکھتا ہے تا کہ کوئی اس کی ہنسی نہ اُڑا دے۔''

وشاء نے ساحل کا ہاتھ تھام لیا۔ ''آؤ میرے ساتھ میں جس دنیا میں رہتی ہوں وہاں رشتے دولت کی ڈور سے نہیں بندھتے۔ وہاں احساسات کے رنگ ہیں، وفاؤں کی خوشبو ہے۔ اُدھر کی فضا محبت کے گیتوں سے مہکتی ہے۔ ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔''

اندر راحت کو اچانک خیال آیا کہ اس نے مولوی صاحب سے ساحل کے لیے تعویذ بنوایا تھا۔ وہ تعویذ اسے ساحل کو پہنا دینا چاہیے۔ وہ اپنے بستر سے اُٹھی، اس نے الماری سے تعویذ نکالا اور باہر صحن میں آ گئی۔

ساحل جیسے اس ساحرہ کی باتوں کے طلسم میں گم تھا۔ راحت نے دیکھا کہ ساحل انار کے درخت کے قریب کھڑا ہے، وہ تعویذ لے کر اس کی طرف بڑھی۔ وشاء، ساحل کے اور قریب ہو گئی۔ اس نے اپنا چہرہ ساحل کی گردن کے قریب کیا تو اس کی نظر راحت کے ہاتھ میں تھامے ہوئے تعویذ پر پڑی وہ ایک ساعت میں ہی وہاں سے غائب ہو گئی۔

''ساحل.....'' راحت نے اسے پکارا مگر وہ جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔

راحت اس کے قریب آئی اور اس کے گلے میں تعویذ پہنا دیا۔ ساحل نے جھرجھری سی لی اور گھبراہٹ سے انار کے درخت کے آس پاس دیکھنے لگا۔ ''وشاء! کہاں گئی۔''

راحت نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''کس چڑیل کا نام لے رہا ہے۔ چل اندر چل.....''

اس نے ساحل کا ہاتھ پکڑا اور تیز تیز قدم چلتی ہوئی اسے اندر لے گئی اور آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم کرنے لگی۔

اگلے روز دس بجے ظفر نے اپنے سارے دوستوں کو اپنے گھر بلایا۔ ساحل کے نہ پہنچنے پر اسے تشویش ہوئی۔ اس نے ساحل کے گھر فون کیا۔ ''ہیلو.....'' راحت نے فون سنا۔

''میں ظفر بول رہا ہوں۔ ساحل کو میں نے اپنے گھر بلایا تھا، کہاں ہے وہ۔''

بھائی کی آواز سن کر راحت رونے لگی۔ ''کیا بات ہے خیریت ہے.....؟''

''ساحل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' راحت نے گلوگیر لہجے میں جواب دیا۔

"میں ایک گھنٹے کے بعد چکر لگاؤں گا۔" یہ کہہ کر ظفر نے فون بند کردیا۔

مہمانوں سے فارغ ہونے کے بعد ظفر، ساحل کے گھر گیا، ردا کالج گئی ہوئی تھی۔ ظفر، ساحل کے پلنگ کے قریب بیٹھا۔ "یہ کیا بھئی ہمارا سولجر بیمار ہوگیا ہے۔"

ساحل مسکراتا ہوا پلنگ سے پشت لگا کے بیٹھ گیا۔

"میں بیمار نہیں ہوں۔ بس معمولی سی کمزوری محسوس ہورہی ہے اور سر میں درد ہے امی خوامخواہ پریشان ہورہی ہیں۔"

"کہاں ہے راحت؟" ظفر نے پوچھا۔

"امی کچن میں ہیں۔" ساحل نے بتایا۔

ظفر وہاں سے اُٹھ کر کچن میں چلا گیا۔

راحت اس کے لیے چائے بنارہی تھی۔ "تم کن تکلفات میں پڑگئی ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے چائے پی تھی۔ اور تم رو کیوں رہی تھی، ساحل تو ماشاءاللہ ٹھیک ہے۔ معمولی سی کمزوری ہے۔ یخنی وغیرہ دو ٹھیک ہوجائے گا۔" ظفر نے کہا۔

راحت کی آنکھیں ابھی بھی اشکبار تھیں، اس نے ظفر کی طرف دیکھا۔ "ظفر بھائی! میں کسی اور وجہ سے پریشان ہوں۔"

"کس وجہ سے۔" ظفر نے پوچھا۔

راحت نے پیالیوں میں چائے ڈالی اور ہاتھ میں ٹرے اُٹھائے کہنے لگی۔ "آیئے ساحل کے پاس بیٹھتے ہیں وہ آپ کو خود بتائے گا کہ رات کو اس نے کسے دیکھا ہے۔"

راحت چائے لے کر ساحل کے پاس آگئی۔ اس نے چھوٹے سے میز پر چائے رکھی۔ ظفر بھی ادھر ہی بیٹھ گیا۔

ساحل بے حد اُلجھا ہوا اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ ظفر نے اس کے چہرے پر گہری نظر ڈالی۔ "کوئی پریشانی ہے؟"

ساحل جیسے پہلے سے ہی بیتاب تھا وہ بلاتامل بولا۔

"انکل رات میں نے وشاء کو دیکھا۔"

"خواب میں؟" ظفر نے پوچھا۔

"نہیں انکل میں نے اسے پورے ہوش وحواس میں دیکھا ہے، وہ انار کے درخت کے قریب کھڑی تھی رات کے گیارہ بج رہے تھے میں صحن میں تنہا تھا۔"

ساحل کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اس نے آگے بڑھ کر ظفر کے ہاتھ تھام لیے۔

"انکل وہ وہی وشاء تھی حساس اور جذبات سے بھرپور......"

ظفر نے ساحل سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔ "تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ دل میں احساسات رکھنے والی وشاء مر چکی ہے جسے تم نے دیکھا ہے وہ اس کا شیطانی ہمزاد ہے۔"

ساحل ایک بار پھر جذبات کی رو میں بہنے لگا۔ "انکل میرا یقین کریں وہ رورہی تھی وہ کہہ رہی تھی کہ اس کا یہ روپ شیطانی ہمزاد میں کہیں گم ہوگیا ہے وہ بمشکل اس روپ میں مجھ سے ملنے آئی تھی۔"

ظفر نے ساحل کے شانوں پر ہاتھ رکھے اور اسے سمجھانے لگا۔ "دیکھو بیٹا! میں نے تسلیم کرلیا ہے کہ میری وشاء مرچکی ہے۔ جسے تم نے دیکھا ہے وہ ایک خوبصورت بلا ہے جو کتنے ہی لوگوں کو اپنا شکار بنا چکی ہے۔ وہ تمہیں دھوکہ دے رہی ہے، ہمزاد یا تو اچھا ہوتا ہے یا بُرا دونوں خصوصیات ایک ہمزاد میں نہیں ہوتیں۔ کالے علم کرنے والے عامل کسی مرے ہوئے انسان کے اسی شیطانی ہمزاد کو قابو کرتے ہیں جو زندگی میں اسے بُرے کاموں کے لیے اُکساتا ہے۔ عامل اس شیطانی ہمزاد کو سفلی کاموں کے لیے استعمال کرتے ہیں، تم نے آئندہ یہ غلطی نہیں کرنی اگر تمہیں وشاء نظر آئے تو سورۃ الناس پڑھنا شروع کردینا اور اس کے قریب مت جانا۔"

ساحل پر جیسے ظفر کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہورہا تھا وہ ابھی تک اپنی ہی بات پر قائم تھا، اس کی سوچیں وشاء کے خیال میں ہی غرق تھیں۔ "میں نے وشاء کے بھیانک روپ دیکھے ہیں مگر اس بار جس طرح میں نے اس کو دیکھا ہے، وہ دھوکہ نہیں ہے۔ وہ واقعی اذیت میں ہے۔"

ظفر غصے سے کھڑا ہوگیا۔ "اذیت میں وہ نہیں ہے، وہ دوسروں کو اذیتیں دے رہی ہے، اپنی سوچ تبدیل کرو ورنہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی موت کی طرف دھکیل دو گے۔"

راحت، ظفر کو باہر تک چھوڑنے گئی۔ "دیکھا ہے بھائی آپ نے ساحل کی انہی باتوں کی وجہ سے میں پریشان تھی۔"

ظفر نے راحت کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”ابھی تازہ بات ہے ٹھیک ہو جائے گا۔ کوشش کرنا کہ وہ اکیلا نہ رہے۔ قرآنی آیات پڑھ کر پانی دم کر کے اسے پلایا کرو اس ناگہانی آفت سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہمارے پاس بس یہی راستہ ہے۔ تم دُعا کرنا کہ لوگوں کو ہم ان بدروحوں سے بچانے میں کامیاب ہو جائیں۔ ہم سب نے تو سروں پر کفن باندھ لیے ہیں۔ ہم میں سے کون کب لقمہ اجل ہو جائے کوئی نہیں جانتا۔“

راحت نے بھائی کا ہاتھ تھام لیا۔ ”ایسی باتیں نہ کریں، جب اس کے بندوں پر ایسی مصیبت آجائے جس سے مقابلے کی سکت نہ رہے تو وہ کسی نہ کسی کو مسیحا بنا کے بھیجتا ہے آپ ایک کام کریں۔“

”کیا؟“ ظفر نے پوچھا۔

”میڈیا میں اس خبر نے سنسنی پھیلادی ہے نمائش میں ہونے والے قتل کسی انسان نے نہیں بلکہ ہمزاد نے کیے ہیں۔ آپ اس بات سے نہ ڈریں کہ میڈیا والے آپ لوگوں کو پریشان کریں گے، آپ اور عمارہ ایک پریس کانفرنس کریں آپ سارا مسئلہ لوگوں کے سامنے بیان کریں اور مدد مانگیں کہ کوئی ایسا عامل یا کوئی بھی شخص جو اس معاملے میں ان کی مدد کر سکتا ہے۔ آپ لوگوں سے رابطہ کرے۔“

ظفر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں...... یہ مشورہ مجھے توقیر نے بھی دیا ہے۔ میں نے یہ سوچ کر اس بات پر دھیان نہیں دیا کہ میڈیا والے ہمیں ہمارا کام نہیں کرنے دیں گے مگر صورت حال اس قدر گمبھیر ہے کہ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے اور ہمارے پاس سوائے ارادے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے سوچ رہا ہوں کہ پریس کانفرنس کر لینی چاہیے۔ شاید کوئی راستہ نکل آئے۔“

”آپ بس دیر نہ لگائیں، خدا کرم کرے گا۔ اب معاملہ آپ لوگوں کے بس کا نہیں رہا اور عمارہ تو خود اس فیلڈ میں نئی ہے۔ اس کا تجربہ محدود ہے۔“ راحت نے ظفر کو ایک بار پھر سمجھایا۔

”ٹھیک ہے میں توقیر اور زبیر سے بات کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر ظفر وہاں سے چلا گیا۔

ساحل کو کوئی بیماری نہیں تھی مگر ایسی نقاہت تھی کہ اس کے اعصاب شل ہو گئے تھے، وہ چار روز تک ایسی ہی کیفیت میں رہا۔ پانچویں روز وہ خود کو کافی بہتر محسوس کرنے لگا۔

میجر اسامہ اپنے کلب میں لڑکوں کو مارشل آرٹ کی ٹریننگ دے رہا تھا، صبح کے دس بج رہے تھے اس نے لڑکوں کو دو گروپز میں تقسیم کر دیا تھا۔ دونوں گروپز ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے تھے۔ ایک طرف سے ایک لڑکا آگے بڑھتا تو اس سے مقابلے کے لیے مخالف گروپ سے دوسرا لڑکا میدان میں آتا پھر ان کے درمیان کراٹے کا چھوٹا سا مقابلہ ہونے لگتا۔

میجر اسامہ ان کے قریب کھڑا انہیں مختلف داؤ پیچ یاد کرا رہا تھا۔ دو لڑکے کراٹے کے خاص سفید لباس میں نجانے خاص انداز میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ لڑکوں نے اپنے پیروں کو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر کرتے ہوئے اپنی ٹانگوں کو پھیلا لیا۔ انہوں نے بازوؤں کا کراس بناتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو سیدھا کرتے ہوئے انگوٹھے سمیت آپس میں جوڑ لیا، اور پھر Cat سٹائل میں اُچھلتے ہوئے ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ چھوٹے سے مقابلے کے بعد انہوں نے سیدھا کھڑا ہو کے سروں کو جھکا کے ایک دوسرے کو دوستی کا پیغام دیا۔

اسامہ نے ایسے ہی چھوٹے چھوٹے تین مقابلے اور کرائے پھر اس نے انہیں بریک دے دی۔ وہ کرسی پر بیٹھ کے اپنا پسینہ پونچھنے لگا۔ دو لڑکے کولڈ ڈرنک لے کر اس کی طرف بڑھے۔ ان کے پاس پیپسی کے تین ٹن پیک تھے۔ ایک انہوں نے اسامہ کو دیا اور سامنے پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”سر! آپ نے دس سال آرمی میں گزارے ہیں ہمیں کوئی دلچسپ واقعہ سنائیں۔“

اسامہ نے اپنا کٹے ہوئے ہاتھ والا بازو ان لڑکوں کے سامنے کیا۔ ”اس واقعے کے بعد مجھے آرمڈ فورس کے کسی واقعے میں دلچسپی نہیں رہی۔ دس سال سر پر کفن باندھ کر اس ملک کی خدمت کی مگر جنوبی وزیرستان میں دہشت گردوں سے مقابلے کے دوران ہاتھ پر گولی لگی۔ فوج سے انعام یہ ملا کہ کسی زخمی گھوڑے کی طرح فوج سے علیحدہ کر دیا۔“

لڑکے نے سر جھکاتے ہوئے معذرت کی۔ ”سوری

سر! ہم آپ کو ہرٹ کرنا نہیں چاہتے تھے...... آرمی والوں سے آپ کا دل ٹوٹا مگر لوگوں کی خدمت کا جذبہ تو اب بھی آپ کے اندر موجود ہوگا۔‘‘

اسامہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ’’اسی بات کا تو افسوس ہے کہ میری طاقت میں اور تجربے میں کوئی کمی نہیں مگر میں لوگوں کے اس طرح کام نہیں آسکتا جس طرح پہلے فوج میں رہ کر ان کا تحفظ کرتا تھا۔‘‘

دوسرے لڑکے نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ’’سر اس کلب کے ذریعے بھی آپ اپنا فن دوسروں کو دے کر لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں۔‘‘

ایک لڑکے نے ریموٹ سے دیوار پر لگا Led TV آن کر دیا۔ نیوز چینل چل رہا تھا ایک سنسنی خیز خبر نے ان سب کو اپنی طرف متوجہ کر دیا۔ نیوز کاسٹر ہاتھ میں مائیک لیے رومان ہوٹل کے باہر اپنی باتوں سے لوگوں کو چونکا رہی تھی۔

’’آرٹ کی نمائش میں ہونے والے پچاس لوگوں کے قتل کی تحقیقات کے لیے بہت سی ٹیمیں کام کر رہی ہیں۔ پولیس، سی بی آئی، رینجرز سب اس Crimnel کو ڈھونڈ رہے ہیں جس نے معصوم لوگوں کی جانیں لیں۔ ہمارے چینل پر ایک خبر نے لوگوں کی نیندیں اڑا دیں۔ سائیکا ٹرسٹ اور exorcist ڈاکٹر عمارہ کا کہنا ہے کہ ان سب اموات کے پیچھے کسی انسان کا ہاتھ ہے مگر لوگوں کی جانیں لینے والا کوئی انسان نہیں بلکہ ایک ہمزاد ہے۔ ڈاکٹر عمارہ اور مسز ظفر نے ایک پریس کانفرنس کی ہے دیکھتے ہیں کہ وہ ہم سب سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔‘‘ اسامہ سمیت سب کی کولڈ ڈرنکس ان کے ہاتھوں میں ہی رہ گئیں۔

عمارہ سامنے آئی۔ ظفر اور وہ اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ عمارہ نے اپنی بات شروع کی۔ ’’ہمارا مقصد لوگوں میں خوف و ہراس پھیلانا نہیں بلکہ ہم تو اس شیطان کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں جو معصوم لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا ہے۔ ہم پولیس کی بات کو رد نہیں کر رہے۔ انہیں جس پر شک ہے وہ اپنے طور پر تحقیقات کریں مگر جو کچھ ہم جانتے ہیں ہم اس کے مطابق اس قاتل کو ڈھونڈیں گے۔ میرے پاس ٹھوس ثبوت ہیں جس کے مطابق نمائش میں لوگوں کا قتل جنہوں نے کیا ہے وہ تین ہمزاد ہیں۔

ہمزاد انسان کا ہی ایک روپ ہے۔ جو مرنے کے بعد انسان کے مُردہ جسم سے الگ ہو جاتا ہے وہ ایک انسان کا ہی روپ ہے تو ہم کیوں اس کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔ ہمیں ان شیطانوں سے مقابلہ کرنا ہے...... ہمیں آپ لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی ہماری مدد کرنا چاہتا ہے تو آگے بڑھے اور اس جنگ میں ہمارا ساتھ دے۔‘‘

سکرین پر عمارہ کا موبائل نمبر اور گھر کا ایڈریس لکھا تھا۔

اسامہ نے اپنے موبائل پر وہ سب نوٹ کر لیا۔ اس خبر کے بعد مختلف لوگوں کے Coments آنے لگے۔ کسی نے عمارہ کی بات کا مذاق اڑایا اور کسی نے عمارہ کی باتوں کو سچ مانتے ہوئے اسے گہرائی سے لیا۔ اسامہ نے ٹی وی بند کر دیا اور گہری سوچ میں پڑ گیا۔

اس کی ٹیم کے کئی لڑکے عمارہ کی باتوں پر ہنس رہے تھے اور کئی خاموش بیٹھے اس کی باتوں کے متعلق سوچ رہے تھے۔ اسامہ واش روم گیا۔ اس نے سنک کا نل کھولا اور منہ دھونے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ہی منہ دھویا اور اپنی آنکھوں میں چھینٹے مارنے لگا۔ اس نے تولیہ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہاں تولیہ نہیں تھا۔ اس نے دوسرے اسٹینڈ سے تولیہ اٹھایا اور آئینے میں دیکھتے ہوئے چہرہ خشک کرنے لگا۔ اسے نل میں سے پانی گرنے کی آواز آئی۔ اس نے چونکتے ہوئے نل کی طرف دیکھا کیونکہ اس نے اچھی طرح سے نل بند کر دیا تھا۔ نل پوری طرح کھلا ہوا تھا اور اس سے کافی پانی نکل رہا تھا۔

اسامہ سینک کی طرف بڑھا اور دوبارہ نل بند کرنے لگا مگر اس کا وال اس قدر سخت تھا کہ اپنی جگہ سے ہل نہیں رہا تھا۔ سینک کے سوراخ میں ربڑ نہیں لگا تھا اس کے باوجود سینک میں پانی جمع ہو رہا تھا، پانی پائپ کی طرف نہیں جا رہا تھا۔

’’یہ کیا گڑبڑ ہو گئی ہے۔‘‘ اسامہ سینک کی جالی چیک کرنے لگا۔ کہ اچانک سے واش روم کا دروازہ خود بخود بند ہو گیا اور چٹخنی بھی لگ گئی۔ اسامہ کو خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

’’کون ہے......‘‘

سینک اوپر تک پانی سے بھر گیا اور پانی اچھل اچھل

کر باہر گرنے لگا۔ وہ ایک بار پھر سینک کا سوراخ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک زلزلے کی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ باتھ روم کے دروازے اور کھڑکیاں ہلنے لگیں۔ باتھ روم کی کھڑکی جو باہر کی طرف کھلتی تھی چٹاخ سے کھل گئی۔

اسامہ کو محسوس ہوا جیسے آئینے میں کسی کا عکس ہے۔ اس نے سر اوپر کرتے ہوئے آئینے کی طرف دیکھا تو پلک جھپکتے ہی وہ عکس غائب ہوگیا اور روشنی کی ایک تیز شعاع باہر سے کھڑکی کی جالی کو چیرتی ہوئی آئینے کی طرف بڑھی اور اس سے منعکس ہوکر اسامہ کی بائیں آنکھ میں داخل ہوگئی۔

اسامہ جیسے پتھر کا ہو گیا۔ قدموں کو تھوڑا تھوڑا موڑتے ہوئے اس نے کھڑکی کی طرف منہ کرلیا کھڑکی کے ساتھ دیوار پر کوئی سایہ تھا جو اس کا نہیں تھا کیونکہ سائے کے دونوں ہاتھ تھے۔ وہ سایہ دھیرے دھیرے اسامہ کی طرف بڑھتا گیا اور پھر اس کے جسم میں داخل ہوگیا۔ جس کے ساتھ ہی اسامہ بیہوش ہوگیا۔

دروازے کی چٹخنی خود بخود کھل گئی۔ کافی دیر اسامہ کے باہر نہ آنے پر شاگردوں کو تشویش ہوئی۔ ایک لڑکا باتھ کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو دروازہ کھل گیا۔ سامنے میجر اسامہ بیہوش پڑا تھا۔ لڑکے نے آگے بڑھ کر چیک کیا پھر اس نے دوسرے لڑکوں کو بلایا۔ تین لڑکوں نے مل کر اسامہ کو اُٹھایا، وہ اسے اندر ہال میں لے گئے۔ انہوں نے اسے صوفے پر لٹایا۔ ایک لڑکا جلدی سے میڈیکل بکس لے آیا، انہوں نے اسے معمولی سی ٹریٹمنٹ دی، جس سے اسے ہوش آگیا۔

اس نے کانپتے ہونٹوں سے چاروں اور دیکھا جیسے تھوڑی دیر کے لیے اس کا ذہن سو گیا ہو، کچھ دیر بعد اس کی آنکھوں میں شناسائی سی جھانکنے لگی۔ ”مجھے کیا ہوا تھا؟“ اسامہ نے لڑکوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”سر آپ بیہوش پڑے تھے۔ شکر ہے خدا کا کہ آپ کو ہوش آگیا ہے۔ اوپر جاکے آپ آرام کریں۔ ہم سب خود ہی پریکٹس کرلیں گے۔“ ایک لڑکے نے کہا۔

اسامہ اُٹھنے لگا تو اسے خاصی نڈھالگی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک لڑکا آگے بڑھا۔ ”سر میں آپ کو اوپر تک چھوڑ آتا ہوں۔“

لڑکا اسامہ کو سہارا دیتا ہوا بالائی منزل تک چھوڑ آیا۔

سارے شاگرد دوبارہ اپنی پریکٹس میں مشغول ہو گئے۔ اسامہ اپنے بستر پر لیٹ کر سوچتا رہا کہ واش روم میں کیا تھا، وہ کون سی پُراسرار طاقت تھی۔ جس نے اس کے فولاد جیسے وجود کو ایک ہی جھٹکے میں نڈھال کردیا۔ ایسے ہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ اس وقت جاگا جب ایک لڑکے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”سر......“

اسامہ نے آنکھیں کھولیں۔ ”سر ہم سب جارہے ہیں۔ ہماری پریکٹس مکمل ہوگئی ہے۔“ لڑکے نے بتایا۔

”ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ۔“ اسامہ نے کہا۔

لڑکے کے جانے کے بعد اسامہ اپنے بستر سے اُٹھا اب وہ خود کو تندرست وتوانا محسوس کررہا تھا۔ وہ کھڑکی کی طرف بڑھا، اس نے پردے پیچھے کیے۔ شہر کا خوبصورت نظارہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کا ذہن ایک بار پھر اس خبر کی طرف چلا گیا، اس بار اسے یہ خبر پہلی کی طرح نہیں لگ رہی تھی بلکہ اس کا ذہن اسے بار بار یقین دلا رہا تھا کہ واقعی ہمزاد یہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ اس خبر میں کہیں بھی کوئی جھوٹ نہیں ہے یہ ایک خوفناک حقیقت ہے۔

یہ ایک ناگہانی آفت ہے جو دھیرے دھیرے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ ”میں اتنی دیر تک سوتا رہا۔“

اس نے خود کلامی کی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے فریج سے برگر نکالا اور اسے اوون میں گرم کرلیا۔ اس نے فریج سے کیچپ بھی نکال لیا۔ وہ اپنا یہ مختصر سا لنچ لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

○.....❖.....○

اگلی صبح ہونے سے پہلے جب لوگ فجر کی نماز کی تیاری میں مصروف تھے۔ زرغام اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل میں مصروف تھا۔ وہ دریا کے کنارے ایک نوجوان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ نوجوان کے ہاتھ میں ایک اُلو تھا۔ سورج طلوع نہیں ہوا تھا اس لیے ابھی اندھیرے کا ہی راج تھا۔

لڑکے نے ایک ہاتھ میں ایمرجنسی لائٹ پکڑی ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے یہ اندھیرا چھٹ رہا تھا اور مدھم مدھم سی روشنی ہونے لگی تھی۔ زرغام نے جینز اور شرٹ کے ساتھ لانگ کوٹ پہنا ہوا تھا جبکہ لڑکا قمیص شلوار میں تھا۔

زرغام کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھی جس نے سرخ رنگ کا دلہن کا لباس پہنا ہوا تھا۔ زرغام کے پاس ایک ڈبیہ میں بہت سی سوئیاں تھیں۔ اس نے ڈبیہ کھول کر زمین پر رکھ دی۔ اس نے گڑیا زمین پر لٹائی اور ڈبیہ سے سوئیاں نکالنے لگا۔

اس نے ہنستے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھا۔ ''ایک سوئی دلہن کے دماغ پر اور ایک سوئی دلہن کے دل پر۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک سوئی گڑیا کے سر پر لگائی اور ایک سوئی گڑیا کے سینے پر لگا دی۔ پھر زرغام نے وہ گڑیا ایک طرف رکھ دی اور ایک بڑی سی پلیٹ نکالی ساتھ ہی ایک چھوٹا سا شاپر نکالا۔ شاپر میں آٹا تھا اس نے آٹا پلیٹ میں ڈال دیا۔

نوجوان نے اُلو کو بمشکل قابو کر کے اس کے گلے پر چھری پھیر دی۔ اُلو تڑپنے لگا۔ نوجوان نے سر کٹے تڑپتے اُلو کو خشک آٹے کے اوپر لٹکا دیا۔ اُلو کے پنجے نوجوان کے ہاتھوں میں تھے، وہ اسے آٹے پر دائرے میں گھمانے لگا جس سے اُلو کے جسم سے نکلتا خون آٹے پر دائرے بنانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ نوجوان اپنا ناپاک منتر بھی پڑھتا جا رہا تھا۔

زرغام کا یہ شاگرد اپنا کام بڑی مہارت سے کر رہا تھا۔ ان دونوں کو اپنا یہ کالا جادو طلوع آفتاب سے قبل مکمل کرنا تھا۔ زرغام نے تھوڑا سا پانی ڈال کر اس خون ملے آٹے کو گوندھ دیا۔ پھر اس نے لکڑی کی ایک ٹرے پر اس آٹے کو رکھ کر اس کا ایک پتلا بنا دیا۔ اس نے اس پتلے کے جسم پر بہت سی سوئیاں لگا دیں۔

اس نے دلہن بنی گڑیا اس پتلے کے ساتھ رکھ دی۔ اس نے وہ لکڑی کی ٹرے دریا میں بہا دی اور انتہائی سفاکی سے ہنسنے لگا۔ ''جاؤ دلہن اپنا دولہا ساتھ لے جاؤ۔ اس بار کام اُلٹا ہے۔ دولہا، دلہن کو لے کر نہیں جائے گا بلکہ دلہن دولہے کو لے جائے گی مگر دھیان رہے کہ کچھ دیر بعد یہ کشتی ڈوب جائے گی اور آٹے کا دولہا پانی میں گھل جائے گا۔''

نوجوان کے لبوں پہ بھی شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس نے زرغام کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ''سر! اپنا سامان سمیٹتے ہیں، سورج نکلنے والا ہے۔'' ان دونوں نے اپنا سامان سمیٹا اور وہاں سے نکل گئے۔

○……❖……○

اسامہ حسب معمول صبح کے چھ بجے واک کے لیے گھر سے نکلا۔ گھر کے قریب ہی ایک کھلا میدان تھا۔ واک کے بعد وہ میدان میں ورزش کرنے لگا۔ وہ خود میں غیر معمولی تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ سرچ کیے بغیر کچھ معلومات اس کے ذہن میں خود بخود جمع ہو گئی تھیں۔

اس کا ذہن اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ ان سب حقائق پر یقین کرے۔ ایک رات میں وہ اسامہ، اسامہ نہیں رہا تھا۔ وہ یوگا کے انداز میں ہاتھوں کی اُنگلیوں اور پیروں کے پنجوں پر وزن ڈالتے ہوئے جھکا ہوا تھا۔

اچانک سے اس کا پھولا ہوا سانس بحال ہو گیا، اس کی جسمانی قوت بڑھ گئی۔ آنکھوں کی پتلی کا رنگ سیاہ سے نیلا ہو گیا۔ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کا ذہن اپنے کسی ادھورے کام کی طرف مائل ہو گیا۔ وہ بے چینی سے اپنے ٹراؤزر کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اس کے ہاتھ ایک چیز لگی۔ یہ کپڑے کا پاؤچ تھا اس نے وہ باہر نکالا اسے کھولا تو اس میں نگینوں سے جڑا پنجا گلہ تھا۔ جس میں عقیق، نیلم اور یاقوت کے پتھروں کو باریک باریک زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ زنجیریں ایک طرف ایک انگوٹھی سے منسوب تھی جس میں زرقون لگا تھا اور دوسری طرف وہ ایک کڑے سے جڑی تھیں۔ اسامہ کے لیے وہ نئی چیز تھی مگر اس کے ذہن میں اس چیز کی یادداشت موجود تھی، وہ اسے پہچانتا تھا۔ اس نے وہ پنجا گلا اپنے ہاتھ میں پہن لیا۔

گھر سے نکلتے ہوئے اس کے ٹراؤزر میں کوئی چیز نہیں تھی مگر اس کا وقت لمحہ بہ لمحہ بدل رہا تھا۔ اس نئی تبدیلی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے موجودہ وقت سے بھی نہیں کٹا تھا، مگر کوئی تھا جو اس کے ذہن میں داخل ہو کے اسے نئے راستے پر چلا رہا تھا۔

○……❖……○

ثمارہ اپنے کلینک میں گم صم سی بیٹھی تھی۔ صبح کے نو بج رہے تھے اس لیے وہ ابھی فارغ تھی ابھی اس کے کلینک میں

کوئی مریض نہیں تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ فون کی بیل بجی۔ اس نے فون اُٹھایا تو ظفر لائن پر تھا۔

"کیسی ہو......؟" ظفر نے پوچھا۔

"بس ٹھیک ہوں......" عمارہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

ظفر نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "ہم ابھی تک کچھ بھی نہیں کرسکے۔ ابھی مل کر کچھ کرنے کا وقت ہے اور ساحل......"

"ساحل کو کیا ہوا......؟" عمارہ نے پوچھا۔

"تم تو سائیکاٹرسٹ ہو، تم اس کا علاج کرسکتی ہو......"

"لیکن مسئلہ کیا ہے......؟"

ظفر نے عمارہ کو ساری بات بتائی کہ کس طرح ساحل کو وشاء نظر آئی۔ عمارہ سب سن کر سخت پریشان ہوگئی۔

"یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔ ساحل کو تو سمجھایا جا سکتا ہے مگر وشاء اس کا پیچھا اتنی آسانی سے نہیں چھوڑے گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ساحل کی جان کو خطرہ ہے۔" ظفر بھی پریشان ہوگیا۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"فی الحال تو آپ ساحل کو میرے پاس بھیجیں۔ میں اسے سمجھا دوں پھر دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے۔ مجھے بہت اُمید تھی کہ خیام ہماری مدد کرے گا مگر پچاس لوگوں کی اموات کے بعد مجھے اس سے بھی کوئی اُمید نہیں رہی۔"

ظفر نے عمارہ کی بات کی تردید کی۔ "یہ بہت پیچیدہ اور راز کی باتیں ہیں، ہم نہیں جان سکتے ہیں کہ خیام نے ایسا کیوں کیا، تم اس سے روحانی عمل کے ذریعے سے بات کرو۔"

"اس نے مجھے منع کیا تھا کہ اسے عمل سے بلانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اس نے کہا تھا کہ جب ہمیں اس کی مدد کی ضرورت ہوگی تو وہ آجائے گا۔" عمارہ نے بتایا۔

ظفر نے اسے تسلی دی۔ "خدا پر بھروسا رکھو وہ ضرور کسی نہ کسی کو مسیحا بنا کے بھیجے گا، ہم نے جو میڈیا کے ذریعے مدد کی اپیل کی ہے اس سے ہمیں فائدہ ضرور ہوگا۔ ہم خیام کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے کیونکہ وہ کوئی انسان نہیں ہمزاد ہے۔ ہماری سوچ اور ہمارا علم محدود ہے۔"

عمارہ نے لمبا سانس کھینچا۔ "شاید میں زیادہ جذباتی ہو رہی ہوں، بہرحال ساحل والا مسئلہ تو پریشان کن ہے۔ آپ جتنی جلدی ہوسکے ساحل کو میرے پاس بھیجیں۔"

"ٹھیک ہے میں آج ہی ساحل سے بات کرتا ہوں۔" ظفر نے فون بند کردیا۔

ساحل اپنے کپڑے استری کر رہا تھا، ردا کالج جا چکی تھی۔ راحت ساحل کے پاس آئی۔ "چھوڑو! میں استری کرتی ہوں۔" ساحل نے بہت پیار سے ماں کا ہاتھ پیچھے کیا۔ "میری پیاری امی جان میں کرلوں گا۔ آپ میری جرابیں اور بوٹ نکال دیں۔"

"کہاں جارہے ہو؟" راحت نے پوچھا۔

"ایک جاب کے لیے اپلائی کیا ہے، اُسی کے انٹرویو کے لیے جارہا ہوں۔"

"اور تمہاری CSS کی تیاری......؟"

"وہ تیاری بھی ہوتی رہے گی...... میرے لیے چھوٹی سی جاب بہت ضروری ہے۔ جس سے میں گھر کا کچھ خرچہ بھی نکال سکوں اور پڑھائی کے لیے بھی وقت نکال سکوں۔ آپ بے فکر رہیں۔ پہلے جو بھی ہوا اس پر میرا بس نہیں تھا، میں CSS کی تیاری نہیں کرسکا۔ مگر اب میں نے سوچ لیا ہے کہ کسی کے جانے سے زندگی ختم نہیں ہوتی۔ آپ اور ردا بھی میری ذمہ داری ہیں۔ میں پوری محنت سے اب CSS کی تیاری کروں گا۔" ساحل نے استری کی ہوئی پینٹ ہینگر پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

راحت کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے ساحل کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ "خدا تمہیں کامیاب کرے۔" پھر وہ کمرے میں گئی اور وہاں سے تعویذ اُٹھا کے لے آئی۔

اس نے تعویذ ساحل کے گلے میں ڈالا۔ "تم سے میں نے کتنی بار کہا ہے کہ یہ تعویذ گلے میں پہن کے رکھو۔ خدا تمہیں ہر مصیبت سے بچائے گا۔"

ساحل نے مسکراتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا۔ "نہ اتنا ڈرا کریں...... مجھے کچھ نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر ساحل دوبارہ اپنی شرٹ استری کرنے لگا۔

راحت گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ ساحل کپڑے تبدیل کرنے لگا تو اس نے اپنے چہرے کو چھوا۔ "وہ

میں نے تو شیو کی ہی نہیں۔"

اس نے کپڑے استری اسٹینڈ پر رکھے اور واش روم کی طرف بڑھا۔ اسے تعویذ کا خیال آیا واش روم میں جانے سے کہیں تعویذ کی بے ادبی نہ ہو اس خیال سے اس نے تعویذ گلے سے اُتار کر استری اسٹینڈ پر رکھ دیا۔

اس نے شیو کی اور پھر کپڑے تبدیل کر لیے۔ پھر وہ تیزی سے اپنی موٹر بائیک کی طرف بڑھا۔ "امی دروازہ بند کر لیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔"

راحت، بیٹے کی آواز سن کر سارے کام چھوڑ کر باہر آ گئی، ساحل جا چکا تھا۔ "اللہ کے حوالے" یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

تقریباً بیس منٹ کے بعد ساحل مین روڈ پر تھا جہاں خاصی ٹریفک تھی۔ اس کی موٹر بائیک بھی اب آہستہ چل رہی تھی۔ اس نے ہینڈل پر زور سے ہاتھ مارا۔ "کیا مصیبت ہے، سارا وقت تو میرا یہیں لگ جائے گا۔ مجھے ذرا پہلے نکلنا چاہیے تھا۔ کچھ دیر بعد گاڑیوں کی بھیڑ ذرا کم ہوئی تو اس نے اپنی بائیک کی سپیڈ دوبارہ تیز کر دی۔

نہ جانے کہاں سے اچانک سفید چادر اوڑھے ایک لڑکی ہاتھ کو لہراتی ہوئی اس کی بائیک کے آگے آ گئی۔ فاصلہ کم ہونے کی وجہ سے ساحل نے بمشکل بریک لگائی، ممکن تھا کہ بائیک اس لڑکی سے جا ٹکراتی۔ ساحل غصے میں بائیک سے اُترا اور لڑکی پر برس پڑا۔

"اندھی ہو یا مرنے کا شوق ہے۔ جانتی ہو جس طرح میں نے بریک لگائی ہے یا میں مرتا یا تم۔" لڑکی کے ہاتھ میں دوائی کی بوتل تھی اور وہ مسلسل رو رہی تھی۔

اس نے دوا کی بوتل ساحل کو دکھائی اور گلوگیر لہجے میں بولی۔ "میری ماں سخت بیمار ہے اگر میں نے یہ دوا بروقت نہ پہنچائی تو وہ مر جائے گی۔ میں نے کتنے لوگوں کو روکنے کی کوشش کی مگر کوئی نہیں رُکتا۔ دور دور تک کوئی رکشہ بھی نہیں ملا۔"

لڑکی نے روتے روتے ساحل کے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔ "میں آپ کی منت کرتی ہوں، آپ مجھے میرے گھر تک چھوڑ دیں۔"

ساحل نے گھڑی دیکھی۔ "مجھے تو انٹرویو کے لیے جانا ہے، مجھے دیر ہو جائے گی۔"

"آپ کو تو نوکری اور بھی مل جائے گی مگر مجھے میری ماں نہیں ملے گی۔" لڑکی نے پھر منت کی۔

ساحل نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "اچھا..... آ جاؤ بیٹھ جاؤ میرے ساتھ۔"

ساحل نے بائیک سٹارٹ کی تو لڑکی جلدی سے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ ادھر راحت گھر کی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ اس نے استری اسٹینڈ سے کپڑے اُٹھائے تو اس کی نظر تعویذ پر پڑی اس نے تعویذ اُٹھایا۔ "یہ لڑکا بھی میری بات سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ میرے کہنے کے باوجود اس نے تعویذ اُتار دیا۔"

وہ تعویذ اُٹھا کے اندر لے گئی۔ ساحل لڑکی کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہا تھا مگر اس کا ذہن اس نوکری کی طرف ہی تھا۔ "میں اب اس انٹرویو کے لیے نہیں پہنچ سکتا نہ جانے ایسی نوکری دوبارہ ملے گی بھی یا نہیں۔" اس نے بیزاری سے راستے کی طرف دیکھا۔ "اور کتنی دور ہے تمہارا گھر......"

"بس نزدیک ہی ہے..... آپ سیدھا جا کے دائیں طرف مڑ جائیں۔" لڑکی نے انتہائی معصومیت سے کہا۔

ساحل نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ "وہ سڑک تو قبرستان کی طرف جاتی ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟ کیا قبرستان کے پاس لوگ نہیں رہتے۔"

لڑکی نے ساحل کو خاموش کر دیا۔ ساحل سیدھا جا کے دائیں طرف مڑ گیا۔ تھوڑے ہی فاصلے کے بعد سڑک کے ساتھ ساتھ قبرستان کی دیوار شروع ہو گئی۔ لڑکی نے ساحل سے قبرستان کے داخلی دروازے کے قریب بائیک روکنے کے لیے کہا۔ ساحل نے بائیک روک دی۔ لڑکی بائیک سے اتری تو ساحل بھی بائیک سے اُتر گیا۔

"یہ تم قبرستان میں کہاں جا رہی ہو......؟" گندمی رنگت والی دبلی پتلی سی وہ لڑکی اٹھارہ یا انیس سال کے لگ بھگ معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی لمبی لمبی غزالی آنکھوں سے ساحل کی طرف دیکھا۔

"اندر تو آؤ میں تمہیں سب سمجھا دوں گی۔"

ساحل کے من میں سوال اُٹھ رہا تھا کہ ماں کی بیماری

کوئے کر اس قدر بے چین اور گھبرائی ہوئی لڑکی میں اچانک تحمل کیسے آگیا۔ اس لڑکی کی بات میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ ساحل اسے منع نہ کرسکا اور اس کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔

وہ دونوں چھوٹے سے تنگ سے راستے پر چل رہے تھے۔ اس راستے کے دونوں طرف قبریں تھیں۔ اکثر قبرستان میں کوئی نہ کوئی شخص دکھائی دیتا ہے مگر اس قبرستان میں مکمل سناٹا تھا۔ دور دور تک سوائے ان دونوں کے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"یہ قبریں جو عبرت کی کہانیاں سناتی ہیں۔ کبھی ڈراتی ہیں، کبھی رُلاتی ہیں۔ انسان کے غم سے نڈھال چُور چُور وجود کو دنیا سے چھپا کے خود میں سمو لیتی ہیں۔" ساحل اپنے دھیان میں بول رہا تھا۔

لڑکی نے پلٹ کر پوچھا۔ "تم بھی ڈرتے ہو ان قبروں سے۔"

"نہیں...... میں نہیں ڈرتا۔"

"اچھا...... آج پتہ چل جائے گا۔" لڑکی نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

لڑکی نے جواب دینے کے بجائے اپنی اُنگلی سے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ سامنے کوٹھڑی دیکھ رہے ہو...... وہی میرا گھر ہے۔"

"تمہارا بھائی یا والد گورکن ہوں گے اس لیے تم لوگ قبرستان میں رہتے ہو...... اور تم تو بہت پریشان اور جلدی میں تھیں، اب کیوں اتنا آہستہ چل رہی ہو، جا کے ماں کو دوا دو۔"

لڑکی چلتے چلتے رُک گئی، اس نے دوا کی بوتل ہوا میں اُچھال دی۔ "دوا کا تو بہانہ تھا...... مجھے تو تم سے کسی کو ملوانا تھا۔"

ساحل گھبرا سا گیا۔ "کیا بکواس کر رہی ہو۔"

"اندر کوٹھڑی میں کوئی تمہارا بے چینی سے انتظار کر رہا ہے۔"

ساحل کو تعویذ کا خیال آیا جو اس کے گلے میں نہیں تھا۔ وہ واپس پلٹنے لگا۔ "مجھے کسی سے نہیں ملنا۔"

اچانک وشاء کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"کہاں جا رہے ہو۔ صرف ایک بار مجھے اپنی جھلک دکھادو۔"

ساحل نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو وہ آواز کوٹھڑی کی طرف سے آرہی تھی۔ وشاء کی آواز نے ساحل کو بے چین کر دیا۔ اس پر عجب سا سحر طاری ہو گیا جس میں اس کے ذہن میں اسی وشاء کا خیال اُبھرنے لگا جو اسے چاہتی تھی۔

اس کے قدم بے خودی میں اس کوٹھڑی کی طرف اُٹھنے لگے۔ جونہی ساحل کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ جیسے اس کی سانسیں تھم گئیں۔ اس پر دل کے احساسات کا فسوں چھا گیا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تکمیل کا روپ لیے اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

وشاء دلہن کے سرخ لباس میں ایک پُرانی سی چارپائی پر اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

"وشاء......" جونہی ساحل کے منہ سے وشاء کا نام نکلا۔ کمرے کا ماحول کسی طلسم سے چند ہی ساعتوں میں بدل گیا۔ مٹی کی کوٹھڑی کسی شاندار کمرے میں تبدیل ہو گئی۔ وشاء دلہن بنی مخملی بستر کے خوبصورت پلنگ پر بیٹھی تھی۔ ساحل نے مبہوت نظروں سے اپنے لباس کی طرف دیکھا، اس کا لباس بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ اس نے براؤن شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنا ہوا تھا اس کے سر پر کلاہ تھا۔ یہ مبہم سی تبدیلی اس کی سماعت میں سرگوشیاں کر رہی تھی کہ آج اس کی اور وشاء کی شادی ہے۔ آج وہ اور وشاء ایک ہونے والے ہیں۔ جس محبوب کا غم اس کے لیے عمر بھر کا روگ بن گیا تھا۔ آج وہ غم اس کی عمر بھر کی خوشی میں بدلنے جا رہا تھا۔

خوشی کے ایک خوبصورت احساس کے ساتھ ساتھ دماغ کی کوئی قوت تھی جو اسے وہاں سے جانے کے لیے کہہ رہی تھی مگر آہستہ آہستہ اس کی سوچیں کسی کی تابع ہوتی جا رہی تھیں۔

وہ دھیرے دھیرے وشاء کی طرف بڑھنے لگا اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہی کم سن لڑکی چادر اوڑھے دروازے پر کھڑی تھی۔

وہ لڑکی ساحل کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی، پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں، ایک ہی پل میں اس کا سادہ سا لباس سبز رنگ کی کُرتی اور لہنگے میں بدل گیا۔ اس کا چہرہ بھی بدل گیا۔ ساحل کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ حوریہ تھی۔

جس کے لبوں پہ شیطانی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

اس بار اس کے ذہن نے اسے پوری طرح جھٹک دیا۔ اسے ہوش آنے لگا کہ وہ یہاں سے نکل جائے، وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا تو وشاء کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''مجھے اس طرح چھوڑ کر جا رہے ہو۔''

ایک بار پھر ساحل اپنے ہوش کھو گیا۔ وہ دوبارہ وشاء کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ وشاء کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ پری جیسی دکھ رہی تھی۔ خوبصورت اور معصوم...... وہ حُسن اس دنیا کا تھا ہی نہیں...... وہ کسی کے خوابوں کی شہزادی تھی یا کسی مصور کا تخیل...... جو بھی تھی وہ ساحل کی تھی۔

اس نے اپنی دہکتی آنکھوں سے ساحل کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''اب یہ وشاء تم سے کبھی دور نہیں جائے گی۔ کچھ دیر کے بعد ہماری شادی ہو جائے گی اور ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔''

ساحل کی نظریں وشاء کے چہرے پہ ٹھہر گئی تھیں، خود پر رشک کرنے کو دل چاہ رہا تھا مگر کوئی شائبہ تھا جو دماغ میں کروٹیں بدل رہا تھا، ایسے سراپا حُسن کا مالک بننے جا رہا تھا مگر خوشی کے اس احساس میں دبی چنگاریوں کو بھی محسوس کر رہا تھا۔ عجیب سا اضطراب تھا۔ وشاء نے آنکھوں ہی آنکھوں میں حوریہ کو کوئی اشارہ کیا حوریہ وہاں سے چلی گئی، کچھ دیر کے بعد وہ کاغذ کی بنی ہوئی پلیٹ میں ایک گہنا لے کر آئی۔

وہ مسکراتی ہوئی ساحل کی طرف بڑھی۔ وہ پلیٹ لے کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ''اپنا ہاتھ اوپر کرو، میں تمہیں یہ گہنا پہنا دوں۔''

وشاء نے شرماتے ہوئے پلکیں جھکا دیں۔ ساحل نے حوریہ سے موتیے کے پھولوں کا گہنا پہن لیا۔ گہنا پہنتے ہی اس کی مدہوشی کو جھنجھوڑتی ہوئی اس کی ذہنی قوتیں سو گئیں۔

اسے وشاء کے علاوہ کچھ یاد نہیں رہا۔ وہ اپنی زندگی کے دوسرے رشتوں سے بے خبر ہو گیا۔

وشاء پلنگ سے نیچے اتری اور اپنے بھاری بھر کم عروسی جوڑے کو سنبھالتی ہوئی ساحل کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ ساحل کی طرف بڑھایا۔ ''آؤ میرے ساتھ میں تمہیں ایک ایسی جگہ دکھاتی ہوں جسے دیکھ کر تم دنگ رہ جاؤ گے۔''

ساحل مسکراتا ہوا وشاء کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ وشاء دروازے کی طرف بڑھی اور وہ دونوں کمرے سے باہر چلے گئے۔ باہر ایک خوبصورت لان تھا بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ باغ تھا جس میں بے شمار پھل دار درخت تھے۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے مالٹوں کے درختوں کے قریب آ گئے۔ وشاء نے ایک لمحے کے لیے بھی ساحل کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ درختوں کے بیچ میں ہی نیچے جانے کا راستہ بنا ہوا تھا وہاں ایک سیڑھی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ وشاء اس سیڑھی کی طرف بڑھی تو ساحل نے تعجب سے پوچھا۔ ''یہ ہم نیچے کہاں جا رہے ہیں......؟''

وشاء نے مسکراتی آنکھوں سے ساحل کی طرف دیکھا۔ ''جو جگہ تمہیں دکھانا چاہتی ہوں، وہ یہیں تو ہے۔''

ساحل بھی وشاء کے ساتھ ساتھ اس زینے سے نیچے اترنے لگا۔ حوریہ بھی ان کے ساتھ ساتھ تھی۔

سیڑھی زیادہ لمبی نہیں تھی وشاء نیچے اتر گئی۔ ساحل آخری زینے تک پہنچا تو کافور کی خوشبو اس کے حلق تک اتر گئی۔ وہ نیچے اترا تو اس کے پیروں تلے کچی زمین تھی۔ ساحل نے چاروں اور نظر دوڑائی۔ تو سنسناہٹ کے جھٹکے سے اس کا پورا وجود کانپ اٹھا۔

جس آسمان کو وہ اوپر دیکھ کر آیا تھا وہی آسمان یہاں بھی دکھائی دے رہا تھا، مگر یہاں رات کا اندھیرا تھا، آسمان میں ستارے ٹمٹمار ہے تھے۔ اس کے دماغ کی رگیں ٹس ٹس کرنے لگیں، ایک سیڑھی اترنے سے وہ کس دنیا میں آ گیا جہاں اس وقت رات ہے۔ دور دور تک سبزے کا نام و نشان نہیں بس ہر طرف مٹی ہی مٹی ہے۔ مٹی کے اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان میں پانی کی ایک جھیل دکھائی دے رہی ہے۔

لفظ بہ مشکل اٹک اٹک کے ساحل کی زبان سے نکلے۔ ''یہ دہشت ناک اور پُراسرار جگہ ہی دکھانا چاہتی تھی...... جہاں پھولوں کی خوشبو کے بجائے کافور کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔''

وشاء تمسخرانہ انداز میں بولی۔ ''پھولوں کی خوشبو تو ایک فریب ہے جذبوں جیسا فریب۔ جس میں مدہوش ہو کے انسان اپنے آپ کو کھو دیتا ہے۔ لمبا سانس کھینچ کر اس کافور کی خوشبو کو خود میں سرایت کر لو۔ یہی اصل حقیقت ہے باقی سب

قریب ہے۔"

"کیا مطلب......؟" ساحل بوکھلا سا گیا

وشاء ہنستے ہوئے ساحل کے قریب آ گئی۔ "تم تو خوفزدہ ہوگئے۔ میں تو تمہیں یہ جھیل دکھانا چاہتی تھی۔ آؤ جھیل کے پاس چلتے ہیں پھر واپس اوپر چلے جائیں گے۔ تمہیں یہ جگہ اچھی نہیں لگ رہی تو ہم یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر تم میرا ہاتھ چھوڑ دو میں خود چلنا چاہتا ہوں۔"

وشاء نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ساحل کی طرف دیکھا اور نفی کے اشارے میں اپنی انگشت ہلائی۔ "ایسی جگہ میرا ہاتھ چھوڑنا ٹھیک نہیں۔ تمہیں ایسا کچھ بھی نظر آ سکتا ہے۔ جس سے تم اپنا ہوش کھو دو۔"

"تم مجھے مزید ڈرا رہی ہو......" ساحل کا حلق خشک ہونے لگا۔

"کیا کروں، یہ جھیل ہے ہی ایسی جگہ اور میں تمہیں یہ جھیل دکھانا چاہتی ہوں...... جھیل دیکھتے ہی ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"

ساحل نے لمبا سانس کھینچا اور حوصلہ کرتے ہوئے وشاء کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

مٹی اس قدر نرم تھی کہ وہ جس جگہ پاؤں رکھتا وہاں اس کے قدموں کا نشان بن جاتا، وہ جھیل کے قریب گئے تو عجیب سا شور ساحل کی سماعت سے ٹکرایا۔ جیسے بہت سی عورتیں اور مرد آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ اس نے آوازوں کی سمت میں پلٹ کر دیکھا تو اس کا سانس اس کے حلق میں ہی اٹک گیا۔ آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔

سفید کفن میں بہت سے مرد اور عورتیں ہوا میں معلق ادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے ان کے وجود غیر مرئی اور باطنی تھے۔ وہ کسی بھی کثیف چیز سے ہوا کی طرح گزر جاتے۔

ساحل کو جھرجھریاں آنے لگی تھیں...... اس کی روح کپکپا رہی تھی...... اس کی وجدانی اور لاشعور کی سوئی ہوئی قوتیں بھی دھیرے دھیرے جاگ رہی تھیں۔

وشاء نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "تم ادھر ادھر کیا دیکھ رہے ہو، سامنے جھیل کی طرف دیکھو جو تمہاری آنکھوں جیسی گہری ہے۔"

ساحل نے کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح فوراً ہی جھیل کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

جھیل کا پانی شفاف اور چمکدار تھا۔ ساحل نے جھیل میں اپنا عکس دیکھا تو اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

ساحل نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "تم میرے شانے پر سر رکھے کھڑی ہو مگر جھیل میں تمہارا عکس کیوں نہیں دکھائی دے رہا۔"

وشاء تمسخرانہ انداز میں ہنسنے لگی۔ "کیونکہ تم انسان ہو اور میں ہمزاد، فکر مت کرو آج میں انسان اور ہمزاد کا یہ فرق ختم کر دوں گی۔"

یہ کہہ کر وشاء نے ساحل کو جھیل کی طرف دھکا دے دیا۔ ساحل چیختا ہوا گہری جھیل میں جا گرا۔ اسے تیراکی نہیں آتی تھی۔ جھیل کا گہرا پانی اسے نیچے کی طرف کھینچتا مگر وہ کوشش کر کے بار بار پانی کی سطح پر آتا اور لمبے لمبے سانس لے کر موت سے لڑنے کی کوشش کرتا۔

موت اور زندگی کی اسی کشمکش میں ساحل نے دیکھا کہ ایک جوان وشاء اور حوریہ کے سامنے کھڑا ہے۔ وشاء کی آواز ساحل کی سماعت سے ٹکرائی۔ "خیام تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

جبکہ اس جوان کا چہرہ خیام کا نہیں تھا۔ ساحل بس اتنا ہی سن سکا پھر وہ گہرے پانی کے آگے بے بس ہو گیا۔

جونہی اس کے ہاتھ پاؤں بے جان ہوئے وہ پانی کی تہہ کی طرف گرتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں سانس کی جگہ منہ سے بلبلے نکل رہے تھے۔ وہ اپنی موت کو بالکل سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے پورے ہوش و حواس میں تھا۔

اسے خیال میں اپنی ماں جائے نماز پر بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ موت سامنے بانہیں پھیلائے کھڑی تھی اور سماعت میں ردا اور ماں کی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہاتھ سے پھسلتی زندگی کی ڈور کو کیسے تھامے رکھوں، شاید اب چند لمحوں کا فاصلہ تھا اس کی زندگی اور موت میں۔

اس کا جسم تیزی سے تہہ کی طرف گر رہا تھا۔ اچانک

اس کا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا، ایک ساعت میں ہی سب کچھ بدل گیا..... وہ جھیل میں نہیں تھا۔

وہ جس جگہ پر تھا..... وہ تنگ سی جگہ تھی، اس کے چاروں طرف مٹی ہی مٹی تھی۔ اس نے اوپر کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی کھلی ہوئی قبر میں لیٹا ہے۔ اس کھلی ہوئی قبر کے دہانے پر وہی جوان کھڑا ہے۔ جس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا۔

جوان نے اپنا دایاں ہاتھ ساحل کی طرف بڑھایا ساحل بمشکل قبر سے باہر نکلا۔ وہ مبہوت نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ قبرستان میں سوائے اس کے اور اس جوان کے اور کوئی نہیں تھا اس نے قبر کے قریب کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔

"وہاں کون رہتا ہے؟"

جوان سیخ پا ہو کر بولا۔ "اندر تمہاری دلہن بیٹھی ہے اس کوٹھری میں کوئی نہیں رہتا۔ ابھی تک تمہیں سمجھ نہیں آئی کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا۔ آؤ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔"

ساحل کا جسم نڈھال تھا، اسامہ اسے سہارا دیتے ہوئے اپنی گاڑی تک لے گیا۔

"میری موٹر بائیک....." ساحل نیم غنودگی کی حالت میں بمشکل بولا۔

"وہ میں منگوالوں گا۔ تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں گاڑی میں ہی جانا ہوگا۔" یہ کہہ کر اسامہ نے اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ اسامہ ساحل کے گھر پہنچا تو راحت نے دروازہ کھولا۔

"کیا ہوا میرے بیٹے کو.....؟" بیٹے کو اس طرح اسامہ کے کندھے سے لٹکے ہوئے دیکھا تو وہ تڑپ کے رہ گئی۔

"کچھ نہیں ہوا، بس غنودگی ہے۔" یہ کہہ کر اسامہ ساحل کو اس کے کمرے تک لے گیا اس نے ساحل کو بستر پر لٹا دیا۔

ساحل کو کچھ ہوش نہیں تھا کہ اس کی ماں کیا کہہ رہی ہے، اس نے تو جیسے نشہ آور چیز کھائی ہوئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔

راحت کچھ بولنے لگی تو اسامہ نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔

راحت مسلسل رو رہی تھی۔ اس نے اسامہ کا بازو پکڑا۔

"بیٹے تم مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ آخر ہوا کیا تھا۔"

ساحل نے راحت کی بے چین آنکھوں میں جھانکا۔

"جائے نماز بچھالیں اور اپنے رب کا شکر ادا کریں جس کے آپ نے بیٹے کو اس شیطان کے شکنجے سے بچالیا جس کے کالے جادو کے کھیل میں آج ساحل نے اپنی زندگی ہار دینی تھی۔ جس وشاء کے لیے ساحل دیوانہ ہوا پھر رہا ہے وہ زرغام کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہے۔ جو زرغام کے اشارے پر ساحل کے لیے جال بچھاتی ہے۔ اگر میں وقت پر نہ پہنچتا تو آپ کا بیٹا اس دنیا میں نہ ہوتا۔"

راحت نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم کون ہو، میں تمہیں نہیں جانتی مگر جو احسان تم نے اس بے بس ماں پر کیا ہے اس کا بدلہ تمہیں خدا دے گا۔"

"آپ مجھے شرمندہ مت کریں۔ آپ ساحل کے پاس بیٹھیں مجھے کسی ضروری کام سے جانا ہے۔ ساحل کی موٹر بائیک بھی منگوانی ہے۔" یہ کہہ کر اسامہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ راحت ساحل کے پاس جا کے بیٹھ گئی۔

ساحل گہری نیند سویا ہوا تھا۔ راحت اس کے بال سہلانے لگی۔ "میں تو بے خبر اپنے بیٹے کی نوکری کے لیے دُعائیں مانگ رہی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا بیٹا کس مصیبت میں گرفتار تھا۔"

راحت اپنے آنسو پونچھتی ہوئی وہاں سے اٹھی اور الماری سے سورۃ یٰسین نکال کر لے آئی۔ وہ ساحل کے پاس بیٹھ کے سورۃ یٰسین پڑھنے لگی۔ سورۃ یٰسین پڑھنے کے بعد اس نے ساحل کی طرف پھونکا اور پھر جائے نماز بچھا کر شکرانے کے نفل پڑھنے لگی۔ خود کو کتنا ہی سمجھاتی مگر اس کے آنسو نہیں تھم رہے تھے۔

اس نے نفل پڑھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور اسامہ کے لیے دُعائیں مانگنے لگی۔ اسی دوران ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ راحت نے دُعا مکمل کی اور جائے نماز تہہ کر کے رکھ دیا اور فون کی طرف بڑھی۔

"ہیلو....." راحت نے ریسیور کان سے لگایا۔

(جاری ہے)